



سچ کہانیاں
آپ بیتیوں جگ بیتیوں

سچ کہانیاں آپ بیتیوں جگ بیتیوں
کراچی
ماہنامہ سرگزشت

جولائی 2018

BOOKSPK
Books & Magazines



بابائے کراچی: شہر کو ترقی پانستہ بنانے والے کی روداد
منفرد نمونہ نگار: لادوال گیتوں کے خالق کی داستان حیات
ماں صدقے: ماں اور بیوی کے فرق کی تصویر کشی، ایک دلچسپ سچ بیانی

سرگزشت

07

شاعر بہارِ پارس

ادارہ

ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر
ایک نادر روزگار کا تعارف

چند مسلسل

44

چارہ گر

زویا اعجاز

تعلیم عملاً کرنے کو مقصد
حیات بنانے والی کا تذکرہ

عزم و حوصلہ

78

برفیلہ جہنم

لے آر اچپوت

برفزار میں تقریباً دو
مہینے پیدل چلنے والیوں کا تذکرہ

تذکرہ

104

جنگجو ملکہ

سید احتشام

میدان جنگ اس
کا پسندیدہ مقام تھا

گفت و شنید

08

شہر خیال

مدیر اعلیٰ

آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ
کے مشورے اور آپ کے سوال

مشعل راہ

56

بابائے کراچی

شکیل صدیقی

اس نے شہر کی ترقی
کے لیے زناگی وقف کر دی تھی

فلم نگری

88

منفرد و غمہ نگار

انور فرہاد

نہایت کم عمری میں مقبولیت
حاصل کرنے والا گیت کار

سفر کہانی

112

شمشال ٹورنٹو

ندیم اقبال

جانبانی کا شہر کا ایک
الگ انداز کی داستان

شخصیت

16

غلا آفا

ڈاکٹر ساجد امجد

آپ نے اسلام کی راہ میں
سب سے زیادہ تشدد برداشت کیا

حادثات

74

آتش فشاں

فرزانہ نگہت

بہتے لاوے میں پھنس
جانے والے کا قصہ

جرم و سزا

100

لبے ہاتھ

زاہد شیخ

حسرم کو جتنا ہی چھپایا
جائے مگر چھپتا نہیں ہے

دلچسپ و عجیب

134

جہان دیگر

شیراز خان

ان مقدمات کا تذکرہ جو اسرار
کے پردے میں چھپے ہیں

تحقیق

138

ہتھیار

منظر امام

انسانوں نے انسانوں کے شکار
کے لیے کیسے کیسے ہتھیار بنائے ہیں

پہلی سچ بیانی

172

ماں صدقے

ایس ایم نوشاد

ماں اور بیوی کے درمیان
سرق کیا ہے؟

چوتھی سچ بیانی

206

معاوضہ

ڈاکٹر ظفر احمد

سازشی عناصر کس طرح
اپنا راستہ صاف کرتے ہیں

ساتویں سچ بیانی

226

گناہ گار

ایم زید شیخ

کیا وہ واقعی
گناہ گار تھا

عالمی سیاست

142

سیاسی قتل

نیرہ احتشام

سرد جنگ نے کیسے کیسے
ہیرے قتل کرادیے

دوسری سچ بیانی

186

دلہن

ناصر حسین بلوچ

شوہر کی نفرت کو اس
نے محبت میں بدل دیا

پانچویں سچ بیانی

214

انصاف

اعتزاز سلیم و صلی

زندگی کے نشیب و سراز
سے ابھری سچ بیانی

آٹھویں سچ بیانی

232

بھیڑیے

افتخار حسین اعوان

اس وادی کی روداد جہاں انسانی
بھیڑیوں نے مسکن بنا رکھا ہے

معاشرت

148

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

ایک معصوم نوجوان کی خوں
رنگ لہو گرمانے والی داستان

تیسری سچ بیانی

194

امانت

اسلم فاروق

یہ خوبی صرف مشرق
بیویوں میں ہوتی ہے

چھٹی سچ بیانی

218

مٹھی بھر زمین

پرویز احمد لانگاہ

دیہی علاقوں کی
بربریت کا بیان

نویں سچ بیانی

238

سلسلہ عذاب

مرشد

اپنی محبت کو سولی پر چڑھا
دینے کی سزا وہ بھگت رہا ہے

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور
تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر
آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ماہ نامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے
کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح فہم دار نہ ہوگا۔

مدیر اعلیٰ: عذرا رسول

مدیر: پرویز بلگرامی

نائب مدیر: نبیلہ ظہر

◆◆◆
منیجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

◆◆◆
سرکولیشن منیجر

سید منیر حسین

0333-3285269

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 70 روپے ❖ زبر سالانہ 900 روپے

پبلشرز پروپرائٹرز: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63، فیز II ایکسٹینشن

ہیفیس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ

کلچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس

ہائی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone: 35804200

E-mail: jdpgroup@hotmail.com



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قارئین کرام!

السلام علیکم!

اور عید بھی گزر گئی۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی ہم سب خوب لئے۔ رمضان کا مہینہ تو بہت دعا و استغفار کا مہینہ ہوتا ہے، اپنے گناہوں سے برأت کا مہینہ ہوتا لیکن دیکھا یہ جاتا ہے کہ اس مہینے ہم سب نادانستگی میں مزید گناہوں کا بوجھ خود پر لا دیتے ہیں۔ مہنگائی کا طوفان جس شدت سے آتا ہے اور اس مہنگائی سے نمٹنے کے لیے ہم سب مزید گناہوں کے بوجھ تلے دبتے چلے جاتے ہیں۔ بچوں کی خواہشوں کو پوری کرنے کے لیے کہاں کہاں سے انتظام کرتے ہیں یہ ہم ہی جانتے ہیں دیگر ممالک میں خاص کر یورپ امریکا میں مذہبی تہواروں پر اشیائے ضرورت کی قیمتیں کم کی جاتی ہیں، حد یہ ہے کہ امریکا اور برطانیہ میں بڑے اسٹورز نے رمضان سے ہی مسلمانوں کے لیے رعایتی نرخوں پر خریداری کے لیے علیحدہ حلال شعبے قائم کر دیئے ہیں۔ یہ اسٹورز مسلمانوں کے نہیں، بلکہ عیسائی اور یہودی مالکان کی ملکیت ہیں، تاکہ ہر کوئی خوشیاں منا سکے لیکن ہم بالکل الٹ چلتے ہیں اور ہمیں کوئی روکنے ٹوکنے والا بھی نہیں۔ کیا ہمارے ہاں ایسا کوئی قانون نہیں بن سکتا کہ مہنگائی کا یہ طوفان نہ اٹھے؟

معراج رسول

شاعر پہلی بارش

سات جولائی 1952ء کی رات آہستہ آہستہ دھل رہی تھی۔ منگھری (ساہیوال) کی اس معصومی دوشیزہ کی زندگی میں یہ رات یادگار بن کر آئی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اسی وقت آہٹ ہوئی۔ وہ چونک گئی۔ اس نے گھونٹ کی آڑ سے دیکھا۔ اسے دو پیر نظر آ رہے تھے۔ وہ مزید سکڑ گئی۔ دروازہ پھر بند ہو گیا، چٹنی لگ گئی۔ آنے والا مزید نزدیک آنے لگا۔ وہ شجر الہیابن کر مزید سٹ گئی۔ وہ اس کے مقابل تھا۔ دونوں کے لیے یہ ایک یادگار لمحہ تھا۔ نووارد نے اپنے سر سے کلاہ اتاری، سہرے کو الگ کیا اور اس یادگار لمحے کو امر بنانے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ لرزتے ہاتھوں نے سرخ گھونٹ کو الٹ دیا۔ ماہ تیاہاں جگمگاٹھا۔ وہ اس حسین چہرے کو پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں پیار کی جوت جل اٹھی تھی وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں مر رہا تھا۔ بھی دو لہانے ایک عجیب بات کہی۔ دھن چونک گئی۔ شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر اس نے دو لہا کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے وہ اس کی بات سمجھ نہ پائی ہو۔

”ہاں تم میری دوسری بیوی ہو“ میں پہلے سے شادی شدہ ہوں۔“ دو لہانے اپنا جملہ دہرایا۔ لمحہ بھر پہلے دھن کا چہرہ کھلا کھلا سا تھا، اس پر سیاہی سی پھیل گئی۔ اس کے چہرے کے تغیر کو محسوس کرتے ہی دو لہا سنبھل گیا اور پھر اس نے ہنستے ہوئے کہا ”اپنی اس سوتن کا نام نہیں پوچھو گی؟“ دھن خاموش رہی تو دو لہا کو اس کے حال پر رحم آ گیا، اس نے شیر وانی کی بڑی سی جیب سے ایک کتاب نکالی اور اس کے حنائی ہاتھوں پر رکھ دی ”یہ ہے تمہاری سوتن میری پہلی بیوی! میں نے بہت پہلے شاعری سے شادی کر لی تھی۔ اور یہ ”برگ“ نے آج ہی ماریٹ میں آئی ہے ایک کاپی تمہارے لیے بھی لے آیا یعنی دوسری بیوی کی خدمت میں پہلی بیوی بطور تحفہ پیش کر رہا ہوں۔“

ایسا سنجیدہ مذاق اس کی فطرت تھی۔ اس نے زندگی کو بھی مذاق سمجھ لیا تھا۔ وہ ہجرت سے پہلے انبالہ کو اپنا وطن سمجھتا تھا۔ اس نے وہیں جنم لیا تھا۔ اس کے دادا سید شریف الحسن کاظمی خاندانی رئیس تھے۔ نجیب الطرفین سید تھے۔ شجرہ حضرت علی سے ملتا تھا۔ امام موسیٰ کاظم کی اولادوں میں سے تھے۔ ان کا شمار شہر کے رؤسا میں ہوتا تھا۔ مگر پورے نصیر پور اور راج گڑھ میں ان کی لمبی چوڑی اراضی تھی۔ گھر میں نوکر چاکر، کنیز باندیوں کی قطاریں تھیں۔ اتنا کچھ ہوتے ہوئے بھی سید شریف الحسن کو ہمیں نہ تھا۔ وہ بھی اپنے دوستوں کی طرح ملازمت کے خواہش مند تھے۔ پھر انہیں بطور انسپٹر ملازمت مل گئی۔ شریف الحسن بڑے کروڑے نوکر کی کر رہے تھے۔ انہوں نے بچوں کو بھی تعلیم کا تاج پہنایا تھا۔ سید محمد سلطان نے جب بی اے کا امتحان پاس کیا تو ان کی خوشی دیدنی تھی۔ انہوں نے ملازمت کے لیے فوج کا انتخاب کیا۔ اس دور میں جب مسلمانوں میں میٹرک پاس نوجوانوں کی تعداد بھی آٹے میں نمک کے برابر تھی مگر بھوشن بہت بڑا اعزاز تھا۔ فوج میں انہیں بہت اچھا عہدہ مل گیا۔ انہوں نے سید محمد سلطان کی شادی بھی ایک علم پرور خاندان میں کی تھی۔ سید نیاز نبی جو انبالہ کے جانے پہچانے شاعر تھے محفل مقاصدہ کی جان تھے کسی امام کی پیدائش کی محفل ہو یا مجلس سید الشہداء ہر جگہ انہیں مدعو کیا جاتا تھا۔ وہ منبر پر پہنچتے ہی محفل پر چھا جاتے تھے۔ انہی کی لاڈلی بیٹی کنیز فاطمہ عرف کنیزہ بیگم سے سید محمد سلطان۔۔۔۔۔ کی شادی کرائی گئی تھی۔ 8 دسمبر 1925ء کو کنیزہ بیگم کی گود میں جب ناصر آئے تو سب سے زیادہ خوشی سید شریف الحسن کو ہوئی۔ انہوں نے دیکھیں چڑھائیں لیکن جب ناصر تین سال کا ہوا تو دادا کی قربت سے اسے دور کر دیا گیا۔ سید محمد سلطان کا تبادلہ پشاور ہو گیا تھا۔ پشاور کے نیشنل ہائی اسکول میں اسے داخل کر دیا گیا مگر وہ وہاں زیادہ دن پڑھ نہ سکا کیونکہ والد کا تبادلہ ڈکھائی میں ہو گیا تھا۔ ڈکھائی کے ڈی بی ٹیڈل اسکول میں وہ پڑھ ہی رہا تھا کہ والد کا تبادلہ پھر نوشہرہ چھاؤنی ہو گیا وہ اپنے ساتھ ناصر کو بھی لے آئے۔ سید محمد سلطان کو جو مکان الاٹ ہوا تھا وہ ریلوے لائن کے قریب تھا۔ سیٹی بجاتی، دھواں اڑاتی، چمک چمک کرتی ریل گزرتی تو وہ ایک ٹک اسے دیکھتا رہتا۔ اس کے صرف دو ہی شوق تھے ریل کو دیکھنا یا پھر چھت پر چڑھ کر پورے چاند کی چاندنی سے لطف لینا، چھوٹے بچوں کے لیے چاند بے معنی ہے اس کے حسن سے محظوظ ہونا عجوبہ ہے لیکن وہ اتنی چھوٹی سی عمر میں فطرت کے حسن کا چھاری بن چکا تھا۔

وقت کے ساتھ وہ بڑا ہوتا گیا۔ میٹرک کے بعد اسے لاہور کے اسلامیہ کالج میں داخلہ ملا تھا۔ لاہور ادبی مرکز تھا۔ یہاں پہنچ کر اس کی شاعری کو جلا ملی۔ اسی دوران قیام پاکستان کا اعلان ہوا۔ اس وقت وہ انبالہ میں تھا۔ بڑی مشکلوں سے وہ خاندان والوں کے ساتھ لاہور پہنچا، پرانی انارکلی میں ایک کابک جیسا گھر ملا اسی میں زندگی گزارنے لگا۔

”برگ“ نے کے بعد اس کا دوسرا شعری مجموعہ ”دیوان“ بعد از مرگ بازار میں آیا۔ پھر 1975ء میں ”پہلی بارش“ (غزلیں) 1977ء میں ”نشاط خواب“ (نظمیں) 1981ء میں ”مڑکی چھایا“ (منظوم ڈراما) 1982ء میں ”خشک چشمے کے کنارے“ (نثر) 1990ء میں ”نیا ایڈیشن“ (مضامین ریڈیو فیچرز مقالے ادارے) 1989ء میں انتخاب میر 1990ء میں انتخاب نظیر 1991ء میں انتخاب ولی 1991ء میں انتخاب انشا بازار میں آئی۔

2 مارچ 1972ء کو البرٹ وکٹر اسپتال کے بیڈ پر لیٹے لیٹے ناصر کاظمی نے آخری ہنگامی لی اور جسم کی قید سے آزاد ہو گیا۔ ابھی اس کے مرنے کے دن نہ تھے۔ 47 سال کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے اس عمر میں تو پختگی آتی ہے لیکن زندگی بھر سب کو ہنسانے والا ایک سب کو رلا گیا۔ ☆☆☆

شہر خیال

مدیر اعلیٰ



☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی کراچی سے۔ ”انصاف پسند منصف کی زیر نگرانی جمہوریت کا سب سے بڑا منصب اس بات کا تقاضا کر رہا ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ قومی سینے پر جمہوریت کا تمغہ آویزاں کرنے کے بجائے کچھ ماہ جمہوریت کے بغیر گزار لیے جائیں اور اس دوران جمہوریت نما جمہوری مجرموں کو دیدہ عبرت بنا دیا جائے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ ووٹر کی عزت پامال کر کے صرف ووٹ کو عزت دو کا نعرہ کس قدر بھونڈا ہے۔ کرپشن کی سڑک پر بگٹٹ دوڑنے والے ہمارے جمہوری رہبر و رہنماؤں نے ہمیں اغیار کے پاس گروی رکھ دیا ہے اور گروی بھی ایسا کہ چھٹکارے کی کوئی صورت بھی نہیں چھوڑی۔ لہذا ضروری ہو گیا ہے کہ اب لگام اور مشکیں کس دی جائیں ورنہ ہماری داستان بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔ بیس صفحات بشمول ایک صفحہ شہر خیال کا کم ہو جانا گوارہ نہیں کیا جاسکتا اور اس صورت میں تو بالکل بھی نہیں کہ محترم نزابت افشاں اور محترمہ سدرہ بانو ناگوری کو انتظار گاہ میں بیٹھنا پڑے لہذا قیمت بڑھا دیں کیونکہ ڈالر کی قیمت ابھی مزید بڑھے گی۔ آپ پرچے کا لے آؤٹ دوبارہ بحال نہیں کر پائیں گے۔ پیر صاحب شاہ سلیمان پھلواڑی کو عقیدت سے دیکھا اور شہر خیال میں تاک جھانک کے ساتھ رانا محمد شاہ صاحب کی قسمت پر رشک کیا اور قلم کار اور قلم کار کی طرف متوجہ ہوئے۔ شیڈن سڈنی کی کامیاب زندگی اس بات کی مثال ہے کہ خدا نے کیوں خودکشی حرام قرار دی ہے۔ نہ جانے اس نے ہماری کتاب زندگی کے اگلے صفحے پر ہماری قسمت میں کیا لکھا ہے جسے مایوس لوگ بڑھے بغیر اس کتاب کو بند کر دیتے ہیں۔ بابائے پشتو خلیق صاحب کی عظمت کو سلام۔ زویا اعجاز نے کیپٹن احسان کے زخم نہاں دکھا کر آنکھوں کو نم کر دیا۔ قوم کے اس سپوت کا احسان ساری زندگی قوم یاد رکھے گی۔ سانحہ مشرقی پاکستان اغیار کی سازش تھی۔ جناب انور فرہاد، طلعت حسین کی فنی خدمات میں رطب اللسان تھے اور ٹھیک تھے۔ ایک باوقار فنکار کو اس کی شان کے مطابق خراج تحسین اس کا حق تھا۔ انداز و بیباں خوب صورت تھا اور بے مثال بھی۔ نشان، نقل کی عام سی روداد تھی۔ ناقابل یقین واجبی سی اس لیے کہ آج کل انٹرنیٹ خصوصاً یوٹیوب پر غیر تحقیق شدہ ایسا بہت سا مواد ہر وقت موجود رہتا ہے اور دیکھا جاسکتا ہے۔ ندیم اقبال صاحب کی شخصیت کے نئے پہلو نمایاں ہو رہے ہیں۔ نورنو میں رہ کر بھی ہمیں یاد رکھتے ہیں۔ انجم فاروق ساحلی کی ہم دل شکنی کرنا نہیں چاہ رہے لیکن شکاریات پر آدم خور جھکی تحریریں ہمارے لیے نئی ہیں لہذا آپ اب کچھ نیا لکھیں۔ ”ناسور“ بہتر سے بہتر ہو رہی ہے۔ ماڈل گرل پیدل مارچ اور حقیقی اداکار بہت اچھی تھیں۔ خاص طور پر لیونارڈو کے بے مثال فنکار ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے، حیرت ہے کہ اسے ٹائی ٹے ٹک میں بہترین اداکار کا آسکر ایوارڈ نہیں ملا۔ ”ستاروں پر کندہ“ انتہائی شاندار محنت تھی۔ منظر امام صاحب نے واقعی منفرد کام کیا ہے۔ ملک کے نایاب ترین گوہروں کو یکجا کر دیا، سمیل حسن، ہارون طارق، عائشہ علی عین، ارفع کریم، فائزہ خان، مہک گل، نمبرہ، سعد علی، لاریب عطاء اللہ، فاطمہ غلو و ضیاء کے والدین اور اساتذہ کو سلام محبت، سچ بیانیوں میں واپسی، خلش اور ہانڈی بالترتیب ہیں۔ اب آخر میں ذکر ہو جائے فتح و شکست کا۔ اعتراف سلیم و صلی کا کمال یہ ہے کہ اپنے انداز بیان سے ازبر یادوں کو دہرائے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ اب بھلا ان سے کیونکر کہا جائے کہ ہماری یادوں کو اس بری طرح نہ کریداکریں کہ کم حقائق کی تلخیاں آپ کی تحریر پر پڑھنے کا مزہ کر کر کر دیں۔ ہم آپ کی اس بات سے تو بالکل بھی اتفاق نہیں کرتے کہ قومی کرکٹ ٹیم کے کروڑ پتی پروفیشنل کھلاڑی اگر کچھ ہار جائیں تو قوم کسی رد عمل کا مظاہرہ نہ کرے۔ بلاشبہ ہار جیت کھیل کا حصہ ہیں لیکن اگر ہار پروقار نہ ہو تو انگلیاں تو انھیں کی اور یہ بھی ملے ہے کہ منہ اور ناراض ہونے کا حق بھی صرف اسی کا ہے جو محبت اور پیار کرتا ہے اور پیار بھی اتنا کہ مایوس ہو کر خودکشی کر لے اپنی اداک تو پھوڑ دے۔ ہم جسٹس عبدالقیوم رپورٹ کا تذکرہ نہ بھی کریں جس میں وسیم اکرم، عطاء الرحمن، سلیم ملک، وقار یونس، مشتاق احمد اور دیگر پر

جولائی 2018ء

8

ماہنامہ سیرگشت

ماہنامہ سیرگشت

9

جولائی 2018ء

شک کا سایہ پڑتا ہے۔ ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ محمد عامر سلمان بٹ اور محمد آصف پر افسوس کہ جنہوں نے چند روپوں کے عوض نہ صرف اپنا شاندار کیریئر تباہ کیا بلکہ ملکی وقار کو بھی خاک میں ملا دیا۔ چند دیگر حالیہ کھلاڑی بھی قومی مجرم ہیں، کیا یہ بات غصہ کرنے اور ناراض ہونے کی نہیں ہے۔ اب آتے ہیں چند مخصوص اور مشکوک میچز کی طرف۔ باآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بھارت کے ساتھ ہونے والے ہمارے میچز وہ بھی ورلڈ کپ میں جن میں ہمیشہ ہار ہمارا مقدر رہی، مشکوک تھے۔ 1996ء میں برسر اقدار جناب آصف علی زرداری نے ورلڈ کپ جیتنے کی شکل میں ہر کھلاڑی کو ایک ایک کروڑ روپے دینا تھے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ کوارٹر فائنل میں بھارت کے ہاتھوں حیرت انگیز شکست بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ 2011ء میں کپتان شاہد آفریدی کی بے بسی دیکھنے کے قابل تھی کہ کیسے کیسی فائنل ان کے ہاتھ سے پھسل گیا۔ 1988ء میں سلیم جعفر سی فائنل میں ہماری بار کا سبب بنے جب کہ اس دن ان کی ٹیم میں جبکہ ہی نہیں بنتی تھی۔ 1992ء کا ورلڈ کپ ہم عمران خان کی الوالعزیز کی وجہ سے جیتے لیکن ہمیں شکر گزار ہونا پڑا آسٹریلیا کا جو اگر اپنا آخری لیگ میچ نہ جیتی تو ہم بہتر اوسط کے باوجود سی فائنل کی دوڑ سے باہر ہو جاتے۔ 2003ء اور 2007ء دونوں میں ہم پہلے راؤنڈ میں ہی باہر ہو گئے۔ 2015ء کے ورلڈ کپ میں بھی وقار یونس کی عاقبت نااندیشی ہمیں لے ڈوبی۔ وہ سرفراز احمد کو کسی قابل سمجھنے کے لیے تیار نہ تھے۔ مختصر یہ کہ اہم مقابلوں میں ہماری بے ٹکی ہار میں کھلاڑیوں کی پر فارمنس سے زیادہ دیگر ان دیکھے عوامل بھی کار فرما ہوتے ہیں۔ گزشتہ رمضان میں ہونے والی چیمپئنز ٹرافی میں بھارت کے مقابل جیت اس وجہ سے تھی کہ ٹیم میں کوئی گروپ بندی نہ تھی۔ آفیشلوں کے اپنے اپنے گروپ ریٹائر ہو چکے تھے بنا کپتان، نیا کوچ، نیا چیف سلیکٹر اور نئے کھلاڑی ہر طرح کی آلودگی سے پاک تھے اس لیے جیت پر وہ قوم کی آنکھ کا تارہ بن گئے۔ اب یہ کس طرح ممکن ہے کہ اگر یہ ہی کھلاڑی بے ٹکے طریقے سے ہار جائیں تو قوم ان سے ناراضگی کا اظہار بھی نہ کرے۔ تمام ساتھیوں کو عید مبارک قبول ہو۔“

☆ نزابت افشاں نے گاؤں مہورہ تحصیل فتح جنگ سے لکھا ہے۔ ”اٹھائیس مئی کی تپتی دوپہر کو سیرگشت ملا۔ شاہ سلمان پھلواڑی کا مختصر تذکرہ اچھا لگا۔ ”بابائے پشتو“ ایک بھر پور تحریر تھی جو کہ شوکت رحمان شوکت صاحب کی محنت اور تحقیق کا نتیجہ تھی۔ شوکت رحمان صاحب سخت بیمار تھے خدا جانے اب کس حال میں ہیں؟ ”زخم نہاں“ پاک فوج کے ایک بہادر ہیرو کی داستان حیات تھی مگر افسوس کیپٹن احسان ملک کی پیدائش و وفات، سلسلہ تعلیم اور اس بات کا ذکر بھی نہیں تھا کہ وہ کس حال میں ہیں اور آج کل کہاں رہتے ہیں۔ ”شمشال سے نورنو“ بہت ہی زبردست اور عروج پر ہے لیکن اس بار صرف ایک جگہ سرین کا ذکر تھا۔ لگتا ہے کہ ندیم صاحب ”حوران فریمک“ کی محبت میں سرین کو بھول گئے اس بار، سر جی نے ان مغربی لڑکیوں کو خوب اُلو بنایا، ساتھ ہی مطیع اللہ اور شہباز کے پٹکلے واہ کیا تڑکا لگا ہوا تھا، اس بار، ندیم صاحب کے بقول یہ سفر نامہ ختم ہونے کو ہے۔ اب پتا نہیں سرین اور ندیم صاحب کا ملن ہوتا ہے کہ نہیں۔ ”ستاروں پر کندہ“ منظر امام صاحب کی تحقیق اور محبت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ ”آدم خورشید“ شکار کہانی پڑھنے کو ملی زبردست رہی۔ واپسی سبق آموز تحریر تھی۔ اپنے آبائی گھر واپسی ہی موصوفہ کے لیے فائدہ مند ہوئی۔ ”سزا“ بہت ہی حیران کن تحریر تھی۔ نیلوفر دوسروں کی زندگی میں زہر گھولتی رہی۔ جنید صاحب نے وہ اڑنگا لگایا کہ بے چاری آسمان سے زمین پر آگئی۔ ”جرم چھپتا نہیں“ بہترین اور سبق آموز کہانی تھی۔ ”خلش“ زبردست اور حقیقت آشکارا کرنے والی تحریر تھی لیکن راجیل نے جو کچھ کیا وہ بہت برا تھا اور اسے اپنے کیسے کی سزا مل گئی شکر ہے نازش کسی لوفر لفنگ کے ہاتھ نہیں لگی ورنہ عزت کے ساتھ جان سے بھی جاتی۔ ”تبدیلی“ بہت ہی مختصر مگر اچھی تحریر تھی۔ موضوع سے اچھا انصاف کیا گیا۔ ”زہریلا مسیحا“ بھی ٹھیک تھی۔ واقعی حیوان غصے میں آجائے تو اپنے مالک تک کو نہیں چھوڑتا۔ ہم چونکہ انک کے مشہور جنگل کالا چٹا پہاڑ کے دامن میں واقع گاؤں میں رہتے ہیں لہذا یہاں اونٹ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ہمارے خاندان کے بھی کئی لوگوں نے اونٹ رکھے ہوئے ہیں۔ کئی دفعہ ایسے واقعات پیش آچکے ہیں۔ ابھی دو سال پہلے ہی ہمارے پڑوسی کے اونٹ نے اس کی ایک ٹانگ اور بازو توڑ دیا تھا۔ ”خواہشوں کا سراب“ بھی بہتر رہی۔ ”شہر خیال“ میں رانا محمد شاہد صاحب صدارت پر تھے۔ 26 مئی کو رانا صاحب کے والد صاحب فوت ہو گئے ہم دکھ کے ان لمحات میں رانا بھائی کے ساتھ ہیں ویسے انسان کا انجام موت کے سوا کچھ نہیں۔ جون ایلیا نے اس بارے میں کہا تھا کہ ہم حسین ترین، ذہین ترین، امیر ترین اور زندگی کے ہر لحاظ سے بہترین ہونے کے باوجود بالآخر مر ہی جائیں گے۔ اللہ پاک رانا صاحب کو صبر اور ان کے والد محترم کو اپنا قرب نصب کرے (ہم بھی رانا صاحب کے غم میں شریک ہیں) آفتاب نصیر اشرفی صاحب بھی بہترین تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ قیصر خان، ندیم اقبال، ساگر تورو کر یاد کرنے کا شکر ہے۔ اعجاز حسین شٹار صاحب نے چار سالوں کے دوران پہلی دفعہ ناچیز کو یاد کیا، بہر حال شکر ہے۔ رانا سجاد آف مظفر گڑھ بھائی یاد کرنے کا شکر ہے۔ عبداللہ چاند تبصرہ پر سراپے جانے کا شکر ہے ویسے اگر آپ اپنے نام کے ساتھ ملتان نہ لکھتے تو میں آپ کو سعید احمد چاند (مرحوم) کا بیٹا سمجھا تھا۔ سدرہ بانو ناگوری، سسر مبارک باد کہ آپ بھی میری طرح لیٹ کمرز میں شامل ہیں۔ شہانہ حنیف، بشری افضل، ڈاکٹر روبینہ نقیس انصاری آپ سب کیوں غیر حاضر ہیں؟“

☆ رضا احمد اعوان بھکر سے رقم طراز ہیں۔ ”اس بار ”فلم مگري“ کے سلسلے میں طلعت حسین پر مضمون ”بے مثال“ کوئی اچھا تاثر نہ چھوڑ سکا۔ کیونکہ طلعت حسین کبھی بھی ہمارا پسندیدہ فنکار نہیں رہا۔ اداکار مصطفیٰ قریشی پر بھرپور لکھیں کیونکہ وہ ایک عہد ساز شخصیت ہیں۔ ”شمشال سے نورنو“ کے ندیم اقبال صاحب سے ایک وضاحت درکار ہے کہ یہ شہباز صاحب اداکار جمیل فخری (مرحوم) کے وہی بیٹے ہیں نا جو امریکا میں قتل ہو گئے تھے؟ آپ اس پر بھی کچھ تحریر کریں۔ ”ستاروں پر کند“ منظر امام کا مضمون خاصے کی چیز تھی۔ زویا اعجاز کی تحریر ”زخم نہاں“ خون گرمادینے والی تحریر تھی۔ ہمیں اپنے وطن کے محافظوں پر فخر ہے۔ ”ناسور“ کی ہر قسط اپنے اندر دلچسپی سیٹھ ہوئے ہے۔ سچ بیانیوں میں ”واپسی“ ماثرہ جنیدی کی ”سزا“ اور محمد سلیم کرد کی ”زہریلا مسجا“ بہترین سچ بیانیوں میں۔ ”عصر خیال“ میں رانا محمد شاہد، آفتاب احمد نصیر اشرفی، اعجاز حسین سٹار اور رانا سجاد کے تبصرے پسندیدہ تھے۔ ”بیت بازی“ کا سلسلہ بند کر کے اس کی جگہ موضوعاتی شعری سلسلہ شروع کریں۔“

☆ قیصر عباس خان کا بھکر سے نوازش نامہ۔ ”ادار یہ میں انکل نے صفحات کم کرنے کی وضاحت دی۔ اگر دس بیس روپے قیمت بڑھادی جائے تو بھی ہمیں قبول ہے مگر معیار پر سودا نہ کریں۔ رانا شاہد کرسی صدارت پر تھے، مبارکال۔ صفحات کم ہونے کی وجہ سے بہت سے دوستوں کے تبصروں سے محروم ہوئے (جی نہیں، لائن گپ کم کر کے 8 صفحے کا ہی میٹر ہے)۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی صاحب کے تبصرہ میں غلطی کی طرف توجہ تھی۔ رانا سجاد صاحب کافی عرصہ بعد حاضر تھے۔ اللہ کے فضل سے خیریت سے ہیں۔ اب انشاء اللہ آتے رہیں گے۔ اس کے ساتھ رومی صاحب اور پیارے انکل ندیم اقبال صاحب، حاجی اعجاز صاحب وغیرہ حاضر تھے۔ تبصرے اچھے لگے۔ زویا اعجاز صاحبہ نے قومی ہیرو کا حق ادا کیا واقعی ہمارے ملک احسان صاحب مایہ ناز فوجی آفیسر تھے انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا لیکن بری قسمت کہ ان کو ہتھیار ڈالنے پڑے، آج کل ملک احسان صاحب کہاں ہیں۔ اس سلسلے میں بھی کچھ بتایا جائے۔ انور فرہاد صاحب نے اس بار ایک لچھڑ کی روداد پیش کی ہے۔ طلعت حسین صاحب واقعی بے مثال اداکار، صداکار ہیں۔ اللہ ان کی عمر لمبی کرے، (آمین)۔ اداکارہ نیلی کے بارے میں مضمون لکھیں، سنا ہے وہ لاہور میں انتہائی کمپری میں ہے۔ نشان، فتح و شکست، ناقابل یقین مضمون اچھے تھے۔ ندیم اقبال انکل کی نئی تصویر کے ساتھ سفر نامہ کمال کا تھا۔ منظر امام صاحب نے تو پورے رسالے کی کی دور کردی۔ ان بہترین ٹیلنٹ جن کو ہم نہیں جانتے تھے ان کی نشاندہی کی۔ واقعی کرکٹ کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے، ویلڈن انکل منظر امام صاحب۔ ”آدم خور“ سید مقصود علی صاحب کا ایک اور کارنامہ پڑھنے کو ملا۔ پیدل مارچ ماڈل گرل حقیقی اداکار اور ناسور، بہترین کہانیاں تھیں۔“

☆ سید امتیاز حسین بخاری سرگودھا سے لکھتے ہیں۔ ”طویل ترین انتظار کے بعد آٹھ بجے رات سرگزشت ملا، دل فرط مسرت سے باغ باغ ہو گیا۔ صبح مطالعہ شروع کیا۔ ”علمی آزمائش“ میں میرا جواب معذرتوں کے باوجود اشاعت پذیر نہیں کیا گیا۔ بہت ہی زیادہ قلق ہوا۔ اس سے قبل ماہ مارچ کے شمارے میں میرا ارسال کردہ شعر معذرتوں کے بغیر شائع نہیں کیا گیا تھا، میں سخت اضطراب سے دوچار ہوا۔ اس بار احتجاجی طور پر بیت بازی میں شعر اور علمی آزمائش میں جواب ارسال نہیں کر رہا بلکہ رئیس امر وہوی پر مضمون لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ مضمون پڑھ کر اس کی اہمیت و افادیت آپ پر ظاہر ہو جائے گی۔ اقتباس رئیس امر وہوی خاک میں پنہاں صورتیں از سید محمد قاسم، میں تحقیقی کا احساس ہوتا ہے ان کے نام کے ساتھ نقوی نہیں لکھا گیا ہے۔ مجھے سخت غصہ آیا ہے اور میں نے یہ تحقیقی مضمون لکھا ہے تاکہ تحقیقی کا احساس باقی نہ رہے۔ (ایسے بہت سے لوگ ہیں جو خاندانی نام کی جگہ اپنے علاقے کا لاحقہ لگاتے ہیں۔ جب وہ امر وہوی لکھتی ہیں تو ہم نقوی کیسے لگا دیتے؟) ابن صفی کا تعارف خوب لکھا گیا ہے۔ اقتباس میں ڈاکٹر سید محمد نقوی لکھا ہے جب کہ ڈاکٹر سید محمد نقوی لکھنا چاہیے جیسا کہ ڈاکٹر سیدہ ناظرہ سلطانہ بخاری۔ کتب، اخبار میں لکھا ہے سادات مرد کے ساتھ سید اور عورت کے ساتھ سیدہ لکھنا لازمی ہے۔ آپ کا ادارہ پڑھا، آفتاب عظیم آباد۔ شعر خیال میں میرا خط شائع ہوا، شکریہ۔ ”بیت بازی“ میں شعر شائع ہوا، شکریہ! زیادہ کیا لکھوں سرگزشت کا مطالعہ جاری ہے گرمی آتے ہی لوڈ شیڈنگ شروع ہو گئی ہے اچھا خط نہ لکھنے پر معذرت چاہتا ہوں انشاء اللہ پھر حاضر ہوں گا۔“

☆ انجم فاروق ساحلی لاہور سے لکھتے ہیں۔ ”سرگزشت میں تحریر ”کو پر کار بچھ“ کی اشاعت دیکھ کر مسرت ہوئی۔ کچھ دیر بعد سلسلہ بحال ہوا (ہمیں شدید صدمہ پہنچا کہ آپ کی دونوں تحریر ہلکی سی رد و بدل کے بعد بالکل ”شیر آبی شیر آبی“ جیسی مشہور کتاب میں شامل کہانیوں جیسی ہے)۔ وقار الرحمن نے بھی مبارک باد دی۔ تحریروں کا اسلوب اور جملوں کی تراش خراش دیکھ کر ماننا پڑتا ہے کہ مدیر سرگزشت الفاظ کی حرمت کو کتنا مقدم رکھتے ہیں۔ اس مرتبہ ادارتی گفتگو خاصی فکر انگیز تھی۔ خطوط دلچسپی سے بھرپور تھے۔“

☆ حمیرا کوکب واسطی بہاولپور سے۔ ”آپ سے گزارش ہے کہ ماضی کی ایک گلوکارہ روبینہ بدر جس نے ایک گانا گایا تھا، ”تم سنگ نیناں لاگے مانے نہ ہی جیارا۔ پیا پیا بولے پیا من کا پہیہارا“ اس کی سرگزشت شائع کر دیں۔ اس کو آپ نے کیوں نظر انداز کیا ہوا ہے؟ اس کے علاوہ اکبر الہ آبادی، پنڈت ہری چند اختر، ڈاکٹر ابن میری شمل کو بھی آپ نے مسلسل نظر انداز کیا ہوا ہے۔ تاریخ میں جو مافی کردار کے حامل ہیں میر جعفر، میر صادق اور حبیبی بیگم ان پر بھی کچھ لکھ دیں۔“

☆ بلال رضوی نے لاہور سے لکھا ہے۔ ”سرگزشت کے کچھ شمارے دیکھے جو کافی پسند آئے، خاص طور پر امام احمد رضا پر ڈاکٹر ساجد امجد کا تفصیلی مضمون تو انتہائی معلوماتی اور ایمان افروز تھا۔ آپ کو کچھ مضامین بھجوا رہا ہوں۔ امید ہے چھاپ کر شکر یہ کا مونیج دیں گے (سرگزشت کی تحریروں کا ایک اپنا مزاج ہے۔ آپ کی تحریر اخبارات کے انداز میں ہے)۔ سلطان صلاح الدین ابوٹی کی حیات مبارکہ کے کچھ گوشے ارسان کروں گا (سلطان نور الدین اور سلطان صلاح الدین پر مکمل تحریر چھپ چکی ہے) کیا اس ماہنامہ میں اصلاحی مضامین بھی چھاپے جاتے ہیں جیسے شادی بیاہ پر بے جارمیں اور اس کے معاشرتی نقصان، تربیت اولاد وغیرہ کے حوالے سے؟ (سرگزشت کے اپنے انداز میں ہی ایسے مضامین شائع ہوتے ہیں)۔“

☆ طارق خان تمبر کھولہ لکھتے ہیں۔ ”میرا پسندیدہ سفر نامہ ”شمشال سے نورنو“ سب سے پہلے پڑھا۔ خدا بخشے مرحوم آفاقی صاحب کو، ان کے بعد ندیم اقبال کے ساتھ سفر کر کے بہت مزہ آتا ہے۔ اس کے بعد ”ناسور“ پڑھی۔ ناسور کی کہانی بہت دلچسپ ہوئی۔ ”واپسی“ بھی سائرہ افضل کی اچھی کاوش ہے۔ ”جرم چھپتا نہیں“ پڑھ کے عبرت حاصل ہوئی۔ ”ستاروں پر کند“ منظر امام کی تحقیق پر اثر رہی۔ واقعی پاکستان میں ٹیلنٹ کی کمی نہیں مگر حالات ایسے ہیں کہ ٹیلنٹ غریبوں میں بہت ہے مگر ان کو کوئی اور آنے نہیں دے رہا۔ ”آدم خور“ پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے، شاہ صاحب نے خواب میں شیر کو شکار کیا ہے، کئی جگہ لکھا ہے کہ وہ میگزین کا مطالعہ کر رہے تھے کہ اچانک شیر کی دھاڑ سنائی دی، حیرت ہے۔ پھر صاحب نے ایک صفحے کی کہانی میں دریا کو کوزہ میں سمو دیا ہے۔ ”بیت بازی“ میں ناہید سلیم کا تبصرہ اچھا ہے اور احمد حمزہ خان لہڑی کا شعر بھی اچھا ہے۔ جناب معراج صاحب یہ لوگ اتنے بڑے بڑے تبصرے کیسے لکھ لیتے ہیں۔ کیا ان کو دنیا میں اور کوئی کام نہیں ہے۔ باقی میری دعا ہے کہ اللہ پاک میرے وطن کی حفاظت فرمائے اور منظر انوں کو ڈیم بنانے کی توفیق دے۔ ہندوستان ہم سے ایک دن بعد یعنی 15 اگست کو آزاد ہوا مگر اس وقت وہاں چھوٹے بڑے چار ہزار ڈیم ہیں اور وہ بھی پاکستان کے دریاؤں پر بن رہے ہیں۔ خدا بخشے صدر ایوب خان کو جتنے ڈیم انہوں نے بنائے کوئی مائی کالا ل نہیں بنا سکا۔ پاکستانی سیاستدان باتیں تو بہت بناتے ہیں مگر ایوب خان مرحوم کے بعد کوئی ڈیم نہ بنانا ہماری حکومتوں کی نالی ہے۔ اس وقت پاکستان میں فیڈرل یاں بند ہیں۔ بجلی سے چلنے والی تمام ملز بند ہیں۔ بجلی ہوگی تو پاکستان ترقی کرے گا خدا ہمارے حکمرانوں کو عقل اور نگزب عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔“

☆ امیر حمزہ اشرف کی تشریف آوری کوٹ رب نواز ملتان سے۔ ”جون کا شمارہ 24 مئی کو ہی مل گیا۔ سرورق کی حسینہ بہت سا ہار سنگھار کرنے کے باوجود ہمیں متاثر کرنے میں ناکام رہی۔ فہرست میں نظر دوڑائی تو اندازہ ہوا کہ حسب معمول دلچسپ مواد پڑھنے کو ملے گا۔ ادارہ میں انکل کا غذ کی مہنگائی کے حوالے سے بات کر رہے تھے۔ انکل جی بے فکر رہیے، اس بحران سے نمٹنے کے لیے ہم آپ سے مکمل تعاون کریں گے (انشاء اللہ)۔ ”عصر خیال“ میں بھائی رانا محمد شاہد کرسی صدارت پر بیٹھے تھے۔ اصل میں ہم مغربی معاشرے کی اندھی تقلید کرتے ہوئے اتنے اندھے ہو چکے ہیں کہ اپنی مسلم تہذیب و تمدن کو فراموش کرتے جا رہے ہیں۔ رانا سجاد کافی عرصہ بعد نظر آئے، ویٹم بیک جناب۔ عبد الجبار رومی انصاری نے بھی بڑا اچھا تبصرہ کیا ہے۔ باقی تمام بہن بھائیوں کے تبصرے بھی زبردست تھے۔ سچ بیانی ”واپسی“ میں جوائنٹ فیملی سسٹم کی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ پاکستانی معاشرے کا حسن ہے ورنہ مغربی ممالک میں تو تقریباً مشترکہ خاندانی نظام کا رجحان ہی ختم ہو گیا ہے۔ ”خلش“ جیسی کرنی ویسی بھرنی کی عملی تفسیر تھی۔ راجیل تو انعام کی آگ میں اتنا اندھا ہو گیا کہ نازش کے سچے جذبات بھی اس کے آگے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ بھٹی صاحب کی ”ناسور“ کی تو کیا ہی بات ہے۔ نعمان صاحب عرب کے صحراؤں میں دشمنوں سے دودھ ہاتھ کرنے کے موڈ میں ہیں اگلی قسط کا انتظار ہے۔ ابتدائی صفحات میں ڈاکٹر ساجد امجد کی بجائے تنویر ریاض نے ”فلم کا قلم کار“ سے ملوایا، ویلڈن تنویر صاحب۔ کوثر اسلام کی مختصر مگر نہایت ہی دلچسپ و جرت انگیز تحریر ”نا قابل یقین“ یقینی بے یقینی کی کیفیت میں پڑھی۔ ہو سکتا ہے نیویارک سے میامی کے لیے اڑان بھرنے والا وہ جہاز ابھی بھی جو پرواز ہو اور کبھی نہ کبھی میامی ایئر پورٹ پر اتر جائے؟ ”زخم نہاں“ زویا اعجاز کی بہترین تحریر تھی۔ ”ستاروں پر کند“ میں منظر امام نے پاکستان کی کم عمر نامور شخصیات کے بارے میں لکھا ہے ہماری خدا سے دلی دعا ہے کہ ان ستاروں کو آسمان پر یونہی چمکتا دیکتا

رکھے (آمین)۔ عید الفطر کی آمد ہے میری طرف سے آپ سب کو دل کی گہرائیوں سے عید مبارک ہو آخر میں سب کو السلام علیکم۔

☆ عبدالجبار رومی انصاری کی آمد پورے والا سے۔ ”عمدہ سرورق کے ساتھ سرگزشت کا شمارہ وقت پر مل گیا، کاغذ کی مہنگائی نے پرچے کی روایت پر خوب اثر ڈالا اور مواد بھی اتنے کا اتنا ہی ملا جیسے پہلے ہوتا۔ یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن قارئین کے لکھنے کے صفحات جن میں تبصرہ نگاری اور بیت بازی اہم ہیں۔ بیت بازی کے لیے دیئے گئے پہلے دو صفحے ہی تھے اب ان میں بھی ایک کم کر دیا، پلیز اس پر نظر ثانی کریں اسے تو دو ہی رہنے دیں۔ اتنے بڑے بڑے مضامین ہوتے ہیں ان میں ایک کم کر کے بیت بازی کی روایت تو لازمی برقرار رکھیں، باقی تو ہم ہر حال میں تعاون کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے (نوازش)۔ ایک مضمون سرگزشت میں شاہ سلمان پھلوری کے بارے میں پڑھا بہت اچھا لگا۔ ایسے اللہ والے بزرگوں کا تذکرہ دل میں ایمان تازہ کر دیتا ہے۔ رانا محمد شاہد اوج صدارت پر تمکنت تھے۔ تبصرہ نگاری کے موتی بکھیرتے اچھے لگے اور آفتاب احمد نصیر اثرنی کے جیسی بیزاری تو ہر محب وطن پاکستانی کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ کھری کھری باتیں اچھی لگیں۔ قیصر خاں کا تبصرہ بھی عمدہ رہا۔ پروفیسر کیو اے قاسمی بھی اپنی پسند کے موتی سیٹھے ہمارے درمیان موجود تھے، اچھا لگا۔ عبداللہ چاند کا خلوص نامہ بھی اچھا لگا۔ ڈاک خانے کے عملی مظاہرے تو گاہے بگاہے ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ اعجاز حسین سخا کی طرح اور بھی ساتھی متاثر ہوتے ہیں۔ بہر حال عمدہ تبصرہ متاثر کن رہا۔ مٹی گن سے ندیم اقبال کا محفل میں شامل ہونا اچھا لگتا ہے۔ غنفر عباس، رضا احمد عباس، محمد احمد رضا انصاری، رانا سجاد احمد، سید امتیاز حسین شاہ، ساگر تلو اور عبدالکیم ثمر کے تبصرے بھی محفل کی جان رہے اور جو معروف تبصرہ نگار غیر حاضر ہیں جن کا تذکرہ بھی ہوتا رہتا، ان سب سے بھی گزارش ہے کہ محفل کو چار چاند لگائیں نوازش ہوگی۔ ”شمشال سے نورنؤ“ کا نیا خاکہ آگیا۔ نیا انداز بھی بہت عمدہ ہے اختتام کی جانب کا مزین سفر نامہ برابر دلچسپی قائم رکھے ہوئے ہے۔ مشرقی مغربی گروپ کے ملنے سے گھومنے کا لطف دو بالا ہوا تو ساتھ میں نئی نئی باتوں کا بھی پتا چلا۔ عمدہ سفر نامہ۔ ”ستاروں پر کندہ“ پاکستان کا روشن چہرہ ہیں اور ہمیں فخر ہوتا ہے ان سب پہ کہ پاکستان میں ٹیلنٹ کی کمی نہیں ہے۔ ”صحراؤں میں پیدل مارچ“ سے نیا جہاں تلاش کرنے والوں نے اپنی جان جو کھم میں ڈال کر کارنامہ انجام دیا اور اپنے بعد آنے والوں کے لیے آسانیاں پیدا کیں، عمدہ اور معلوماتی تحریر تھی اچھی لگی۔ ہمت و شجاعت دینے والے جری سپاہی مشرقی پاکستان میں مجبوری کی وجہ سے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوئے ورنہ وہ انڈین آرمی کو دھول چاٹنے پر مجبور کرنے والے تھے۔ ”زخمِ نہاں“ جیسی تحریر پڑھ کر دل افسردہ ہو جاتا ہے کہ کاش مشرقی پاکستان ہم سے جدا نہ ہوا ہوتا۔ ایسا ٹکول ماڈل گرل بھی اپنے ہی بے حس معاشرے کی بھیئت چڑھ گئی۔ پہلی بچ بیانی ”واپسی“ دلچسپ اور عمدہ رہی۔ جوائنٹ فیکلٹی سسٹم کے جو تھوڑے بہت نقصان ہوں بھی تو برداشت کریں اور انا کا مسئلہ نہ بنائیں تو دڑ بے جیسے گھروں میں دم گھٹنے سے بھی بچ جائیں۔ وائٹڈ شریر جن نے ثانیہ کو بہت تر پایا آخر ایک عام سے دکاندار نے اپنے عمل سے جن کو قید کیا اور تانیہ کی جان چھوٹی۔ پاگل اونٹ کتنا خطرناک ہوتا ہے یہ صرف سنا ہی تھا، عبدالرحمن کی سرگزشت نے دل دہلا دیا۔ دونوں جگہ اونٹ سے سانپوں نے بچایا عمدہ کہانی۔ ”ناسور“ میں نوی اور فوزیہ نے ایک دوسرے کی دیک کی پیاس بجھا کی اور پھر الگ الگ بیرون ملک روانہ بھی ہو گئے۔

☆ اکبر انصاری نے حیدر آباد سے لکھا ہے۔ ”اداریہ کی ہر سطر سے میں متفق ہوں۔ یہی باتیں ہیں جن کی وجہ سے ہم بھرپور انداز میں ترقی نہیں کر پارہے ہیں۔ پیر صاحب، مختصری تحریر ہوتے ہوئے بھی اتنی جامع ہے کہ تعریف کر کے زبان نہ تھکے۔ فلم کا قلم کار بھی خاصے کی چیز ہے۔ بابائے پشتو ایک اچھی کوشش ہے اس لیے کہ اتنی بڑی شخصیت اور پشتو ادب سے ناواقفیت کی وجہ سے ہم لوگ ان کے نام اور کام سے ناواقف تھے، اسی طرح دیگر زبان کے مشہور ادیب و شعراء پر بھی تحریر آنی چاہیے۔ سندھی، بلوچی، سرائیکی، پنجابی کے شعراء و ادیب پر تحریر ضرور دیں۔ ”زخمِ نہاں“ از زویا اعجاز، ویلڈن، بہت عمدہ۔ ہمارے سپاہی ہمارے محافظ۔ ایسے بہادر جوان صرف پاک فوج میں ملتے ہیں۔ ”بے مثال“ از انور فرہاد نے بھی بہت مزہ دیا۔ گزرا زمانہ نظروں میں آگیا۔ ”خج و شکست“ از اعتراف سلیم و صلی اور کوثر اسلام کی ”نا قابل یقین“ بہت عمدہ، معلوماتی تحریر ہے۔ ستاروں پر کندہ از منظر امام۔ اس تحریر کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، سچ بیانیوں میں واپسی، سزا، جرم چھپتا نہیں اور یادوں کا زہر بہت پسند آتی، خواہشوں کا سراپ بھی بہتر بچ بیانی تھی۔“

☆ نادر شاہ نے ڈوب سے لکھا ہے۔ ”شمارہ جون پڑھ کر احساس ہوا کہ اس بار بھی تحریریں زبردست تھیں۔ ”واپسی“ ایک سبق بھری بچ بیانی۔ واقعی ہمارے بزرگوں نے جو جوائنٹ فیکلٹی کا سسٹم رائج کیا تھا اس کے فوائد کتنے تھے، اسد عباس کی ”جرم چھپتا نہیں“ پڑھ کر بے ساختہ زبان سے واہ نکلا۔ بہت عمدہ کہانی ہے۔ محمد فاروق انجم کی ”خلش“ نے بھی خوب مزہ دیا۔ ”خواہشوں کا سراپ“ از ثمنینہ طاہر بیٹ بھی دلچسپ تھی۔ اب آتے ہیں اس شمارے کی سرتاج تحریر پر۔ اس میں زویا اعجاز نے ”زخمِ نہاں“ لکھ کر دل

موہ لیا۔ کیا خوب صورت تحریر ہے۔ اس تحریر کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ زبردست تحریر ہے۔ ”بابائے پشتو“ بھی معلومات سے لبالب بھری تھی۔ اتنا بڑا قلم کار اور ہم اس سے واقف بھی نہیں تھے۔“

☆ ممتاز اشعر نے ڈی آئی خان سے لکھا ہے۔ ”پہلی بار حاضر بزم ہیں۔ اُمید ہے سینئر تبصرہ نگار خوش آمدید کہیں گے۔ جون کے شمارے میں سب سے زیادہ پسندیدہ تحریر ”واپسی“ تھی۔ اس کے بعد جرم چھپتا نہیں، زہریلا مسیحا اور خواہشوں کا سراپ بھی پسند آئی۔ ”یادوں کا زہر“ سو سو تھی۔ ”خلش“ بھی اچھی لگی۔ منظر امام کی ”ستاروں پر کندہ“ نے بہت دیر تک سوچنے پر مجبور کر دیا کہ ہمارے ہاں ٹیلنٹ کی کمی نہیں، بس انہیں سامنے لانے میں تھوڑی سی مدد درکار ہے۔ ”آدم خور“ جسے انجم فاروق ساحلی نے لکھا ہے صرف اس لیے پسند نہ آئی کہ اس میں جتنا کچھ بیان کیا گیا ہے وہ ہم پہلے سے پڑھے ہوئے ہیں۔ ”شمشال سے نورنؤ“ میری پسندیدہ تحریر ہے۔ معلوماتی بھی ہے اور سبق آموز بھی ہے اس سفر نامے کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ”قلم کار قلم کار“ بہت زیادہ پسند نہ آئی۔ شخصیت میں ہم صرف اپنوں کو پڑھنا چاہتے ہیں۔ (اپنوں کی نشاندہی کرنی چاہیے تھی۔ اگلے تبصرے میں اس بات کی تشریح ضرور کر دیں گے) ”نشان“ بھی کوئی اچھا تاثر چھوڑ نہ سکی۔ ”پیدل مارچ“ بہت مختصری تحریر تھی۔“

☆ انعام الحق عطاری نے ملتان سے لکھا ہے۔ ”بابائے پشتو اور زخمِ نہاں کو ہم درجہ اول پر رکھتے ہیں۔ عمدہ ہی نہیں بہت عمدہ تحریر ہے۔ ”ستاروں پر کندہ“ بھی بہت پسند آئی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ذرا نام ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے، ساقی۔ ہم پاکستانی آگے بہت آگے جاسکتے ہیں لیکن ہمیں موافق نہیں ملتے۔ سچ بیانیوں میں واپسی، خلش، جرم چھپتا نہیں اور خواہشوں کے سراپ زیادہ پسند آئی، باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔“

☆ رابعہ کوثر کا خط فیصل آباد سے۔ ”پیر صاحب بہت عمدہ تحریر تھی۔ صرف ایک صفحہ میں مکمل زندگی کا احاطہ کرتی یہ تحریر قابل ستائش ہے اور یہ صرف سرگزشت کا خاصا ہے کہ اتنے کم جملوں میں پوری تحریر سمیٹ دی جاتی ہے۔ ”قلم کار قلم کار“ کچھ خاص اثر چھوڑ نہ سکی۔ ”بابائے پشتو“ بھی اچھی تحریر تھی۔ ”بے مثال“ کی بات ہی کچھ اور ہے۔ طلعت حسین لیجٹ اداکار ہیں۔ ان کے بارے میں اتنی بھرپور تحریر، مزہ آگیا۔ ”زخمِ نہاں“ کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ اتنے خوب صورت انداز میں ہمارے اس ہیرو کی زندگی پیش کی ہے کہ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ہمارا اتنا بڑا ہیرو اور نظروں سے اوجھل، ہم اس سے واقف بھی نہیں تھے۔ ایسے کم نام مجاہدین کا تذکرہ ضروری ہے۔ اس لیے کہ کچھ ملک دشمن عناصر ہماری بہادر فوج کے کارناموں کو گھٹانے کی کوشش کر رہے ہیں، دنیا کی بہترین فوج میں ہماری فوج کا شمار ہے اور یہ مقام انہیں گھر بیٹھ کر نہیں ملا ہے۔ یہ اپنی زندگی کو داؤ پر لگا کر ہمارے لیے امن و سکون کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ ہماری افواج ہی ہے جس نے دشمنوں کی آنکھیں نوچ لی ہیں۔ 1965ء کی جنگ اس کا ثبوت ہے کہ ہماری فوج نے دشمن کا کیسا حشر نشر کیا تھا۔ رہی بات 1971ء کی تو اس میں بھی فوج کا پٹا بھاری تھا، یہ اور بات ہے کہ اپنوں نے پیٹھ میں چھری گھونپی اور فوج کو ہتھیار ڈالنا پڑا لیکن ان کی بہادری ان کے کارناموں پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ ”ستاروں پر کندہ“ بھی بہت دلچسپ اور معلوماتی تحریر تھی۔ ”شمشال سے نورنؤ“ ہماری فیورٹ ہے۔ ندیم اقبال خوب ہی نہیں بہت خوب لکھ رہے ہیں۔ اگر باریک بینی سے دیکھا جائے تو یہ تحریر سرگزشت کی سب سے دلچسپ تحریر ہے۔ ہر ماہ باقی آئندہ پڑھ کر دل پر گھونسا سا لگتا ہے۔ اگر ممکن ہو تو اس تحریر کے صفحات مزید بڑھا دیں۔ ”واپسی“ اور ”جرم چھپتا نہیں“ بہت پسند آئی۔ ”پانڈی“ کا انداز تحریر تو بہت اچھا ہے لیکن موضوع پسند نہیں آیا۔ پراسرار کہانیاں مجھے کبھی بھی پسند نہیں آتیں۔ ”یادوں کا زہر“ بھی دلچسپ تھی۔

☆ آفاق محسن کی آمد شیخوپورہ سے۔ ”پیر صاحب نے ایمان تازہ کر دیا۔ ایسے بزرگوں کے بارے میں ہر ماہ کوئی نہ کوئی تحریر ضرور دیا کریں۔ تاکہ بچے بھی ان واقعات سے مستفیض ہو سکیں۔ یہ ہمارے بزرگوں کی ہی محنت ہے کہ برصغیر میں مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا، یہ اولیاء اللہ، بزرگان دین نے کتنی محنت کی تھی کہ وہی ہند جہاں کافروں کا راج تھا۔ تمام کے تمام لوگ بتوں کی پرستش کرتے تھے ان کو صراطِ مستقیم پر لے آئے۔ اسلام پھیلا ہی ان لوگوں سے۔ شوکت رحمن خٹک کا نام دیکھ کر علی سفیان آفاقی کی یاد آگئی۔ ان کے کالم میں شوکت رحمن خٹک کی تحریر ضرور ہوتی تھی۔ قلمبر یا کے مریض کے نام سے انہیں یاد کیا جاتا تھا۔ ”زخمِ نہاں“ اور ”نا قابل یقین“ بھی پسند آئی۔ ”ستاروں پر کندہ“ اور ”شمشال سے نورنؤ“ سرفہرست رہی۔ ندیم اقبال کے قلم میں جادو ہے کہ وہ قارئین کو باندھ لیتے ہیں۔ ہر ماہ ان کی تحریر کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ سچ بیانیوں میں واپسی، سزا، جرم چھپتا نہیں۔ یادوں کا زہر، خلش زیادہ پسند آئی۔ میری طرف سے تمام قارئین کو عید مبارک۔“

☆ کوثر علی کوثر کا پیام کونڈ سے۔ ”ستاروں پر کندہ“ نے یہ بتایا ہے کہ ہمارے نوجوان بہت آگے جاسکتے ہیں بشرطیکہ اس

کا موقع دیا جائے لیکن افسوس ہمارے اپنے لوگ ہی ٹیلنٹ کو برباد کر دیتے ہیں۔ کاش ہم سفارش کے گھیرے سے نکل سکتے لیکن یہ وڈ پرے، چوہدری اور ملک و خاناں انہیں دانستہ چل دیتے ہیں۔ انور فرہادی فلم نگری بھی بہت دلچسپ جا رہی ہے۔ علی سفیان آفاقی کی کی محسوس ہی نہیں ہو رہی ہے۔ طلعت حسین کی زندگی کو اتنے بہتر انداز میں پیش کیا ہے کہ ایک نہیں دو بار میں نے پڑھا۔ ناقابل یقین بھی اچھی تھی۔ ”شمشال سے ٹورنٹو“ کا جادو کم نہیں ہوا ہے۔ سب سے پہلے میں اسی کو پڑھتا ہوں۔ ”واپسی“ بھی بہتر تھی۔ ”خلش“ اور ”جرم چھپتا نہیں“ بھی اچھی تحریر تھی۔ یادوں کا زہر چھوٹی تھی لیکن دلچسپ تھی۔ ”خواہشوں کے سراب“ بھی اچھی لگی۔ جب تک سرگزشت مارکیٹ میں آئے گا۔ عید گزر چکی ہوگی اس لیے تمام دوستوں کو عید مبارک۔“

☆ عنایت حسین بھٹی کی آمد ساہیوال سے۔ ”سرگزشت میرا پسندیدہ ڈائجسٹ ہے۔ اتنا معلوماتی کہ اس کا مقابلہ کوئی دوسرا ڈائجسٹ کر ہی نہیں سکتا۔ جون کے شمارے میں ”زخمِ نہاں“ نے آنکھوں میں آنسو بھر دیے۔ 1971ء کا زخم یاد آگیا۔ ہماری فوج نے کس طرح بیک وقت دو دشمنوں کا مقابلہ کیا اس پر بہت کم روشنی ڈالی جاتی ہے۔ کچھ لوگ سانحہ مشرقی پاکستان کا بوجھ فوج پر ڈال کر خوش ہوتے ہیں جب کہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ ہماری فوج نے کسی جگہ بزدلی نہیں دکھائی تھی، اس کا ثبوت احسان ملک صاحب جیسے بہادر ہیں۔ یہ تو عالمی سازش تھی کہ پاکستان کو دو لخت کر دو اور الزام پاکستان کے سر دھر دو فوج کو بدنام کرو۔ ہماری فوج دو طرفہ طور پر پھنس گئی تھی۔ ایک جانب دشمن کی فوج دوسری جانب کئی بھنی کے نقاب میں بھارتی غنڈے بد معاش اور سپاہی جو مسلسل پیٹھ پر وار کر رہے تھے۔ دونوں محاذ پر ہماری فوج کامیاب تھی۔ پارڈر سے ایک چڑیا کا بچہ بھی داخل نہ ہو سکا لیکن اندر کے دشمنوں کی وجہ سے سقوط ڈھاکہ کا رونما ہو گیا۔ ”ستاروں پر کندہ“ بھی مزے کی تحریر تھی۔ ”شمشال سے ٹورنٹو“ بھی اچھی جا رہی ہے۔ اس بار... اس سفر نامے کی ہیروئن کا تذکرہ نہیں تھا اور ہم اس انتظار میں ہیں کہ ندیم صاحب کب دوسری شادی کا اعلان کرتے ہیں۔ ”واپسی“ بہت عمدہ سچ بیانی تھی۔ خط لہانہ ہو جائے اس لیے اجازت کا طلب گار ہوں۔“

☆ خالد محمود نے ملتان کینٹ سے لکھا ہے۔ ”میں خیال کے لیے ایک تمبر ارسال خدمت ہے۔ اُمید ہے وقت پر پہنچ جائے گا۔ جون 2018ء کا شمارہ دیکھا۔ جسامت کم لگی۔ دوبارہ غور کیا تو معلوم ہوا کہ صفحے کم ہیں پھر جناب معراج رسول صاحب کا ادارہ پڑھا اور تصدیق ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ آئندہ بہتری کرے گا۔ تمبر سے پہلے مجھے دو باتیں عجیب لگیں۔ ان کا ذکر ضروری ہے۔ محترمہ زویا اعجاز صاحبہ کی کہانی پاک فوج کے بہادر کپٹن احسان ملک صاحب کا ناقابل فراموش قصہ ہے۔ ان کی فوٹو بھی ساتھ چھپی ہے۔ ان کی یونیفارم دیکھ کر معلوم ہوا کہ ان کا رینک کرنل کا ہے۔ غالباً ان کی بعد میں ترقی ہو گئی ہوگی۔ اگر ایک سطر لکھ دی جاتی کہ وہ کرنل کی پوسٹ سے ریٹائر ہوئے تو مناسب تھا۔ دوسری بات جو تشریح طلب ہے وہ طارق عزیز صاحب کا مضمون ”پیدل مارچ“ ہے۔ اس میں ذکر ہے کہ پہلا انسانی قدم آسٹریلیا میں 40 ہزار سال پہلے انڈونیشیا سے تعلق رکھنے والے قدیم باشندوں کا تھا۔ میری معلومات کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام دنیا میں تقریباً 10 ہزار سال پہلے تشریف لائے۔ اس سے پہلے دنیا میں انسان کا وجود نہ تھا۔ غالباً یہ کتابت کی غلطی ہے یا ترجمہ غلط کیا گیا ہے (سائنس اپنے طور پر اظہار خیال کرتی ہے کہ انسان کی ارتقاء کیسے ہوئی، تحریر نے سائنس دانوں کی کبھی کو لکھا ہے۔ جب کہ قرآن بالکل الٹ کہتا ہے اور یہی سچ ہے کیونکہ قرآن میں انسانوں کے خالق کا بیان ہے) اب دیگر باتیں ”ناسور“ کی قسط نمبر 17 بڑی دلچسپ لگی۔ اُمید ہے کہ آئندہ یہ سلسلہ بہتر ہو جائے گا دیگر سچ آپ بیتیوں میں واپسی، سزا، خلش، خواہشوں کا سراب، یادوں کا زہر اور ہانڈیڈ بہت زیادہ پسند نہیں آئی۔ ایسی کہانیوں کی تعداد کم رہیں تو بہتر ہوگا۔ ”تبدیلی“ پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ یہ رمضان مبارک کا تحفہ ہے۔ میری طرف سے تمام بہن بھائیوں کو ایڈوانس عید مبارک۔“

تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط:

نادیہ خان، انور شاہ، امجد حسن، شوکت کمال (کراچی)۔ اختر کوکب، بلقیس بتول، شاہینہ بتول، شناور علی (لاہور)۔ شازیہ اکرام، بہادر خان اچکزئی (پشاور)۔ کلیم الحسن، افروز جہاں، اختر عباس، زبیر احمد، امروڑ اقبال (حیدرآباد)۔ احسان علی (فیصل آباد)۔ زاہد شاہ بخاری، چوہدری اشفاق، محمد فیضان (سرگودھا)۔ ثانیہ حسن، اطہر حسین (سیالکوٹ)۔ بانو برہیس، احمد رشید مصطفائی (جھنگ)۔ احسان خان (نوبہ یک سنگھ)۔ ثناء اللہ، اشفاق حسن (شیخوپورہ)۔ نادیہ خان (جہلم)۔ علی نواز شاہ (گجرات)۔ شوکت ملک، افروز جہاں، نوشین اختر (کوئٹہ)۔ حمکین جعفری، صنوبر علی شاہ، پنو عاقل شاہ (شجاع آباد)۔ محمد عماد (بکھر)۔ طاہر حسین (مظفر گڑھ)۔ زرین پروین (شہدادکوٹ)۔ فرید اسلم ڈوگر (ڈی آئی خان)۔ حکیم فیروز ملک، اقراء تبسم (راولپنڈی)۔ چوہدری ممتاز علی، فرید اسلم، ثانیہ حسن ثانی (اسلام آباد)۔ زبیر ملک، عتیق اسلم (شادی پور)۔ منور سلیم (خیرپور آزاد کشمیر)۔ عرفان مروت، دلاور حسن (منڈی بہاؤ الدین)۔ عباس علی (رحیم یار خان)۔ فاطمہ فرحت، نصرت اسماعیل، گل باز خان (کوئٹہ)۔

جولائی 2018ء

14

ماہنامہ سرگزشت

GARM KO THAND KARAO

20% EXTRA
English
Prickly Heat
Powder
ActivNeem

English
Neem
Soap Bar
Natural
English
Prickly Heat
ActivNeem

Prickly Heat

غلام آقا

ڈاکٹر ساجد امجد

جب کفر کے اندھیوں کا سینہ چیر کر ایمان کا نور پھیلا تو لبیک کہنے والوں میں وہ سرفہرست تھے۔ وہ غلام تھے، رنگت بھی کالی تھی۔ اپنی رنگت کی وجہ سے وہ خود کو کمتر سمجھتے تھے مگر اللہ کے نزدیک حسین ترین تھے۔ یہ اعزاز ہفت اقلیم کی بخشی ہوئی نعمتوں سے بڑھ کر ہے کیونکہ انہیں یہ اعزاز قربانیوں کی فصیل کھڑی کرنے پر ملی۔ ایمان کی راہ اپنانے پر انہیں جس طرح زدوکوب کیا گیا، ایذاں دی گئیں اس کی مثال نہیں ہے۔

برگزیدہ سٹیوں کی روداد پر ہونا اور سبق حاصل کرنا خوش قسمتی ہے

ابھی مکہ کی تنگ گلیاں دھوپ سے بھری نہیں تھیں کہ دکانیں گاہکوں کا استقبال کرنے لگیں۔ دو دن بعد عکاظ کا سالانہ میلہ سجنے والا تھا۔ مکہ کے لوگ اسے مذہبی تہوار کی طرح منایا کرتے تھے۔ چہروں کے علاوہ ہر چیز بدل جاتی تھی۔ پرانے کپڑے بدل جاتے، نئے کپڑوں کی خریداری ہوتی، ہتھیار تیز کرائے جاتے تھے کہ ہتھیار باندھ کر میلے میں شریک ہونا اظہارِ امارت سمجھا جاتا تھا۔ اس میلے کی رونق سے لطف اندوز ہونے کے لیے اردگرد کے علاقوں سے قافلے آنا شروع ہو جاتے تھے۔ ان دنوں مکہ کی آبادی دوگنی ہو جاتی تھی۔ لڑکے بالے ٹولیوں کی شکل میں بازاروں کے چکر کاٹتے تھے۔ ان کے دم سے میلے سے پہلے ہی میلہ ج جاتا تھا۔ اس وقت بھی یہ ٹولیاں بھنورانی ادھر ادھر ڈولتی پھر رہی تھیں کسی پر فقرہ کس دیا،

ماہنامہ سرگزشت

16

آنکھ بچی اور کسی کا مال اڑا لیا۔ کوئی اس نشے میں اکڑتا پھر رہا تھا کہ اس کا قبیلہ سب سے بڑا ہے۔ کسی کو یہ ناز تھا کہ اس کا باپ شاعر ہے۔ کسی کا خوف تو کیا حجاب بھی نہیں تھا۔

”وہاں محمد بھی تو آئیں گے۔“ ایک لڑکا کہہ رہا تھا۔

”آئیں گے بھی اور اس مرتبہ جو دین انہوں نے گھڑا ہے اس کی تبلیغ بھی کریں گے کیونکہ وہ کہتے ہیں جو فرشتہ ان کے پاس آتا ہے اس نے انہیں تبلیغ کرنے کی ہدایت کی ہے۔“

”عکاظ کا میلہ تو ان کے لیے میٹھی کھیر ہوگا۔ مکہ والوں کے سامنے تو زبان کھول نہیں سکتے، مکہ کے باہر سے جو لوگ آئیں گے انہیں بہکانے کی کوشش کریں گے۔“

”ہم انہیں ایسا کرنے دیں گے جب نا۔“

”ہم کیا کر لیں گے۔ بڑے بڑے سردار سر جوڑ کر بیٹھے ہوئے ہیں کہ اب کیا کیا جائے۔“

”جو وہ نہیں کر سکتے وہ ہم کریں گے۔ وہ جب میلے میں آئیں تو دوستوں ان کے ساتھ ساتھ چلنا اور مزہ، مزہم کا شور بلند کرتے رہنا (مکہ کے لوگ محمدؐ کے بجائے مذہم کہا کرتے تھے یعنی جس کی برائی کی گئی)۔“

”اس سے کیا ہوگا۔ محمدؐ تو ایسے ہیں کہ انہیں کچھ بھی کہا جائے وہ سر جھکا کر سنتے رہتے ہیں۔“

”ہمیں ان سے کیا، مکہ کے باہر سے جو لوگ آئے ہوئے ہیں انہیں تو معلوم ہو جائے گا کہ محمدؐ سچے نہیں ہیں اس لیے مکہ کے لوگ انہیں پسند نہیں کرتے۔ محمدؐ ہماری باتیں سن لیتے ہیں لیکن غیروں کے سامنے اپنی بے عزتی برداشت نہیں کر سکیں گے۔“

☆.....☆

امیہ بن خلف اپنے غلام کے ہمراہ خانہ کعبہ کی طرف جا رہا تھا۔ اس کا رسمی ملبوس زمین کا منہ چوم رہا تھا۔ غلام کے لیے لازم تھا کہ وہ اس کے ساتھ اتنا فاصلہ دے کر چلے کہ اس کا ملبوس غلام کے قدموں کے نیچے نہ دب جائے۔ آقا کی ہیبت ظاہر کرنے کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ غلام کے اوپر جیسے پر کوئی لباس نہ ہو۔ یہ جتنی غلام تھا۔ سرخ آنکھیں، بال ہٹکریا لے، مونے مونے ہونٹ کسی قدر باہر کو نکلتے ہوئے، جسم چھریا لیکن مضبوط۔ آبنوی رنگ جو دھوپ کی تمازت میں چمک رہا تھا پسینے کے قطرے اس کی تنگی پشت پر پہرا دے رہے تھے۔

خانہ کعبہ کی دیوار نے دھوپ کو اپنی طرف آنے سے روک رکھا تھا۔ اسی سائے میں کچھ عرب کچھ یمنی تاجر بیٹھے ہوئے تھے۔ امیہ بن خلف بھی ان کا ہم نشین ہو گیا۔ اس سائے میں کچھ فاصلے پر دو غلام اور بیٹھے تھے جو اپنے اپنے آقاؤں کے

جولائی 2018ء

ساتھ آئے ہوئے تھے۔ امیہ بن خلف کا غلام بھی اپنے آقا سے دور ہٹ کر ان غلاموں کے پاس بیٹھ گیا لیکن اس طرح جیسے اس کے سوا وہاں کوئی نہ ہو۔ مکہ کے اس معاشرے میں غلاموں کا کام صرف سننا تھا بولنا نہیں تھا۔ کسی محفل میں اگر دو غلام جمع ہو بھی جاتے تو سرگوشیوں کے سوا ان کے مقدر میں کچھ اور نہیں تھا۔ امیہ کا غلام تو کچھ زیادہ ہی وفادار تھا۔ آقا کے سوا کسی کو آنکھ بھر کے دیکھتا بھی نہیں تھا، بولنا تو درکنار، اس وقت بھی اس نے صرف یہ دیکھا تھا کہ اس کے دو ہم قسمت اور بھی بیٹھے ہیں پھر اس نے گھٹنوں میں سر دے کر زمین پر نظریں جمادی تھیں۔ وہ اپنے کانوں سے آقا کو دیکھ رہا تھا کہ آقا کی آواز کو جنبش ہو اور وہ زمین چھوڑے۔ اس کی سماعت بڑھ گئی تھی یا پھر اس کے اور آقا کے درمیان فاصلہ کم تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے اس روز سب بازاروں میں تھے ارد گرد سناٹا، بہت تھا اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آج کچھ باتیں ایسی ہونے والی تھیں جو قدرت چاہتی تھی کہ غلام کے کان ان باتوں سے آشنا ہو جائیں۔

غلام کے کانوں میں آواز آئی، کوئی کہہ رہا تھا لو ابولہب آگئے۔ پھر اس کے کانوں میں آواز آئی، ان کے ساتھ ابوالحکم (ابو جہل) بھی ہیں۔ گفتگو کا لطف تو اب آئے گا۔ آقا کی آواز پر غلام نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس وقت تک ابولہب اور ابو جہل دونوں دیوار کعبہ کے سائے میں تشریف فرما ہو چکے تھے۔ غلام نے گردن پھر گھٹنوں میں چھپا لی، اس کے بعد اسے کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کچھ سننے کی کوشش کرتا۔

جب انسان خاموش ہوتا ہے تو اس کی روح بولتی ہے۔ وہ غلام تھا مگر انسان بھی تو تھا۔ خاموشی نے اس کا دھیان بنایا تو وہ اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔ میرا باپ بھی ایک غلام تھا۔ وہ رات میں کیسے بھول سکتا ہوں جب وہ میری ماں سے کہہ رہا تھا، ہمیں چاہیے کہ ہم اسے مار ڈالیں۔ ہم نے اسے پیدا کر کے ہی غلطی کی۔ ہماری طرح یہ بھی زندگی بھر غلامی کرتا رہے گا۔ ہماری طرح نیگے پاؤں گھومتا رہے گا۔ ہماری طرح اس کی ہڈیاں بھی درد کرتی رہیں گی اور کوئی یہ سوچنے والا بھی نہیں ہوگا کہ یہ بھی انسان ہے۔ اسے بھی درد ہوتا ہوگا۔ میری ماں یہ سن کر رونے لگی تھی اور شاید اسی وجہ سے میری ماں نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میرے باپ نے اپنا ارادہ نہ بدلا ہوتا پھر میری ماں مر گئی تھی۔ میں جوان ہونے لگا تھا۔ میں فروخت ہونے کے لائق ہو گیا تھا مگر شاید کسی غلام کو یہ حق بھی نہیں تھا۔ میرے باپ کا بھی آخری وقت آگیا اور اس نے مرتے وقت میرا ہاتھ امیہ بن خلف کے ہاتھ میں دے دیا اور جب سے آج تک میں

ماہنامہ سرگزشت

17



جولائی 2018ء

بنی حج میں غلامی کے دن گزار رہا ہوں۔

وہ ان باتوں کو سوچتے سوچتے بڑی دور نکل گیا تھا۔ ابھی یہ سوچنا باقی تھا کہ اس کے والدین حبشہ سے مکہ کیوں آئے اور غلام کیوں بنالیے گئے کہ ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔ کوئی محمد کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔

”اس نے تو وہ کام کیا ہے کہ آج تک کسی نے نہ کیا ہو گا۔ ہمارے خداؤں کو برا کہتا ہے۔ بھلا بتاؤ ہمارے تین سو ساٹھ خدا ہیں اور وہ کہتا ہے خدا تو صرف ایک ہے۔“

”وہ ایسا کیوں کہتا ہے۔ بظاہر تو اس کی ذہنی حالت ٹھیک ٹھاک ہے۔“

”اے یہ وہم ہو گیا ہے کہ اس کے پاس کوئی فرشتہ آتا ہے جو اسے یہ سب بتاتا ہے۔“

کئی قہقہے ایک ساتھ بلند ہوئے پھر کسی نے کہا۔ ”ہمارے خدا خود اس سے نمٹ لیں گے۔ کہنے دو جو وہ کہتا ہے۔“

”بات اتنی سادہ نہیں ہے۔ صرف خداؤں کا مسئلہ نہیں ہے۔ وہ تو ایسی حرکتیں کر رہا ہے کہ ہمارا پورا معاشرہ ہی بکھر کر رہ جائے گا۔ وہ کہتا پھر رہا ہے کہ سب انسان برابر ہیں۔ نہ کوئی چھوٹا ہے نہ کوئی بڑا ہے۔“

اس موقع پر امیہ کی آواز ابھری۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیا میں اور میرے غلام برابر ہو سکتے ہیں۔“

یہ امیہ کی آواز تھی لہذا غلام نے اپنی عادت کے مطابق سر اٹھایا۔ مالک جب بھی آواز دے، غلام کو چوکنا ہو جانا چاہیے کہ کب کوئی حکم صادر ہو۔

”ابولہب! محمد تمہارا بھتیجا ہے۔ تم ہی بتاؤ اسے ہوا کیا ہے۔ اچھے خاندان کا ہے۔ دولت مند بیوی کا شوہر ہے لیکن عیش و آرام کو چھوڑ کر غار حرا میں راتیں گزار دیتا ہے۔“ ابوالحکم نے پوچھا۔

”کیا کہا جا سکتا ہے۔“ ابولہب نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ”میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ہمیں یوں شرمندہ کرے گا۔ ابھی چند سال پہلے تک وہ صادق بھی تھا امین بھی۔ ہم لوگ اس سے اپنے فیصلے گرایا کرتے تھے اور اب یہ حال ہے کہ.....“ ابولہب اس کے آگے کچھ اور نہ کہہ سکا۔

امیہ کی آواز پھر ابھری۔ غلام نے پھر گھٹنوں سے سر اٹھا لیا اور اپنے آقا کی طرف دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”ہمیں ابوطالب کا خیال آ جاتا ہے کہ محمد ان کا چھیتا ہے ورنہ ہم دیکھ لیتے۔“

”وہ تو ایسی راہ چل رہا ہے کہ اگر کامیاب ہو گیا تو غریب و نادار لوگوں کو ہمارے برابر لا کھڑا کرے گا۔ یہ کیسے ہو

سکتا ہے۔ اس طرح تو ہمارا کروفر ہی رخصت ہو جائے گا۔“ امیر غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ ”بلال! اس کی آواز گونجی۔ غلام یوں اس کے سامنے پہنچ گیا جیسے وہیں بیٹھا تھا۔

”کیا تو اور میں برابر ہیں؟ بتا ان سب کو۔“ غلام کی زبان ہی کب ہوتی ہے۔ وہ نظریں جھکائے، ساکت کھڑا رہا۔ امیہ نے اپنے رسمی ملبوس کو جھٹکا دیا اور چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

ابوسفیان پہلے ہی جا چکا تھا ابوجہل بھی امیہ کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ غلام نے قدم ناپے اور اپنے آقا کے پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔

اس وقت بھی امیہ اور ابوجہل محمد ہی کی باتیں کرتے ہوئے چل رہے تھے۔ غلام کے ذہن کی ساخت ہی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ سوچنا اسے آتا ہی نہیں لیکن اسی وقت وہ سوچ رہا تھا۔ محمد نے ایسا کیا کر دیا ہے کہ یہ لوگ ان کے دشمن ہو گئے ہیں جب کہ وہ انہی میں سے ہے۔ کچھ باتیں اس کی سمجھ میں آئی تھیں کچھ نہیں آئی تھیں۔ وہ بس اتنا سمجھ سکا تھا کہ محمد جو چاہتے ہیں یہ لوگ نہیں چاہتے یہ بات اسے بھی عجیب سی لگی تھی کہ محمد کہتے ہیں آقا اور غلام برابر ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ ہو نہیں سکتا لیکن اسے خوشی ہوئی تھی۔ محمد تو بڑی اچھی باتیں کرتے ہیں پھر یہ لوگ ان کے خلاف کیوں ہیں؟

حضرت محمد کو اس نے صرف دو بار دیکھا تھا۔ اپنے خیالوں میں کم، پہاڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے حرم کی طرف جارہے تھے۔ اس کو ان کا اس طرح چلنا اچھا لگا تھا۔ اسے یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ کتنا بڑا انقلاب برپا کر چکے ہیں لیکن آج کی گفتگوں کو وہ سوچنے لگا تھا کہ ان میں ضرور کوئی ایسی بات ہے جو انہیں دوسروں سے مختلف بنادیتی ہے۔ اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ اب اگر وہ کہیں نظر آئے تو ان کی طرف غور سے دیکھے گا۔

یہ موقع اسے صرف دو دن بعد ہی مل گیا۔ اس کا آقا امیہ بن خلف نہیں جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اسی وقت ابوالحکم (ابوجہل) بھی دروازے پر آ گیا۔ اس کے مالک نے سواری کے لیے سرخ اونٹ نکلوا دیا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ کسی خاص جگہ جا رہا ہے، کہاں؟ یہ غلام کو نہیں بتایا جاتا اور غلام پوچھ نہیں سکتا۔

امیہ نے اونٹ پر سوار ہونے کے بعد اسے اشارہ کیا۔ وہ سمجھ گیا اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے اونٹ کی رسی پکڑ لی۔ اونٹ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ابوجہل کا اونٹ ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ راستے نے بتایا دیا تھا کہ اس کا مالک عکاظ کے میلے کی

طرف جا رہا ہے۔ اس کا دل خوشی سے جھومنے لگا۔ کاش وہاں محمد بھی آئے ہوئے ہوں۔ آج وہ انہیں غور سے دیکھے گا اور یہ جاننے کی کوشش کرے گا کہ ان میں ایسی کیا تبدیلی آگئی ہے کہ یہ لوگ ان سے دشمنی پر اتر آتے ہیں۔

وہ عجیب سرشاری کے عالم میں چل رہا تھا۔ حسب معمول اس کی پیٹھ ٹنگی تھی۔ غلام کی پیٹھ لباس کے لیے نہیں کوڑوں کے لیے بنی ہوئی ہے۔

وہ میدان قریب آتا جا رہا تھا۔ کئی جانے پہچانے چہرے اس کے قریب سے ہو کر گزرے لیکن آج اسے صرف ایک چہرے کی تلاش تھی۔

ایک مرتبہ پھر اس نے محمد کی شان میں گستاخانہ الفاظ سنے جو ابوجہل کی زہریلی زبان سے ادا ہوئے تھے۔ اپنے مالک کا قہقہہ سن لیکن آج وہ کچھ سننا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی نظریں آنے جانے والوں پر ٹنگی ہوئی تھیں۔

اونٹ کو ایک جگہ بٹھانے کے بعد وہ اپنے آقا کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ابوجہل بھی ساتھ تھا۔

آتش بیان شعراء اپنے قصائد سے ماحول کو گراما رہے تھے۔ فخر و مباہات کی داستانیں سنائی جا رہی تھیں۔ کہیں تیر اندازی کے مقابلے ہو رہے تھے۔ کسی جگہ نیزے اچھالے جا رہے تھے۔ یعنی، شامی اور فارس کے تاجر اپنا مال فروخت کرنے کے لیے دکانیں سجائے بیٹھے تھے۔

یہ سب چیزیں ایسی تھیں جن میں اسے بے حد دلچسپی تھی۔ وہ جب بھی یہاں آتا تھا ان چیزوں کو بڑے غور سے دیکھا کرتا تھا لیکن اب اسے اکتاہٹ ہو رہی تھی۔ محمد یہاں کیوں نہیں ہیں۔ وہ ہوتے تو میں انہیں دیکھتا۔ اس سے پہلے وہ نظر آئے تھے تو بھلا ایک غلام ان جیسے اعلیٰ درجے کے انسان کو کیسے دیکھ سکتا تھا۔ بس ایک نگاہ ڈالی اور ہٹالی لیکن آج تو مجھے ان کے چہرے میں کچھ تلاش کرنا ہے۔

وہ اس دھن میں چلا جا رہا تھا کہ اس کے آقا نے ایک دکان کے آگے پہنچ کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ آقا کے ہر اشارے کو سمجھتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دکان میں جا رہا ہے اور غلام سے کہہ رہا ہے یہیں کھڑا رہ۔ شاید اس کی مراد پوری ہونے والی تھی اسی لیے اسے روکا گیا تھا۔ وہ اندھیرے میں جھگنو تلاش کر رہا تھا کہ روشنی میں نہا گیا۔ اسے سامنے سے حضرت محمد آتے دکھائی دیے۔ ان کے ساتھ ان کے دوست ابوبکر صدیق بھی تھے۔ انہیں وہ خوب جانتا تھا۔ وہ نہ جانتے ہوں لیکن وہ جانتا تھا ابوبکر صدیق بھی بنی حج کے محلے میں رہتے تھے جہاں

امیہ کا گھر اور غلام کا غلام خانہ تھا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ وہ ہر وقت محمد کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس وقت بھی وہ بھی دیکھ رہا تھا کہ وہ ان کے ساتھ ہیں۔ اتنی دیر میں ایک روشنی سی اس کے قریب آگئی تھی۔ اس نے آنکھ اٹھا کر آپ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اسے دیکھ کر آپ کے ہونٹوں پر ایک دل آویز مسکراہٹ ابھری۔ ایسی مسکراہٹ جو کسی عزیز کو دیکھ کر ہونٹوں پر جگہ بناتی ہے۔ وہ ان سے ہم کلام ہونے کے لیے آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ امیہ کے قدم دکان سے باہر نکلے۔ وہ شاید اس وقت ان قدموں کو بھی نظر انداز کر دیتا لیکن اس کے آقا نے خلاف معمول اسے آواز دے کر بلایا تھا۔ وہ اسے نام سے کبھی کبھی ہی بلاتا تھا ورنہ تو غلام یا غلام زادہ ہی اس کے ہونٹوں پر رہتا تھا۔

حضور آگے نکل گئے تھے۔ وہ گردن گھما کر انہیں دیکھ بھی نہیں سکا اور آقا کی آواز پر دوڑا چلا گیا۔ امیہ نے کچھ سامان اس دکان سے خریدا تھا جسے اٹھانے کے لیے اس کی ضرورت پڑ رہی تھی۔ بلال نے سامان کی گھڑی کندھے پر دھری اور مالک کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

چند قدم چلنے کے بعد امیہ نے بلال سے پوچھا۔ ”غلام تو نے کچھ دیکھا۔“

”میں اپنے آقا کے سوا کس کو دیکھتا ہوں۔“

”کیا تو نے نہیں دیکھا محمد تیرے سامنے سے گزرے تھے۔“

”میں تو انہیں پہچان بھی نہیں سکا۔“

”اچھا ہی ہوا، پہچاننے کی کوشش بھی مت کرنا۔ وہ ہم سب کا دشمن ہے۔ میرا دشمن ہے اور یاد رکھ جو میرا دشمن وہ تیرا دشمن۔“

بلال نے اس کی بات کی تصدیق کی نہ تردید کی۔ یہ ایسی بات بھی نہیں تھی جس کی امیہ کو پروا ہوئی۔ وہ اکثر خاموش ہی رہتے تھے بلکہ تمام غلاموں کا یہی وتیرہ تھا۔ جب کچھ غلام کسی جگہ آپس میں مل جاتے تھے تو ایک دوسرے کو یہی تلقین کیا کرتے تھے کہ غلام وہ ہے جو سر جھکا کر آقا کی بات سنتا رہے۔

”یہ بات میں تجھ سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ محمد آج کل تم جیسے ناکارہ غلاموں کو ورغلاتا پھر رہا ہے۔ وہ غلاموں کو ان کے آقاؤں کے خلاف کر دیتا ہے اور ان کے آقا ان غلاموں کو موت کی نیند سلا دیتے ہیں۔“

رئیس امر وہوی (1914ء-1988ء)

سید محمد مہدی نقوی رئیس امر وہوی 14 ستمبر 1914ء کو امر وہہ ضلع مراد آباد (یوپی بھارت) میں علامہ سید شفیق حسن ایلیا کے ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ حضرت مخدوم سید شرف الدین شاہ ولایت، ابن سید علی بزرگ نسل مبارک سے تھے جو جید عالم دین اور صاحب کرامت بزرگ تھے۔ امام زادہ حضرت سید جعفر الذکیٰ ابن حضرت امام علی نقی علیہ السلام کے فرزند طویل حضرت سید ہارون کی ساتویں پشت سے تھے جو سید علی بزرگ وسط شہر سے سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں ہندوستان آئے۔ 653ھ میں سوہدرہ کے مقام پر حضرت مخدوم سید شرف الدین شاہ ولایت کی ولادت باسعادت ہوئی اور حضرت سیدہ فاطمہ بنت حضرت مخدوم اعظم سید شیر شاہ جلال الدین حیدر سرخ پوش بخاری (اوج شریف بہاول پور) سے عقد ہوا۔ جو حضرت سلطان سید احمد کبیر بخاری کی ہمیشہ تھی۔ حضرت مخدوم سید شرف الدین شاہ ولایت نے 90 سال کی عمر میں 743ھ میں انتقال فرمایا۔ امر وہہ میں آپ کا مزار مبارک مرجع خلافت ہے۔ آپ قبیلہ سادات نقوی امر وہوی کے مورث اعلیٰ تھے۔ آپ کے دو جلیل القدر فرزند ارجمند امیر قاضی سید علی اور سید حسن المعروف عبدالعزیز تھے۔ رئیس امر وہوی امیر قاضی امر وہی سید علی کی نسل مبارک سے تھے۔ نقوی امر وہوی قبیلہ میں سید محمد میر عدل ایک شجاع جنگ جو عادل منتظم گورنر بکھر سندھ تھے۔ شہنشاہ ہند جلال الدین اکبر اعظم کے عہد میں ”میر عدل“ جیسے ممتاز عہد پر فائز تھے۔ میر سید

روح نہیں۔ ان کی بیٹائی صرف وہ دکھاتی ہے جو ان کا آقا نہیں دکھانا چاہتا ہے۔

یہی سیاہ فام غلام جب میلے سے واپس آیا اور رات غلام خانے میں زمین پر پڑ گیا تو اسے اس تبسم دلواز کا خیال آ گیا جس کا دیدار اس نے بازار عکاظ میں کیا تھا۔ کیسی شفقت تھی اس تبسم میں، کیسی تسکین کیسی ٹھنڈک تھی۔ ہم غلام ہیں کسی اعلیٰ طبقے کا انسان ہماری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا اور محمد نے میری طرف مسکرا کر دیکھا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے یا ان کی اعلیٰ ظرفی۔ کچھ یہی ہے لیکن میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ محمد اچھے اور سچے آدمی ہیں۔ پھر امیہ، میرا آقا یہ کیوں کہہ رہا تھا کہ محمد سے اس کی دشمنی ہے۔ انہوں نے ایسا کیا کر دیا ہے۔ پھر اسے دیوار کعبہ کے سائے میں ہونے والی گفتگو یاد آئی۔

وہی اس بات پر سب سے زیادہ زور دیا جارہا تھا کہ محمد کہتے ہیں سب انسان برابر ہیں۔ میرے آقا نے مجھے نزدیک بلا کر مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ کیا میں اور تو برابر ہیں۔ اس کا مطلب ہے ان لوگوں کو سب زیادہ تکلیف اسی ایک بات سے پہنچی ہے اور پہنچی بھی چاہیے۔ ان لوگوں کی تو امارت ہی اس فرق پر قائم ہے۔ امیر لوگ آقا ہیں غلام ہیں۔ یہ لوگ نہیں چاہتے کہ یہ فرق ختم ہو۔ غلام تو محمد بھی خرید سکتے ہیں اور انہیں وہی ایذا میں پہنچا سکتے ہیں جو امیہ مجھے پہنچاتا ہے لیکن وہ تو اس نظام ہی کو ختم کیے دے رہے ہیں۔ پھر محمد تو بہت اچھے آدمی ہوئے اور اگر وہ کہتے ہیں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور

سعادت علی سعادت جو ایک عظیم شاعر تھے خدائے سخن اور شہنشاہ غزل میر محمد تقی میر کے استاد گرامی کا اعزاز جاوید رکھتے تھے۔ رئیس امر وہوی کے دادا سید نصیر حسن ابن سید امیر حسن اور والد معتمد گرامی القدر علامہ سید شفیق حسن ایلیا جید عالم دین اور صاحب اسلوب شاعر، ادیب تھے۔ ابن خانہ ہمہ آفتاب است کا یکتائے روزگار نمونہ تھے اور آپ کے تین بھائی سید محمد تقی نقوی فلسفی صحافی، ایڈیٹر، سید محمد عباس نقوی ڈائجسٹ ایڈیٹر صحافی سید حسین اصغر جون ایلیا صاحب طرز شاعر، ادیب کالم نگار تھے۔ ان چاروں بھائیوں نے اقلیم سخن و صحافت پر شان و شوکت سے حکمرانی کی جب کہ سید امیر حیدر نقوی کمال امر وہوی ابن سید انیس حسن نے فلم کی دنیا میں حکمرانی کی اور اداکاری کے جوہر دکھائے جو رئیس امر وہوی کے چچا زاد بھائی تھے۔ قبیلہ نقوی امر وہوی عالمی شہرت یافتہ ہے ادیب اعظم علامہ سید ظفر حسن نقوی امر وہوی بھی اسی قبیلہ کے قابل فخر چشم و چراغ تھے جو ایک جید عالم دین و مصنف مؤلف مترجم تھے۔ سید صادقین احمد نقوی بین الاقوامی شہرت یافتہ خطاط تھے۔ رئیس امر وہوی روزنامہ جنگ کے ایڈیٹر، کالم نگار، قطعہ نگار، شاعر، ادیب، ماہر نفسیات، صحافی، دانشور اور بیسیوں کتابوں کے مولف مصنف مترجم تھے۔ متعدد اعزازات اور صدارتی ایوارڈ یافتہ تھے۔ یکتائے روزگار ہرفن مولا تھے۔ 22 ستمبر 1988ء کو اپنے گھر کراچی میں حادثاتی موت سے انتقال کر گئے۔ اس وقت کالم لکھ رہے تھے علامہ عقیل ترابی نے نماز جنازہ پڑھائی اور نجی حسن قبرستان میں سپرد خاک کر دیئے گئے۔

مرسلہ: سید امتیاز حسین بخاری۔ سرگودھا

کر سکتے تھے۔ انہیں حیرت ہوتی تھی کہ اتنے اچھے آدمی کو برا کیوں کہا جا رہا ہے۔

☆.....☆

بلال ان دنوں عبداللہ بن جدعان کی بکریاں معاوضے پر اپنے آقا کی مرضی سے چرایا کرتے تھے۔ صبح بکریاں لے کر نکلتے اور دوپہر کے بعد تک انہیں اچھی طرح کھلا پلا کر لے آتے (اکثر لوگ اپنے غلاموں کو اس طرح کے کاموں پر لگا دیتے تھے تاکہ جو کچھ وہ کمائیں اس میں بھی ان کا حصہ ہو۔ یہی وہ استحصالی نظام تھا جس کے خلاف حضرت محمد آواز بلند کر رہے تھے)۔

اس دن وہ بکریوں کا ریوڑ لے کر مکہ سے باہر نکلے اور ہونے والی بات تھی، اس پہاڑ کی طرف جا نکلے جہاں غار حرا واقع تھا اور یہ بھی اتفاق کہ اس وقت حضرت محمد سیدنا ابو بکر صدیق کے ہمراہ غار میں تشریف فرما تھے۔

گرمیوں کے دن تھے۔ سورج سر پر آگیا تھا جھلسا دینے والی گرم ہوا چل رہی تھی۔ پیروں کے نیچے کی ریت آگ بن گئی تھی۔ سنگریزے انکارے بنے ہوئے تھے۔ بلال کے ننگے بند پر سورج کی کرنیں تیروں کی طرح برس رہی تھیں۔ وہ سوچ ہی رہے تھے کہ یہاں سے نکل کر سایہ دار مقام تلاش کریں۔ واپس چلے جاتے تو سزا کے سزاوار ہوتے۔ مالک تو یہی کہتا کہ دھوپ سے گھبرا کر غلام بھاگ آیا۔

گرمی ایسی تھی کہ شاید جانور بھی جھلنے لگے تھے۔ ایک بکری کچھ زیادہ ہی گھبرا گئی۔ وہ ریوڑ سے الگ ہوئی اور دوڑتی ہوئی پہاڑی پر چڑھ گئی۔ یہ وہی مقام تھا جہاں غار حرا تھا۔ بلال اس بکری کو پکڑنے کے لیے اوپر کی طرف دوڑے۔ ان کی آواز شاید غار کے اندر تک پہنچ گئی تھی۔ حضور نے آواز سن کر ابو بکر صدیق سے فرمایا۔ ”شاید کوئی چرواہا ہے جو اپنی بکریاں لے کر ادھر آ گیا ہے۔ اس سے پوچھو اگر اس کے پاس دودھ ہے تو ہم اجرت دے کر خرید لیں۔“

حضرت ابو بکر نے غار کے اندر سے باہر کی طرف دیکھا۔ ”ارے یہ تو بلال حبشی ہے، امیہ کا سیاہ فام غلام۔ مجھے جانتا بھی ہے۔ یہ ضرور ہمیں دودھ دے دے گا۔“

بلال کے کانوں میں آواز آئی۔ کوئی اس کا نام لے کر اسے پکار رہا تھا۔ اس پکار میں حکم کا انداز نہیں تھا۔ شفقت ہی شفقت تھی۔ انہوں نے دھوپ سے نظریں بجا کر اس طرف دیکھا جس طرف سے آواز آئی تھی۔ وہ دیکھتے ہی پہچان گئے۔ یہ حضرت ابو بکر صدیق تھے۔ یہ ہیں تو وہ بھی ہوں گے۔ ہر وقت ساتھ ہی تو رہتے ہیں۔ شاید اس وقت بھی..... وہ اس طرف دوڑ پڑے لیکن اس قدر بوکھلائے ہوئے کہ ایک جگہ ٹھوکر بھی لگی۔

”بلال، تمہارے ریوڑ میں کوئی ایسی بکری بھی ہے جو پہاڑ پر چلی آئی ہے اور اس کے پیچھے پیچھے میں بھی یہاں آ گیا اگر

ارشاد ہوتا اس کا دودھ نکال کر پیش کروں۔“

بلال نے جواب کا انتظار کیے بغیر دوڑ لگا دی۔ بکری ابھی تک وہیں کھڑی تھی جہاں وہ اسے چھوڑ آئے تھے۔ انہوں نے اپنے ہی برتن میں دودھ نکالا اور غار کے دہانے پر آگئے۔ ابو بکر صدیقؓ نے اندر ہی سے آواز دی کہ وہ دودھ لے کر اندر آجائیں۔

غار حرا کے اندر جانے کا راستہ اتنا نیچا تھا کہ بلالؓ کو اندر جانے کے لیے اتنا جھکنا پڑا جیسے کوئی نماز کے دوران رکوع کی حالت میں ہوتا ہے۔ داخل ہونے کے بعد بائیں جانب چھت بھی اتنی نیچی تھی کہ جھک کر بیٹھنا پڑتا تھا اور وہ بھی آرام سے نہیں کیونکہ سطح بھی ہموار نہیں تھی۔ غار کی چٹانوں میں لمبی لمبی دراڑیں قدرتی طور پر تھیں جس سے ہوا اور روشنی اندر آرہی تھی۔ ان درزوں سے خانہ کعبہ کی عمارت صاف نظر آرہی تھی۔ اس غار کا کل رقبہ اتنا تھا کہ دس پندرہ آدمی آجائیں۔

بلالؓ اندر پہنچے تو دودھ کا برتن ان کے ہاتھ سے گرتے گرتے بجا۔ وہ سانس لینا بھول گئے۔ ان کی مراد ان کے سامنے تھی۔ ایک گوشے میں حضرت محمدؐ شریف فرماتے۔ وہی دل کو چھو لینے والا تبسم ان کے ہونٹوں پر تھا جو بلال نے عکاظ کے بازار میں دیکھا تھا۔

دودھ کا برتن ابو بکر صدیقؓ نے ان کے ہاتھ سے لے لیا اور حضورؐ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ حضورؐ نے ایک نظر دودھ کے برتن پر ڈالی اور بلال سے مخاطب ہوئے۔

”بلال، بیٹھو۔ کھڑے ہوئے کیوں ہو، تم نے میرے لیے دودھ لانے میں کتنی مشقت کی ہے تھک گئے ہو گے۔“

بلالؓ کی عادت حکم ماننا تھا اور یہ تو محمدؐ کا حکم تھا لیکن وہ ان اعلیٰ مرتبت ہستیوں کے قریب کیسے بیٹھ سکتا تھا۔ وہ غار کے آخری سرے پر جا کر بیٹھ گئے جس طرح دیوار کعبہ کے سائے میں اپنے آقا سے دور بیٹھ جایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی باتیں بھی صاف سنائی نہیں دیتی تھیں۔

”بلال! اتنی دور کیوں بیٹھ گئے۔ میرے قریب آ کر بیٹھو تاکہ میں تم سے باتیں کروں۔“

”میں تو ادنیٰ سا ایک غلام ہوں۔ میں آپ کے قریب کیسے بیٹھ سکتا ہوں۔“

”یہی تو میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ اللہ کے نزدیک کوئی ادنیٰ کوئی اعلیٰ نہیں۔ سب انسان بحیثیت انسان برابر ہیں۔ ہاں ان کے کام ادنیٰ یا اعلیٰ ہو سکتے ہیں۔“

بلالؓ اپنی جگہ سے اٹھے تو خوشی سے یاغم سے ان کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آئے اور حضورؐ کے نزدیک ہی بیٹھ گئے۔

رسول اللہؐ نے بلال کے لائے ہوئے برتن سے دودھ نوش فرمایا اور خوب سیر ہو چکے تو برتن ابو بکر صدیقؓ کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے پیا اور وہ بھی سیر ہو گئے۔ انہوں نے دودھ کا برتن بلالؓ کی طرف بڑھا دیا۔ واہ! کیا خوب سودا تھا۔ بلالؓ تو بیٹھے بیٹھے جھومنے لگے۔ جس برتن کو رسول خدا کے ہونٹوں نے مس کیا تھا اسی برتن سے وہ دودھ پی رہے تھے، خوب سیر ہو کر پیا۔

”بلال! کیا تم نے سن رکھا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، کیا تمہیں اس پر یقین ہے؟“

”میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ آپ غلط کہہ رہے ہوں گے۔“

”کیا تم نے وہ باتیں سن رکھی ہیں جو اللہ میری زبان سے کہلاتا ہے۔“

”میں نے تو صرف یہ سنا ہے کہ آپ بتوں کی پرستش کو منع کرتے ہیں۔ ایک خدا کو ماننے کا حکم دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ تمام انسان برابر ہیں۔“

”بس اس کے سوار ہا کیا۔ جو کچھ تو نے سنا وہی تو میں ہوں۔ خدا تجھ پر اپنی رحمت کا سایہ ڈالے۔“

ان لفظوں میں تاثیر کی ایسی دنیا چھپی ہوئی تھی کہ وہ مضبوط سیاہ فام جس کی آنکھیں تک پھر ہو گئی تھیں، موم کی طرح پگھل گیا۔ کب کے رے ہوئے آنسو خراج بن کر پھیلی اذیتوں کا کفارہ ادا کرنے لگے۔

”بلال، روتے کیوں ہو۔“

”ایک یہی کام تھا جو مجھ سے آج تک نہیں ہو سکا تھا۔ وہ شفقت دیکھی ہی نہیں تھی جو دل پگھلاتی ہے۔ میرے تو والدین کے پاس بھی اتنی فرصت نہیں تھی کہ مجھ سے محبت کا برتاؤ کرتے۔ میں اچانک رئیس ہو گیا۔ آپؐ نے اتنی محبت میرے حوالے کر دی کہ میں رونے کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکا۔ اچھا اب تم جاؤ تمہارا آقا تمہارا منتظر ہوگا۔“

”میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔“ بلالؓ نے کہا اور حضورؐ کے قدموں میں سر رکھ دیا۔

”بلال، تمہیں اسلام مبارک ہو مگر اس کے اظہار میں جلدی مت کرنا۔ ابھی اہل مکہ میرے مخالف ہیں۔“

مسلمانوں کی تعداد کم ہے۔ ایسا نہ ہو تمہاری اذیتوں میں مزید اضافہ ہو جائے۔

جب حضورؐ کے حکم سے بلالؓ جانے کے لیے اٹھے تو حضورؐ اور ابو بکر صدیقؓ نے انہیں باری بار گلے لگا کر رخصت کیا۔ کوئی یاد ایسی نہیں تھی جو بلال کو یہ بتاتی کہ انہیں آج تک کسی نے گلے لگایا ہو۔

بلالؓ غار سے باہر آئے تو ان کی بکری اسی طرح کھڑی تھی۔ بلندی سے نشیب کی طرف دیکھا تو ریوڑ کی بکریاں اسی طرح ان کی منتظر تھیں۔ سب کچھ وہی تھا لیکن دل کی دنیا بدل گئی تھی۔ پہاڑ سے نیچے اترنے لگے تو محسوس ہوا بلندی سے بلندی کی طرف جا رہے ہیں۔ ایک لمحے کو یہ خیال بھی آیا تھا کہ انہوں نے اپنے آقاؐ کی حکم عدولی کی ہے۔ ان کے دشمن سے دوستی کی ہے لیکن دوسرے ہی لمحے احساس گناہ احساس فخر میں بدل گیا۔ غلام تو ہوتے ہی اس لیے ہیں کہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جاتے رہیں۔ مجھے فخر ہے کہ مجھے امیہ سے اچھا آقا ملا ہے۔ اگر راز داری کا مرحلہ درمیان میں نہ ہوتا تو میں آج ہی امیہ سے کہہ دیتا کہ میری قیمت بہت اچھی لگی ہے۔ میں بیک چکا ہوں۔ اب میرا آقا تو نہیں، کائنات کے سب سے افضل انسان نے مجھے خرید لیا ہے۔

وہ ریوڑ لے کر مکہ کی طرف چلے تو ان کی بکریوں کی چال ہی دوسری تھی۔ انہیں ایسا چرواہا اس سے پہلے کہاں ملا ہوگا۔ وہ شہر میں داخل ہوئے تو پھر وہی غلام بلالؓ تھے۔ کوئی آنکھ بھر کے دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ کسی کی نظر پڑتی بھی تھی تو بے اعتنائی سے منہ دوسری طرف پھیر لیتا تھا۔

وہ عبداللہ بن جدعان کے گھر کے قریب پہنچے تو اچانک ایک خوف نے حصار کر لیا۔ بکری کے تھن خالی ہو چکے ہیں۔ عبداللہ ضرور پوچھے گا دودھ کہاں گیا۔

اس دودھ کی جو اجرت حضورؐ نے ادا کی تھی وہ ان کی مٹھی میں دبی ہوئی تھی لیکن وہ یہ کیسے بتائے گا کہ یہ دودھ اس نے کسے فروخت کیا۔

بلالؓ نے گھبرا کر بکری کے تھنوں کی طرف دیکھا۔ یہ کیا اس کے تھن اسی طرح دودھ سے بھرے ہوئے تھے۔ انہیں خود شک ہونے لگا کہ یہی وہ بکری تھی یا کوئی دوسری تھی۔

ان کے پہنچنے ہی عبداللہ بن جدعان نے حکم دیا کہ بکری کا دودھ نکال کر اس کے پاس لائے۔ حضورؐ کی دعا سے

برطانیہ سے تعلق رکھنے والے رچرڈ براؤنی نامی شخص نے ایک ایسا انوکھا کاسٹیوم تیار کیا ہے جسے پہننے والا آئرن مین کی طرح ہوا میں اڑاں بھرتا ہوا دکھائی دے گا۔ چھوٹے جیٹ پیک سے مزین اس آئرن مین کاسٹیوم کے دونوں بازوؤں میں جیسے گیس ٹر بانز نصب ہیں اور ہر ٹر بان آٹھ سو ہارس پاور کی قوت پیدا کرتی ہے جس کی وجہ سے یہ سوٹ پہننے والا 32.02 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے فضا میں اڑاں بھر سکتا ہے جس کا عملی مظاہرہ بذات خود رچرڈ پیش کر چکا ہے۔ اس انوکھے سوٹ کی قیمت چالیس ہزار پاؤنڈ مقرر کی گئی ہے اور یہ جلد ہی مارکیٹ میں دستیاب ہوگا۔

مرسلہ: مٹھی محمد عزیز مے۔ لندن

بکری کے تھنوں میں دودھ نہ اترتا ہوتا تو کتنی شرمندگی ہوتی۔ بلالؓ نے سوچا اور دودھ نکالنے بیٹھ گئے۔

دوسرے دن وہ بکریوں کا ریوڑ لے کر نکلے تو ان کے قدم خود بخود غار حرا کی طرف اٹھ گئے۔ یہ ضروری بھی تھا کیونکہ محبت کا تقاضا بھی یہی تھا اور یہ بھی تھا کہ مکتب رسولؐ سے ابھی بہت سے سبق حاصل کرنے تھے۔ بکریاں پہاڑ کے نیچے چرتی رہیں اور بلالؓ اور عشق الہی کے اسباق پڑھتے رہے۔

مکہ کی فضا اتنی پُراسرار ہو گئی تھی کہ آنکھیں نگرناں بنی ہوئی تھیں۔ ہر آنے جانے والے پر نظر رکھی جا رہی تھی۔ ہر بڑھتے ہوئے قدم کو دیکھا جا رہا تھا کہ وہ کس مقصد کے لیے اٹھ رہا ہے۔ مکہ کی اعلیٰ سوسائٹی کو یہ ہرگز گوارا نہیں تھا کہ محمدؐ کا پیغام آگے بڑھے، ان کے چاہنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔

بلالؓ کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ ایک آنکھ نے انہیں بھی دیکھ لیا ہے۔ ابھی صرف چار دن گزرے تھے کہ ابو جہل، عبداللہ بن جدعان کے گھر آیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ اصل مقصد برآ گیا۔

”آج کل تمہاری بکریاں خوب موٹی ہو رہی ہیں۔ دودھ بھی کچھ زیادہ ہی دے رہی ہوں گی۔“

”ہاں دیکھ تو میں بھی رہا ہوں۔ یہ سب بلالؓ کی محنت ہے۔“

”بلال واقعی بہت محنت کر رہا ہے۔“ ابو جہل نے

تسخیر اڑانے کے انداز میں کہا۔ ”کون سی چراگاہ میں لے کر جاتا ہے؟“

”یہ سب باتیں غلاموں سے پوچھی تو نہیں جاتیں۔“

”تم بڑے بھولے ہو عبد اللہ۔ ابھی میں امیہ کو اس معاملے میں ڈالنا نہیں چاہتا لیکن یہ بتا دوں کہ تمہارے غلام نے وہ جگہ دیکھ لی ہے جہاں ابوطالب کا بھتیجا بیٹھتا ہے۔“

پھر اس نے کہا۔ ”یہی تو میں تمہیں بتانے آیا ہوں۔ تم اسے وہاں بکریاں چرانے سے منع کر دو۔ تمہارا غلام مذمم (محمد) سے ملاقاتیں کرتا ہے اگر اب وہ وہاں گیا تو میں اس سے نہیں تم سے پوچھوں گا۔ میں نے سوچ لیا ہے جو محمد سے ملے گا میں اس کا جینا دو بھر کر دوں گا اور جو ایسے لوگوں کی سرپرستی کرے گا اسے بھی معاف نہیں کروں گا۔“

”میں خود یہ برداشت نہیں کر سکتا۔“

ابو جہل تو ان دھمکیوں کے بعد وہاں سے اٹھ گیا لیکن عبد اللہ بن جدعان سوچ میں پڑ گیا اگر میں بلال کو نکال دوں تو امیہ کا تو کچھ نہیں جائے گا۔ میرے بہت سے کام رک جائیں گے اور بلال اگر ابوالحکم سچ کہتا ہے، محمد سے ملاقاتیں کرتا رہتا تو میں اس کے انتقام کا نشانہ بنوں گا پھر اس کی خود غرضی نے اسے یہ مشورہ دیا کہ وہ بلال کو غار حرا کے ارد گرد بکریاں چرانے سے منع کر دے۔ اگر اس کے بعد بھی وہ نہ مانا تو ابوالحکم جانے اور بلال۔

عبد اللہ بن جدعان نے بلال کو طلب کیا۔ گردن سینے سے لگی ہوئی، ہاتھ بندھے، آنکھیں جھکی ہوئیں۔ ایسا وفادار غلام حکم عدولی کیسے کر سکتا ہے، ابوالحکم کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ پھر بھی سرزنش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ عبد اللہ بن جدعان نے بلال کو منع کر دیا کہ بکریوں کو مکہ سے باہر اس طرف نہ لے جایا کرے جہاں غار حرا واقع ہے۔ غلام کی کیا مجال کہ حکم ٹال سکے۔ وہ کرے جو وہ چاہے، وہ نہ کرے جو اس کا مالک چاہتا ہے۔ احتیاط کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ابھی جذبوں کی بغاوت پر اصرار نہ کیا جائے۔ اس کا احساس بھی ہو گیا کہ ان کی نگرانی کی جارہی ہے۔ انہوں نے چراگاہ بدل دی۔ مکہ سے باہر ضرور نکلے لیکن دل پر پھر رکھ کر کسی اور طرف نکل جاتے۔ ایک مرتبہ چوری کر بھی لی۔ چھپ چھپا کے غار حرا پہنچ گئے دھڑکتے دل کے ساتھ اندر جھانکا۔ غار خالی پڑا تھا۔ یہ ضروری تو نہیں قسمت ہمیشہ یاوری کرے۔ دو گرم آنسو رخساروں کو تسلی دیتے ہوئے نیچے اتر گئے۔ فرمان رسول یاد آیا۔ ”اسلام کے اظہار میں جلدی مت

کرنا۔ ایسا نہ ہو تمہاری اذیتوں میں اضافہ ہو جائے۔“

ابھی تک فرمان رسول پر عمل کیا تھا۔ کسی پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ ایمان لے آئے ہیں۔ اس مہتاب کی طرح دھکتے چہرے کی یاد آتی تھی تو اندھیری کوٹھڑی میں، سونے سے پہلے آنسو بہا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیا کرتے تھے۔ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ کفار کی تختیوں میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس مخالفت میں سرداران مکہ کی مرضی شامل تھی اس لیے مفسدوں کو خوب شمل رہی تھی۔

ان سرداران مکہ کو جن کا سرغنہ ابو جہل تھا اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ تحریک زندگی کے کسی ایک شعبے تک محدود نہیں بلکہ ایک انقلاب ہے۔ اگر کامیاب ہوا تو ہر اس ستون کو گرا دے گا جس پر ہمارے نظریات کی چھت لگی ہوئی ہے۔ جو ہمارے زیر دست ہیں، روایتوں کے نفس سے نکل بھاگیں گے۔ دولت کی تقسیم کا گورکھ دھندا ہی بکھر کر رہ جائے گا۔ ہمارے عیش و عشرت کے سب سامان خاک میں مل جائیں گے۔ یہ تحریک صرف نظام کو نہیں، یہ تو انسان ہی کو بدل دے گی۔ محمد کہتا ہے جو دولت مند ہیں اپنی دولت میں غریبوں کو شریک کریں۔ وہ تو ہماری اقدار ہی کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ کہتا ہے کوئی قبیلہ دوسرے قبیلے پر فضیلت نہیں رکھتا۔ وہ ہمارے رسم و رواج ہی کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ حد تو یہ ہو گئی کہ عورتوں اور مردوں میں بھی مساوات قائم کرتا ہے۔

بلال غلامی کی زندگی گزار رہے تھے۔ انہیں باہر نکلنے اور لوگوں کے ساتھ میل جول رکھنے کی اجازت نہیں تھی لیکن تھے تو وہ مکہ میں، اڑتی اڑتی بہت سی خبریں پہنچ جاتی تھیں۔ کبھی دو غلام کسی جگہ مل جاتے تھے تو تبادلہ خیال ہو جاتا تھا۔ ایک دن کسی نے یہ خبر سنائی کہ ابوسفیان کی بیوی اس راستے پر گندگی ڈال دیتی ہے جدھر سے محمد گزرنا ہوتا ہے۔ شریر بچے آپ پر آوازیں کتے ہیں، کنکریاں اچھالتے ہیں، راستے میں کانٹے بچھاتے ہیں۔

کفار کی ان حرکتوں کی ہر خبر پر بلال کے دل میں خون کی ایک بوند جم جاتی تھی۔ انہیں شدت سے احساس ہوتا تھا کہ وہ ایک غلام ہیں۔ اگر وہ کسی باعزت خاندان کے فرد ہوتے تو محمد کے لیے سینہ سپر ہو جاتے۔ فرمان رسول بھی یاد آتا تھا کہ اظہار اسلام کے لیے جلدی مت کرنا۔ اب تک وہ اس عہد پر قائم تھے۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ مکہ کا انقلاب ان کے دل کو مرکز بنا کر اس میں ٹھہر گیا ہے۔ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ ان کا آقا امیہ اور ان جیسے دوسرے سردار ہم غلاموں کا

خون چوس چوس کر ریشم پہن رہے ہیں، شراب پی رہے ہیں، سود کھا رہے ہیں اور محمد کی مخالفت اس لیے کر رہے ہیں کہ وہ ان سب باتوں سے انہیں روکتے ہیں۔

ہر آنے والا دن بلال کے غصے میں اضافہ کرتا رہا۔ ایک روز وہ حرم کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ انہیں کعبہ دیکھ کر یاد آ گیا کہ یہاں بت رکھے ہوئے ہیں۔ وہی بت جنہیں یہ کفار پوجتے ہیں۔ ان سے منتیں کرتے ہیں۔ ہبل تم میرا اونٹ تلاش کر دو۔ میں بار بار تمہارے در پہ حاضری دوں گا۔ یہ عجیب بات ہے۔ خدا کو مانتے بھی ہیں اور بتوں سے مانگتے بھی ہیں۔ ان کی ناقص عقلوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ لکڑی اور پتھر کے ان بتوں میں روحانی جوہر چھپا ہوا ہے۔ ہر قبیلہ کا الگ بت ہے جب کہ خدا رب العالمین ہے۔ بتوں کی پرستش انسانوں کو آپس میں بانٹتی ہے۔ کبھی کبھی تو آپس میں خونریزی ہو جاتی ہے۔ ایک قبیلہ کہتا ہے میرا بت بڑا ہے دوسرا قبیلہ کہتا ہے میرا بت عظیم ہے۔ اگر سب ایک خدا کو مانیں تو بڑے اور عظیم کا فرق ہی مٹ جائے۔ یہ بت بول نہیں سکتے، کوئی ہدایت نہیں دے سکتے اس لیے بھی ان نادانوں کو یہ بت عزیز ہیں کہ ان کی بد اعمالیوں پر یہ بت سرزنش نہیں کر سکتے کوئی ہدایت جاری نہیں کر سکتے۔ من مانیاں کرنے کی کھلی آزادی مل گئی ہے۔ خدا کو مانیں تو اس کے احکام پر عمل بھی کرنا پڑے گا۔ محمد ان کی بنیادیں ہلا رہے ہیں۔ دورانیت کا سبق پڑھا رہے ہیں، اسی لیے یہ لوگ متحد ہو کر ان کی مخالفت پر اتر آئے ہیں۔

وہ بڑی دیر تک اپنے خیالوں میں گم رہے۔ اپنے آپ سے سوال جواب کرتے رہے۔ پھر انہوں نے دیکھا کوئی انہیں دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ گرم دوپہر کا سناٹا سب کو ہڑپ کر گیا تھا۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ بس ایک نفرت تھی جو ان کے دل میں دھڑک رہی تھی۔ وہ کسی ارادے سے کعبے میں داخل ہوئے۔ ایک مرتبہ پھر اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ کوئی انہیں دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ اسی وقت چند قریشی بھی اندر داخل ہوئے بلال انہیں دیکھ نہیں سکتے اور بتوں پر تھوکتا شروع کر دیا۔ ساتھ ساتھ کہتے جاتے تھے۔ ”جس نے بھی تمہاری عبادت کی اور پوجا کی وہ نقصان میں رہا۔“

قریش نے دیکھا تو چیخنے لگے اور انہیں پکڑنے کے لیے آگے بڑھے۔ بلال نے جب دیکھا کہ دیکھ لیے گئے ہیں تو پورے قوت سے بھاگے اور کعبہ سے نکل کر عبد اللہ بن جدعان کے گھر کی راہ لی۔ یہ رات کا اندھیرا نہیں تھا کہ انہیں

بچھا لیتا۔ دن کی چمکیلی دھوپ تھی۔ بہت سے لوگوں نے انہیں دیکھا۔ یہ بھی دیکھ لیا کہ وہ عبد اللہ بن جدعان کے گھر میں جا کر چھپے ہیں۔

قریش، عبد اللہ کے گھر کے آگے جمع ہو گئے۔ جس کو معلوم ہوا دوڑا ہوا آیا۔ ایک بھیڑی لگ گئی۔ شور مچا کر عبد اللہ بن جدعان گھر سے نکل آیا۔

”عبد اللہ، کیا تو صابی ہو گیا ہے۔“ لوگوں نے زور زور سے کہنا شروع کر دیا۔

”تم لوگ یہ کیا کہہ رہے ہو۔ اگر میں صابی (جو مسلمان ہو جاتا تھا اسے صابی کہتے تھے یعنی جو دین سے پھر گیا ہو) ہو گیا ہوں تو میرے لیے ایک سواونٹ کی قربانی لات و عزتی کے نام پر واجب ہے۔“

”تو نہیں تو پھر تیرا غلام صابی ہو گیا ہے۔“

”کیا ہوا۔ کیا کیا ہے اس نے۔“

”اس نے ہمارے بتوں پر تھوکا ہے ان کی تذلیل کی ہے۔“

”تمہاری مراد بلال سے ہے۔“

”ہاں، تم نے اسے چھپایا ہے۔“

”میں نے اسے نہیں چھپایا۔“

”تو پھر اسے باہر نکالو۔ ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”وہ میرا نہیں امیہ کا غلام ہے۔ میرے پاس تو وہ معاوضے پر بکریاں چراتا ہے۔“

”ہمیں اس سے غرض نہیں کہ وہ کس کا غلام ہے۔ اسے ہمارے حوالے کرو۔“

”تم لوگ امیہ کے پاس جاؤ۔ اسے بلا کر لے آؤ پھر وہ جو فیصلہ کرے۔“

یہ جرم معمولی نہیں تھا کہ لوگ واپس پلٹ جاتے۔ انہوں نے عبد اللہ کے گھر کا گھیراؤ کر لیا کہ بلال جو اندر چھپے ہوئے ہیں بھاگ نہ جائیں اور کچھ لوگ امیہ کو بلانے چلے گئے۔ وہ آیا تو ابو جہل بھی اس کے ساتھ تھا۔ عبد اللہ نے بلال کو ان کے سامنے پیش کر دیا۔

”تم اس کے مالک ہو۔ اس کے ساتھ جو چاہو سلوک کرو۔“

اس آواز کے ساتھ ہی شور کی آواز دی گئی جیسے مجمع سانس لینا بھول گیا ہو۔ یہ خاموشی سننا چاہتی تھی کہ امیہ اس حبشی غلام کے حق میں کیا فیصلہ سناتا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا

کے ننگے فرش پر ڈال دیا گیا۔

جب کوئی زخمی ہوتا ہے تو اس کی تیمارداری کی جاتی ہے، اس کے زخموں پر مرہم لگایا جاتا ہے لیکن بلال کا تیماردار کون تھا؟ ان کے زخموں پر مرہم کون رکھتا؟ وہ خود ہی ہوش میں آگئے۔ بلنے کی کوشش کی تو ہلکی سی ایک کراہ نکل گئی۔ اندھیرے میں کوڑوں کے نشان نظر نہیں آتے تھے لیکن تکلیف بتا رہی تھی کہ کوڑے اپنے نشان چھوڑ گئے ہیں۔ وزنی پتھر جسم پر رکھے رہنے سے پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔ وہ دیکھتے ہوئے بدن کو گھسیٹتے ہوئے پانی کے گھڑے کی طرف گئے۔ ابھی اس میں پانی موجود تھا۔ اس وقت یہ پانی آب حیات سے کم نہیں تھا۔ پانی پیا تو حواس کچھ ٹھکانے آئے۔ ابھی پہلا دن تھا بدن پر نشان تو تھے لیکن یہ نشان ابھی زخم نہیں بنے تھے۔ امیہ کو بھی یہ توقع تھی کہ اس سزا کے بعد ہوش ٹھکانے آگئے ہوں گے لہذا وہ ان کے پاس آیا۔ ایک غلام ایک برتن میں شوربا اور کچھ روٹیاں لیے ہوئے اس کے ساتھ تھا۔

”مجھے یقین ہے، تجھے اب معلوم ہو گیا ہوگا کہ تو کتنا بڑا جرم کر بیٹھا ہے۔ یہ کھانا کھالے اور اپنا فیصلہ تبدیل کرنے کے بارے میں سوچ۔“

امیہ انہیں مشورہ یا دھمکی دے کر چلا گیا۔ بلال کے سامنے روٹی رکھی تھی۔ دن بھر کے بھوکے تھے اور اتنی اذیت سے گزر چکے تھے۔ دوسرے دن کا علم نہیں تھا کہ اور کیا بیت جائے۔ انہوں نے اللہ کا نام لیا اور روٹی کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

دوسرے دن جب دن چڑھ گیا اور زمین گرم ہو گئی تو بلال کو ایک مرتبہ پھر غلام خانے سے نکالا گیا اور جلتی ہوئی زمین پر لٹا کر پہلے سے بھی زیادہ وزنی پتھر رکھ دیا گیا۔ امیہ نے کوڑا اٹھایا اور مارتے مارتے تھک گیا۔ ہر ضرب کے بعد تقاضا کرتا تھا کہ بلال اس کے خداؤں کو تسلیم کرے۔ بلال ہر تقاضے کے جواب میں احدا حد پکارتے۔

ابھی ایک دن پہلے کے کوڑوں کے نشان ختم نہیں ہوئے تھے کہ کوڑے پھر برسے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خون رسنے لگا۔ پتھر پلے گرم زمین کمر کو جھلسا رہی تھی لیکن بھاری پتھر سینے پر رکھے ہوئے تھے جنہیں بھی نہیں کر سکتے۔

یہ ایسی سزا تھی کہ امیہ کے خیال میں بلال کو نصیحت ہو جانی چاہیے تھی لیکن جب دھوپ ڈھل گئی اور امیہ کے بازو شل ہو گئے تو وہ حیران رہ گیا۔ بلال کی زبان پر اب بھی اللہ

کی وحدانیت کے سوا کوئی کلمہ نہیں تھا۔ پتھر ہٹا دیئے گئے۔ بلال کو سہارا دے کر اٹھایا تو قریش نے دیکھا بلال کی پیٹھ پر بڑے بڑے آبلے پڑ گئے ہیں جنہیں بھینتا دوسرے دن زخم بن جاتا تھا۔

بنو حنیف کے لوگوں کو بلال کی حالت دیکھ کر افسوس تو ضرور تھا لیکن ان کے نزدیک یہ بھی ضروری تھا کہ بلال کی اصلاح کی جائے، اگر بلال کو سزا نہیں دی گئی تو دوسرے غلاموں کی ہمت بڑھ جائے گی۔

تیسرے دن بلال کو دھوپ بھرے میدان میں لایا گیا تو تماشاخیوں نے دیکھا کہ بلال کی کمر کے چھالے پھوٹ گئے ہیں اور ان سے خون اور پانی بہہ رہا ہے۔ سخت اذیت میں ہیں لیکن زبان سے احدا حد کی آوازیں ادا ہو رہی ہیں اور جب انہیں زمین پر لٹایا گیا تو کافروں کے پتھر دل بھی رونے لگے۔ بلال کی پیٹھیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں لیکن امیہ کو رحم نہ آیا۔ ایک بڑا پتھر ان کی چھاتی پر رکھ دیا گیا۔ امیہ نے کوڑے برسانے شروع کر دیے۔ جب وہ تھک گیا تو انہیں دھوپ میں جلتا چھوڑ کر خود ایک جگہ سایہ دیکھ کر بیٹھ گیا۔

ورقہ بن نوفل اس تماشاخیوں کی بھیڑ میں کھڑے تھے۔ وہ اس تشدد کی تاب نہ لاسکے۔ بھیڑ کو چیرتے ہوئے بلال کے قریب پہنچے اور ان کے کان میں سرگوشی کی۔

”بلال! تکلیف سے بچنے اور نجات حاصل کرنے کے لیے جو یہ کہتے ہیں اس کو قبول کر لو کہہ دو کہ تم آئندہ لات اور عزلی کی پرستش کرو گے، مجھ سے تمہاری یہ تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔ تم امیہ کا مطالبہ مان لو اور وقتی طور پر ہی سہی، چھٹکارا حاصل کر لو۔“

بلال کی نجیف آواز ابھری۔ ”میں قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ اگر یہ لوگ مجھے قتل بھی کر دیں تو اللہ تعالیٰ بہترین انتقام لینے والا ہے۔ وہ میری مغفرت فرمائے گا۔ میں کسی صورت ان کی بات ماننے والا نہیں ہوں۔ میرا رب الصمد اور احد ہے۔“

ورقہ بن نوفل ان کے استقلال کو دیکھ کر پیچھے ہٹ گئے اور امیہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تو نے اسے مار ڈالا تو میں اس کی قبر پر درگاہ تعمیر کروں گا۔“

امیہ نے جب دیکھا کہ ورقہ بن نوفل جیسا عالم، بلال سے متاثر ہو رہا ہے تو اس نے حکمت عملی تبدیل کر لی۔

دوسرے دن اس نے بنو حنیف کے لڑکوں کو جمع کیا اور بلال کے گلے میں رسی ڈال کر وہ رسی ان لڑکوں کے ہاتھوں میں تھا دی۔ ان لڑکوں نے رسی کو زور سے جھٹکا دیا جس سے بلال نیچے گر گئے۔ لڑکوں نے انہیں زمین پر گھسینا شروع کیا اور پچی پتھر پلے زمین پر گھسیٹتے پھرے۔ یہ سزا پہلے سے بھی بڑھ کر تھی۔ نوکیلے پتھروں کی رگڑ سے پورے بدن پر زخم ہی زخم ہو گئے۔ گردن کی رسی کو وہ اس زور سے پھینچ رہے تھے کہ دم گھٹ رہا تھا۔ لڑکوں کے قہقہے بازار کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے اور جب ان کی نظر بلال پر پڑتی تھی تو وہ بھی اس تماشا میں شریک ہو کر قہقہے لگانے لگتے تھے۔ بعض تو یہ کہتے نظر آ رہے تھے کہ اس حبشی غلام نے ہمارے خداؤں کی توہین کی تھی، اب خدا اسے سزا دے رہے ہیں۔ جب شام ہونے لگی تو ان لڑکوں نے زخموں سے چور بلال کو غلام خانے میں لا کر ڈال دیا۔

لڑکوں کے ہاتھ تو مشغلہ لگ گیا تھا۔ دوسرے دن وہ پھر اپنے تماشا کو آگے بڑھانے کے لیے امیہ کے گھر پہنچ گئے۔ بلال کے گلے میں رسی ڈالی اور کھینچتے ہوئے باہر لے آئے۔ پھر وہی ناہموار رستے تھے اور بلال کی زخمی کھال تھی۔ ایک دن پہلے کے زخم بھرے نہیں تھے کہ دوسرے زخم لگ گئے۔ اب بلال کا بدن نہیں ایک بڑا زخم تھا جو بلال کا بدن کھلا رہا تھا۔

ابھی مسلمانوں کی تعداد چھ یا سات سے زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ ان کے پاس اتنی طاقت نہیں تھی کہ مکہ کے نامور سرداروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں کیونکہ یہ سب کچھ ان کی منشا سے ہو رہا تھا۔ ابو جہل سب سے پیش پیش تھا۔ مسلمانوں کو بلال کے بارے میں معلوم ہو رہا تھا لیکن وہ ان کے حق میں دعا کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ خود حضور اکرم کفار کی شرارتوں سے محفوظ نہیں تھے۔ بلال تو ایک غلام تھے۔

امیہ، بلال کو اذیت دینے کے لیے نئے نئے حربے سوچتا رہتا تھا۔ ایک روز اس نے بلال کے کپڑے اتروا کر لوہے کی زرہ پہنا دی اور اس وقت جب سارا مکہ تپ اٹھا تھا، انہیں دھوپ میں ڈال دیا۔ لوہا گرم ہو کر آپ کے جسم کو جلا رہا تھا۔ وہ صرف چیخ سکتے تھے۔ ان چیخوں میں بھی اللہ کے سوا کوئی نام ان کے ہونٹوں پر نہیں تھا۔ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے، یہ کیسا نشہ ہے جو اترنے ہی میں نہیں آتا۔ کیا کسی آدمی میں اتنی ہمت بھی ہو سکتی ہے جس

کا مظاہرہ بلال کر رہے ہیں۔ یہ کیسا جادو ہے۔ یہ کیسی طاقت ہے۔

بلال کا حوصلہ باقی تھا لیکن امیہ کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ اس نے وہ حربہ اختیار کیا کہ اگر بلال مردہ بھی ہوتے تو چیخ اٹھتے۔ اس نے زمین پر کوئلے بچھائے اور انہیں اچھی طرح دکھا دیا۔ جب ہر کوئلے کی سیاہی، سرخی میں بدل گئی تو بلال کو ان کوئلوں پر لٹا دیا گیا اور سینے پر ایک بھاری پتھر رکھ دیا۔ چربی جلنے کی بو پھیل گئی۔ بلال کی پیٹھیں کچھ دیر دلوں کو دھلاتی رہیں پھر ان پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔

کوئلوں نے ان کی جلد کو جگہ جگہ سے جلا دیا تھا۔ امیہ نے ان داغوں کے ٹھیک ہونے تک اپنا کوڑا پھینک دیا۔ بلال کو غلام خانے میں ڈال دیا۔ کھانا پینا وہیں پہنچا دیا جاتا تھا۔ صبح شام امیہ آکر پوچھ بھی لیتا تھا کہ انہوں نے امیہ کے خداؤں کو تسلیم کیا یا نہیں۔

زخم ابھی پوری طرح بھرے بھی نہیں تھے کہ نئے زخموں کی تیاری ہونے لگی۔ ایک دوپہر کو غلام خانے سے باہر نکالا اور دھوپ میں جلتی ہوئی ریت پر ڈال دیا۔ دھوپ ڈھلی تو لڑکے، گلے میں رسی ڈال کر کھینچتے پھرے پھر یہ روز کا معمول ہو گیا۔

بلال کے زخم بد بو دینے لگے تھے۔ ان زخموں سے ہر وقت خون رستار ہتا تھا۔ بلال کا ایک ہی وظیفہ تھا، ”احدا حد“ امیہ کے حربے ایسا ہتھیار بن گئے تھے جو خود اسے زخمی کر رہے تھے۔ تماشاخی اس تماشا کو دیکھ دیکھ کر اکتا چکے تھے۔ بعض لوگ تو امیہ کو سمجھانے لگے تھے کہ بلال کی جان چھوڑ دے، اب یہ وہ نہیں کہہ سکتا جو تو کہتا ہے۔

لوگوں کے یہ مطالبے امیہ کی کھلی ٹھکست تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ ہوگا جواب تک نہیں ہوا۔ اذیتوں کی انتہا زندگی کا خاتمہ۔ بلال کی موت۔

امیہ اس رات ایک ایسے جواری۔۔۔ کی طرح غلام خانے میں داخل ہوا جو ہار گیا تھا لیکن اپنے آپ کو فلاح سمجھ رہا تھا۔ زمین پر پڑے ہوئے کمزور اور زخمی آدمی کے سینے پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

”بلال، تو نے میری رعایت سے بہت فائدہ اٹھا لیا۔ اب میں وہ دکھاؤں گا، جس کا تو حق دار ہے۔ کل تیری زندگی کا آخری دن ہوگا۔“

”مجھے اس اذیت سے تو نجات ملے گی جو تو مجھے پہنچاتا رہا ہے تو میری اذیت خود ہی ختم کر رہا ہے تو میں کیا کر

سکتا ہوں۔“

”اب بھی اپنے کفر سے توبہ کر لے۔“

”اب تو میں تجھ سے بھی کہتا ہوں، اپنے جھوٹے خداؤں کو چھوڑ دے۔“

امیہ اب اتنا تھک چکا تھا کہ اتنا سخت جواب سننے کے بعد بھی بلال کی طرف کوئی ڈنڈا کوئی کوڑا کوئی گھونسا اچھالے بغیر کمرے سے نکل گیا۔ اتنا بوکھلایا ہوا تھا کہ اپنے ہی ملبوس میں الجھ کر گر گیا تھا۔ بلال میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ اس کی اس حالت پر ہنس سکتے۔

امیہ کے جاتے ہی بشری کمزوری نے بلال کو اپنے حصار میں لے لیا۔ زندگی کیسی بھی ہو موت سے تو بہر حال حسین ہوتی ہے۔

زندگی اور موت کے درمیان بس چند گھنٹوں کا فاصلہ تھا۔ ایک خیال دل میں یہ بھی آیا کہ اگر میں ان لوگوں کی بات مان لوں تو زندگی میسر آسکتی ہے، موت ٹل سکتی ہے لیکن اگلے ہی لمحے وہ ایک خدا کے تصور میں ڈوب گئے۔ اس تصور کے ساتھ ہی وہ میٹھی مسکراہٹ یاد آگئی جو انہیں دیکھ کر حضور کے ہونٹوں پر ابھرتی تھی۔ اگر میں نے ان کافروں کی بات مان لی تو یہ مسکراہٹ میرے لیے نہیں رہے گی۔ مجھ میں اور ان ظالموں میں کیا فرق رہ جائے گا۔ میں پھر وہی غلاموں کی زندگی گزاروں گا۔ اس زندگی سے بابرکت موت کتنی اچھی ہو گی۔ اس رات انہوں نے اللہ تعالیٰ کی خوب عبادت کی۔ عبادت کا کوئی طریقہ یاد نہیں تھا۔ بس اس کی حمد و ثناء اور یہ احساس کہ وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں یہی ان کی عبادت تھی۔

امیہ کے ساتھ کئی اور لوگ بھی تھے جو انہیں مقتل گاہ کی طرف لے جانے کے لیے آئے تھے اور یہ سوچ کر آئے ہوں گے کہ بلال موت کے خوف سے ان کے قدموں پر سر رکھ دے گا۔ اس کا جسم پسینے میں بیگا ہوا ہوگا۔ امیہ نے بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھا تھا جنہیں موت کی سزا دی جاتی تھی۔ انہیں مقتل کی طرف لے جایا جاتا تھا تو ان کی ٹانگیں اس کے جسم کا ساتھ نہیں دے پاتی تھیں۔ بلال کا دماغ چل گیا ہے کہ موت کے خوف سے آزاد ہو چکا ہے۔

امیہ کے غلام نے بغاوت کی تھی، حکم عدولی کی تھی، اس کی بات نہ مان کر اسے رسوا کیا تھا۔ اس کے یہ سب جرائم اہل مکہ کے سامنے تھے۔ وہ سب امیہ کے ساتھ تھے لیکن کوئی بلال کے ساتھ بھی تھا جسے ان لوگوں کی اندھی آنکھیں دیکھنے سے

قاصر تھیں۔ یہی وہ ہستی تھی جو بلال کو طاقت و رہنمائی تھی۔ بنو حنیئہ کے محلے میں رات بھر یہی باتیں ہوتی رہی تھیں۔ ہر گھر میں بلال کی بغاوت اور موت کی سزا کے تذکرے ہو رہے تھے۔ کسی دل میں ان کے لیے ہمدردی نہیں تھی۔ ایک غلام کے ساتھ اس کا آقا کچھ بھی کر سکتا ہے۔

اس محلے میں گھروں کی کھڑکیاں صبح ہوتے ہی کھل گئی تھیں۔ سب کی نظریں امیہ کے گھر پر جمی ہوئی تھیں۔ سب کو معلوم تھا کہ یہ کھیل دن چڑھنے کے بعد کھیل جائے گا جب دھوپ اچھی طرح پھیل چکی ہوگی لیکن بے قراری نے صبح ہی سے انتظار کرنا شروع کر دیا تھا۔

قریش کے کچھ لوگ آئے اور بلال کو کھینچتے ہوئے باہر نکالا۔ اس لیے نہیں کہ وہ مزاحمت کر رہے تھے بلکہ صرف اس لیے کہ زیادہ سے زیادہ اذیت پہنچائی جائے۔ ان کے پیچھے تالیاں بجاتا، شور مچاتا جمع تھا۔ وہ انہیں ایک میدان میں لے گئے۔ اس میدان کے پتھوں بیچ ایک بہت بڑا پتھر پڑا تھا یا خاص اسی مقصد کے لیے ڈال دیا گیا تھا جو دھوپ کی شدت سے گرم بھی ہو چکا تھا۔ بلال کو اس پتھر پر اس طرح اوندھا ڈال دیا گیا کہ پتھر ان کے پیٹ اور سینے کے بیچ بیچ گیا۔ ایک طرف ان کا سر جھول رہا تھا دوسری طرف ان کی ٹانگیں۔ اس پتھر کے ساتھ انہیں رسیوں سے جکڑ دیا گیا۔ جب یہ انتظام مکمل ہو گیا تو قریش کے ایک مضبوط آدمی کے ہاتھ میں کوڑا دے دیا گیا۔

”اس پر اس وقت تک کوڑے برساتے رہو جب تک یہ مرنے نہ جائے۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ تو میرے کام کا نہیں رہا تو میں تجھے محمد کے کام کا بھی نہیں رہنے دوں گا مگر یہ نہ مانا۔“ امیہ نے اس پہلوان سے کہا اور اس آدمی نے کوڑے برسانے شروع کر دیے۔

ایک دو تین پھر کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وقفہ تھا تو صرف اتنا کوڑا فضا میں بلند ہوتا اور پھر بلال کے بدن تک پہنچتا۔

لوگوں کے شور میں بلال کی چیخیں دب سی گئی تھیں۔ پھر بھی امیہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد آکر دیکھ لیتا تھا کہ غلام زندہ ہے یا مر گیا۔

ان کی چیخیں کچھ دیر احتجاج کرتی رہیں پھر خاموش ہو گئیں۔

”شاید مر گیا۔“ امیہ نے اپنے آپ سے کہا اور بلال کے قریب پہنچ کر انہیں جھنجھوڑ کر تصدیق کرتی چاہی۔ بلال کے

ہونٹ آہستہ آہستہ مل رہے تھے۔ امیہ نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ احدا احد۔ بلال آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔ امیہ غصے سے مٹھیاں بھینچتا ہوا اٹھا اور کوڑے مارنے والے کے ہاتھ سے کوڑا اچھین لیا۔ ابھی یہ کوڑا امیہ کے ہاتھ میں آیا ہی تھا کہ اس نے حضرت ابو بکرؓ اور محمدؐ کے منہ بولے بیٹے زید بن حارثہ کو آتے دیکھا۔ کوڑے والا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ ابو جہل بھی اسی طرح امیہ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا جیسے خطرے کے وقت گھوڑا اپنی کنوئیاں کھڑی کر لیتا ہے۔ ابو بکرؓ ان لوگوں کے قریب آکر رک گئے۔

”امیہ، تو اپنے غلام کے ساتھ یہ سلوک کیوں روا رکھتا ہے۔“

”اتنے بھولے مت بنو ابو بکرؓ کیا تمہیں نہیں معلوم یہ لات عزیزی کو چھوڑ کر محمدؐ کے ایک خدا کو ماننے لگا ہے۔“

”تو تم اس کی اصلاح کر رہے ہو؟“

”شاید ایسا ہی ہے۔“

”تم تو اسے جان سے مارنے پر تل گئے ہو۔“

”یہ میرا غلام ہے میں اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“

”اللہ کی قسم! تم لوگ اس کے جذبات کو نہیں دبا سکتے۔“

”پھر اسے موت سے ہم کنار ہونا پڑے گا اور تم اسے نہیں بچا سکتے۔ ہمارے اصول کے مطابق غلام کو سزا دینا اس کے مالک کا حق ہے۔ میں نے اسے رقم دے کر خریدا ہے۔“

”غلام بیچے بھی تو جاتے ہیں تمہارے اصول میں یہ بھی تو شامل ہے۔“

”یہ اب تمہارے دین پر ہے۔ تم تو بڑے پیسے والے ہو، تم خرید لو اسے۔“ امیہ بن خلف نے اپنے ساتھیوں کو آکھ مارتے ہوئے کہا۔

”اگر تم فروخت کرنا چاہتے ہو تو میں اس کو خریدنے کے لیے تیار ہوں۔“

اس وقت ابو جہل نے امیہ کا کندھا پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ ”امیہ کیا کرتے ہو۔ کیا تم اس صابی غلام کو بیچ دو گے۔ یہ ہمارے اصول کے خلاف ہے کہ غلام کو سزا ختم ہونے سے پہلے خریدایا جائے۔“

”سزا ختم ہی سمجھو ابو جہل۔ اب تو بلال کی کھال بھی ہمارے کام کی نہیں رہی۔ ابو بکرؓ اگر اس کے سودر ہم بھی دے تو بہت ہوں گے۔“

”امیہ، تم اسے فروخت کر کے ایک مسلمان کا اضافہ کرو

گے، اسے مار دو۔“

”یہ مر گیا تو مجھے اس کا کوئی ایک درہم بھی نہیں دے گا۔“

دونوں میں ٹکراؤ ہونے لگی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کہ مکہ کے معاشرے میں ایسے قصے روز سننے کو ملتے تھے۔ پورا معاشرہ دولت کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ ایک ناکارہ غلام جو تقریباً مر چکا ہے، بک بھی سکتا ہے۔ یہ سن کر امیہ کے منہ میں پانی آ گیا تھا۔ ابو بکرؓ اسے سودر ہم کا وعدہ کر چکے تھے۔ امیہ نے ایک مرتبہ پھر بلال کے قریب پہنچ کر انہیں جھنجھوڑا کہ کہیں وہ مرنے نہیں گئے۔ گھبراہٹ میں بلال کو کئی آوازیں بھی دے ڈالیں۔ وہی جواب تک ان کے مرنے کی دعائیں مانگ رہا تھا اب ان کے جینے کی آرزو کر رہا تھا کہ کہیں سودا غارت نہ ہو جائے۔ کئی آوازوں کے بعد بلال نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ امیہ چیخ اٹھا۔ ”زندہ ہے زندہ ہے غلام زندہ ہے۔“

”میں اس غلام کے دو سودر ہم لوں گا۔“

”آپ کو وعدہ خلائی کرتے ہوئے حیا نہیں آتی؟“

ابو بکرؓ نے کہا۔

”میرا مال ہے میں جتنے میں بیچوں۔ اس میں حیا کی کیا بات ہے۔“

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے دو سودر ہم گن دیے۔ امیہ نے بلال پر رکھے ہوئے بھاری پتھر ہٹا لیے۔ رسیاں کھول دی گئیں۔ بلال کی آنکھوں تلے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ تو یہ بھی نہ جان سکے تھے کہ انہیں خریدنے والا کون ہے یا وہ بیچے گئے ہیں۔ خون اور آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں نے صرف یہ دیکھا کہ ایک نوجوان آگے بڑھا اور انہیں سہارا دے کر اٹھایا۔

”ابو قافہ، تم دھوکا کھا گئے۔“ امیہ نے ابو بکرؓ سے کہا۔

”تم اگر ذرا دیر لگاتے تو میں اس غلام کو سودر ہم میں بھی دے دیتا مگر تم نے دو سودر ہم دے دیئے۔“

”امیہ، اگر اس کے بدلے تم ابو قافہ کی تمام دولت بھی مانگتے تو وہ تمہیں دیتا۔“ ابو بکرؓ نے فرمایا اور سہارا دینے کے لیے بلال کی بغل میں ہاتھ ڈال دیا۔ ایک طرف سے زید سنبھالے ہوئے تھے دوسری طرف سے ابو بکرؓ نے سہارا دیا اور انہیں اپنے گھر لے آئے۔

وہ جن اذیتوں سے گزر کر آئے تھے اس کا تقاضا تھا کہ صحت یاب ہونے کے لیے علاج اور آرام سے گزرا جائے۔ جسم پر کوڑوں کے نشان اور کونکوں کے داغ تھے۔

ٹانگوں میں اتنی جان نہیں رہی تھی کہ حرکت بھی دے سکیں۔ کئی دن تک زخموں پر مرہم رکھا جاتا رہا۔ تیل ملا جاتا رہا۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں انہیں صرف یہ یاد تھا کہ کسی نے ان سے کہا تھا، بلال! اب تم آزاد ہو یا کبھی ابوبکر صدیق کا چہرہ آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا تھا۔ اپنے محسن کو کون بھولتا ہے۔

ہفتے ڈیڑھ ہفتے بعد وہ صحت یاب ہوئے اور چند قدم اٹھانے کے لائق ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں سلام عرض کرنے پہنچے۔

”میں آپ کا شکر یہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے خرید بھی اور آزاد بھی کر دیا۔“

”دیکھو بلال! میں نے تم پر نہیں خود پر احسان کیا ہے۔ میں تو تمہارا شکر یہ ادا کرتا ہوں کہ تم نے مجھے یہ موقع دیا کہ اللہ کو راضی کر سکوں۔ میں نے رسول اللہ کو فرماتے سنا ہے کہ غلاموں کو آزاد کرنے سے اللہ خوش ہوتا ہے۔“

حضرت ابوبکرؓ نے بلال کو کچھ اور کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ان کے پاس سے اٹھ گئے۔ واپس آئے تو دودھ کا ایک پیالہ آپ کے ہاتھ میں تھا۔

”لو بلال، یہ دودھ پی لو۔ کمزوری بہت ہو گئی ہے۔ کچھ دن اپنی غذا کا خیال رکھنا ہوگا۔“

دودھ کا پیالہ ہاتھ میں تھا اور بلال سوچ رہے تھے یہ کیسے عظیم لوگ ہیں۔ میں اب غلام نہ سہی لیکن ہوں تو ایک ادنیٰ جہش۔ میری حیثیت ہی کیا ہے۔ ابوقافہ جیسا اعلیٰ طبقے کا فرد مجھے اپنے ہاتھ سے دودھ کا پیالہ پیش کر رہا ہے اگر یہی انقلاب ہے تو کیا عظیم انقلاب ہے۔

”ابھی ہم کا شانہ نبویؐ میں چلیں گے۔ حضورؐ کو تمہاری بہت فکر تھی۔ جب تم بے ہوش تھے تو کئی مرتبہ تمہیں دیکھنے آئے تھے۔ اب تمہیں دیکھیں گے تو کتنے خوش ہوں گے۔“

جب کوئی نووارد حضورؐ کے گھر تک جاتا تھا تو رات کے اندھیرے کا انتخاب کرتا تھا۔ احتیاط کی جاتی تھی کہ کفار کی نظروں میں نہ آجائے لیکن بلالؓ کا ایمان تو سورج کی طرح روشن ہو چکا تھا۔ مکہ کے سنگریزوں تک کو معلوم ہو چکا تھا کہ بلال کی روح ایمان کے گلزار میں چہل قدمی کے لیے ان کے بدن میں رہ گئی ورنہ امیہ تو اپنی دانست میں انہیں مار ہی چکا تھا۔ اس لیے ابوبکرؓ انہیں دن کی روشنی میں لے کر نکلے۔ گھروں کی کھڑکیاں ایک مرتبہ پھر کھلیں اور بند ہو

گئیں۔ یہ وہی بلال تھے جن کے گلے میں رسی ڈال کر لڑکے کھینچتے پھر رہے تھے، اب اس شان سے جا رہے تھے کہ رسول اللہ کے دوست ابوبکر صدیقؓ ان کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ہوئے چل رہے تھے۔ بلال ابھی اچھی طرح چل نہیں سکتے تھے اس لیے ابوبکرؓ بھی آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہے تھے۔

بارگاہ نبوت میں پہنچے تو ہوش و خرد ایک مرتبہ پھر رخصت ہو گئے۔ وہی پاکیزہ چہرہ، دلنواز تبسم سامنے تھا جس کے عشق میں دیکھتے انگاروں کو ٹھنڈا کیا تھا، رسی کے پھندے کو گلے کا ہار سمجھا تھا۔ اسلام میں کسی انسان کی پرستش جائز نہیں ورنہ ان کا جی تو یہی چاہتا تھا کہ اس ہستی کو حرم بنا کر طواف کیا جائے۔ ایسی رقت طاری ہوئی کہ حضور کے قدموں میں بیٹھ کر دریا بہا دیے۔ آنکھیں تھیں کہ اٹھتی نہ تھیں، دل تھا کہ دھڑکنا بھول گیا تھا۔ شادمانی کے انہی لمحوں کے لیے جدائی کے اتنے دن گزارے تھے۔ اب منزل سامنے آئی تو بیعت کے لیے ہاتھ بڑھ گئے۔ کلمہ تو انہوں نے پہلے ہی پڑھ لیا تھا لیکن دست مبارک پر بیعت حاصل کرنے کی بات ہی اور تھی۔

حضورؐ نے ان کے دونوں کندھے پکڑے اور انہیں اپنے ساتھ اس چٹائی پر بٹھالیا جس پر آپؐ تشریف فرما تھے۔ بلالؓ نے ہچکچا کر ان کی طرف دیکھا اور آنکھیں ایک مرتبہ پھر برسنے لگیں۔ حضورؐ ان کی اس کیفیت کو سمجھ رہے تھے۔ بلالؓ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ”دیکھو بلال! میں جس دین کا داعی ہوں اس میں کوئی ادنیٰ کوئی اعلیٰ نہیں۔ قبیلے صرف اس لیے بنائے گئے ہیں کہ ہم پہچانے جائیں اس لیے نہیں کہ کوئی قبیلہ اپنے آپ کو اعلیٰ کہے دوسرے کو ادنیٰ سمجھے۔ اسلام کی راہ میں کون کئی جان شاری دکھاتا ہے اعلیٰ تو وہ ہے۔ تم سے زیادہ اذیت کس نے جھیلی ہوگی۔ کیا اب بھی تمہیں کوئی ادنیٰ کہے گا۔ ایک اللہ کو مانتے رہو، اسی کی عبادت کرو اور دیکھو ابھی مسلمانوں کی مشکلیں دور نہیں ہوئیں۔ ثابت قدم رہنا۔“ یہ گویا وہ الفاظ تھے جو آپؐ بیعت کے وقت فرمایا کرتے تھے۔

اس کے بعد آپؐ حضرت ابوبکرؓ سے مخاطب ہوئے۔ ”بلالؓ کا کوئی گھر نہیں ہے۔ اسے اپنے گھر لے جاؤ۔ مہمان کی طرح رکھو اس کی تعلیم و تربیت تمہاری ذمہ داری ہے۔ اسے لکھنا سکھاؤ اور اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرو۔“

ابھی بہار سے لطف اندوز ہونے نہ پائے تھے کہ

خزاں کی نوید آگئی۔ بلالؓ تو یہ سوچ کر آئے تھے کہ اب ہمیشہ کے لیے حضور کے قدموں میں رہنے کا موقع ملے گا۔ آنکھیں ایک ہی چہرے پر جمی رہیں گی۔ دل ایک ہی نام پر دھڑکے گا۔ سماعت میں ایک ہی آواز رس گھولتی رہے گی۔ اب فراق کے لیے کہا جا رہا تھا۔ انکار کی مجال نہیں تھی۔ جھومتے ہوئے آئے تھے، لڑکھڑاتے ہوئے اٹھے۔ ایک مرتبہ پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔

”بلالؓ تم ہمیشہ کے لیے حضور سے جدا نہیں ہو رہے ہو۔ ملاقات تو ہوتی رہے گی۔ بس تمہیں رہنا میرے ساتھ ہے۔“

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں حضور کے قدموں کی خاک بنارہوں۔“

”ہم سب کی یہی آرزو ہے لیکن ابھی ہمارا الگ الگ رہنا ہی ضروری ہے۔“

دھوپ دے قدموں مکہ کی پہاڑیوں پر چڑھ کر کسی طرف اتر گئی تھی اور اپنے پیچھے ہلکا اندھیرا چھوڑ گئی تھی جو کچھ دیر بعد گہرے اندھیرے میں تبدیل ہو گیا۔

☆.....☆

بلالؓ کا ایمان لانا قریش کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ بہت اہم آدمی تھے بلکہ اس لیے کہ وہ غلام تھے۔ مکہ کا معاشرہ اپنی آب و تاب اسی طبقہ ازل کے کندھے پر کھڑے ہو کر قائم رکھ سکتا تھا۔ اگر یہ طبقہ ان سے نوٹ کر محمدؐ کے ساتھ مل جاتا تو ان کا دبدبہ ہی ختم ہو جاتا۔ پھر وہ کس بر حکومت کرتے؟

ابو جہل کے گھر میں کئی مٹینکیں ہوئیں، ان سب میں بلالؓ کے نام کی گونج سنائی دی اور یہ طے ہوا کہ محمدؐ کی سرگرمیاں سختی سے چل دی جائیں۔ اس سے پہلے کہ محمدؐ کا دین اس نچلے طبقے میں نفوذ کر جائے محمدؐ کو بتا دیا جائے کہ مکہ میں ان کی سرپرستی کرنے والا کوئی نہیں۔

”کیا ابوطالب بھی نہیں؟“ ایک طرف سے آواز آئی۔

”ابوطالب ہی تو رکاوٹ بنے ہوئے ہیں ورنہ ہم محمدؐ کو قتل کر چکے ہوتے۔“ ولید بن مغیرہ کی آواز ابھری۔

”نہیں ابوطالب سے بات کرنی ہوگی۔“

”اسی وقت ایک وفد ترتیب دیا گیا جو ابوطالب کے پاس پہنچا اور اپنا غصہ ابوطالب کے سامنے رکھ دیا۔ اس وفد کی سربراہی ولید بن مغیرہ کر رہا تھا۔“

”ابوطالب آپ ہمارے رہنما ہیں اور ہم میں سب سے معزز بھی۔ آپ سے پوشیدہ نہیں کہ آپ کا بھتیجا ہمارے مذہب کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہے۔ آپ محمدؐ کو ان سرگرمیوں سے باز رکھیں یا ہمیں اجازت دیں کہ ہم جس طرح چاہیں اس سے نمٹ لیں۔“

حضرت ابوطالب نے ان لوگوں کی گفتگو کو بہ غور سنا۔ ان سے وعدہ کیا کہ وہ اس معاملے کی تحقیق کریں گے۔ یہ وفد مطمئن تو کیا ہوتا، حجت پوری کرنے اور وقت دینے کے لیے لوٹ آیا۔ چند ہفتوں بعد یہ وفد پھر حضرت ابوطالب کے گھر پہنچا لیکن ناکام لوٹ آیا ابوطالب اپنے بھتیجے کی حمایت سے ہاتھ اٹھانے کو تیار نہیں تھے۔

ابو جہل کے گھر سٹنگ پھر جمی۔

”ہم نے مصلحت کا ہر دروازہ کھٹکھٹا کے دیکھ لیا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ محمدؐ کو قتل کر دیا جائے۔“ ابو جہل نے ترنگ میں آکر کہا۔

”نہیں یہ جذباتی فیصلہ ہوگا۔“ ولید کی آواز گونجی۔

”ہماری اس حرکت کو بنو ہاشم بھی معاف نہیں کریں گے۔ پھر کسی کے تن پر سرباقتی نہیں رہے گا۔“

”اب کوئی مصلحت نہیں سنی جائے گی۔“

”چال ایسی چلو کہ سانپ بھی مر جائے اور لامٹھی بھی نہ ٹوٹے۔“ ولید نے تجویز پیش کی۔ ”محمدؐ پر اور اس کے پیروکاروں پر عرصہ حیات تنگ کر دو اس قدر تنگ کر دو کہ انہیں ہمارے سامنے سر جھکائے بغیر چارہ نظر نہ آئے۔“

اس دن کے بعد سے گئے چنے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔ سازشیوں نے مکہ کے آوارہ لوگوں کو نبی کریمؐ کے پیچھے لگا دیا۔ آپؐ جس طرف سے گزرتے غنڈے آپؐ پر مٹی پھینکتے اور آپؐ کے راستے میں کانٹے بچھاتے، غلاطت بھینکتے۔

اس مہم میں سب سے زیادہ نقصان ان عام مسلمانوں کو اٹھانا پڑ رہا تھا جو چپکے چپکے آپؐ پر ایمان لے آئے تھے اور ان کا تعلق اعلیٰ خاندانوں سے نہیں تھا۔ انہیں ناقابل بیان ایذاؤں سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ دشمنوں کا خیال تھا کہ جب آپؐ کے سامنے آپؐ کا ساتھ چھوڑ جائیں گے تو محمدؐ خود بخود اکیلے رہ جائیں گے۔

کانٹوں بھرے دن گزرتے رہے، خاموشی سے مسلمانوں کی تعداد بھی بڑھتی رہی۔

نبوت کا دعویٰ کیے چھ سال گزر گئے تھے پھر بھی

مسلمانوں کی تعداد سو ڈیڑھ سو سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ یہ تعداد بھی دشمنوں کی آنکھوں میں کھٹک رہی تھی۔ اب تشدد کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ قتل تک نوبت پہنچنے لگی کوئی دن نہ گزرتا تھا کہ مسلمانوں پر کوئی نہ کوئی ظلم نہ ہوتا ہو۔ جب کئی مسلمانوں کی شہادتیں ہو چکیں خطرے کی تلوار برہنہ ہو کر سامنے آگئی تو عملی قدم اٹھانے کی ضرورت پیش آئی۔

اس رات حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ حضرت بلالؓ کا شانہ نبوی میں حاضر تھے۔ حضرت علیؓ بھی موجود تھے۔ چند دوسرے مسلمان بھی تشریف فرما تھے کہ حضورؐ کی زبان مبارک سے ارشاد ہوا۔ ”بلال! تم دروازے کو اچھی طرح بند کر لو اور دروازے کے ساتھ کھڑے رہو۔ ایسا نہ ہو کسی دشمن کو خبر ہو جائے اور وہ بری نیت سے داخل ہونے کی کوشش کرے۔“ حضورؐ نے اپنا نیزہ ان کے ہاتھ میں دے دیا۔ یہ ایسا اعزاز تھا کہ بلال نے دل ہی دل میں اپنی نظر خود اتاری۔ شیخ رسولؐ کے پروانوں نے اٹھ اٹھ کر بلالؓ کو مبارک بادیں دیں۔ بلالؓ نے نیزہ سنبھالا اور دروازے سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ اللہ اللہ میرا یہ مرتبہ کہ میں اللہ کے رسولؐ کے متوالوں کا محافظ ہوں۔ یہ سوچتے ہی نیزے پر بلالؓ کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

اس اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ جو لوگ کمزور ہیں اور جنہیں کے میں کسی کی پشت پناہی حاصل نہیں، وہ ہجرت کر جائیں۔ صرف وہ رہ جائیں جنہیں خون خرابے کے ڈر سے کوئی ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

ایک مقررہ رات کو تقریباً تراسی مرد اور عورتیں حضرت عبداللہ ابن جعفر طیار کی سربراہی میں صحرا میں نکل گئے۔ خبر پھیلنے ہی گھڑ سواروں کا ایک دستہ ان کے تعاقب میں روانہ ہوا جس کی قیادت ولید کر رہا تھا۔ اس دستے نے بہت ریت اڑائی لیکن مسلمانوں کا قافلہ جشہ پہنچ گیا جہاں کا بادشاہ نجاشی عیسائی تھا اور مسلمانوں کے لیے نرم جذبات رکھتا تھا۔

اپنا شکار یوں ہاتھوں سے نکلنا دیکھ کر ابوجہل اور دوسرے سرداران مکہ کے تن بدن شکست کی آگ میں جل اٹھے۔ ابوجہل اٹھا اور عمرو بن العاص کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”کے میں تمہاری خطابت کی دھوم ہے۔ تم جھوٹ کو سچ ثابت کرتے ہو۔ اپنے جو ہر دکھاؤ اور جشہ جا کر نجاشی

کے دربار میں پہنچو اور اس سے کہو ہمارے شہر کے چند نوجوانوں نے اپنا مذہب ایجاد کر لیا ہے اور آپ کے ملک میں پناہ لے لی ہے۔ یہ اگر یہاں رہے تو آپ کے لوگوں کو بھی خراب کریں گے۔ یہ ہمارے مجرم ہیں انہیں ہمارے حوالے کرو۔“

عمرو بن العاص کے لیے یہ کام کون سا مشکل تھا۔ اس نے ہامی بھری۔ نجاشی کو قائل کرنے کی کوشش بھی کی لیکن اس کی خطابت کام نہ آئی لیکن بادشاہ نے انہیں صاف جواب دے دیا۔ ”ہم سونے کے پہاڑ کے عوض بھی ان لوگوں کو تمہارے حوالے نہیں کریں گے۔“

عمرو بن العاص واپس آگئے۔ افسوس کہ جو بات عیسائی بادشاہ کی سمجھ میں آگئی اہل مکہ اس سے غافل ہی رہے۔ اس کوشش میں ناکامی کے بعد تو مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ ٹوٹنے لگے۔ وہ ہستی جو صبر مجسم تھی، یہ دعا کرنے لگی کہ اللہ کسی ایسے شخص کو اسلام لانے کی توفیق دے جو مسلمانوں کے لیے سہارا بن سکے، جو کفار کی چالوں کو اپنی طاقت سے توڑ دے۔

☆.....☆

اس دن ابوجہل اپنے چند اوباش دوستوں کے ساتھ کوہ صفا کے دامن میں بیٹھا تھا ام الخثالث اس کے دماغ پر جزمی ہوئی تھی۔ ان دنوں زیر بحث ایک ہی مسئلہ تھا اور وہ تھی محمدؐ کی ذات مبارک اور ان کا پیغام۔ اس وقت بھی یہی باتیں ہو رہی تھیں۔ ابوجہل اپنی ترنگ میں محمدؐ کے بارے میں ہرزہ سرائی کر رہا تھا کہ امیر حمزہؓ کا اس طرف سے گزر ہوا۔ آپ گھوڑے پر سوار تھے اور کسی شکار سے واپس آرہے تھے۔ ابوجہل کی زبان سے چند فحش کلمات ادا ہوئے اور امیر حمزہؓ کے کانوں تک پہنچ گئے۔ آپ کا گھوڑا آگے نکل چکا تھا۔ کچھ دور جا کر آپ نے ابوجہل کے تمبرے پر غور کیا۔ حضرت محمدؐ آپ کے پیچھے تھے۔ اسی وقت ہونے والی بات کہ ابو نے جوش مارا۔ آپ اسلام نہیں لائے تھے لیکن پیچھے کے بارے میں ایسے الفاظ برداشت نہ کر سکے۔ اپنے گھوڑے کو پھرایا اور ابوجہل کے سامنے جا کر پہاڑ کی طرح جم گئے۔

”تم کیا کہہ رہے تھے محمدؐ کے بارے میں۔ ذرا وہ الفاظ پھر تو دہراؤ۔“

وہ بے وقوف نشے کی ترنگ میں امیر حمزہؓ کے تیور پہچان ہی نہ سکا بلکہ النابیہ سمجھا کہ امیر حمزہؓ وہ الفاظ دوبارہ سننا

چاہتے ہیں۔ شاید خوش ہوں گے۔ اس نے وہی الفاظ من و عن دہرا دیئے۔ کمان حضرت امیر حمزہؓ کی پشت پر تھی۔ آپ نے کمان اتاری اور ابوجہل کی پیشانی پر پوری قوت سے دے ماری۔ اس کا سفید چہرہ سرخ ہو گیا۔ آپ گھوڑے سے کود پڑے۔

”تو کیا سمجھ رہا تھا۔ محمدؐ لا وارث ہے؟ اس کا چچا امیر حمزہؓ مر گیا ہے۔ آج سے جو مذہب میرے پیچھے کا وہ میرا۔ اس کا اللہ میرا اللہ۔“

ابوجہل کی کیا جرأت تھی کہ ان کے مقابلے پر آتا۔ زمین پر لیٹے لیٹے ان کا منہ تکتا رہا۔ امیر حمزہؓ نے رکاب میں پاؤں ڈالا اور گھوڑا آگے بڑھ گیا۔

”بلال، جا کر دیکھو دروازے پر کون ہے۔“ حضورؐ کرم نے بلالؓ سے جو ان دنوں آپ کی درباری پر متعین تھے۔

”دروازے پر امیر حمزہؓ کھڑے ہیں۔ خدا خیر کرے۔“ بلالؓ نے واپس آ کر کہا۔

”دروازہ کھول دو اور احترام سے اندر لاؤ۔ وہ میرے چچا ہیں اور آپ ان کے لیے اپنی جگہ چھوڑ کر کھڑے ہو گئے امیر حمزہؓ اندر آئے تو غصہ ابھی فرو نہیں ہوا تھا چہرے سے نرمی نہیں تھی نظر آ رہی تھی۔

”آخر میری طرف سے آپ کا دل کب صاف ہو گا۔“ حضورؐ نے فرمایا۔

”وہ وقت آ گیا ہے۔ میں ایمان لانے کی غرض سے آیا ہوں۔ جو مذہب میرے پیچھے کا وہی میرا۔“

”یہ مذہب میرا گھڑا ہوا نہیں۔“

”آپ کا اللہ میرا اللہ۔“

”اللہ تو سب کا ہے۔ بات یہ ہے کہ آپ مجھے اللہ کا رسول تسلیم کریں۔“

”میں نے تسلیم کیا۔“

”تو پھر صدق دل سے کلمہ پڑھیے۔“

انہوں نے بہ آواز بلند کلمہ پڑھا اور حضورؐ نے نعرہ تکبیر بلند کیا۔ امیر حمزہؓ نے قریب کھڑے بلالؓ کو گلے سے لگا لیا۔

یہ اس بات کا اظہار تھا کہ انہوں نے ادنیٰ اور اعلیٰ کا تصور مٹا دیا ہے۔

”بلال، مجھ سے کوتاہی ہوئی۔ تم پر اتنے ظلم ہوتے رہے اور میں خاموش رہا لیکن خدا گواہ ہے میں کسی سازش میں شریک نہیں رہا۔ بس اپنی دنیا میں مست تھا۔“

حضرت امیر حمزہؓ کو ایمان لائے ابھی تین دن ہوئے تھے کہ حضرت عمرؓ بھی ایمان لے آئے۔

یہ دو مضبوط حضرات حلقہ اسلام میں داخل ہوئے تو مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ دوسری جانب ابوجہل، ابولہب، امیہ اور بہت سے بااثر دشمن جو نہ جانے کیا کیا منصوبہ بنائے بیٹھے تھے۔ اب ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ امیر حمزہؓ اپنی نجابت کی وجہ سے اور حضرت عمرؓ اپنی تند خوئی کی بنا پر ان کفار کے لیے تر نوالہ ثابت نہیں ہو سکتے تھے۔ بہت دن تک مکہ کے بازاروں میں یہی دونوں موضوع بحث بنے رہے۔

مسلمانوں کی صفوں میں اطمینان کی نوید سنائی دے رہی تھی۔ بنو قیس کی پہاڑی کے دامن میں ایک صحابہ ارقم کا مکان تھا حضورؐ نے اس مکان میں ایک مسجد بھی قائم کر لی تھی۔ نماز کے اوقات میں خاص طور پر مسلمان یہاں جمع ہو جاتے تھے۔ حضور اکرمؐ کبھی بھی یہاں عارضی سکونت اختیار کر لیا کرتے تھے۔ امیر حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے قبول اسلام کے وقت بھی آپؐ یہیں قیام پذیر تھے۔ بلالؓ حضور اکرمؐ کی قربت کے مزے بدستور لوٹ رہے۔ سودا سلف لانے کی ذمہ داری بھی آپ کی تھی۔ جب مسلمان نماز میں مشغول ہوتے تو آپؐ نیزہ ہاتھ میں تھام کر پہرہ دیتے رہتے۔

حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کے بعد مسلمان قدرے بے فکر ہو گئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے مکان کے سامنے میدان میں مسجد تعمیر کر لی تھی جہاں چند بااثر مسلمان نماز پڑھنے کی ہمت کر لیا کرتے تھے۔

کچھ دنوں کے لیے طوفان قہم گیا تھا۔ سر راہ کوئی مسلمان نظر آ جاتا تو اہل مکہ نفرت سے منہ پھیر لیتے لیکن کہتے کچھ نہیں تھے سرداران مکہ کسی موقع کی تلاش میں تھے اور یہ موقع انہیں بہت جلد مل گیا۔ حضرت ابوطالب کا انتقال ہو گیا۔ حضورؐ کی محبت کا مجسم نمونہ اور مسلمانوں کا سہارا اٹھ گیا۔ ان کے انتقال کے ساتھ ہی کفار مکہ کھل کر سامنے آ گئے۔ وہ طوفان جو خاموش تھا مکہ کی گلیوں میں سانس لینے لگا۔

اس برائی میں ایک برائی کا اور اضافہ ہو گیا۔ حضورؐ کا دشمن ابولہب خاندان بنو ہاشم کا سردار بن گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کفار مکہ برسر اقتدار آ گئے۔ ابولہب اور ابوجہل کے گٹھ جوڑنے نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ اب مسلمانوں کا مکہ میں زندگی گزارنا مشکل ہو گیا۔ رسول اکرمؐ خود جن سختیوں

علافی سے مشورہ

اس زمانے میں جب کہ راجا دہر اور رمل کے راجا میں لڑائی کی گھن رہی تھی، عرب کا ایک مشہور سردار محمد علافی جو بنی اسامہ کے قبیلے سے تھا۔ بنو امیہ سے بغاوت کر کے پانچ سو سرداروں کے ساتھ سندھ بھاگ آیا تھا اور راجا دہر کی حمایت میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ راجا دہر اپنے وزیر کے مشورے کے مطابق فوراً اس کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ میرا جو سلوک تمہارے ساتھ اب تک رہا ہے اور میں جس قدر تم کو عزیز رکھتا ہوں، میرا خیال ہے کہ اسے تم بھی محسوس کرتے ہو گے، آج رمل کے راجا کے ہاتھوں ہمارا ملک خطرے میں ہے۔ تم مجھے مشورہ دو کہ اس موقع پر مجھے کیا کرنا چاہیے؟ محمد علافی نے دہر کو تشفی دیتے ہوئے کہا کہ آپ بالکل پریشان نہ ہوئے، میں ایسی تدبیر کروں گا کہ آپ کا دشمن عمر بھر یاد رکھے گا۔ پھر اس نے کہا کہ پہلے تو آپ مجھے کچھ فوج دیجیے تاکہ میں اس کو ساتھ لے کر دشمن کا حال معلوم کر دوں۔ دوسری تدبیر یہ اختیار کیجیے کہ یہاں سے تین میل کے فاصلے پر خندق کھود کر وہاں ٹھہریں۔ راجا دہر نے محمد علافی کو پانچ سو سوار دیے محمد علافی نے پانچ سو سواروں کو لے کر ایک رات جب رمل کی فوجیں بے خبر سو رہی تھیں۔ شب خون مارا اور راجا تک اس زور سے حملہ کیا کہ رمل کی فوجیں گھبرا کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ اس کے علاوہ ہزاروں آدمی گرفتار ہوئے اور ہزاروں قتل ہوئے۔ دشمنوں کا بے شمار ساز و سامان ان کو ملا اور اس جنگ میں پچاس ہاتھی بھی ان کے ہاتھ لگے۔

مرسلہ: نصیر الدین، حیدر آباد

مکی مسجد کے کچے فرش پر کئی صحابہ کرام سر جوڑے بیٹھے تھے۔ آنحضرت بھی تشریف فرما تھے۔ حضرت علیؓ، حضرت ابو بکرؓ اور بلالؓ بھی۔ کسی نے تجویز دی۔ ”نماز کے وقت چھت پر جھنڈا لہرا دیا جائے۔“

”یہ جھنڈا سوتے ہوئے لوگوں کو کیسے جگائے گا۔“

”گھنٹیاں؟“

”یہ تو کلیساؤں میں ہوتی ہیں۔“

”نقارہ بجا دیا کریں۔“

جائے گی میں وہاں قیام کروں گا۔“
اونٹنی چلتی رہی۔ لوگ بھی اس کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ اب بنو نجار کا محلہ آگیا جو آپ کے ننھیال سے تھے۔ اس اونٹنی نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کے ننھے حرکت میں آئے اور وہ ایک جگہ بیٹھ گئی۔

لڑکیوں نے دف پر گانا شروع کر دیا۔
”ہم بنو نجار کی لڑکیاں ہیں۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ محمدؐ ہمارے بڑوسی ہیں۔“

”یہ جگہ کس کی ملکیت ہے۔“ حضورؐ نے فرمایا۔
”یہ دو یتیم بچوں پہل اور سہیل کی ہے۔“ ایک مدنی نے بتایا۔

”ان بچوں کو بلاؤ تاکہ میں ان سے یہ زمین خرید کر ایک مسجد تعمیر کراؤں۔“

ان بچوں کو بلایا گیا۔ ان دونوں نے بلا قیمت یہ جگہ آپ کو نذر کرنی چاہی لیکن آپ بہ ضرر رہے اور دس دینار دے کر یہ جگہ خرید لی۔

”میں یہاں رہوں گا۔ یہیں میری مسجد بنے گی اور یہیں میں دفن ہوں گا۔“ حضورؐ نے فرمایا۔

”آپ تو یہ فرما رہے تھے کہ ابو ایوب بازی لے گئے۔ انہوں نے اونٹنی سے حضورؐ کا سامان اتارا اور اپنے گھر لے گئے۔ حضورؐ نے انہی کے مکان پر عارضی قیام فرمایا۔

دوسرے دن سے اس احاطے میں مسجد کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔ مکہ کے قیام کے دنوں میں مسلمانوں کی کوئی مسجد نہیں تھی۔ آخری دنوں میں ابو بکر صدیقؓ نے ایک مسجد اپنے مکان کے سامنے بنوائی تھی۔

یہ مسلمانوں کی پہلی باقاعدہ مسجد تھی۔ کھجور کے تنوں کے ستون تھے جس پر کھجور کی شاخوں کی چھت ڈالی گئی تھی، جائے امامت کے سامنے دونوں طرف پتھر چن دیئے گئے تھے۔ مٹی سے مسجد کی چار دیواری بنادی گئی تھی۔

اس مسجد میں پہلی نماز ہوئی تو مہاجرین مکہ کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ ان کے وہ سب زخم تازہ ہو گئے جو مکہ میں ان کی رگوں پر لگے تھے۔ کیا کیف تھا کیا لذت تھی اس زبان میں۔

چند دنوں کے بعد شدت سے محسوس کیا جانے لگا کہ اکثر نمازیوں کو یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ مسجد میں جماعت کھڑی ہو گئی ہے۔ نمازیوں کو مسجد میں بلانے کا کوئی انتظام ہونا چاہیے۔

سرگوشیوں میں باتیں ہو رہی تھیں۔ دشمن سے غمنا آسان نہیں تھا۔ سازش کا مقابلہ تنہا سے نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مکہ سے نکلنا بھی آسان نہیں تھا۔ قدم قدم پر نگرانی کی جارہی تھی۔ رہے سہے سہارے بھی مدینہ جا چکے تھے۔ اس کشمکش میں دن بیت گیا۔ ان امانتوں کا خیال آیا جو لوگوں نے آپ کے پاس رکھوائی تھیں۔ انہیں کیسے واپس کیا جائے؟ اگر خود واپس کرتے ہیں تو یہ راز افشا ہو جائے گا کہ آپ مکہ چھوڑ رہے ہیں، آپ نے یہ امانتیں حضرت علیؓ کے سپرد کیں کہ ان کی روانگی کے بعد لوگوں کو واپس کر دیں اور خود بھی مدینہ چلے آئیں۔

رات ہوئی تو آپؐ اور حضرت ابو بکرؓ مکہ سے نکل گئے۔ نگرانی اب بھی ہو رہی تھی لیکن اللہ نے مشرکوں کی بیباکی سلب کر لی تھی کہ دیکھ ہی نہ سکے۔ ہوش تو اس وقت آیا جب آپؐ مکہ سے بہت دور جا چکے تھے۔ تعاقب کرنے والوں نے تعاقب کیا لیکن بے سود۔

☆.....☆

مدینہ میں آپؐ کا انتظار ہو رہا تھا۔ یہ خبریں پہنچ چکی تھیں کہ اللہ کے رسولؐ مکہ سے ہجرت کر چکے ہیں۔ ایک روز ایک شخص اپنی چھت پر چڑھا ہوا تھا کہ اس نے دور صحرائیں دو سوار دیکھے۔ یہ اونٹ، اونٹنی سوار اتنی دور تھے کہ شناخت ممکن نہیں تھی لیکن کسی قافلے کے بغیر صرف دو سوار! یہ ضرور محمدؐ ہیں جو اپنے کسی ساتھی کے ساتھ تشریف لارہے ہیں۔ وہ چیخا ہوا جھٹ سے اتر آئے، محمدؐ آگئے، اللہ کے رسولؐ آگئے، ہماری خوش نصیبی کا سامان آپؐ پہنچا۔ یہ سننا تھا کہ کسی نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تو نے ٹھیک طرح دیکھا بھی ہے۔ شہر کا شہر اللہ اکبر کے گھرے لگا تا صحرائی طرف بھاگ گئے لگا۔ ابھی آپؐ صحرا میں تھے کہ جشن پھا ہو گیا۔ ایک ہجوم کے ساتھ آپؐ مدینہ میں داخل ہوئے۔ بچیاں استقبالی گیت گارہی تھیں۔

ان پہاڑوں سے جو ہیں سوائے جنوب چودھویں کا چاند ہے ہم پر چڑھا
کیا عمدہ دین اور تعلیم ہے
شکر واجب ہے ہمیں اللہ کا

مدینے میں داخل ہوتے ہی چاروں طرف سے شور مچنے لگا۔ ہر شخص کی خواہش تھی کہ آپؐ اس کے گھر میں قیام کریں۔ اسے میزبانی کا شرف بخشیں لیکن کسی ایک گھر قیام کرنے سے سب کی دل آزاری ہوئی۔ آپؐ نے یہ فیصلہ اس اونٹنی پر چھوڑ دیا جس پر آپؐ سوار تھے۔ ”یہ جہاں رک

سے دو چار ہو رہے تھے اس سے پہلے کبھی نہ ہوئے تھے۔ عام مسلمانوں کا تو جینا دو بھر ہو گیا تھا اور اس دن تو ساری امیدیں ٹوٹ گئیں، سارے خواب بکھر گئے جب رسول اکرمؐ کی تبلیغ پر پابندی لگا دی گئی۔ اب ہجرت کر کے کسی اور شہر میں جانیسے کے سوا چارہ نہیں تھا۔

☆.....☆

مدینے کے کچھ لوگ اسلام لے آئے تھے۔ ان کی طرف سے برابر پیغامات آرہے تھے کہ آپؐ اپنے ساتھیوں سمیت ان کی بستیوں کی طرف ہجرت کریں اور ان کے ساتھ مقام فرمائیں۔ آپؐ کچھ دنوں تو اس دعوت کو نظر انداز کرتے رہے لیکن جب خطرات بہت بڑھ گئے تو آپؐ نے ان کی دعوت قبول کر لی۔ حکمت عملی یہ طے ہوئی کہ لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں رات کے وقت صحرائیں نکل جائیں اور الگ الگ راستوں سے ہوتے ہوئے مدینہ پہنچ جائیں۔ حضورؐ نے بلالؓ کو بھی ایک ٹولی کا قائد بنادیا۔ چھ مرد، دو عورتیں اور تین بچے ان کے ساتھ تھے۔ امیہ کا سیاہ قام سابق غلام اب انسانوں کا ایک ذمہ دار قائد تھا۔

بلالؓ کو اتنی بڑی ذمہ داری پہلی مرتبہ ملی تھی۔ وہ خوشی سے جمومتے ہوئے صحرائیں اتر گئے۔

گرمیوں کے دن تھے۔ یہ وہ دن ہوتے ہیں جب صحرائیں طوفان اٹھتے ہیں۔ ریت کے سمندر قافلوں کو نکلنے کے لیے پھرتے رہتے ہیں۔ اسی صحرائیں انہیں کم سے کم بارہ دن تک سفر کرنا تھا۔ دل دھڑکتا رہا سفر کتنا ہلکا۔ یہ معجزہ ہی تھا کہ مطلع صاف رہا، رات کے وقت ستارے پوری آب و تاب سے چمکتے رہے۔ راستے کا صحیح تعین ہوتا رہا۔ تمام قافلے بخیر و عافیت مدینہ پہنچ گئے۔

قریش اس ہجرت سے بہت خوش تھے۔ وہ اسے اپنی فتح سمجھ رہے تھے لیکن یہ حقیقت اب بھی ان کے لیے سوہان روح بنی ہوئی تھی کہ محمدؐ اور ابو بکرؓ انہی تک ان کے شہر میں موجود ہیں۔ ادھر مدینہ پہنچنے والے ہر مسلمان پریشان تھے کہ کفار کا سارا اعتاد تو انہی دونوں سے ہے۔ نہ جانے ان پر کیا بیت رہی ہوگی۔

اندیشے سرا بھار رہے تھے۔ خطرے ہو لے بن کر ادھر ادھر منڈلاتے پھر رہے تھے۔ قریش نے بالآخر پختہ ارادہ کر لیا کہ محمدؐ کو قتل کر دیا جائے۔

یہ نہایت نازک وقت تھا۔ سازش کا علم ہو چکا تھا۔ آنحضرتؐ، حضرت ابو بکرؓ کے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔

ماہنامہ سرگزشت

36

جولائی 2018ء

جولائی 2018ء

37

ماہنامہ سرگزشت

”نقارہ تو جنگ اور خوف کی یاد دلاتا ہے۔ ہمارا دین امن و سلامتی کا دین ہے۔“
یہ بحث ہوئی رہی لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچی اور سب لوگ گھروں کو رخصت ہو گئے۔

حضورؐ نے اذان کے الفاظ بتا کر کہا کہ اسے بلند جگہ پر کھڑے ہو کر پکارتا ہے۔ اب یہ بحث ہونے لگی کہ یہ الفاظ ادا کون کرے گا یعنی کون اذان دے گا۔ اس میں بھی کئی آراء تھیں۔ کسی نو جوان کی آواز میں یا بزرگ کی آواز میں۔ ایک آدمی اذان دے گا یا کئی لوگ مل کر پکاریں گے۔
حضورؐ نے تمام لوگوں کو غور سے سنا اور پھر اپنے فیصلے کے لیے لب کشا ہوئے۔ کچھ دیر بلالؓ کی طرف غور سے دیکھتے رہے پھر فرمایا۔ ”بلال تم اذان دو گے۔ تمہاری آواز بلند بھی ہے اور شیریں بھی۔“

حضورؐ کی زبان سے ان الفاظ کا ادا ہونا تھا کہ جتنی آنکھیں اس وقت موجود تھیں بلالؓ کی نظر اتارنے لگیں۔ خود بلالؓ کا عالم یہ تھا کہ خوشی سے غشی طاری ہو رہی تھی۔ الفاظ کا سحر ایسا تھا کہ کچھ اور سننے کی تاب نہیں تھی۔ پہلی مسجد پہلی اذان اور حبشی غلام! بلالؓ بہت دن سے رونا بھول گئے تھے۔ اتنی سعادتیں ملی تھیں کہ شکر ہی شکر ادا ہو رہا تھا لیکن اس وقت آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آنسو خوشی کے تھے مگر تھے تو آنسو۔ اسلام نے میرے دامن میں کیا کچھ ڈال دیا ہے۔ میرے پاس کیا ہے جو میں اسلام کو دوں۔ مجھ فقیر پر بادشاہت کا تاج سجا دیا گیا ہے۔ اللہ اللہ یہ سعادت۔ میں نمازیوں کو نماز کے لیے بلایا کروں گا۔

”عبداللہ! تم بلالؓ کو الفاظ یاد کرا دو۔ کل فجر کی نماز میں پہلی اذان دی جائے گی۔ جب تک بلالؓ کو الفاظ یاد بھی ہو جائیں گے۔“

یہ الفاظ کس لحن میں ادا کیے جائیں گے یہ طے کرنا بلالؓ کا کام تھا۔ فجر سے ظہر تک بہت وقت تھا اور ابھی رات بھی پڑی تھی بلالؓ نے عبداللہ بن زید کی مدد سے الفاظ ازبر کیے اور مدینے سے باہر نکل گئے۔ ان الفاظ کو طرح طرح سے ادا کرتے رہے۔ صحرا کے سنائے میں ان کی آواز گونج رہی تھی۔ اللہ کے رسولؐ کو شاید یہ لحن پسند آئے شاید یہ پسند آئے نہیں اس سے بہتر تو یہ ہوگا۔ یوں کہا جائے تو اور بہتر ہو گا۔ ان کا ذہن انہی لفظوں میں الجھا ہوا تھا۔ ”یا اللہ! مجھے لحن داؤدی عطا کر۔“

”یا اللہ! ایسا لحن دے کہ میرے محبوب کو پسند

آجائے۔“

”یا اللہ ایسی شیرینی عطا کر کہ نمازیوں کی تعداد بڑھتی رہے۔“

وہ رات انہی خیالوں، خوشی کے انہی پنڈولوں میں جھولتے ہوئے گزر گئی۔ نہ وہ سوئے نہ آنکھیں سونیں ابھی پوری رات گزری نہیں تھی کہ بلالؓ مسجد میں پہنچ گئے۔ کچھ دیر میں حضورؐ اور چند لوگ اور بھی آ گئے۔

اذان کی تیاریاں کی جا رہی تھیں کہ اچانک انہیں خیال آیا کس بلند مقام پر کھڑے ہو کر اذان دی جائے۔ مسجد کی چھت کجھور کی شاخوں سے بنائی گئی تھی اس پر چڑھنا نہیں جاسکتا تھا۔

”جاؤ اس چھت پر چڑھ جاؤ اور وہاں سے لوگوں کو نماز کے لیے بلاؤ۔“ حضورؐ نے ایک مکان کی طرف اشارہ کیا۔

حضرت بلالؓ کسی نہ کسی طرح اس چھت پر چڑھ گئے۔ پہلے ادھر ادھر دیکھا جیسے گھبرا رہے ہوں پھر فضا میں صدائے اللہ اکبر گونجی۔ وہی صدا جو آج بھی دن میں پانچ مرتبہ سنائی دیتی ہے۔

بلالؓ اذان دے کر مسجد میں آئے تو حضورؐ نے انہیں اپنے پاس بٹھالیا۔

”بلال تم نے میری مسجد مکمل کر دی۔“ حضورؐ نے فرمایا۔

☆.....☆

مدینہ طیبہ میں جب رسول اللہؐ کے زیر قیادت ایک اسلامی سلطنت قائم ہو گئی۔ قواعد و قوانین مرتب ہوئے۔ فوج، عدلیہ، درس و تدریس جیسے مسائل کو حل کر لیا گیا، قبائل کی آپس کی دشمنی آپ کے قدموں کی برکت سے ختم ہو گئی۔ آفتاب نبوت کی روشن کرنیں تمام دنیا کو منور کرنے لگیں جن کے متلاشی مدینہ منورہ دور دراز سے آنے لگے۔ یہ لوگ بطور مہمان آتے تھے ان کی میزبانی سلطنت کی ذمہ داری تھی۔

اس اہم خدمت کے لیے قرعہ فعال بلالؓ کے نام نکلا۔ اب تک اہل مدینہ یہ دیکھ رہے تھے کہ پانچوں وقت کی اذان بلالؓ کی آواز گونج رہی ہے۔ حضورؐ جب باہر نکلتے ہیں تو بلالؓ نیزہ اٹھا کر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ حضورؐ جب عیدین وغیرہ کے مواقع پر کھلی جگہ پر نماز پڑھتے ہیں تو بلالؓ اسی نیزے کو زمین پر گاڑ دیتے ہیں اور حضورؐ امامت فرماتے ہیں۔ اب وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ کاشانہ نبوت کے منتظم بھی

حضرت بلالؓ ہیں۔ ایک غلام کو اللہ کا نبی کن کن نعمتوں سے نوازا رہا ہے۔

رسول اللہؐ کے پاس جب کوئی مہمان آتا، آپ اسے بلالؓ کے پاس بھیج دیتے۔ ان مہمانوں میں بعض مفلوک الحال بھی ہوتے اور اکثر یہ بھی ہوتا کہ بیت المال خالی ہوتا۔ انہیں حجاب آتا کہ رسول اکرمؐ کے بھیجے ہوئے مہمان کو خالی ہاتھ لوٹائیں۔ حاجت مند کو بازار لے جاتے، ادھار پر اس کی ضرورت کی اشیاء دلاتے اور بعد میں جب بھی کہیں سے رقم آتی، یہ ادھار لوٹا دیتے۔

ایک مرتبہ رہن رکھنے کو ان کے پاس کچھ نہیں تھا اور وہ مشرک تاجرجس سے قرض لیا کرتے تھے کسی ضمانت کے بغیر قرض دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ حضرت بلالؓ کی غیرت نے یہ گوارا نہ کیا حضورؐ کے بھیجے ہوئے مہمانوں کو وہ خالی ہاتھ لوٹائیں۔ ضرورت شدید تھی اور رہن رکھنے کو کچھ نہیں تھا۔ ”کیا میں اپنے آپ کو تمہارے پاس رہن رکھ سکتا ہوں۔“

”کالی چڑی والے، میں تمہارا کیا کروں گا۔“
”اگر ایک ماہ کے اندر میں نے تمہارا قرض نہ لوٹا یا تو میری ذات پر تمہارا حق ہوگا۔ تم مجھ سے جو کام لینا چاہو لینا اگر کچھ نہیں تو بکریاں تو میں چراہی سکتا ہوں۔ میں اپنے تجربے سے تمہیں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ کسی بکری کو زیادہ دودھ دینے پر کیسے آمادہ کیا جاتا ہے۔“

اس مشرک نے ان کی ضمانت مان لی اور مطلوبہ قرض دے دیا۔ جو ضرورت تھی پوری ہو گئی۔ حضورؐ کی طرف سے تعریف بھی ہوئی کہ انہوں نے اپنی اہلیت سے یہ مشکل وقت ٹال دیا۔ حضورؐ کو تو یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ رقم کا بندوبست انہوں نے قرض لے کر کیا ہے۔ بھلا یہ کیا معلوم ہوتا کہ خود کو گرو دی رکھ کے قرض لیا ہے۔

اس مرتبہ یہ ہوا کہ کہیں سے کوئی ایسا ذریعہ نہیں نکلا کہ اس کا قرض اتارا جاسکتا۔ مدت ختم ہونے کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔ ایک دن وہ مشرک مسجد میں آ گیا اور بڑی بے ہودگی سے انہیں آواز دی۔ ”اے حبشی!“

”میں موجود ہوں۔“ بلالؓ نے کہا۔ ”اس طرح کیوں پکار رہے ہو۔“

”تم نہیں جانتے کہ تم نے قرض لیا تھا اور ایک ماہ کا وعدہ کیا تھا۔“

”ابھی ایک ماہ پورا تو نہیں ہوا۔“

”صرف چار دن باقی ہیں۔ میں یہ بتانے آیا ہوں کہ اگر میرا قرض واپس نہ کیا تو تم خود کو میرے حوالے کر دو گے اور میں تمہیں بکریاں چرانے پر لگا دوں گا جیسا کہ تم اسلام لانے سے پہلے بکریاں چراتے تھے۔“

وہ یہ دھمکی دے کر چلا گیا اور بلالؓ کو بہت دن بعد وہ زمانہ یاد آ گیا جب وہ مکہ میں امیہ کے غلام تھے۔ وہ سب اذیتیں یاد آ گئیں جو امیہ کے ہاتھ انہیں جھیلنی پڑی تھیں۔ آپ اسی وقت حضور اقدسؐ کی خدمت میں پہنچے اور تمام ماجرا سنا دیا۔

”آپ مجھے حکم دیں تاکہ میں اپنے آپ کو اس رسوائی سے بچانے کے لیے بعض قبائل کی طرف بھاگ جاؤں جو مسلمان ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔“

بلالؓ نے اپنی دانست میں اجازت لے لی تھی۔ حضورؐ نے خاموشی اختیار کر لی تھی اس لیے انہوں نے اسے اجازت ہی سمجھا اور جانے کی تیاری کرنے لگے۔ جوتے پاؤں میں ڈالے، تلواریں اور ڈھال اٹھائی اور حجرے سے نکلے۔ اسی وقت ایک شخص دوڑتا ہوا آیا اور یہ پیغام دیا کہ حضورؐ نے انہیں بلایا ہے۔ وہ خدمت اقدس میں پہنچ گئے۔

”خیر تو ہے بلال! یہ تلواریں، یہ ڈھال کسی جنگ پر جارہے ہو؟“ حضورؐ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

”رسوائی سے اچھا ہے میں کہیں نکل جاؤں۔“

”ہمیں چھوڑ کر؟“ حضورؐ نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ ”تم نے مال و اسباب سے لدے ہوئے چار اونٹ باہر بندھے ہوئے نہیں دیکھے؟“

”حضور دیکھے تو ہیں۔“
”وہ سب تمہارے ہیں۔ جاؤ اور قرض ادا کر دو۔“
”بلالؓ نے وہ تمام مال و اسباب بازار لے جا کر فروخت کیا اور جتنا قرض تھا سب اتار دیا۔ جو رقم باقی بچ گئی وہ غریبوں میں بانٹ دی کیونکہ حضورؐ کا حکم تھا کہ ضرورت سے زیادہ کچھ بھی اپنے پاس نہ رکھو۔“

ایسے ایسے کئی مراحل آئے تھے لیکن اس مرتبہ اس مشرک نے انہیں غلامی کا طعنہ دیا تھا۔ انہیں اپنا سابق آقا امیہ بری طرح یاد آ رہا تھا۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ امیہ تو مکہ میں عیش کر رہا ہے اور انہیں وطن بھی چھوڑنا پڑا اور یہاں بھی غلامی کے طعنے مل رہے ہیں۔ اس دن انہوں نے اپنے جسم پر لگے زخموں کے نشانات کو بڑے غور سے دیکھا تھا۔ امیہ کا ایک ایک ظلم یاد آیا تھا۔ اس رات وہ ایسی تکلیف

محسوس کر رہے تھے جیسے امیہ اب تک ان پر کوڑے برسا رہا ہو۔ یہ گھڑی کچھ ایسی قبولیت کی تھی کہ امیہ کی موت کے سامان ہونے لگے۔

مسلمان جب سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ گئے تھے اس وقت سے قریش کا اہل مدینہ سے اصرار تھا کہ مسلمانوں کا زور توڑنے کے لیے اب بھی وقت ہے ورنہ وہ وقت دور نہیں جب وہ طاقت پکڑتے ہی مکہ پر حملہ کریں گے۔ ہمیں قتل کریں گے اور ہماری عورتوں کو لونڈیاں بنالیں گے۔

یہی وہ اصرار تھا جس کے نتیجے میں دونوں فوجیں بدر کے مقام پر آئے سامنے ہوئیں۔ اہل ایمان صرف 313 تھے جب کہ فریق مخالف کی تعداد ایک ہزار تھی۔ جنگی ساز و سامان کے لحاظ سے بھی دونوں کا کوئی مقابلہ نہیں تھا لیکن خدا کی نصرت ساتھ تھی۔ پہلے ہی حملے میں دشمن کے تین سو راموت کے گھاٹ اتر گئے۔ ان میں لشکر کا سپہ سالار عتبہ بن ربیعہ بھی تھا۔ لشکر کے پاؤں اکھڑ گئے لیکن ابوجہل موجود تھا۔ لشکر نے پھر سنبھالا لیا۔ مسلمان مشرکین کو گاجر مولیٰ کی طرح کاٹ رہے تھے۔ کسی کا باپ مرا کسی کے بیٹے کا سراڑا۔ تلواروں کی باڑھ اور نیزوں کا جنگل قائم تھا۔ جنگ کا فیصلہ نہ جانے کیا ہوتا کہ ابوجہل بھی مارا گیا۔ اس کی موت کے بعد ابتری پھیل گئی۔ اسی افراتفری میں بلالؓ کی نظر اپنے سابق آقا امیہ پر پڑی۔ اس نے بھی بلالؓ کو دیکھ لیا۔ اس وقت تک اکثر کا یہ عالم تھا کہ نہایت حقارت سے بلالؓ کو آواز دی۔ ”او غلام کے بیٹے غلام۔“

اس آواز میں ایسا زہر تھا کہ بلالؓ کے سارے زخم تازہ ہو گئے۔ وہ سارے ظلم یاد آ گئے جو اس نے ان پر کیے تھے۔ انہوں نے چلا کر کہا۔ ”ادھر آؤ میں نے امیہ کو دیکھ لیا ہے۔“

چند انصار قریب کھڑے تھے۔ وہ دوڑے اور امیہ پر ٹوٹ پڑے۔ کئی تلواریں ایک ساتھ انھیں اور امیہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

کفار کی اس شکست نے نہ صرف انہیں رسوا کیا اور مسلمانوں کا رعب ان پر قائم ہوا بلکہ مکہ کے ہر گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ مکہ کا کوئی گھرا یا نہیں تھا جس کا کوئی نہ کوئی فرد اس میں ہلاک نہ ہوا ہو۔

اس شکست کے بعد انہیں مسلمانوں کی سیادت قبول کر لینی چاہیے تھی لیکن مقتولین کے ورثا یہ مطالبہ کرنے لگے کہ ہمیں ”بدر“ کی اس شکست کا بدلہ لینا چاہیے اور پہلے سے

زیادہ تیاری کے ساتھ بھرپور حملہ کرنا چاہیے۔ تیاریاں ایک مرتبہ پھر شروع ہوئیں جن کا نتیجہ جنگ احد کی صورت میں نکلا۔ جنگ احد میں فتح تو مسلمانوں ہی کی ہوئی لیکن بعض غلطیوں کی وجہ سے مسلمانوں کا بہت نقصان ہوا۔ اس جنگ میں حضرت امیر حمزہؓ نے بھی جام شہادت نوش کیا۔

اس جنگ کے بعد مکہ سے جو خبریں آ رہی تھیں وہ حوصلہ افزا نہیں تھیں۔ اس مرتبہ صرف مکہ کے مشرکین اس جنگ میں حصہ نہیں لے رہے تھے بلکہ انہوں نے عرب کے تمام قبائل کو جمع کر لیا تھا۔ یہ عرب قبائل مکہ پہنچنے شروع ہو گئے تھے اور صاف ظاہر تھا کہ اب وہ آخری جنگ لڑنا چاہتے ہیں۔ آریا پار۔ مسلمان سخت گھبرائے ہوئے تھے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ اس طوفان سے مقابلہ کر سکیں گے۔

دس ہزار کے لشکر کا مقابلہ کھلے میدان میں نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سلمان فارسیؓ کے مشورے سے مدینے کے گرد خندق کھود دی گئی۔ دشمن کا لشکر اس خندق کے قریب آ کر رک گیا۔ دونوں طرف کے تیر انداز مورچے سنبھالے ہوئے تھے۔ خندق کو عبور کرنا مشکل تھا۔

آخر کار مسلمانوں نے محاصرے کی شدت کا ذکر کر کے بارگاہ رسالت میں دعا کی درخواست کی۔ آپؐ نے دعا فرمائی۔ دعا کے الفاظ ادا ہوتے ہی رحمت خداوندی جوش میں آئی۔ قریش پر تند و تیز طوفان آیا۔ خیمے اکھڑ گئے۔ طنائیں ٹوٹ گئیں، ہانڈیاں الٹ گئیں۔ یہ لشکر اتنا سراسیمہ ہوا۔ یہ خوف بھی خدا ہی نے ان کے دل میں ڈالا تھا کہ انہوں نے خیمے اٹھائے۔ سامان لادا اور واپس ہو گئے۔ یہ ابتری بھی اس لیے پھیلی کہ اس لشکر میں مختلف الخیال لوگ موجود تھے اور ان میں آپس میں اختلافات تھے۔ مشکل کے وقت میں یہ اختلافات کھل کر سامنے آ گئے۔

غزوات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ تین مرتبہ قریش سے جنگیں ہوئیں پھر ارد گرد کے یہودیوں نے سر ابھارا تو ان کے خلاف لڑنا پڑا۔ حضرت بلالؓ بدر سے لے کر تبوک تک ہر معرکے میں شامل رہے۔ آپؐ چونکہ کوشش کے باوجود تلوار زنی میں مہارت حاصل نہ کر سکے تھے اس لیے ان معرکوں میں فوج کو راشن فراہم کرنا، فوجیوں کی بھرتی، شہادتوں کا حساب رکھنا، جو وفود مدینہ میں آتے تھے ان کے آرام و ضروریات کا خیال رکھنا۔ بیت المال کا حساب کتاب یہ سب حضرت بلالؓ کے سپرد تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے غلامی سے آزادی کے بعد انہیں لکھنا پڑھنا سکھادیا تھا جواب

ان کے کام آ رہا تھا۔ اس کے علاوہ حضورؐ کے محافظ اور دربان کا قلم دان بھی آپؐ ہی کے پاس تھا۔ کل کا غلام آج کی مملکت کا اہم رکن بنا ہوا تھا۔ یہ سب اسلام کی برکت تھی کہ ایک غلام آقاؐ کی کر رہا تھا۔

مسلمانوں کی بے دریغ فتوحات نے قبائل کو اسلام کی طرف راغب کر دیا تھا۔ لوگ جوق در جوق اسلام قبول کر رہے تھے۔ چشم حیرت کو مزید حیرت ہوتی ہے جب وہ یہ دیکھتی ہے کہ جب آپؐ 10 رمضان المبارک 8ھ کو فتح مکہ کے لیے مدینہ سے نکلے اور مکہ کے قریب نزول کیا تو دس ہزار خدا پرست مسلمان آپؐ کے ساتھ تھے۔ ان مجاہدوں کی روشن کی ہوئی آگ کے الاؤ ایک بحرنا کنار تھا جو صحرا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر ابوسفیانؓ چیخ اٹھا تھا۔

”میں نے اس جیسی آگ اور اس جیسا لشکر جو آج دیکھ رہا ہوں بھی نہیں دیکھا۔ واللہ ہائے قریش ابوسفیان اس لشکر کی آمد کا سن کر رات کے اندھیرے میں اس کا حال جاننے آئے تھے اور ایسا رعب طاری ہوا کہ حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے۔“

”اللہ کے سوا اگر کوئی اور اللہ ہوتا تو آج ہمارے کام آتا۔“

حضورؐ تو کریم ابن کریم تھے ابوسفیان کو تحفہ دے کر رخصت کیا۔ ”مکہ میں جا کر اعلان کر دو کہ ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوا سے امان ہے۔ جو شخص مسجد حرام میں داخل ہو جائے اس کے لیے بھی امان ہے جو شخص اپنے گھر کا دروازہ اندر سے بند کر لے وہ بھی مامون ہے۔“

حضورؐ نے اپنے لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ بلالؓ کو ایک اور سعادت نصیب ہوئی۔ حضورؐ نے انہیں اپنے دستے میں اپنے ساتھ رکھا۔ یہ دستہ شہر میں داخل ہوا تو شہر سنان پڑا تھا۔ لوگوں نے امان کے اعلان کے بعد اپنے دروازے بند کر لیے تھے۔ کعبے پر نظر پڑی تو مسلمانوں کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ اس عمارت کو وہ کتنے سالوں بعد دیکھ رہے تھے۔ ذرا آگے بڑھے تو بلالؓ کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ یہاں وہ امیہ کے کاموں کے سلسلے میں آیا جایا کرتے تھے اور وہ بھی بھاگتے ہوئے کہ اگر دیر ہو گئی تو کہیں آقاؐ ناراض نہ ہو جائے۔

کہیں کوئی مزاحمت نہیں تھی۔ فاتح لشکر بھی لوٹ مار میں مشغول نہیں تھا۔ کہیں ایسے بھی کوئی شہر فتح ہوا ہوگا۔ شاید

آئندہ بھی نہ ہو۔ خود فاتح مکہ حضرت محمدؐ کا عالم یہ تھا کہ عاجزی اور انکسار سے سر جھکا ہوا تھا، نہ یہ کہ اکثر اور شان دکھاتے۔ آپؐ نے محن کعبہ میں دو نفل شکرانے کے پڑھے۔ اس کے بعد فرمایا کعبے کے گرد رکھے ہوئے بتوں کو نذر آتش کر دیا جائے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ بت راکھ کا ڈھیر بن گئے۔ آج کوئی نہیں تھا جو ان بتوں کو بچانے کے لیے آتا۔ آپؐ صفا کی طرف گئے۔ یہاں کے بتوں کو توڑا۔

حضرت بلالؓ کو حضورؐ کے ساتھ خانہ کعبہ کے اندر جانے کا شرف حاصل ہوا۔ وہ کبھی خانہ کعبہ کے اندر نہیں گئے تھے۔ یہاں دیواروں پر مورتیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان مورتیوں کو صاف کرایا گیا۔ حضورؐ نے باب کعبہ پر کھڑے ہو کر تاریخی خطبہ دیا۔ مجمع پر نظر ڈالی تو انہی مجرمن کو کھڑے دیکھا جنہوں نے آپؐ پر ظلم کیے تھے، کانٹے بچھائے تھے، گستاخیاں کی تھیں اور اب اپنی سزا سننے کے منتظر تھے لیکن آپؐ کی زبان مبارک سے نکلا تو یہ نکلا۔ ”جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ آج تم پر کوئی الزام نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔“

یہ اعلان کیا تھا سناٹے کی دبیز چادر تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے سب گونگے ہو گئے ہیں۔ اعلان ہی ایسا تھا۔ یہ لوگ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ کوئی انہیں معاف کرے گا۔

اس وقت تک ظہر کا وقت ہو گیا تھا۔ رسالت مآبؐ نے بلالؓ کو اپنے قریب بلایا اور حکم دیا کہ وہ کعبے کی چھت پر چڑھ کر اذان دیں۔ بلالؓ نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا کہ چھت پر چڑھا کیسے جائے گا۔ باب ملتزم کے پاس سے لنگ رہے تھے۔ وہ ان رسولؐ کی مدد سے چھت پر پہنچ گئے۔ نیچے لوگوں کا جم غفیر تھا۔ ارد گرد کی پہاڑیوں پر بھی لوگ جمع تھے کہ بلالؓ کی آواز گونجی۔ ”اللہ اکبر، اللہ اکبر۔“

اہل مکہ اذان کے ان الفاظ کو پہلی مرتبہ سن رہے تھے۔ بلالؓ کی آواز کی شیرینی ان کے دلوں میں اتر رہی تھی۔ بلالؓ آج خود اپنی آواز کے عاشق ہوئے جا رہے تھے۔ ایسی حلاوت انہوں نے اس سے پہلے محسوس نہیں کی تھی۔ معلوم ہوتا تھا ان کے ساتھ مکہ کی پہاڑیوں کا ہر سنگ ریزہ تو صیف ربانی میں مشغول ہے۔ بت جلتے پڑے تھے اور اللہ کا نام بلند ہو رہا تھا۔

فتح مکہ کفر اور اسلام کے درمیان ایک فیصلہ کن معرکہ تھا۔ تمام قبائل کی نظر۔ س قریش مکہ پر لگی ہوئی تھیں کہ یہ خود اپنے اس پیغمبر کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ ان قبائل کا خیال یہ تھا کہ اگر قریش نے اسلام قبول کر لیا اور

اس کی دعوت کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تو پھر اسی کے قبول کرنے میں ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ فتح مکہ کے بعد تمام عرب کو معلوم ہو گیا کہ دین اسلام واقعی اللہ کا دین ہے چنانچہ فتح مکہ کے بعد ہر طرف سے لوگ بارگاہ نبوت میں حاضر ہونا شروع ہو گئے لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔ اسلام تیزی سے پھیلنا شروع ہو گیا۔

ابن سعد نے طبقات میں ساتھ و فود کا ذکر کیا ہے جو فتح مکہ کے بعد صرف دو سال میں مکہ آئے۔ ان تمام و فود کے انتظام و انصرام میں بلالؓ ہی کا دخل تھا۔ یہ کوئی معمول بات نہیں تھی لیکن بلالؓ کا خلوص ان سے یہ کام بہ احسن تکمیل تک پہنچا رہا تھا۔ کل کا غلام آج سب کی نگاہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔

23 سال کی شبانہ روز دعوت و تبلیغ سے لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہو چکے تھے۔ کعبہ کو مراسم جاہلیت سے بالکل صاف کر دیا گیا تھا۔ اب ہاتھ غیبی یہ اشارہ کر رہا تھا کہ اب دنیا میں قیام کا زمانہ اختتام پذیر ہے۔ حج کی فرضیت کے بعد آپ امت کو یہ دکھا دینا چاہتے تھے کہ انہیں حج کس طرح کرنا ہے۔ آپ نے 10ھ میں حج کا اعلان کر دیا۔ یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اطراف و اکناف سے لوگ جمع ہونے لگے کہ وہ بھی آپ کے ہمراہ حج کی سعادت حاصل کریں۔

تمام قبائل عرب آپ کے ہمراہ تھے۔ حضرت بلالؓ آپ کو سورج کی گرمی اور روشنی سے بچانے کے لیے ایک کپڑے سے سایہ کیے ہوئے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

مقام عرفات پر آپ نے خطبہ دیا جس میں صاف صاف آپ نے فرما دیا کہ رحلت کا پیغام آ گیا ہے۔ ”اے لوگو! میری بات غور سے سنو کیونکہ میں نہیں جانتا شاید اس سال کے بعد اس مقام پر تم سے کبھی نہ مل سکوں۔“ حج کی تکمیل کے بعد آپ نے مسجد نبویؐ میں منبر پر جلوہ افروز ہو کر فرمایا۔ ”میں تمہارا امیر کارواں ہوں اور تم سے پہلے جا رہا ہوں۔ میرا تم سے حوض کوثر پر ملنے کا وعدہ ہے اور میں اس وقت حوض کوثر کو دیکھ رہا ہوں۔“

☆.....☆

مرتدین کا استیصال اور لا تعداد قربانیوں کے بعد مسلمانوں کو کچھ امن نصیب ہوا تھا کہ رسالت مآب واصل بہ حق ہوئے اور تاریخ اسلامیہ نے خلافت راشدہ میں قدم رکھا۔ سارے شہر میں سناٹا تھا۔ گھر گھر سے سسکیوں کی آواز

ماہنامہ سرگزشت

ابھر رہی تھی۔ بعض محبت کرنے والے تو ایسے تھے کہ انہیں یقین ہی نہ آتا تھا محمدؐ کا وصال بھی ہو سکتا ہے لیکن حضرت ابو بکرؓ نے یہ کہہ کر سب کو خاموش کر دیا۔ ”اگر ہم میں سے کوئی ایسا ہے جو محمدؐ کو معبود سمجھتا ہے تو وہ جان لے کہ محمدؐ کا انتقال ہو چکا ہے لیکن جو اللہ کو معبود سمجھتا ہے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے۔“

بلالؓ نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا لیکن آنسوؤں پر قابو نہ پاسکے اس لیے کہ آنسوؤں پر کس کو اختیار ہے اور ایسے آنسو جو آنکھوں سے نہیں دل سے نکلتے ہوں۔ تدفین کے بعد قبر پر چڑھ کر آنسوؤں کی اور مٹی ہموار کرنے کی سعادت بھی بلالؓ ہی کے حصے میں آئی لیکن آنکھ کے آنسو کیسے صاف کرتے کہ ہاتھوں پر تو مٹی لگی ہوئی تھی۔ آنسوؤں کے پانی سے اگر مٹی دھل جاتی تو خزانہ ہی چھن جاتا لہذا زندگی بھر آنسو بھی خشک نہ ہوئے۔ ہاتھوں سے قبر رسولؐ کی مٹی کی خوشبو بھی نہیں گئی۔ اذان کا وقت ہوا تو سب لوگ بلالؓ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر خاموشی پہرا دے رہی تھی۔ بس آنکھیں بول رہی تھیں۔

”بلالؓ، اذان دو۔ وقت نکلا جا رہا ہے۔“

”اب کون سامنے ہے۔ کس کے لیے اذان دوں۔“

”اذان تو اللہ کے لیے ہوتی ہے۔“

”مجھے بھی معلوم ہے۔ میرا دل بھی چاہتا ہے۔ میں ہی تو رسولؐ کا پہلا مؤذن تھا۔ میں اذان دوں لیکن میں جس کے نام کی گواہی دیتا تھا وہ سامنے ہوتا تھا۔ اب وہ نہیں ہوگا۔“ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ دوسرے صحابہ کی بھی سسکیاں بندھ گئیں۔

”بلال ہمت کرو۔“

”اب میں کبھی اذان نہیں دے سکوں گا۔ مجھے معذور سمجھا جائے۔“

ان کی جگہ ابو محذورہ نے اذان دی جو کبھی کبھی بلالؓ کی غیر موجودگی میں اذان دیا کرتے تھے۔

چند روز بعد صحابہ نے پھر اصرار کیا۔ حضرت علیؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ نے ضد کر کے انہیں چمت پر چڑھا دیا۔ عجیب حالت تھی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ ابھی اللہ اکبر ہی کہا تھا کہ آنسوؤں نے لفظ چھین لینے، کبھی کوئی لفظ نکلتا تھا کبھی کوئی۔ حضورؐ کا نام آتے ہی جیسے یادداشت چلی گئی۔ اذان دوبارہ شروع کی۔ پھر محمدؐ کا نام آتے ہی رک گئے۔ پھر لفظ کہیں گم ہو گئے۔ خاموشی طاری ہو گئی۔ نذہن ساتھ دے رہا تھا نہ زبان۔

آخر علیؓ اور ابوذرؓ دونوں نے ترس کھایا اور انہیں نیچے اتار لیا۔ حضورؐ کی وفات کا صدمہ کبھی کوہوا تھا لیکن بلالؓ کی تو دنیا ہی اجڑ گئی تھی۔ ان کا تو گھر بار ہی نہیں تھا۔ ان کے سب کچھ حضورؐ ہی تو تھے۔

حضرت ابو بکرؓ خلیفہ بنا دیے گئے۔ رفتہ رفتہ تمام کاروبار حیات معمول کے مطابق چلنے لگا لیکن بلالؓ کی دنیا تاریک ہو گئی تھی۔ اب ان کی کوئی منزل نہیں تھی۔ حضرت عائشہؓ کے حجرے کے سامنے بیٹھ رہتے۔ کبھی روتے رہتے کبھی چپ ہو جاتے۔ بازار میں نکل جاتے جہاں کچھ لوگ مل جاتے، ان سے حضورؐ کی باتیں کرتے۔ وہ واقعات سناتے جو حضورؐ کی قربت میں ان کے سامنے پیش آئے تھے۔ آخر ایک دن اس بے قراری نے طوفان اٹھا دیا۔ آپ ابو بکرؓ کی خدمت میں پہنچ گئے۔

”آپ نے مجھے اپنے لیے آزاد کیا تھا یا اللہ کے لیے؟“

”بلالؓ، میں نے تمہیں اللہ کے لیے آزاد کیا تھا۔“

”تو پھر اللہ کی راہ میں جہاد کرنے دیجیے۔“

”تم کیا چاہتے ہو۔“

”جہاد کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں شہید ہو جاؤں۔“

”بلالؓ، تم میری ڈھارس ہو۔ میری خاطر مدینے ہی میں رہو۔“ حضرت ابو بکرؓ نے انہیں مدینہ چھوڑنے کی اجازت نہیں دی۔

حضرت ابو بکرؓ کے انتقال کے بعد جب حضرت عمرؓ کا دور خلافت آیا تو بلالؓ نے اپنا وہی مطالبہ دہرایا۔ انہوں نے بھی ابتدا میں اجازت نہیں دی لیکن بلالؓ اصرار کرتے رہے اور بالآخر اجازت مل گئی اور آپ شام روانہ ہو گئے جہاں ان دنوں معرکہ کارزار رہا تھا۔ آپ نے شام پہنچ کر رومیوں کے خلاف کئی معرکوں میں حصہ لیا۔ یہ معرکے ختم ہوئے تو یہیں شام کے علاقے خولان میں سکونت اختیار کر لی۔ یہ روایات بھی ملتی ہیں کہ آپ نے یہاں شادی بھی کر لی تھی۔

ایک رات رسول اللہؐ کو خواب میں دیکھا۔ فرما رہے تھے۔ ”بلالؓ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تم ہم سے ملنے آؤ۔“ آنکھ کھلی تو آقاؐ کا بلاوا یاد آیا۔ فوراً رخت سنباندھا۔ مدینہ پہنچے ہی اپنے آپ کو روضہ اقدسؐ پر گر دیا۔ کیسے کیسے راز و نیاز ہوئے ہوں گے کون کہہ سکتا ہے۔

بلالؓ مدینہ پہنچیں اور کسی کو خبر نہ ہو۔ حضورؐ کے نواسے حسنؓ اور حسینؓ بھی روضہ رسولؐ پر پہنچ گئے۔ بلالؓ کی بے تابی عروج پر تھی۔ کبھی مانتا چومتے تھے کبھی بالوں پر شفقت سے ہاتھ

پھیرتے تھے۔ کبھی آغوش میں بھر لیتے تھے۔

”کل فجر کی اذان آپ دیں گے۔“

”میں نے حضورؐ کی وفات کے بعد کبھی اذان نہیں دی لیکن آپ جگر گوشہ رسولؐ ہیں آپ کی خواہش کیسے ٹال سکتا ہوں۔“

شہر کو خبر کر دی گئی کہ کل فجر کی اذان مؤذن رسولؐ حضرت بلالؓ دیں گے۔ شہر میں اب تک وہ لوگ بھی تھے جو پہلے بھی ان کی اذانوں کے بلاوے پر نمازیں پڑھتے رہے تھے اور وہ بھی تھے جنہوں نے صرف نام سنا تھا۔ اشتیاق کے پھول دونوں جانب کھلے ہوئے تھے۔ دور نبویؐ آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ شہر مدینہ پوری رات جاگ کر صبح ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ ہر شخص یہ سوچ رہا تھا کہ اگر آنکھ نہ کھلی تو وہ اس سعادت سے محروم رہ جائیں گے۔

صبح ہوئی تو سارا شہر ان کی اذان سننے کے لیے اٹھ آیا۔ آپ اذان کے لیے کھڑے ہوئے تو نمازیوں کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ بلبل مدینہ نے اللہ اکبر کہا تو سکوت چھا گیا۔ شہادت رسولؐ کے کلمات کہتے ہوئے انگشت شہادت کا رخ روضہ اقدس کی طرف کیا تو کوئی بھی اپنے جذبات ... پر قابو نہ رکھ سکا۔ یوں لگتا تھا حضورؐ ابھی کسی طرف سے تشریف لے آئیں گے۔ بعض محبت والے تو یہ بھی کہنے لگے کہ رسول اللہؐ پھر مبعوث ہو گئے ہیں۔

آپ کو پھر دمشق جانا تھا۔ ایک مرتبہ پھر روضہ رسولؐ پر حاضری دی اور دمشق روانہ ہو گئے۔ مدینہ آنکھوں سے کہیں دور رہ گیا۔ بارونق مگر بلبل مدینہ سے محروم۔ لوگ بڑے دنوں تک اس اذان کو اور اس اذان دینے والے کو یاد کرتے رہے۔

مزار دیکھ آئے تھے اب صاحب مزار سے ملنے کی جلدی تھی۔ دمشق آتے ہی بیمار رہنے لگے۔ پھر وقت نزع قریب آ گیا۔

”کل ہم اپنے دوستوں سے ملاقات کریں گے۔ محمدؐ اور آپ کے ساتھیوں سے۔“

وفات سے قبل آپ نے فرمایا۔ ”وافر ماہ“ اور آنکھیں بند کر لیں۔

آپ کی سن وفات 20ھ اور بعض روایات میں 21ھ ہے۔

ماخذات

سیدنا بلالؓ حکیم محمود احمد ظفر
بلالؓ سلیم گیلانی

ہم سب طلبہ کو خود اس بات پر اسکا تے ہیں کہ وہ اپنے ذہن میں پینے والے سوال اساتذہ سے پوچھ کر کشفی کریں، ذہنی افق وسیع کریں لیکن اینڈریا مقابل کو کوفت زدہ کر دیا کرتی ہے۔ وہ مضامین سے ہٹ کر غیر ضروری باتوں میں الجھنے لگتی ہے۔“

”ہم دلی طور پر معذرت خواہ ہیں۔“ مرد نے بے بسی سے کہا۔

”سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنی کم عمری میں وہ اپنے ہی اساتذہ کی خامیاں نکالنے کی جسارت بھی کیونکر کر سکتی ہے؟ کیا اسے گھر میں ایسا ماحول اور لسانی آزادی فراہم کی گئی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ لوگ ہی اس کے سامنے ایسے نکات اٹھا دیتے ہوں۔“

”ہرگز نہیں! ہم میں سے کوئی بھی ایسا کیوں کرے گا بھلا؟ ہم اس عمل کی بھرپور مذمت کرتے ہیں۔“ اس کے والد نے شرمندگی سے کہا۔

”پھر تو یہ صورت حال مزید الجھ گئی ہے۔ اگر اسے والدین کی طرف سے کوئی شہہ حاصل نہیں ہے تو یہ دوستوں کی صحبت کا اثر ہوگا۔ اس کے حلقہ احباب میں یقیناً اپنی عمر سے بڑے اور انقلابی نظریات کے حامل افراد شامل ہوں گے۔ اینڈریا کی یہ حرکات اور اعمال ایسے ہی کسی انقلابی گروہ کا شاخسانہ ہوگا۔“

”میں معذرت کے ساتھ آپ سے غیر متفق ہوں سر! ہمیں اینڈریا کے حلقہ احباب کے متعلق مکمل معلومات ہیں۔ اس کے دوستوں کے اہل و عیال سے ہمارے بہت اچھے اور دوستانہ تعلقات ہیں۔ وہ بالکل اس مزاج کے نہیں ہیں۔“ والد نے بریقین انداز میں کہا۔

”تو پھر اصل مسئلہ کہاں ہے؟ اگر اینڈریا کو خارجی عوامل کی جانب سے کوئی تحریک حاصل نہیں ہے تو پھر یہ داخلی عوامل کی کارستانی ہے۔ اس کی شخصیت عدم توازن کا شکار ہو رہی ہے۔ اسے احساس برتری کا خبط ہو چلا ہے۔ اسی خبط میں جتلا ہو کر وہ یہ سوچنے لگتی ہے کہ اساتذہ اس سے بہت کمتر ہیں۔ دوسری جانب اسے لیڈر بننے کی تمنا ہوگی جس کی بدولت وہ اپنے ہم جماعت طلبہ کو من پسند راہوں کا مسافر بنادینا چاہتی ہے۔“ ایک اور معلم نے اس کا بھرپور نفسیاتی تجزیہ کیا۔ ”آپ دونوں بہت باشعور، زیرک اور سمجھدار والدین ہیں۔ میرا آپ لوگوں کو پر خلوص مشورہ ہے کہ اینڈریا کو بہترین ماہر نفسیات کے پاس لے کر جائیں۔ اس کی ذہنی الجھنوں اور



پراکساتی ہے۔ صرف یہی نہیں! وہ جماعت میں موجود اساتذہ کو بتاتی ہے کہ ان کا طریقہ تدریس کس مقام پر مناسب ہے اور کہاں غیر مناسب۔“

”یا خدا!! یہ کیسے انکشافات سن رہی ہوں میں؟“ خاتون نے متوحش ہو کر سر ہٹا لیا۔ کسی بھی تعلیمی ادارے میں پرائمری سطح کے بچے کی ایسی حرکات کا براہ راست مطلب وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ اس روز اینڈریا کے سبھی اساتذہ کے تیور بگڑے ہوئے تھے ہر ایک کی زبان پر مختلف شکایات تھیں۔

”سوال جواب کرنا اچھی بات ہوتی ہے محترم خاتون! ماہنامہ مغل گزشت

چارہ گر

زویا اعجاز

انسان کی ترقی محنت میں مخفی ہے، جس نے محنت کو جذبہ بنا لیا، ترقی اس کی لونڈی بن جاتی ہے۔ اس لڑکی نے بھی محنت کو عظمت جانا اور سب کے منع کرنے کے بعد بھی اپنی دھن میں لگی رہی۔ اسے شہرت کی تمنا نہیں تھی اس لیے اس نے کبھی شہرت کی جانب مڑ کر بھی نہ دیکھا تھا وہ جذبہ خدمت کے تحت اس میدان میں آئی تھی اور محنت کیے جا رہی تھی، اسی محنت نے اسے عالمی شہرت کا حامل بنا دیا۔

جذبہ خدمت کس طرح انسان کا میلہ کرتی ہے اس کی ایک جھلک

”اینڈریا کا یہ رویہ ناقابل فہم ہے۔ ہم نے اس کی ایسی پرورش بالکل نہیں کی۔“ خاتون نے تاسف سے کہا۔

”والدین بھی اولاد کی تربیت ایسے خطوط پر نہیں کیا کرتے لیکن بچہ کہیں نہ کہیں سے منفی عادات اپنے مزاج میں سمو ہی لیتا ہے۔ ایسی صورت حال میں والدین کو کبھی طور پر مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔“ ایک اور معلم نے تدبر سے کہا۔

”ہم آپ کی بات سے بالکل متفق ہیں۔“ ان دونوں نے سکون کا سانس لیتے ہوئے دزدیدہ نگاہوں سے اپنے پہلو میں کھڑی اینڈریا کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر اب بھی شرمساری یا ملال کا کوئی شائبہ نہ تھا۔

”تو پھر آپ ہی بتائیے کہ اینڈریا کو اپنے بڑوں سے بحث و مباحثہ کرنے کی عادت کیسے پڑ گئی؟“ انتظامیہ کا اگلا سوال ان کے لیے نیا دھماکا تھا۔

”قابل یقین، قطعی ناقابل یقین۔“ مرد نے خود کلامی کی اور پھر سنبھل کر گویا ہوا۔ ”کیا میں جان سکتا ہوں میڈم کہ اینڈریا نے ایسی کیا حرکت کی ہے؟“

”وہ کلاس روم میں اوٹ پٹانگ سوال کرتی ہے۔ بچوں کو عجیب و غریب خاللات فراہم کر کے ملل کرنے

جولائی 2018ء

اسکول کی خصوصی میٹنگ کے وہ دونوں شرکاء بہت مشکل صورت حال سے دوچار تھے۔

”آپ لوگوں کو آج یہاں خصوصی طور پر مدعو کیا گیا ہے۔ آپ کی بیٹی کے متعلق ضروری امور پر بات چیت کرنی ہے۔“ ایک اوجیز عمر معلم نے سنجیدگی سے بات کا آغاز کیا۔

”جی میڈم! ہم ہمہ تن گوش ہیں۔“ خوش شکل اور پروقار مرد نے کہا۔

”اینڈریا کا رویہ اسکول انتظامیہ کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ وہ ضرورت سے زیادہ ہی خوش فہم اور پراعتماد ہو چکی ہے جس کی بدولت جماعت میں نظم و ضبط کے مسائل کھڑے ہو رہے ہیں۔“

”یقین نہیں آتا کہ اینڈریا ایسی کوئی حرکت کر سکتی ہے۔ وہ تو نہایت سلجھے ہوئے مزاج کی لڑکی ہے۔“ نفیس مہذب اور سبک نقوش کی مالک اس خاتون نے کہا۔ اس کے چہرے پر تشویش کی گہری پرچھائیاں جھلکنے لگی تھیں۔

”تو آپ کے خیال میں کیا ہم غلط بیانی کر رہے ہیں؟“ معلم نے ابرو اچکائے۔

”اوہ نو میڈم! ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔“ مرد نے فوری معذرت کی۔

ماہنامہ مغل گزشت

نفسیاتی گتھیوں کا سلجھنا بہت ضروری ہو چکا ہے ورنہ ہم انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے۔“

اینڈریا کے والدین شدید کشمکش میں مبتلا ہو چکے تھے۔ عزیز از جان بیٹی کی یہ ذہنی حالت اور انتظامیہ کے ردِ عمل نے انہیں بہت سے تفکرات لاحق کر دیئے تھے۔ ”ہم اس مسئلہ کا بہترین حل تلاش کر لیں گے۔“ اس کی والدہ نے عزم سے کہا۔

”یقیناً ایسا ہی ہونا چاہیے۔“ اساتذہ نے اینڈریا کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا جواب بھی لائق انداز میں ہی کھڑی تھی۔

☆.....☆

”یہ سب کیا ہے اینڈی؟ تمہیں اندازہ بھی ہے کہ آج ہم دونوں کو کس خفت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔“ گھر آنے کے بعد والدین نے اسے گھیر لیا۔ شمال مغربی لندن کا رہائشی یہ یونانی جوڑا اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کے لیے بہت حساس تھا۔

”آئی ایم سوری پاپا! میری وجہ سے آپ کو یہ سب برداشت کرنا پڑا۔“ اسے ان کی ذہنی اذیت کا بخوبی احساس ہو رہا تھا۔ وہ دونوں ہی بہت نفیس اور سلجھے ہوئے مزاج کے نوکری پیشہ افراد تھے۔ اینڈریا اپنے بہن بھائیوں میں درمیانی نمبر پر تھی اور والدین کی غیر حاضری میں دادی ہی انہیں سنبھالتی تھی۔ انگریزی زبان سے قطعی نا بلد اور یونانی روایات سے وابستہ اس بوڑھی خاتون نے انہیں ہمیشہ والدین کے احترام اور ملکی وقار پر نازاں رہنے کا درس دیا تھا۔

”صرف سوری کہہ دینے سے یہ مسئلہ ختم نہیں ہو سکتا میری بیٹی! آپ کے اساتذہ اس قدر نالاں کیوں ہیں؟ آپ انہیں اتنا زچ کیوں کرتی ہو؟“ ماں نے استفسار کیا۔

”میں ایسا جان بوجھ کر نہیں کرتی ماما!! میں تو صرف اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالوں کے جواب طلب کرتی ہوں۔“

”چلو وہ بھی کسی حد تک مناسب ہے لیکن دوسرے بچوں کی لیڈر بننے کی کیا ضرورت ہے بھلا؟“

”میں انہیں کسی غلط کام کے لیے نہیں اسکتی۔ میں انہیں یہ کہتی ہوں کہ اگر کوئی ٹاپک سمجھ نہیں آ رہا تو ٹیچر سے پوچھ کیوں نہیں لیتے؟ خاموش کیوں رہتے ہیں؟“

”آپ کو کیونکر علم ہوتا ہے کہ انہیں ٹیچر کا پڑھایا ہوا سمجھ نہیں آ رہا؟“ باپ کو اچنبھا ہوا۔

”ان کی نظروں میں بنا سمجھی اور حرکات میں بے چینی

”اس نے سادگی سے بتایا۔“

”تو پھر یہ سب ٹیچر کو نظر کیوں نہیں آتا؟“

”کیونکہ ان کا دھیان صرف اس بات پر ہوتا ہے کہ ہم لوگ کلاس میں زیادہ شور نہ کریں اور کورس جلد از جلد ختم کر لیں۔“ اس کم عمری میں ایسی دو ٹوک منطق اور تجزیے پر والدین ششدر تھے۔

”دیکھو اینڈی!! وہ آپ کے اساتذہ ہیں اور استاد بہر صورت قابل احترام ہوتا ہے۔“ ماں نے بات کو سیٹھا چاہا۔

”میں نے ان کے احترام میں کبھی کوئی کمی نہیں کی۔“

”اگر ایسا نہیں ہے تو ان کے ساتھ حاکمانہ رویہ اپنانے یا انہیں طریقہ تدریس میں تبدیلی کا کہہ کر توہین کرنے کا کیا مقصد ہے پھر؟“ ماں نے اس بار قدرے غصہ سے کہا۔

”میں فسمیہ طور پر کہتی ہوں ماما! میں ان کی توہین یا تذلیل نہیں کرنا چاہتی۔ وہ ہر صورت میں میرے لیے قابل احترام ہیں۔“ اینڈریا رو ہانسا ہوئی۔

”تو آپ انہیں زچ کیوں کرتی ہو پھر؟ انہیں آپ سے اتنی شکایات کیوں ہیں؟“ باپ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”میں دیگر بچوں کو جب ان کی غیر موجودگی یا غیر حاضری کی صورت میں اٹنے سیدھے خطابات دیتے عدم اطمینان کا اظہار کرتے اور ان کے مضامین سے تفرک اظہار کرتے دیکھتی ہوں تو مجھے بہت برا لگتا ہے۔ میں تو صرف انہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ایک معمولی سی تبدیلی سے وہ ان سب بچوں کی شکایات دور کر سکتے ہیں۔“ اس کے تجزیہ اور توجیہ پر وہ ایک بار پھر ششدر رہ گئے لیکن اس موقع پر وہ بیٹی کی حوصلہ افزائی کر کے اسے شہ نہیں دے سکتے تھے۔

”دیکھو اینڈی! تم ابھی بچی ہو اور تمہارا ذہنی افق نہایت محدود ہے۔ اساتذہ نے تم سے زیادہ دنیا دیکھی ہے۔ ان کا تجربہ تمہاری عمر سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ ان معاملات کو تم سے کہیں بہتر سمجھتے ہیں۔“ ماں نے لہجہ میں سختی سموتے ہوئے کہا۔

”وہ بچے بھی بھی ترقی نہیں پاسکتے جو اپنی ذات کو اساتذہ سے بہتر گردانتے ہیں۔ وہ اس مقام پر یونہی تو نہیں پہنچ گئے ناں! حصول تعلیم کا طویل سلسلہ پیشہ وارانہ تربیت کے لیے تربیتی کورسز حکومت کی جانب سے طے کردہ اصول و ضوابط اور مخصوص طریقہ کار سے کامیابی سے گزرنے کے بعد ہی وہ اس عہدے پر پہنچتے ہیں۔ برس ہا برس سے پڑھانے کا ایک کٹھن مرحلہ طے کرتے ہوئے انہوں نے تم جیسے کتنے بچوں کو کسی نہ کسی مقام پر پہنچتے دیکھا ہے۔ اب اگر ایک کم

عمر نادان، کم فہم اور جذباتی سی لڑکی اپنی خود ساختہ برتری کے زعم میں انہیں ناکردہ غلطیوں کا احساس دلانے لگے تو یہ ان کی توہین نہیں تو اور کیا ہے؟“ ماں کی باتیں سننے اور اس کی برہمی بھانپ کر اینڈریا خاموش ہو گئی۔ اس کم عمری میں بھی اسے رویوں کو سمجھنا بخوبی آتا تھا۔

”میری بیٹی!! آپ ہمیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہو۔“ باپ نے کہا۔ ”آپ سسٹم سے الجھنے چلی ہو اور یہ عمل باغیانہ ہی نہیں احتقانه بھی ہے۔ حکومت برطانیہ نے بہترین دماغوں کی مشاورت اور تجزیے سے اپنا تعلیمی نظام مرتب کیا ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پیشہ وارانہ اہلیت کے حامل افراد کو تعلیم دینے کی کمان سونپی ہے۔ آپ کے اس طرز عمل سے تعلیمی نظام کے زنجیر کی صورت میں باہم مربوط سلسلہ بر تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ الٹا آپ کی زندگی ایک بھونچال کی زد میں آ جائے گی۔ اس باغیانہ روش کے بعد اگر اسکول نے آپ پر نااہلی کی مہر لگادی تو اس جرم کا تادان تا عمر ادا کرنا پڑے گا۔ آپ کا کیریئر شروع ہونے سے قبل ہی ختم ہو جائے گا۔“

”آئی ایم سوری پاپا!“ اس نے سر جھکا کر کہا۔

”اپنے دماغ سے ہر قسم کا خناس نکال دو اور صرف پڑھائی پر توجہ دو۔ اس شخص دور میں پڑھائی لکھائی کے بغیر بقاء حاصل کرنا بالکل ناممکن ہے۔ سمجھیں؟“

”جی پاپا!“ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

”اس لڑکی نے تو میرے دماغ کی چولیس ہلا دی ہیں۔ شکر ہے کہ اس کی عقل میں بات سا گئی ہے۔“ اینڈریا کے جاتے ہی ماں نے تھکے تھکے انداز میں اپنی پیشانی مسلتے ہوئے کہا۔

”امید ہی کی جاسکتی ہے کہ اسے واقعی ہماری باتیں سمجھ آ گئی ہوں۔“ وہ مسکرایا۔

”کک..... کیا کہہ رہے ہو؟ مطلب ہمارے اتنے لمبے چوڑے ٹیکچر کا اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔“

”ایک بات تو ہمیں تسلیم کرنی پڑے گی کہ ہماری بیٹی غیر معمولی طور پر حساس اور معاملہ فہم ہے۔ اسے قدرت نے لوگوں کے پوشیدہ جذبات ذاتی طور پر محسوس کرنے کی صلاحیت سے نوازا ہے۔ وہ زندگی میں کبھی بھی روایتی طریقوں پر عمل نہیں کرے گی۔“

”تو پھر کیا کرے گی؟ کیا اسے واقعی نفسیاتی علاج کی

ضرورت ہے؟“ ماں کا دل کانپ اٹھا۔

”ہرگز نہیں! بس اسے سمجھنا بہت ضروری ہے ورنہ وہ ذہنی و قلبی طور پر ہم سے بہت دور ہوتی جائے گی۔“

والدین کے ان خدشات سے لاعلم اینڈریا اپنے کمرے میں لیٹی متفرق جذبات میں گھری تھی۔ اسے حقیقتاً اپنے اساتذہ کی ان شکایات اور والدین کے ردِ عمل کا بہت دکھ ہوا تھا۔

”اگر کسی معلم کی تدریس بچے کو سمجھ ہی نہ آئے تو پڑھانے کا مقصد کیا ہوا بھلا؟“ اس نے خود کلامی کی۔

”ایک ٹیچر تو اتنا تجربہ کار زیرک اور معاملہ فہم ہوتا ہے پھر وہ سب مجھے غلط کیوں سمجھ رہے ہیں؟ انہوں نے ایسا کیوں سمجھا کہ میں ان کی تذلیل کرنے کی کوشش کیا کرتی ہوں۔“

ایک اور سوچ نے ذہن کے در بچوں پر دستک دی۔

”طالب علم اور استاد میں محض خوف، نظم و ضبط یا امتحانات و آزمائش کا رشتہ ہی اس تعلق کی معراج ہے؟ کیا اساتذہ کبھی اپنے طلبہ کے اصل مسائل اور ذہنی استعداد کو نہیں سمجھ پائیں گے؟“ ایک اور سوال سامنے آن کھڑا ہوا۔

”کسی کو تو بارش کا پہلا قطرہ بن کر طلبہ پر طاری اس جس نما جمود کو ختم کرنا چاہیے۔“ اس نے اضطراب سے کروٹ بدلتے ہوئے سوچا۔

”بارش کا وہ پہلا قطرہ تبدیلی کی وہ پہلی لہر خوشگوار ہوا کا اولین جھونکا تم خود ہی کیوں نہیں بن جاتیں اینڈی؟“ اس نے بستر کے پاس ایک اور اینڈریا کو کھڑے پایا۔

”میں..... میں کیسے بھلا؟“ وہ حیران ہوئی۔

”ہاں تم تم کیوں نہیں بھلا؟“ ہمزاد نے اطمینان سے کہا۔

”کیا یہ سب میرے لیے آسان ہوگا؟“ وہ بے خودی میں اٹھ بیٹھی۔

”بالکل! تمہارے لیے ہی تو سب سے زیادہ آسان ہوگا کیونکہ تمہارے سامنے یہ سب مسائل اور ان کا حل پہلے سے موجود ہوگا۔“

”ہاں! ایسا بالکل ہو سکتا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ ”میں ان بچوں کا کرب محسوس کر سکتی ہوں۔ مستقبل میں ان کے درد کا درماں اور چارہ گر بھی میں ہی ثابت ہوں گی۔“

”ضرور ایسا ہی ہوگا۔“ ہمزاد نے یقین دلایا۔

مستقبل کے اس نقشہ نے اینڈریا کو خوابوں کی نئی

رہنڈ فرام کر دی جہاں اسے اپنے وجود کو ایک چارہ گر بنانے کی تیاری کرنی تھی۔ اس نے جی جان سے اس سفر کو کامیاب کرنے کے لیے کمر کس لی۔

☆.....☆

اینڈی کے والدین اب قدرے پرسکون ہو چکے تھے۔ اس کے رویے میں مثبت تبدیلی آتے ہی اسکول سے شکایات آنا بھی ختم ہو گئیں۔ اساتذہ اس کی ذہانت اور تخلیقی صلاحیتوں کے قائل تو تھے ہی، انہیں محض اس کے اضطرابی اور غیر معمولی رویہ سے ہی مسائل ہوتے تھے۔ اس کی کم گوئی، اپنے کام سے کام رکھنے کی روش اور اچھے نتائج نے تو گویا بھی مسائل کا چشم زدن میں ہی خاتمہ کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد اسے اسکول کی ہیڈ گرل بنادیا گیا۔ والدین تک ان کا مثبت رد عمل حوصلہ افزائی بن کر پہنچتا تو ان کی خوشی کا بھی کوئی ٹھکانا نہ رہتا۔

بحر حیات میں زندگیوں کا سفینہ ہموار انداز میں کئی سال تک اپنے سفر کے پڑاؤ طے کرتا رہا۔ اس بحر میں تلاطم اس وقت پیدا ہوا جب اینڈریا نے اپنے منتخب شدہ مضامین کا اعلان کیا۔

”تم ہوش میں تو ہو اینڈی؟“ باپ نے قدرے بے یقینی سے کہا۔

”کیا تم نے وہی کہا جو میں نے ابھی ابھی سنا ہے؟“ ماں کی کیفیت بھی کچھ مختلف نہ تھی۔

”آپ دونوں نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ میں بھائی ہوش و حواس ہی یہ بات کہہ رہی ہوں کہ مجھے سائنسی مضامین سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”دنیا چاند پر پہنچ چکی ہے بے وقوف لڑکی! آنے والا دور جدید ترین ٹیکنالوجی کا ہوگا۔“

”جی ہاں! دنیا بے شک چاند پر قدم رکھ چکی ہے۔ آنے والا دور بھی کمپیوٹر اور ٹیکنالوجی کا ہی ہوگا۔۔۔۔۔۔ لیکن انسانی جذبات و احساسات کے تقاضے بہر حال اپنی جگہ برقرار رہیں گے۔ میں بھی اپنے جذبات سے فرار حاصل کر کے غیر فطری زندگی نہیں جی سکتی۔ میری ترجیح آرٹ اور ٹیکسٹائل ہی رہیں گے۔“ اس کے حتی انداز پر وہ خاموش ہو گئے۔ انہیں علم ہی کہاں تھا کہ مستقبل قریب میں بیٹی نے ایک اور جھٹکا ان کے لیے تیار کر رکھا ہے۔

پڑھائی مکمل ہوتے ہی پیشہ وارانہ زندگی کا انتخاب مزید حیران کن تھا۔

ماہنامہ ستر گزشت

48

”تم ٹیچر بننا چاہتی ہو؟“ ماں نے حیرانی سے استفسار کیا۔

”بہنہ نہیں چاہتی مام!! میں ٹیچر ہی بنوں گی۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”تمہارا اطمینان تو یہی بتاتا ہے کہ یہ سب کچھ پہلے سے ہی طے شدہ تھا۔“

”آف کورس پاپا!! یہ سب تو اسی روز طے ہو گیا تھا جب اسکول والوں کی شکایات پر آپ نے مجھے ہدایات کا ایک طویل پلندہ تھما دیا تھا۔“

”میں جانتا تھا، بالکل جانتا تھا کہ تم ایسا ہی کوئی غیر معمولی فیصلہ کرو گی۔“ اس نے صوفے کی کپڑی پر جوش سے ہاتھ مارا۔

”مجھے خوشی ہوئی پاپا کہ آپ اپنی بیٹی کو گہرائی سے سمجھنے لگے ہیں۔“ اینڈریا کے چہرے پر حقیقی خوشی کا تاثر دیکھ کر وہ پدرانہ شفقت سے مغلوب ہو گیا۔

”میں تمہیں اس مہم جوئی سے روکنا نہیں چاہتا اینڈی! لیکن اس میدان میں درپیش معاشی مسائل سے تمہیں آگاہی ضرور دینا چاہوں گا۔“

”مجھے علم ہے پاپا! اساتذہ کی محنت کے بدلے میں انہیں قرار واقعی معاوضہ ادا نہیں کیا جاتا لیکن انہی کے ہاتھ میں مستقبل کی عنان ہوتی ہے۔ یہ اہم ترین ذمہ داری کسی سعادت سے کم تو نہیں۔“

”کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اپنے ہم عمر افراد کو خود سے زیادہ خوشحال دیکھ کر ملال اور خلش کا شکار ہو جاؤ۔“ ماں نے خدشہ ظاہر کیا۔

”ایسا ہرگز نہیں ہوگا مام! اور کبھی میرا ارادہ کمزور ہونے لگا تو اپنی یہی سعادت اور ذمہ داری یاد کر کے خود کو معتبر محسوس کر لیا کروں گی۔“ اس کا عزم مضبوط تھا۔ والدین کو خاموش ہوتے ہی بیٹی۔

☆.....☆

اپنی عزم کی مالک پچیس سالہ اینڈریا کے خیالات پختہ اور ارادے بے حد بلند تھے۔

اس نے سوچ بچار کے بعد ’برینٹ‘ میں واقع ’Alperton Community School‘ میں نوکری حاصل کرنے کی درخواست دے دی۔ برینٹ برطانیہ کے قدرے پسماندہ علاقوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہاں مختلف اقوام کے لوگ رہائش پذیر ہیں۔ علاقہ کی رہائشی عمارات اپنے

جولائی 2018ء

www.bookspk.site

اندر سینکڑوں کینوں کو سموئے ہوئے ہیں۔ ایک فلیٹ میں کئی کئی خاندان اخراجات بانٹ کر رہتے ہیں۔ ایک عمومی اندازے کے مطابق برینٹ کے اسکولوں میں 135 سے زائد زبانیں بولی جاتی ہیں۔ لیٹرٹن کیونٹی اسکول ’کوئڈی‘ کا درجہ حاصل ہونے کے باعث ریاستی سرپرستی حاصل ہے اور یہاں زیر تعلیم طلبہ کے تعلیمی اخراجات برلہ راست حکومت کے ذمہ ہیں۔

مذکورہ اسکول مخلوط نظام تعلیم پر مشتمل ایک ثانوی سطح کا سکھ فورم ادارہ ہے۔ (برطانیہ شمالی آئرلینڈ ویلز اور دولت مشترکہ کے چند ممالک کے نظام تعلیم میں سکھ فورم ثانوی سطح (ہائی اسکول) کے حتی تین سالوں پر مشتمل ایک ادارہ ہوتا ہے جہاں عام طور پر سولہ تا اٹھارہ سال کے بچوں کو ایے لیول یا اس کے متوازی نصاب کی تعلیم دی جاتی ہے) اینڈریا کے لیے نوکری کا حصول آسان ثابت نہیں ہوا تھا کیونکہ عمومی قومی سوچ اور مزاج کے باعث سائنس ریاضی کمپیوٹر انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی کے مضامین کو زیادہ توجہ اور اہمیت حاصل ہو چکی تھی۔ نصاب سے آرٹ کے کئی مضامین ختم کر کے اس شعبہ کے لیے مختص بجٹ میں بھی تخفیف ہونے لگی تھی۔ اس صورت حال میں اینڈریا کے لیے انتظامیہ کو اپنے وجود اور طریقہ تدریس کی افادیت ثابت کرنا پہلی آزمائش ثابت ہوا۔ اس پہ مستزاد طلبہ کا رویہ اور اسکول عمارت کی خشکی اعصاب کے لیے ان کا پابا امتحان بننے لگی۔ عمارت کی کھڑکیاں بند ہونے سے انکاری ہوئیں اور چھتیں ٹپکا کر تیں۔ اسکول میں پہلا دن اس کے لیے ایک ہولناک تجربہ تھا۔

وہ ماہ فروری کا ایک بخ بستہ دن تھا۔ اس روز برفباری ہونے لگی تھی۔ اینڈریا بہت جوش و جذبہ سے کمر لے جماعت میں طلبہ کی منتظر تھی لیکن وہ تو گدھے کے سر سے سینکڑوں کی طرح غائب تھے۔ کچھ دیر بعد جب وہ شور شرابہ اور ہلا گلا کرتے وارد ہوئے تو ان کے ہاتھوں میں برف کے بڑے بڑے گولے تھے جن سے چند منٹوں کے توڑ کر وہ متواتر ایک دوسرے پر اچھال رہے تھے۔ کچھ منٹوں کے تو برف کے وہ ٹکڑے ایک دوسرے کے کوٹ میں ڈال کر محفوظ ہو رہے تھے۔ لاابالی پن غیر ذمہ داری اور نظم و ضبط کے فقدان کی یہ نئی مثال دیکھ کر وہ شدید حیرت زدہ تھی لیکن یہ وقت جذبات سے مغلوب ہونے کا نہیں تھا۔ اس بجڑے ہوئے معاملات کو غیر روایتی طریقہ کار کی مدد سے لے کر دانشمندی سے سلجھانا تھا۔ رستہ طویل اور تنگ آمیز تھا۔ اینڈریا کے بچپن کا حسین خواب تعبیر پانے کے

لے اس کی دسترس میں تھا اور یہ تعبیر بھرپور محنت اور لگن ہی سے مل سکتی تھی۔ حوصلہ مند اور باعزم اینڈریا نے اس مرحلہ سے نمٹنے کی ذہن سازی کرتے ہوئے طلبہ کو بھرپور محنت اور اعتماد کا احساس دلانا شروع کر دیا۔

”عام طور پر بچے اساتذہ کو غیر مرئی افراد سمجھتے ہوئے اس سے قدرے خائف گریزاں اور گلے شکوؤں کا شکار رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ تدریسی عمل ہمیشہ غیر موثر رہتا ہے۔ میں آپ سب کے لیے محض استاد ہی نہیں بلکہ ایک سایہ دار ٹیچر بننا چاہتی ہوں۔ مجھے آپ سبھی کا بہترین دوست بن کر بے حد خوشی ہوگی۔ کمر لے جماعت میں نصاب سے متعلق کوئی مسئلہ ہو یا کوئی اور الجھن، آپ بلا جھجک میرے پاس آئیے۔ آپ کی الجھنیں دور کرنا میری اولین ترجیح اور درحقیقت فرض ہی کی ادائیگی ہوگی۔“

طلبہ نے متبسم انداز میں اس کے جذبے کو سراہا لیکن بچپن ہی سے چہرہ شناسی کا ہنر سیکھ چکی اینڈریا نے لمحہ بھر میں ہی اندازہ لگا لیا کہ ان میں سے اکثریت کی مسکراہٹ بے جان تھی۔ کھوئی کھوئی سی آنکھیں اور بوجھل ذہن کسی اندرونی کشمکش کا احوال بتاتے تھے۔ وہ اپنے تجربات کی رو سے یقینی طور پر یہ کہہ سکتی تھی کہ اس منتشر کیفیت کا تعلق اسکول یا نصابی معاملات سے ہرگز نہیں تھا۔

ذاتی حیثیت میں ان مسائل کا پس منظر جاننے کا ارادہ کر کے اس نے ایک اور معاملہ کو سلجھانے کا فیصلہ کیا جو کافی عرصہ سے التواء کا شکار تھا۔

☆.....☆

اینڈریا کسی گہری سوچ میں گہری ایک ریسٹوران میں بیٹھی تھی۔ اس کے عارض پر ہلکی سی سرخی چھائی تھی اور آنکھوں میں جگنو دک رہے تھے۔

”میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں اینڈی!“ اس کے سامنے بیٹھے خوبرو شخص نے گھمبیر لیکن جذبول سے بھرپور لہجے میں کہا۔ وہ ایک فزیکل ٹرییز تھا اور اینڈریا سے شادی کا خواہاں بھی۔

”میں تمہارے جذبات کی قدر کرتی ہوں جان! لیکن میرے کچھ تحفظات اب بھی برقرار ہیں۔“ اس نے سنسنیل کر جواب دیا۔

”میں تمہارے تمام خدشات اور تحفظات کو ختم کرنے کی بھرپور ضمانت دے سکتا ہوں۔“ جان پُر اعتماد تھا۔ وہ اینڈریا سے ہیئتاً بہت متاثر تھا۔ زندگی کے متعلق اس کے

ماہنامہ ستر گزشت

49

جولائی 2018ء

www.bookspk.site

لاٹری سسٹم



خوشیوں سے لبریز لمحات
جولائی کی دلشین سوغات

اولین صفحات

ایکشن کی گہما گہمی اور سیاست کدہ میں رونما
ہونے والے تغیرات..... محبت اور سیاست
کے اتار چڑھاؤ۔ ایچ اقبال کے قلم سے

انگارے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک چیمپئن
کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی نصف میں آگے بڑھتا
طاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت
سے برسر پیکار نوجوان کی سرگزشت.....

عبدالرب بھٹی کی سلسلے دار کہانی

سرورق کے رنگ

سیاحانہ سیاحی کے ہاتھوں درلودہ کھوں کی خیزہ فزیز کا روٹاں احوال
دل ناتواں سے حالات کا مقابلہ کرنے والوں کا دل گداز فسانہ

جینی نکتہ جینی

آپ کے تمبرے... مشورے... محبتیں...
شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

لگے۔ مرد نے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری اور اٹکتے
ہوئے کہا۔ ”سوری..... آئی..... ناٹ..... انگلش۔“
”میم!! میرے والدین انگریزی زبان پر دسترس نہیں
رکھتے۔ وہ آپ کو روانی سے جواب دینے یا آپ کا مکمل مطمح
نظر سمجھنے سے قاصر ہیں۔“ سیتا نے لب کھلتے ہوئے اسے
بتایا۔

”اوہ!! یہ تو نہایت افسانہ صورت حال ہے۔ میں
ان سے تمہاری غیر حاضریوں کے متعلق استفسار کرنا چاہتی
تھی۔ اسکول میں تمہیں بہت دفعہ سمجھانے پر بھی تم نے اپنی
روش اب تک نہیں چھوڑی۔“

”آپ مجھ ہی سے جان لیں میم!! شاید آپ کو یہی
لگتا ہوگا کہ میں کسی لڑکے کے ساتھ ڈیٹ کے لیے اسکول سے
غائب ہو جاتی ہوں لیکن حقائق اس کے بالکل برعکس
ہیں۔ میرے یہ بے بس والدین برطانیہ کی چکا چوند سے
متاثر ہو کر کسی نہ کسی طرح یہاں آتو بے ہیں مگر زبان دانی
پر عبور سے اب بھی محروم ہیں۔ یہ دونوں ہی نچلے درجے کی
ملازمت سے گھر کا خرچ چلاتے ہیں۔ یہاں کچن کی سہولت
سے استفادہ کرنے کے لیے سات خاندانوں کے چالیس
افراد پہلے سے موجود ہیں۔ ہماری کھانا پکانے کی باری صبح کے
اوقات میں آتی ہے۔ میرے بہن بھائی پرائمری اسکول میں
پڑھتے ہیں۔ یہ ذمہ داری اب میرے ہی کندھوں
پر ہے۔ اسکول سے غیاب کے بعد میں گھر آ کر کھانا بناتی
ہوں۔ ایک روز کا بنایا ہوا کھانا ہم دو سے تین دن استعمال
کر لیا کرتے ہیں۔ یہاں شانتی بالکل ناپید ہے۔ ہم بہن
بھائیوں کو اکثر اپنا ہوم ورک ہاتھ روم میں مقفل ہو کر
کرنا پڑتا ہے۔“ سیتا کے انکشافات اینڈریا کے لیے چشم
کش تھے۔

”میں تمہاری اس جدوجہد کی قدر کرتی ہوں میری
بچی! لیکن تعلیم بھی تو ضروری ہے ناں!“

”مجھے اس حقیقت سے کب انکار ہے میم!! لیکن
کیا میری بلاناغہ حاضری پر انتظامیہ مجھے اسکول میں کھانا پکانے
کی اجازت دے سکتی ہے؟“ سیتا نے صاف گوئی سے کہا۔
اس روز جب اینڈریا اپنے گھر لوٹی تو اس کے ذہن
میں دو سوالات نے اوجم بجا رکھا تھا۔ انتظامیہ کو ان سختی طلبہ کی
مدد کے لیے کس طرح قائل کیا جائے اور انگریزی زبان سے
نابلد والدین سے بات چیت کے لیے کون سا رستہ
اپنایا جائے؟ اول الذکر تو اس کے لیے ایک طویل اور دشوار

جان سے شادی کے بعد اینڈریا کی زندگی میں ایک
نیا اعتماد پیدا ہو گیا۔

اس کی نجی زندگی بہت ہموار اور پُر کیف ہو چکی تھی لیکن
پیشہ وارانہ زندگی کے مسائل میں ناخوشگوار اضافہ ہی ہوتا چلا جا
رہا تھا۔ وہ اپنے طلبہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی قائل تھی
مگر طلبہ میں نظم و ضبط کا فقدان بھی اسے قبول نہ تھا۔ ان کی شخصی
خوبیوں کو پروان چڑھانے کے لیے بھی کسی سمجھوتے کی وہ
قائل نہیں تھی۔ ایسے میں جب ایک ایشیائی طالبہ نے اس کی
جماعت سے غائب ہونا شروع کر دیا تو یہ جسارت وہ
کیونکر قبول کر پاتی؟

اس موقع پر پیشہ وارانہ اخلاقیات کا مظاہرہ کرتے
ہوئے اس نے انتظامیہ کو سب سے پہلے آگاہ کیا۔
”طلبہ میں اسکول سے بھاگنے کی شرح تشویشناک حد
تک بڑھتی چلی جا رہی ہے اور قابل غور بات تو یہ ہے کہ ان
میں اکثریت ایشیائی افراد ہی کی ہے۔“ ایک انتظامی
عہدیدار نے کہا۔

”ہمیں ان عوامل پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت
نہیں ہے کیا؟“ اینڈریا نے متانت سے جواب دیا۔
”انتظامیہ جلد ہی اس بارے میں کوئی حکمت عملی
مرتب کر لے گی۔“ بے نازی سے کہا گیا۔

اس مبینہ حکمت عملی کے انتظار میں اینڈریا مذکورہ لڑکی کو
مزید بدظنی کے مواقع فراہم نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے سیتا کے
والدین کو اسکول طلب کیا لیکن وہ آگے ہی نہ دیئے۔ بہت
سوچ بچار کے بعد اینڈریا نے اس کے گھر جانے کا فیصلہ
کر لیا۔ گویہ عمل آؤٹ آف یو تھا لیکن فرض کی پکار پر وہ
کچھ بھی کرنے کے لیے تیار تھی۔ سیتا کے گھر جاتے ہی جو
صورت حال اس کے سامنے آئی وہ حقیقتاً پاؤں تلے سے زمین
ٹکانے والی تھی۔

وہاں داخل ہوتے ہی اس کا سامنا ایک جم غفیر سے
ہوا۔ مختلف رنگ و نسل کے ان افراد کا ہجوم دیکھ کر وہ بوکھلاہٹ
کا شکار ہو گئی۔ سیتا کے والدین جھپکتے ہوئے اسے ایک کمرے
میں لے گئے جہاں کئی افراد پہلے سے موجود تھے لاغر صحت اور
مسلے ہوئے کپڑے پہنے وہ دونوں افراد کسی بھی طور پر برطانیہ
کے رہائشی معلوم ہی نہیں ہو رہے تھے۔

”میں آپ سے سیتا کی بابت کچھ بات چیت
کرنا چاہتی ہوں۔“ اینڈریا نے سنجیدگی سے کہا۔
ان کے چہرے سے یکدم ہی ناقابل فہم اثرات جھلکنے

نظریات اور عزم تو ایک مدت سے اپنا اسپر بنائے ہوئے
تھے۔ دوسری جانب اینڈریا نے بھی قبل ازیں کسی بھی مرد کے
لیے ایسے خصوصی جذبات محسوس نہیں کیے تھے۔ گھر بسانے کی
جلی آرزو اس کے اندر بھی پوری شدت سے موجود تھی۔ وہ اس
حقیقت سے بھی با علم تھی کہ کار حیات میں کسی بھی خطے کی
عورت کے لیے والد سے زیادہ شوہر کا حوالہ معتبر ہوا کرتا ہے۔
اس مضبوط سائبان کے بغیر حاصل کی گئی ہر نسوانی کامیابی ازل
سے ہی متنازع قرار دی جاتی رہی ہے۔

ان جذبات سے قطع نظر اس میں پیشہ وارانہ زندگی کے
خواب اور اصول محبت و چاہت پر قربان کرنے کا یارا بھی نہ تھا۔
”میں اپنی جاب نہیں چھوڑ سکتی!“ اس نے دو ٹوک
بات کرنے کی ٹھان لی۔

”تمہیں چھوڑنی بھی نہیں چاہیے۔“ وہ مسکرایا۔
”پیشہ وارانہ زندگی کی اہمیت میرے لیے بے حد مسلم
ہے۔“

”میری وجہ سے کبھی زندگی کے ان دودھاروں
کا تصادم نہیں دیکھو گی تم۔“
”میرے عزائم کی پرواز بہت بلند ہے۔“ وہ اس کی
آنکھوں میں جھانک کر بولی۔
”میری محبت کی اڑان اسے ہمیشہ محفوظ آڑ فراہم کرتی
رہے گی۔“

”سنا ہے مرد کبھی اپنی بیوی کو کسی بھی بیرونی سرگرمی
یا ذمہ داری کے ساتھ بانٹ نہیں سکتا۔“
”ادھوری حقیقت ہے، تم یقیناً یہ نہیں جانتی کہ مرد کے
لیے مخلص اور با وفا عورت کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں
ہوتی۔ مجھے تمہارے خلوص اور احساس ذمہ داری ہی نے سب
سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ جو عورت اپنی پیشہ وارانہ زندگی کے
لیے اتنی مخلص ہو سکتی ہے وہ ذاتی زندگی میں بھی بہت وفا شعار
ثابت ہوگی۔ اگر میرا گھر اور زندگی اسی وفا کے زیر اثر رہے
تو مجھے بھلا تمہاری کسی بھی بیرونی مثبت سرگرمی سے اعتراض
کیوں ہوگا؟“

وہ ایک جادوئی لمحہ تھا۔ اینڈریا کو اپنا وجود بہت
معتبر محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا وجدان گواہی دے رہا تھا کہ جان
ہی اس کے لیے مثالی شریک حیات ثابت ہوگا۔ اس نے
مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ اسے تھما دیا۔ محبت کی سند خوبصورت
انگوٹھی کی صورت میں اینڈریا کی انگلی میں جکھلنے لگی۔

☆.....☆

مرحلہ ثابت ہوتا تھا تاہم مؤخر الذکر کا منطقی حل اس کے اپنے اختیار میں تھا۔ اس نے جان سے مشاورت اور... اس کی رضامندی کے بعد مختلف غیر ملکی زبانیں سیکھنے کا باقاعدہ آغاز کر دیا۔

☆.....☆

”اینڈریا! میں نے سنا ہے کہ تم ایشیائی زبانیں سیکھ رہی ہو۔“ کچھ عرصہ بعد اسکول میں ایک قریبی ساتھی نے حیرانی کا اظہار کیا۔

”بالکل درست سنا ہے۔“ وہ مسکرائی۔ ”میں تمہیں اس قدر بے وقوف نہ سمجھتی تھی۔ تم اپنی توانائی اور وسائل اس طرح کیوں ضائع کر رہی ہو؟“ ”کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے۔ طلبہ اور ان کے والدین سے بہتر رابطہ کے لیے یہ سب ضروری ہے۔“ ”آپہیں اس قدر سنجیدہ لینے کی ضرورت ہی کیا ہے آخر؟ یہ ایشیائی تو ویسے بھی ہمارے ملک کا ناسور ہیں۔“

”بہت غیر مناسب سوچ ہے تمہاری!! وہ ہمارے ملک کو بہتر اور برتر سمجھ کر یہاں آتے ہیں۔ جوابی طور پر ہمارا بھی فرض بنتا ہے کہ ان کے مسائل کو سمجھیں۔ یہ مہاجر بھی اسی خدا کی تخلیق کردہ مخلوق ہیں جس نے ہمیں ایک بہتر زندگی عطا کی ہے۔“ ”میں تم سے متفق نہیں ہوں۔“ مقابل نے نخوت سے کہا۔

”ہمارا یہی رویہ معاشرے میں عدم توازن اور نا انصافی ہی اصل بگاڑ کا سبب بنتے ہیں۔ اگر ہم ان کے مسائل کا حل تلاش کرنے میں مدد نہیں کریں گے تو یہ مایوسی اور ناامیدی کی کھائیوں میں گر کے جرائم کی راہیں اپنا کر ہمارے ہی ملک کے لیے نقصان دہ ثابت ہوں گے۔ آج وقت اور وسائل ہمارے ہاتھ میں ہیں تو کل کے لیے ملال اور پچھتاؤں کی فصل کیوں بوٹی جائے؟“

”میں تمہیں صرف یہ سمجھانا چاہتی ہوں اینڈریا کہ اپنی اولاد کے مستقبل کے لیے بھی کچھ سوچو۔ ان غیر فروغی معاملات میں الجھ کر کیوں وقت گنوارہی ہو؟“

”یہ چودہ سوطبہ بھی میری اولاد ہی کی طرح ہیں کیسی! لیکن تم شاید میرے جذبات بھی نہیں سمجھ سکو گی۔“ اس نے نرمی سے کہہ کر بات ختم کر دی۔

☆.....☆

وقت کا پچھی اپنی مخصوص پرواز سے روز شب کا سفر

طے کرتا کئی سالوں کے پڑاؤ عبور کر گیا۔

اینڈریا کی محنت اور لگن روز اول کی طرح قائم و دائم تھی۔ اس کی شفقت، محبت، نرمی، خلوص اور دانشمندی طلبہ کے لیے زاد راہ بن چکی تھی۔ وہ اپنے روزمرہ کے کبھی مسائل کے حل کے لیے اس کی رہنمائی کے طالب ہونے لگے۔ ان کی مدد کے بعد اسے روحانی و دلی سکون نصیب ہوا کرتا۔ ان کی تکلیف پر وہ خود بھی جی جان سے تڑپ اٹھتی۔ ایسے ہی ایک روز آمنہ نامی ایک طالبہ کے چہرے اور ہاتھوں پر خراشیں دیکھ کر وہ لرز سی گئی۔

”یہ سب کیا ہے آمنہ؟ ایسا کس نے کیا؟“

”میم! کیا آپ واقعی انجان ہیں؟“ وہ تلخ ہوئی۔

اینڈریا کی تشویش مزید بڑھ گئی۔ اسکول کے اندرونی معاملات میں سدھارا اپنی جگہ مسلم سہی لیکن بیرونی عوامل ہنوز شدید بگاڑ کا شکار تھے۔ ان میں سرفہرست برینٹ کی امن وامان کی صورت حال تھی۔ یہاں فکل و غارت کی شرح دیگر برطانوی علاقوں کی نسبت سب سے زیادہ تھی۔ جرائم پیشہ افراد نے مختلف اور منظم گروہ بنا رکھے تھے جن کا خصوصی نشانہ تعلیمی ادارے ہوا کرتے۔ غشیات فروشی سے لے کر جنسی تشدد کے واقعات وہاں ایک معمول تھے۔ اسکول کی حدود سے نکلتے ہی طلبہ غیر محفوظ ہو جاتے تھے۔

”یہ واقعہ کہاں پیش آیا تھا؟“ اس نے پناغصہ ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

”بغلی سڑک پر۔ وہ دو یحیم شیم افراد تھے۔ میرا اسکارف نوج ڈالنے کے بعد وہ مجھے گھسیٹ کر وہیں کی فلیٹ میں لے جانا چاہتے تھے لیکن میں نے انہیں کامیاب نہیں ہونے دیا۔ یہ خراشیں اسی جدوجہد میں پڑی تھیں۔“

”تم نے بہت اچھا کیا میری بچی!! اب وقت آ گیا ہے کہ کوئی انقلابی قدم اٹھا لیا جائے۔“ اس نے ایک عزم سے کہا۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ کچھ عرصہ قبل ہی اس نے انتظامیہ سے تفصیلی بات چیت کی تھی۔ طلبہ کو ایک خاص حد تک ہی سیکورٹی فراہم کی جاسکتی تھی۔ ہر ایک فرد کے ساتھ گھر پہنچنے تک انفرادی سیکورٹی گارڈ روانہ کرنا بعد از عقل تھا۔ اسکول ٹرانسپورٹ اور پیدل آمد و رفت والے طلبہ کی حفاظت کے لیے اینڈریا کے فراہم کردہ منصوبے کو تھوڑی سی رد و کد کے بعد منظور کر لیا گیا۔

اگلے روز جب وہ کمرے جماعت میں مئی تو اس کے پاس ایک تیز دھار چاقو بھی موجود تھا جو اس نے بچوں کے سامنے

رکھ دیا۔

”یہ کیا ہے بھلا؟ اس سے واقف ہیں ناں آپ؟“ ”جی میم!! یہ ایک چاقو ہے۔“ وہ سمجھ ہی نہیں پارہے تھے کہ اس نے یہ کون سی نئی کسوٹی کھینچی شروع کر دی ہے۔

”آپ جزوی طور پر درست ہیں۔ یہ محض ایک چاقو نہیں بلکہ آپ کی عزت اور زندگیوں کی بقاء کی ضمانت ہے۔ آپ سب اسے اپنے ساتھ رکھا کریں گے۔“ ”کیا واقعی میم؟“ وہ حیران ہوئے۔

”یاد رکھیے!! قانون ہمیں اپنے دفاع کا حق بھی ادا کرتا ہے۔ اگر آپ کو کہیں بھی اپنی زندگی یا عزت خطرے میں محسوس ہو تو یہ ساتھی آپ کی یقینی حفاظت کرے گا۔ مجرم ہمیشہ بہت بزدل ہوتا ہے۔ وہ آپ کا حوصلہ عزم اور ولولہ بھی بھی سہہ نہ پائے گا۔ اسے بالآخر بھاگتے ہی سنے گی۔ آج سے ٹرانسپورٹ میں جانے والے طلبہ کو میں اور دیگر اساتذہ اپنی نگرانی میں اسٹینڈ تک لے جایا کریں گے۔ ہماری مدد اور تعاون ہر طرح سے آپ کے شامل حال رہے گا۔“

”یہ مجھے دے دیجیے میم! آج آپ یہ راہ نہ دکھاتیں تو میں تعلیم کو خیر باد کہنے کا ذہن بنا چکی تھی۔“ آمنہ کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔

”اپنا محاذ چھوڑ دینا سب سے بڑی بزدلی اور آدمیت کی توہین ہوتی ہے میرے بچو!! مجھے یقین ہے آپ کبھی بھی ایسا نہیں کریں گے لیکن یہاں ایک اور بات بھی واضح کر دوں کہ اگر اس چاقو زنی کو کبھی انتقامی یا کسی بھی غلط مقصد کے لیے استعمال کیا گیا تو اس فرد کو سب سے پہلے میں ہی قانون کے حوالے کروں گی۔ ذاتی دفاع کو قانون شکنی کا جواز بھی ہرگز نہیں بنایا جاسکتا۔“ اس کی ہموار آواز اور چٹائی لہجہ وہاں بیٹھے بھی طلبہ کے دل و دماغ میں گھر کر رہا تھا۔

عزم و حوصلہ کے بادل تبدیلی کی گھٹائیں برسانے کے لیے تیار تھے۔

☆.....☆

35 مختلف ایشیائی، افریقی اور یورپی زبانیں سیکھنے کے بعد اینڈریا کے لیے تدریسی عمل بہت پُر لطف ہو چکا تھا۔ اس کے مضامین میں طلبہ کے نتائج دیگر اساتذہ کے لیے قابل رشک تھے تو انتظامیہ کے لیے قابل فخر۔ سب سے حیران کن امر تو یہ تھا کہ پیرنٹس ٹیچر میٹنگز کے سلسلہ میں وہ والدین جو اپنی زبان دانی کے احساس کمتری میں اسکول آنے سے ہمیشہ گریزاں رہتے تھے اب بخوشی وہاں

آنا پسند کرتے۔ سالہا سال سے طاری جمود ٹوٹنے لگا تھا۔ وہ اپنے تحفظات بیان کرتے اور اینڈریا کی تشفی پا کر پُرسکون ہو جاتے۔ ان میں سے اکثریت اپنے بچوں کے آرٹس مضامین پڑھنے پر معترض ہوتی۔

”ہم تو چاہتے تھے کہ یہ سائنس مضامین پڑھ کر کامیابی اور خوشحالی کا سفر طے کرتے۔ آرٹس کی تو کوئی وقعت ہی نہیں ہے۔ ہمارے خاندان میں کبھی بچے میڈیکل، انجینئرنگ، نیورو سائنس، اسپیس سائنس اور کمپیوٹر پڑھ رہے ہیں۔“

”کامیابی اور خوشحالی کی کتنی سائنس نہیں بلکہ بچے کا اپنا ذہنی میلان ہوتی ہے۔ اس کی عملی مثال میری صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ میرے والدین بھی آپ ہی کی طرح بہت چھیں بہ چھیں ہوتے تھے لیکن آج وہ سب میری کامیابیوں پر نازاں ہیں۔ آرٹ کو معمولی اور بے وقعت مت سمجھیے۔ یہی وہ رہگذر ہے جو بچوں کو اپنے مسائل خود حل کرنے کی طرف سفر کرواتا ہے۔ ان میں خود اعتمادی اور خود شناسی پیدا کرتی ہے۔“

ان سوالات کے علاوہ ایک اور سنجیدہ مسئلہ بھی بہت سے اساتذہ کے لیے دردِ سر تھا۔ ایشیائی والدین کی چند شخصیتی قباحتیں ان کے بچوں کی تعلیمی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوا کرتی تھیں۔ اینڈریا ایسے افراد کی نفسیاتی گرہیں بہت سہاؤ سے کھولتی۔ وہ ان کے تحفظات کے جواب میں صرف ایک ہی بات کہتی۔ ”بچہ ایک نازک پھول ہوتا ہے۔ وہ اپنے تحفظ اور نمو کے لیے والدین کی بہترین شخصیت کا محتاج ہوتا ہے۔ اگر آپ ان کے سامنے جھگڑیں گے آپس میں مار پیٹ کریں گے یا ان کے ساتھ غصہ اور سختی سے برتاؤ کریں گے تو جوابی طور پر عزت، تابعداری یا بہترین تعلیمی نتائج کی توقع رکھنا آپ کی حماقت ہے۔ ان سے اپنی بات منوانے سے قبل ان کے نفسیاتی تقاضے پورے کرنے بھی تو سیکھیں۔“

اینڈریا کی انہی ان تھک کوششوں کا نتیجہ تھا کہ وہ کیونٹی اسکول برطانیہ کے بہترین تعلیمی اداروں میں شمار ہونے لگا۔ اسے اسکول کی انتظامی کمیٹی میں شامل کر لیا گیا۔ اس کے بعد اس نے کبھی پلٹ کر نہ دیکھا۔ اب وہ انتظامی فیصلہ آزادانہ طور پر بھی کر سکتی تھی۔ اس نے اسکول کی دیواروں پر ادارے کا ’اصول عمل‘ (خواہش کرو..... محنت کرو..... اور کامیابی پالو۔) لکھوا دیا۔ لڑکیوں کے لیے الگ کرکٹ ٹیم بنائی گئی۔ انہیں لڑکوں کے ساتھ کھیلنے میں تحفظات درپیش رہتے تھے

جس کے نتیجے میں کارکردگی بھی اثر انداز ہو جاتی۔ اس انقلابی قدم کے بعد وہ کامیابیوں کے نئے میدان سر کرنے لگیں۔ اسکول کے دفتر کی الماریوں میں دیدہ زیب ٹرافیاں اور انعامی شیلڈز کی بہتات ہونے لگی۔ اینڈریا کی صوابدید پر ایک باکنگ کلب قائم کرنے کے علاوہ یوگا سکھانے کا اجراء بھی کیا گیا۔ ان سرگرمیوں سے طلبہ کی مثبت توانائیاں مزید نکھر کر سامنے آنے لگیں۔ وہ ایک ساحرہ بھی جو اپنے طلبہ کو مسحور کر کے ان کی زندگیاں ہی بدل دیا کرتی۔ ان کی نفسیاتی الجھنیں دور کرنے کے لیے اس نے نئی بار مالی مدد بھی کی۔ احساس کمتری کے آسیب سے نجات دلوانے کے لیے انہیں اپنی صوابدید پر معاشی وسائل فراہم کرتی رہی۔ اس کے خلوص کی چاشنی میں گھرے وہ بچے جب اس 'قرض' کی ادائیگی کا پوچھتے تو وہ بہت محبت سے گویا ہوتی۔ "سجیدگی اور ایمانداری سے اپنی تعلیم مکمل کر لو۔ یہی اس قرض کی ادائیگی ہوگی۔ مستقبل میں جب کسی اچھے مقام پر پہنچ جاؤ تو اپنے ارد گرد ایک بار نظر ضرور دوڑانا کہ کہیں کسی کو تمہارے سہارے کی ضرورت تو نہیں۔"

اینڈریا اپنی نوعیت کی پہلی معلمہ تھی جو طلبہ کو ناشتے کے بارے میں پوچھتی 'زائد وقت میں ان کی مدد کے لیے کھانا پکانے سے لے کر کپڑے دھلوانے میں ہاتھ بٹا دیا کرتی۔ طلبہ اور والدین اس کے گردیدہ ہوتے چلے گئے۔ الپٹرن کیونٹی اسکول کی دھوم ملک کے طول و عرض میں پھیلنے لگی۔ والدین دیگر تعلیمی اداروں سے اپنے بچوں کے انخلا کے بعد انہیں اینڈریا کے پاس بھیجنا پسند کرتے۔ ادارے کے دیگر شعبہ جات (ریاضی، موسیقی، کمپیوٹر) اپنے نتائج میں بہتری کے لیے اسی سے مدد کے طالب رہتے۔ ان پیشہ وارانہ سرگرمیوں میں وہ اپنے ذاتی فرائض سے بھی بالکل غافل نہ تھی۔ اس کے چمن میں دو پھول کھلے تھے۔ مصروفِ تر زندگی میں جان کی محبت بھی روز اول ہی کی طرح برقرار تھی۔ وہ اس کی ذہنی تھکاوٹ پیشہ وارانہ مسائل کا تناؤ اپنی پُر خلوص محبت اور وارفتگی سے چن لیا کرتا۔

اینڈریا کی مصروفیات کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک مدت سے ٹیلی ویژن دیکھنا فراموش کر چکی تھی۔ تین گھنٹے کی نیند لینے کے بعد صبح ساڑھے سات بجے اسکول روانہ ہوتی تو شام ساڑھے پانچ بجے سے قبل شاذ ہی فرصت مل پاتی۔ کھانے کے وقفے میں بھی مؤخر پر دیکھ لیتیں پر کام چلتا۔ گھر آنے کے بعد بھی یہ سلسلہ ختم نہیں پاتا تھا۔ اپنے بچوں اور شوہر کی روزمرہ

ماہنامہ سرگزشت

ضروریات پوری کرنے کے بعد اس کے کام کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو جاتا۔ یہی وہ وقت تھا جب مزید بہتر نتائج حاصل کرنے کے لیے اس نے ایشیائی اور دیگر غیر ملکی طلبہ کو ان کی ثقافت اور قومی روایات سے متعلقہ پروجیکٹس کے ساتھ تعلیم دینے کا آغاز کر دیا۔

"یہ نیا بکھیرا کیوں پیدا کر لیا ہے اینڈریا؟ وہ برطانوی شہری ہیں۔ انہیں بھی اسی طریقہ سے تعلیم دو جیسے عام برطانوی حاصل کر رہے ہیں۔" ایک ساتھی نے قدرے کوفت سے کہا۔

"وہ برطانوی شہری ضرور ہیں ایڈم! لیکن ان کا ضمیر اس مٹی سے نہیں اٹھا۔ تم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ کوئی بھی پودا صرف اسی زمین میں نمو پا کر شجر بنتا ہے جہاں اس کی جڑیں پیوست ہوں۔ ان بچوں کو ہماری تہذیب، ثقافت، ماضی اور آرٹ سے زیادہ اپنے ملک سے محبت ہے اور سدا رہے گی۔ ان کے جذبے کا احترام کرتے ہوئے اگر ہم تھوڑا منفرد طریقہ اختیار کر لیں تو یہی افراد مستقبل میں برطانیہ کے لیے خلوص اور لگن سے پیشہ وارانہ فرائض سرانجام دیں گے۔ میں آج اپنی ذات پر یہ زائد مصروفیت جمیل کر اپنے ملک کے لیے وفادار ایماندار اور مثبت توانائی کی حامل افرادی قوت تیار کر رہی ہوں۔ بصورت دیگر یہ مٹنی سوچ، نیزاری اور مایوسی میں مبتلا ہو کر ہماری معیشت کے لیے بوجھ ثابت ہوں گے۔"

"تم بے حد عجیب عورت ہو اینڈریا! میں تمہارے یہ فلسفے کبھی سمجھ ہی نہیں پایا۔" ایڈم نے کہا۔

"میں صرف ایک عورت نہیں ہوں ایڈم!! میں ایک معلمہ ہوں۔ اپنے ملک کا مفاد میرے لیے کسی بھی جذبہ سے بڑھ کر ہے۔" اس نے کندھے اچکائے۔

ایڈم کی بات شاید جزوی طور پر ٹھیک ہی تھی۔ اینڈریا واقعی ایک عجیب عورت تھی کیونکہ وہ ہر صبح اپنے طلبہ کو 'سلاما علیکم'..... 'نمستے'..... 'وراکم' اور 'ست سری اکال' کہہ کر کوشدلی سے استقبال کرتی۔ وہ واحد معلمہ تھی جس کے پاس والدین کی آمد کا تناسب پچانوے فیصد ہوتا۔ اس کی انہی عجیب و غریب حرکات ہی کا شاخسانہ تھا کہ خستہ حال اور گنہگار الپٹرن کیونٹی اسکول بارہ سال کے عرصہ میں ہی برطانیہ کے نامور اداروں میں شمار ہونے لگا تھا اور جرائم و آوارگی کی راہیں اپنانے والے طلبہ یونیورسٹی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اعلیٰ عہدوں پر تعینات ہونے لگے۔ اس کے چند سابقہ اور موجودہ ساتھیوں نے

اصرار کر کے اینڈریا کا نام 'گلوبل ٹیچرز پرائز' میں نامزد کروا دیا۔ اس کی لگن اور کامیابیوں نے ورکی فاؤنڈیشن کو متاثر کیا اور 'تیس ہزار اینٹریز' میں سے کانٹ چھانٹ کے بعد اسے چالیس امیدواروں میں شامل کر لیا گیا۔

اینڈریا اعداد و شمار کے اس بہر پھر سے بے نیاز اپنے کام کو نکھارنے میں مگن تھی۔

"کیا برینٹ سے تمام جرائم پیشہ افراد کا صفایا ہو گیا ہے یا ہمارے ملک نے تیسری دنیا پر نظریں گاڑے دخل اندازی کرتے یورپی ممالک کا مزید اتحادی نہ رہنے کا اعلان کر دیا ہے؟ اگر ایسا کوئی تہلکہ مچا ہے تو میں واقعی بے خبر ہوں۔" اس نے مصروف سے انداز میں کہا۔

"ارے غافل!! ورکی فاؤنڈیشن کی جانب سے تمہیں حتیٰ دس بہترین امیدواروں میں شامل کر لیا ہے۔ یہ تمہاری بے مثال کامیابی ہے۔ اگر یہ مقابلہ تم جیت جاؤ تو ملین ڈالرز کے انعام کی حقدار بنو گی۔ کیا کرو گی بھلا اس رقم کا؟"

"تم شاید یہ نہیں جانتی کہ اس مقابلہ کا فاتح مزید پانچ سال کے لیے اپنے تدریسی شعبہ سے منسلک رہنے کا پابند ہوتا ہے۔ میں بھی آرٹ اور ٹیکسٹائل کی ترقی اور فلاح کے لیے عملی اقدامات اٹھاؤں گی۔" وہ بے نیازی سے بولی اور پھر ایک توقف سے گویا ہوئی۔ "اس دنیا میں بلحاظ کارکردگی و جدوجہد میں ہی سب سے کمتر معلمہ ہوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ بقیہ نو افراد مجھ سے کہیں زیادہ قابلِ مستحق اور بے مثال ہوں گے۔ اس لیے میں کسی بھی خوشی کا شکار نہیں ہوں۔" اینڈریا کے ان الفاظ پر تقدیر وہیں کھڑی خندہ زن تھی۔ ورکی فاؤنڈیشن کی جانب سے دعویٰ آمد کا دعوت نامہ ملنے وسیع و عریض ہال میں دنیا کے لائٹانی اساتذہ کے ساتھ بیٹھنے اور اس کا نام پکارے جانے، عرب امارات کے حاکم شیخ محمد بن راشد النخومت کے ہاتھوں ایک جگمگاتی ٹرافی ملنے کے تمام تر مراحل اس کے لیے کسی خواب جیسے ہی تھے۔ تالیوں سے گونجتے ہال اور کیمروں کی چکاچوند روشنیوں میں اس کی ہزاراد ایک بار پھر اس کے پاس آن کھڑی ہوئی۔

"دیکھ لو اینڈریا!! میں نے کبھی بھی یہ سب تمہارے لیے ہی تو سب سے زیادہ سہل ہوگا اور تم ان بچوں کے درد کا درماں اور چارہ گر ضرور ثابت ہو گی۔" اس نے چپکے سے سرگوشی کی۔

"مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا۔ یہ سب یقیناً کوئی خواب ہے۔" اینڈریا کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی۔

☆.....☆

بہتر وائیر پورٹ پر کسی تہوار اور جشن کا ساماں تھا۔ سینکڑوں طلبہ و رجمنوں سیاسی اور معزز شخصیات اینڈریا کے استقبال کے لیے موجود تھیں۔ اسے ایک خصوصی گاڑی میں بٹھا کر پارلیمنٹ لے جایا گیا جہاں وزیراعظم، تھریسٹن سے ملاقات پہلے سے طے شدہ تھی۔ سیکرٹری تعلیم اور وزیراعظم کے تعریفی کلمات کے عقب میں اسے بچپن میں بیٹے سانحہ کی بازگشت بھی سنائی دے رہی تھی۔ اپنے ان اساتذہ کی پیش بینی کے مطابق وہ نفسیاتی عدم توازن کا شکار تھی نہ ہی والدین کے خدشات کے لحاظ سے معاشی تنگی پر احساس محرومی میں مبتلا۔ اس کے پاس دنیا کی بہترین معلمہ کا اعزاز تھا جو اس کے طویل سفر کی کامیابی کی ضمانت تھا۔

"آپ کی بے مثال کامیابی ہمارے لیے قومی اثاثہ ہے۔ یقیناً یہ سفر کبھی آسان ثابت نہیں ہوا ہوگا۔ اس موقع پر ہم نظام تعلیم میں آپ کی متعین کردہ اصلاحات سے شناسائی حاصل کرنا چاہیں گے۔" سیکرٹری تعلیم نے منانت سے کہا۔

"تعلیم ایک مقدس عمل ہے۔ اسے کسی کے لیے بھی بوجھ نہ بنائیے۔ آج اساتذہ کو بیگار کی طرح سات پاؤنڈ فی گھنٹہ کے حساب سے تنخواہ دی جاتی ہے۔ انہیں معاشی بوجھ سے آزاد کرنے میں ہی ہمارے تعلیمی نظام کی فلاح ہے۔ وہ آپ کی نسل کو ایک نیا دوج عطا کر سکتے ہیں۔ مہاجرین اور تارکین وطن کو اپنائیت دیجیے۔ بدلے میں وہ اپنی وفاداریاں اور خلوص آپ کے نام کر دیں گے۔ انسانیت کی فلاح جنگ و جدل اور سرحدیں بڑھانے میں نہیں بلکہ اپنے باشندوں کو انسانیت کی معراج عطا کرنے میں ہے۔ میں برطانیہ میں ایسا نصاب رائج دیکھنا چاہتی ہوں جو طلبہ مساوات کی افزائش اور تعصبات کا خاتمہ کرے۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔

ملک کے دوسری عہدیداران کی سوچ میں ڈوبی آنکھیں اس بات کی گواہی دے رہی تھیں کہ اسے جلد یاد پیرا اپنے سفر کے لیے مزید راہ اور سہولیات ضرور میسر آئیں گی۔



بابائے کراچی

شکیل صدیقی



عروس البلاد کراچی جو آج دنیا بھر میں ایک پہچان رکھتا ہے، کبھی چند جھونپڑیوں پر مشتمل تھا۔ مائی کلانچی سے شہر کراچی کا ایک طویل سفر ہے۔ مجھیروں کی اس چھوٹی سی بستی کو میٹروپولیٹن شہر میں تبدیل کرنے میں بے شمار افراد کی محنت ہے مگر اس بندے نے تو شہر کو ترقی دینے کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔

ان حسن کاتہ کہ جس نے کراچی کو ترقی کی ادج پر پہنچایا

نسروانجی رستم جی مہتا کے صاحبزادے جمشید نسروانجی 7 جنوری 1886ء کو کراچی میں پیدا ہوئے اور 66 برس کی عمر میں یکم اگست 1952ء کو کراچی ہی میں وفات پائی۔ وہ نسلاً باری تھے۔ انہوں نے ایک پرائیویٹ پرائمری اسکول میں تعلیم پائی تھی جو آج بھی آر پی ہادی اسکول کے نام سے صدر میں کے ایم سی کی گمرانی میں چل رہا ہے۔ انہوں نے وی سی اسکول سے میٹرک کیا (جو اس وقت وہاں قائم تھا جہاں اب ڈاؤ میڈیکل کالج بنا دیا گیا ہے) اس کے بعد انہوں نے دیا رام جھٹال کالج میں تعلیم حاصل کی۔

جمشید کے والد نسروانجی رستم ایک تاجر تھے جو دور اندیش، باہمت، جوش و ولولہ رکھنے والے ہشت پہلو شخص تھے۔ جب کہ ان کے دادا ڈاک خانے میں ملازم تھے۔ ان کے والد نے غیر ملکی شراب اور دیگر چیزوں کی ایک دکان لفٹن روڈ پر کھول رکھی تھی۔ رفتہ رفتہ انہوں نے دکان کو

ماہنامہ سرگزشت

56

جولائی 2018ء

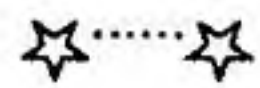
بڑھانا شروع کر دیا۔ برف کارخانہ لگا لیا، پھر آٹے کا ایک کارخانہ قائم کیا، اس کے بعد انہوں نے ٹائلز بنانے کی فیکٹری بھی لگالی۔ جب یہ کاروبار چل پڑا تو انہوں نے تیل کے ایک کارخانے کی بنیاد ڈالی۔ قدرت کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کارخانے میں بھی انہیں منافع ہونے لگا۔ نسروانجی رستم کی ہمت بڑھی اور انہوں نے ایسے چھوٹے چھوٹے مزید کارخانے قائم کرنا شروع کر دیے۔ چند برسوں کے بعد انہوں نے صوبہ پنجتوخواہ میں ریلوے کینٹین کے ٹھیکے بھی لے لیے۔ انہیں یقین تھا کہ کاروبار میں جتنی ترقی ہوگی۔ لوگوں کو کام ملے گا اور روزگار میں اضافہ ہوگا۔

جمشید نسروانجی مہتا بچپن میں خوب کھیلتے کودتے تھے وہ تعلیم کے ساتھ کھیلوں سے بھی شغف رکھتے تھے۔ اس زمانے میں انہیں کرکٹ سے بھی بہت دل چسپی تھی۔ اس کے علاوہ شاید ہی کوئی ایسا کھیل ہوگا جو انہوں نے نہ کھیلا ہو۔ ہراکی، ٹینس اور کشتی وغیرہ۔ مگر وہ عام لڑکوں کی طرح بے سرو پانداق اور ٹھنڈے بازی نہیں کرتے تھے۔ وہ طبعاً سنجیدہ تھے۔ قاتلو وقت وہ لاہوری میں گزارتے تھے۔ گریجویشن کرنے کے بعد انہوں نے والد کا کاروبار سنبھال لیا۔ وہ دیکھنے میں دوسروں سے زیادہ خوبصورت لگتے تھے، خاص طور پر ان کی آنکھیں قاتلانہ تھیں، چنانچہ لڑکیاں ان کے گرد منڈ لایا کرتی تھیں۔ لیکن وہ کسی کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے۔

اپنے زمانہ طالب علمی میں وہ رابرٹ بیڈن پاؤل کی اسکاؤٹ تنظیم سے بہت متاثر ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے اسکول کے اساتذہ سے مشورہ کر کے بوائے اسکاؤٹ تنظیم کی بنیاد رکھی۔ اس تحریک کو بعد میں فروغ ملا اور دوسرے اسکولوں میں بھی بوائے اسکاؤٹ تنظیم قائم ہو گئی۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے بھی ان کے مدعو کرنے پر بوائے اسکاؤٹس سے ملاقات کی تھی۔ جمشید تیس برس تک خاموشی سے اسکاؤٹ تنظیم کا حصہ بنے رہے اور اس کے لیے کام کرتے رہے۔ ان کا مشن تھا کہ پاکستان امن اور سلامتی کا گہوارا بنے۔ اپنی موت کے وقت وہ پاکستان میں ڈپٹی چیف کمشنر تھے۔ ان کی ان مساعی جیلہ پر انہیں اسکاؤٹ تنظیم کا سب سے بڑا اعزاز ”سلور وولف“ دیا گیا۔ جب تنظیم مضبوط ہو گئی تو اپنی بیسٹ بھی اس میں شامل ہو گئیں۔

کراچی چونکہ سمندر کے کنارے واقع ہے، اس لیے انہوں نے لوگوں کے کہنے پر اکتوبر 1938ء میں ”سمندری اسکاؤٹنگ“ کی داغ بیل بھی ڈال دی۔ اس تنظیم کا مقصد یہ تھا

کہ پانی میں گھرے ہوئے افراد کی مدد کی جائے۔ جب تنظیم میں لوگوں نے دل چسپی لینا شروع کر دی تو جمشید نے ایک چھوٹا سا جہاز بھی خرید لیا جس پر سی اسکاؤٹ سمندر میں بیس میل تک سفر کر کے حادثات میں گھرے افراد کی مدد کیا کرتے تھے۔



نوجوان طالب علموں کو حوصلہ دینے کے لیے وہ انتہائی ترکیبیں سوچا کرتے تھے۔ تین دن بعد کرشنا مورٹی کی موت کے بارے میں ایک تقریب ہونے والی تھی۔ انہوں نے ایک طالب علم سے کہا۔ ”ایڈوائی! تمہیں سمپوزیم میں کرشنا مورٹی کے بارے میں تقریر کرنا ہے۔ تم سے اچھا مجھے کوئی اور مقرر نہیں ملے گا۔“

”مم..... میں۔“ اس نے ہکا کر پوچھا۔

”ہاں، تم۔“ جمشید بولے۔

”مم..... مگر میں نے تو ان کے بارے میں کچھ نہیں پڑھا صرف ان کا نام سنا ہے۔“ ایڈوائی بدستور تذبذب میں مبتلا تھا۔

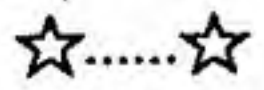
”تو تیاری کر لو۔ کیا ان پر کتابیں نایاب ہیں؟“ انہوں

ماہنامہ سرگزشت

57

نے کہا۔ ”میں نے تمہارا نام پبلٹی میں دے دیا ہے۔ مجھے شرمندہ نہ کر دینا۔“

ایڈوائی کی جان جب مصیبت میں پھنس گئی تو اس نے کرشنا مورٹی کے بارے میں سات آٹھ کتابیں جمع کیں اور انہیں پڑھ کر ایک تقریر لکھ کر جمشید کو دکھائی۔ انہوں نے تعریف کی۔ مقررہ دن پر ایڈوائی نے تقریر کی تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ جمشید کی حوصلہ افزائی اس کے کام آئی تھی۔



جمشید نسروانجی کے دادا اس کے لیے مشعل راہ تھے۔ اسے گھبرایا دیکھ کر کہتے۔ تم ہر وقت خدا سے کامیابی کے پاسپورٹ کی توقع تو نہیں کر سکتے۔ زندگی میں ناکامیاں بھی ہوتی ہیں جن پر ہم اپنی ہمت اور دانائی سے قابو پاتے ہیں۔ کسی کی زندگی میں شہد ہی شہد گھلا ہوا نہیں ہوتا ہے۔

جمشید کی والدہ گل بانی بھی انہیں مہیز کرتی تھیں اس کی شخصیت میں ان کی والدہ کی بہت سی خصوصیات جھلکتی تھیں۔

انہوں نے اپنی والدہ سے راضی بہ رضارہنے کا انداز سیکھا تھا۔ ان کی والدہ اکثر کہتی تھیں۔ ”بیٹے! یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ جو ہوتا ہے، ہونے دو۔“

جمشید نے اپنی زندگی کا آغاز اپنے والد کے برنس سے

جولائی 2018ء

کیا۔ 1879ء میں ان کے والد نے شراب کی دکان کھولی جس نے خوب ترقی کی۔ والد کا تجربہ اور محنت ان کے کام آئی۔ اس کا روبرو انہوں نے مزید پھیلا دیا۔ نرواچی رستم نے اپنا ایک شاندار آفس چھٹی میانی میں قائم کر رکھا تھا۔ جمشید اس آفس میں بیٹھنے لگے اور اپنے والد سے کاروباری اسرار و رموز سیکھنے لگے۔ انہوں نے والد سے یہ سیکھا کہ مستقبل کی اسکیمیں کس طرح بنائی جاتی ہیں۔ رفتہ رفتہ انہوں نے بزنس کو فروغ دیا اور نئی نئی صنعتیں لگانا شروع کر دیں۔ وہ ہندوستان تاجر ایسوسی ایشن کے صدر بھی منتخب ہو گئے۔ وہ اپنے والد کے متعلق کہتے تھے۔ ”میرے والد ایک کاروباری شخص تھے اور کسی بھی معاملے کو کل پر نہیں ٹالتے تھے۔ انہیں ورزش کرنے کا شوق تھا تاکہ وہ فٹ رہ سکیں۔ وہ ظاہری اور دکھاوے کی عبادات نہیں کرتے تھے، بلکہ خدا کو اپنے دل میں رکھتے تھے اور لوگوں کے دینی جذبات کو مجروح نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے معاملات میں کھرے تھے۔ ان کا کاروبار وسیع تھا جس کی بنا پر وہ خوش رہتے تھے کہ اس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو روزگار ملا ہوا ہے۔ کاروبار میں نفع نقصان کی انہیں پروا نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے انہیں دولت سمیٹنے کی عادت نہیں تھی۔

جمشید ماہر مالیات تھے۔ پھیلے ہوئے کاروبار کی پیچیدگیوں کو خوب سمجھتے تھے۔ صنعتی کارخانوں کے مالک، بڑے بزنس مین اور حکومت کے عہدے دار سب ہی ان سے مشورہ کرتے تھے۔ ٹیکس، کرنسی، ریٹے بورڈ، پورٹ ٹرسٹ، کوآپریٹو سوسائٹی اور زراعت کے معاملوں میں لوگ ان سے رائے طلب کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔ ان کو کسی وقت بھی طلب کر لیا کرتے تھے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مالیات میں ان کی سوجھ بوجھ سب پر حاوی تھی۔

وہ گجراتی اچھی طرح بولتے تھے اور اس زبان میں اچھا لکھتے بھی تھے۔ مگر وہ انگریزی میں اتنے اچھے نہیں تھے۔ جب وہ انگریزی میں تقریر کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ الفاظ ان کے دل سے نہیں صرف زبان سے ادا ہو رہے ہیں۔ ان کے دلی جذبات تقریر میں شامل نہیں ہوتے تھے۔ ان کی تقریریں کر پروفیسر بیوٹانی نے کہا تھا۔ ”وہ کسی منطق کے بغیر تقریر کرتے ہیں۔ اکثر ان کی گرامر درست نہیں ہوتی۔ ان کی انگریزی تقریریں بس کام چلاؤ ہوتی ہے۔“

☆.....☆

بیسویں صدی کا پہلا حصہ ہندوستان کے لیے سیاسی جدوجہد اور انتشار کا دور تھا۔ آزادی کی جنگ کا سہرا بلاشبہ دادا

ماہنامہ سرگزشت

58

بھائی نوروجی، گوکل، سرسید احمد، ڈاکٹر اینی بیسٹ، مہاتما گاندھی اور محمد علی جناح کے سر رہا۔ جمشید کو گاندھی کا ”شہری نافرمانی“ کا فلسفہ پسند تھا اور انہوں نے اس تحریک میں شرکت بھی کی تھی لیکن اینی بیسٹ نے انہیں اس سے منع کیا اور بتایا کہ یہ تھیوسوفی کے منافی ہے تو وہ خاموشی سے اس تحریک سے علیحدہ ہو گئے۔ چنانچہ جب بمبئی میں دوسری بار ”شہری نافرمانی“ کا اعلان ہوا تو انہوں نے گرجوٹی کا اظہار نہیں کیا۔

اس کے برعکس وہ محمد علی جناح اور ڈاکٹر اینی بیسٹ کی ہوم رول لیگ کے ذریعے آزادی کی جنگ میں شامل تھے۔ اگرچہ انہیں تقسیم کی وجہ سے راہوں کے جدا ہونے کا صدمہ تھا لیکن اس کو انہوں نے معبود کی مرضی سمجھ لیا۔ وہ بے خانماں لوگوں کی آباد کاری میں لگ گئے جو اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کراچی میں پناہ گزیں ہو گئے۔ سندھ جیلیٹو اسبلی میں جمشید منتخب ہوئے۔ وہ قائد اعظم رفیوجی ریلیف کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ انہوں نے مصیبت زدہ اور در ماندہ لوگوں کے لیے دن رات کام کیا۔

جمشید کی انتھک محنت کام کی لگن اور خدمت کے جذبہ نے کراچی کے رہنے والوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔

1938ء میں کراچی کے سابق صدر حاتم علوی نے جمشید کو ”جدید کراچی کا بانی“ قرار دیا تھا۔ اگر ہم کراچی کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہ معلوم ہوگا کہ انگریزوں کے وقت میں یہ ماہی گیروں کے ایک چھوٹے سے گاؤں کی حیثیت رکھتا تھا۔ 1939ء سے لے کر 1947ء تک کراچی کی وسعت و ترقی بے مثال ہے اور اس میں شک نہیں کہ 1947ء کے بعد سے کراچی میں زبردست تغیر آیا اور اس کے محرک جمشید تھے۔

جمشید سے زیادہ کراچی سے شاید ہی کوئی واقف ہوگا۔ ان کے سامنے کسی بھی سڑک کا نام لے لیجیے۔ وہ فوراً بتا دیں گے کہاں واقع ہے اور اس کے دونوں طرف کون کون سی عمارات کھڑی ہیں اور وہاں کون کون مشہور و معروف افراد مقیم ہیں۔

☆.....☆

جب وہ بمبئی میں تھے تو انہوں نے ایک ہال کی طرف لوگوں کو رواں دواں دیکھا۔ معلوم ہوا کہ کوئی تقریر کرنے والا ہے۔ انہیں بھی اشتیاق ہوا کہ وہ بھی اس ہستی کو دیکھیں اور سنیں جس کے لوگ اتنے مداح ہیں۔ ایک عالم خاتون تقریر کر رہی تھیں۔ جن کا نام ڈاکٹر اینی بیسٹ تھا۔ تقریر سننے کے بعد جمشید نے اس ہستی سے ملنے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے ان سے

جولائی 2018ء

تھے۔

☆.....☆

جمشید کم عمری ہی میں کراچی بلدیہ کے صلاح کار بنائے گئے تھے۔ ہر چند رائے دشناس نے جو اس وقت بلدیہ کے صدر تھے، جب جمشید سے کراچی بلدیہ کے پرانے ریکارڈ کے کاغذات جملانے کے کام کی نگرانی کرنے کو کہا تو جمشید نے اس کام کو اپنی نگرانی میں کر لیا۔ وہ پانچ گھنٹے تک کارکنوں کے پاس کھڑے رہے۔ جب دشناس نے انہیں کام کو اس طرح لگن سے کرتے دیکھا تو محسوس کیا کہ یہ کوئی اعلا وارفع انسان بنے گا۔ چھ برس کے بعد جب غلام علی چھاگلہ (احمد چھاگلہ کے والد جنہوں نے پاکستان کے قومی ترانے کے لیے موسیقی ترتیب دی تھی) نے کراچی بلدیہ کے صدارتی منصوبے سے استعفا دیا تو صلاح کاروں کو جمشید سے قابل کوئی نظر نہیں آیا۔ ابتدا میں جمشید اتنی بڑی ذمہ داری اور منصب سے قدرے ہچکچائے، لیکن بقول حاتم علوی کے سارے لوگوں کی دلی آرزو تھی کہ وہ صدر منتخب ہوں۔

اس طرح جمشید اور کراچی ایک دوسرے سے قریب ہوتے چلے گئے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ شہر کی خدمت اس کے کمینوں سے ہو سکتی ہے۔ سیاسی اصلاح میں شاید انہیں پہلا شہری کہا جائے، لیکن وہ خود کو شہر کے لوگوں کا غلام کہتے تھے۔ ایک مبلغ کی طرح اپنا جسم، ذہن، روح، دولت، عقل و آرام سب کچھ دے کر اس پسماندہ شہر کو ایک ایسی جگہ بنانا چاہتے تھے جہاں لوگ ہر سکون زندگی گزار سکیں۔

کوئٹہ میں زلزلہ آگیا اور ہزاروں متاثرین روزانہ گاڑیوں میں لدر کر کراچی آنے لگے۔ جمشید انہیں اسپتال پہنچاتے تھے اور ان کی خبر گیری کرتے تھے۔

جب گاندھی جی کی شہری نافرمانی کی مہم چلی تو پولیس لاشی چارج کرتی تھی۔ جمشید زخمی ہونے والوں کو اسپتال میں داخل کراتے اور ان افراد کا علاج کراتے تھے۔

جمشید بلا واسطہ 1922ء سے 1932ء تک کراچی بلدیہ کے منتخب صدر رہے۔ وہ روزانہ یہ دعائیں لگتے تھے:

اے خدا مجھے کار آمد بنا
اے خدا مجھے بے ضرر بنا
اے خدا مجھے پاکیزہ بنا
اے خدا مجھے اپنا ذریعہ بنا

وہ آرام بھی کر رہے ہوں یا سو رہے ہوں تو ان کا ذہن شہر کے بارے میں سوچتا رہتا اور منصوبے بناتا رہتا۔ وہ صبح

جولائی 2018ء

59

ماہنامہ سرگزشت

پانچ بجے جاگ جاتے تھے، پھر چھ بجے سے شام چھ بجے تک کام کرتے تھے۔ انہیں کھڑی کا بنا ہوا کوٹ اور پاجامہ پہننے کا شوق تھا۔ جن کا رنگ سفید ہوتا تھا۔ سر پر وہ کڑھی ہوئی ٹوپی پہنتے تھے اور ہاتھ میں چھری رکھتے تھے۔ ان کے پاؤں میں کینولیس کے جوتے ہوتے تھے۔ وہ لکڑی کی چوکی پر سوتے تھے اور اس پر گدا نہیں بچھاتے تھے۔ کہتے تھے کہ انسان کو اتنا آرام پسند نہیں ہونا چاہیے۔

اپنی میز پر بیٹھ کر وہ ضروری کام کرتے اور ملاقاتیوں کے سوالات کے جوابات دیتے۔ پھر سول اسپتال میں مریضوں کی عیادت کے لیے جاتے۔ پھر وقت ضائع کیے بغیر میوہلٹی کے آفس واپس آ جاتے۔ دوسرے جو کام ہفتوں میں کرتے تھے وہ ایک دن میں کر لیتے تھے۔ اس کے باوجود وہ کبھی عجلت میں نہ ہوتے اور ہر وقت مسکراتے رہتے۔ انہیں کسی نے غصے کی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ سماجی تقریبات میں بھی پابندی سے شریک ہوتے تھے چاہے وہ کسی کی شادی ہو یا میت۔ اس کے بعد کسی ضرورت مند کے کام منٹا رہے ہوتے۔ وہ آکس کریم کھانے کے بھی شوقین تھے اور اتوار کی صبح خاص طور پر زیلن یا کپٹل ٹی ہاؤس جاتے تھے۔ آکس کریم کے علاوہ انہیں دیگر ٹھنڈی چیزیں بھی پسند تھیں۔

☆.....☆

سکھر بیراج کی تعمیر کا منصوبہ بمبئی حکومت نے بنایا تھا، لیکن اس کی فائل دب کر نیچے چلی گئی۔ یہ منصوبہ 1922ء میں بنایا گیا تھا۔ اس وقت مسٹر لائنڈ گورنر تھے۔ جمشید کو بھی اس میٹنگ میں بلایا گیا تھا۔ انہوں نے یہ منصوبہ نہیں بنایا تھا، لیکن انہیں اس کے بارے میں معلوم تھا، لہذا جب گورنر کراچی آیا تو جمشید نے سکھر بیراج کی تعمیر کی فائل تلاش کر کے اس کے سامنے پیش کر دی۔ گورنر کو یہ منصوبہ پسند آیا اور اس نے تعمیر کی منظوری دے دی۔

بیراج کی تعمیر آٹھ برس میں مکمل ہوئی۔ اس سے بہت سی نہریں نکالی گئی تھیں۔ یہ دنیا میں برطانوی حکومت کا سب سے بڑا تعمیری کارنامہ تھا۔ اس سے ساٹھ لاکھ ایکڑ بھری زمین کاشت کے قابل ہو گئی۔

بلدیہ کی صدارت کے بارہ برسوں میں جمشید نے شہر کراچی کو ایک کوزہ گر کی طرح ہاتھ میں لے لیا تھا اور بقول عمر خیام کے بڑی محنت سے اسے اپنی آرزوؤں کے مطابق سانچے میں ڈھال دیا۔ انہوں نے میوہل معاملات سے متعلق شہر کی ترقی پر اثر انداز ہونے والے ہر مسئلے پر ایک ایک

ماہنامہ سرگزشت

کر کے مکمل توجہ دی اور اپنی ذہنی توانائی سے اسے حل کیا۔ وہ ایک ایسے میوہل سربراہ تھے جس کا ہر سر بر صغیر ہندوپاک نے کبھی نہیں دیکھا۔

جمشید کے بقول ان کے ایک مرحوم دوست مسٹر برج، جو حکومت کے عہدے دار تھے، کی بیوہ نے انہیں ایک کتاب پڑھنے کے لیے دی۔ وہ جب اس کا مطالعہ کرنے لگے تو اس میں سے ایک دستاویز نکل کر گر پڑی۔ انہوں نے اسے اٹھایا تو معلوم ہوا کہ آرٹلری میدان کا علاقہ کراچی میوہل کارپوریشن کی ملکیت ہے۔ جب کہ بمبئی حکومت اس بات پر اڑی ہوئی تھی کہ علاقہ حکومت کا ہے۔ چونکہ اس کا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں تھا، اس لیے جمشید نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

اس دستاویز کے ہاتھ میں آنے کے بعد وہ پونا گئے اور گورنر سے ملاقات کی۔ گفتگو کے دوران جمشید نے بتایا۔ ”آرٹلری میدان کا علاقہ میوہل کارپوریشن کا ہے اور آپ کی حکومت اس سلسلے میں گھٹاؤنا کھیل کھیل رہی ہے۔ یہ انتہائی شرمناک حرکت ہے۔“

گورنر نے پوچھا۔ ”تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟“

جمشید نے وہ دستاویز ان کے ہاتھ میں تھادی جو انہیں پُر اسرار طور پر ملی تھی۔ اس دستاویز کو دیکھ کر گورنر حیران رہ گیا۔ وہ پشیمان تھا۔ اس نے حکومت کی طرف سے معذرت کی۔ پھر اس نے جمشید سے کہا کہ وہ انہیں ”نائب ہڈ“ کا خطاب دینا چاہتا ہے۔ جمشید نے اسے لینے سے انکار کر دیا اور کہا۔ ”اس خطاب کو حاصل کرنے کے بعد میں اپنے دوستوں اور عام لوگوں سے دور ہو جاؤں گا۔ اس وقت جس کا جی چاہتا ہے۔ میری گاڑی میں بیٹھ جاتا ہے یا میرے آفس میں آکر بات کر لیتا ہے۔ میرے نائب ہڈ بننے کے بعد سب مجھ سے دور ہو جائیں گے کیونکہ میرے اور ان کے درمیان ادب، تمیز اور لحاظ حاصل ہو جائے گا۔“

گورنر نے یہ پیشکش بھی کی کہ وہ بمبئی ایگزیکٹو کونسل میں ایک سیٹ دینا چاہتا ہے۔ یہ اس زمانے میں ایک بڑا اعزاز تھا۔ مگر جمشید نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ ایک بیوروکریٹ حکومت میں غلام بن کر نہیں رہنا چاہتے۔ جب وہ کراچی آ گئے اور بات پھیل گئی تو ”ڈیلی گزٹ“ نے ان کے اقدامات کو بہت سراہا اور انہیں عوام کا سچا خادم قرار دیا۔

جولائی 2018ء

60

دی۔ جسے حکومت نے منظور کر لیا، لہذا ہالچی واٹر ورکس کی اسکیم مکمل کی گئی اور شہریوں کو پانی فراہم ہو سکا۔

جمشید نے جب کراچی کی صدارت سنبھالی تو سڑکوں کی کل لمبائی 12 میل تھی۔ لیکن اس سڑک پر کوٹار کی تہ نہیں تھی۔ ان کی سبک دوشی کے وقت کراچی میں سڑکوں کی لمبائی 72 میل ہو چکی تھی اور وہ سب کوٹار سے چمک رہی تھیں۔ سڑکوں کے ساتھ انہوں نے فٹ پاتھ بھی بنوائے تھے۔ تقسیم کے وقت یہ سڑکیں چمکتی تھیں اور ان کے کنارے تک کئے بھٹے نہ تھے۔ آج کل سڑکوں کا حال تو آپ جانتے ہی ہوں گے، لہذا ان کے بارے میں مع خراشی کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

1932ء میں کراچی میں صرف دو عوامی پارک تھے۔ ایک برنس گارڈن اور دوسرا گورنمنٹ گارڈن جس میں چڑیا گھر بھی تھا۔ جمشید نے منصوبہ بنایا کہ ہر علاقے میں ایک پارک بنایا جائے۔ ان کے ریٹائر ہونے تک کراچی میں بارہ پارک بن چکے تھے، جس میں خصوصیت سے ایک گوشہ بچوں کے لیے رکھا گیا تھا۔ اس میں ہلکی ورزش کا سامان بھی تھا۔ بعد میں اس سامان کی مرمت کرنے والا بھی کوئی نہ رہا اور پارکوں میں خاک اڑنے لگی۔

گورنمنٹ گارڈن کا نام تبدیل کر کے گاندھی گارڈن رکھ دیا گیا۔ یہ پارک 1860 میں لگایا گیا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ اس کی توسیع کی جائے گی لیکن حکومت نے دونوں سائڈ پر دکانیں بنالیں جس سے اس منصوبے پر پانی پھر گیا۔

جمشید نے کوآپریٹو کی بنیاد رکھی اور اس منصوبے کو یہاں تک پہنچا دیا کہ ہندوستان کا کوئی اور شہر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ 1922ء میں اب جہاں جمشید کوارٹر بنے ہیں ان دنوں وہاں ویران میدان ہوا کرتا تھا۔ دولت مند لوگ کلفٹن، فیئر ز اور گارڈن کوارٹر میں رہتے تھے۔ انہوں نے جمشید کوارٹر میں رہنا گوارا نہ کیا چنانچہ اس میں متوسط طبقے کے افراد آکر بس گئے۔ کم آمدنی والے لوگوں کے لیے پلاٹ خریدنا محال تھا۔ اس لیے جمشید نے فیصلہ کیا کہ زمین آپریٹو کو مفت فراہم کی جائے اور مکان بنانے کے لیے کوآپریٹو بینکوں سے قرضے دیے جائیں۔ ہر چند کہ جمشید کو سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا مگر انہوں نے حکومت اور میوہل کمیٹی سے اپنا منصوبہ منظور کرایا۔ ان کی صلاحیتوں کے اعتراف کے طور پر میوہل کمیٹی نے ان کو آرٹسز کا نام ”جمشید کوارٹرز“ رکھ دیا۔

جمشید کئی برس تک میوہل اسکول بورڈ کے چیئر مین

1932ء میں کراچی کے کئی علاقے ایسے تھے مثلاً گارڈن کوارٹر اور آرٹلری میدان جہاں زیر زمین پانی کی نکاسی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ آرٹلری میدان جہاں آج سندھ چیف کورٹ اور اسمبلی کی عمارتیں اور سنٹرل سیکریٹریٹ کی بیرکیں واقع ہیں، اس وقت میوہل کو منتقل نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ میوہل کارپوریشن کو اس علاقے پر کوئی اختیار نہ تھا۔ گندگی اٹھانے کے لیے وہاں ایک ٹیل گاڑی آیا کرتی تھی۔ یہ صورت حال ایک جدید شہر سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ جمشید نے فوری اس مسئلے پر توجہ دی۔

جب آرٹلری میدان میں پانی کی فراہمی اور نکاسی کی لائنیں پڑ گئیں تو چیف کورٹ کی عمارت کو بھی ان سے منسلک کر دیا گیا۔ کارپوریشن نے تقریباً تیس لاکھ روپے اس پر خرچ کیے۔ حکومت کو اتنا بڑا بل ادا کرنے میں تامل تھا۔ اس کے علاوہ بیوروکریسی کے عہدے داروں کو اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اکثریت میں ہیں اس لیے جمشید ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔

جمشید نے کافی مراسلت کی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ مجبوراً انہوں نے دھمکی دی کہ وہ چیف کورٹ کی لائنیں کاٹ دیں گے۔ حکومت بمبئی کا ایک نمائندہ پونا سے دوڑتا ہوا آیا اور اس نے میوہل کارپوریشن کے بل کی ادائیگی کرائی۔

کراچی میں صاف پانی کی فراہمی بھی ایک مسئلہ تھی۔ صاف پانی کا انحصار ڈملونی کے کنوؤں پر تھا۔ جب کہ بارش نہ ہونے کی صورت میں پانی کی قلت ہو جایا کرتی تھی۔ جمشید نے اس مسئلے کو بھی خوش اسلوبی سے حل کیا کہ کراچی کے شہری نکلا کھولتے تو پانی کی موٹی دھار گرنے لگتی ورنہ اس سے بیشتر ہوا کی سنناٹا ہی سنائی دیتی تھی۔

جب سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کیا گیا تو جمشید سندھ لیس لیو اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور میوہلٹی کے رکن نہ رہے لیکن اس کی پروانہ کرتے ہوئے انہوں نے کراچی کو پانی کی فراہمی کا مسئلہ پوری شدت سے حکومت سندھ کے سامنے اٹھایا۔ کابینہ کے سارے ارکان جمشید کی عزت کرتے تھے اور ان کے سابقہ کاموں سے واقف تھے۔ انہوں نے لوکل گورنمنٹ کی ایک انکوائری کمیٹی قائم کی اور جمشید کو اس کا چیئر مین مقرر کر دیا اور ان سے گزارش کی کہ وہ اعداد و شمار اکٹھا کریں اور مکمل رپورٹ پیش کریں۔

1939ء میں جنگ شروع ہو گئی لیکن جمشید نے نہایت مختصر عرصے میں اپنا سروے مکمل کیا اور رپورٹ پیش کر

ماہنامہ سرگزشت

61

جولائی 2018ء

لائیں تو میں نے ایک طالب علم کی حیثیت سے انہیں دیکھا۔ میں پہلے ہی سے ان سے متاثر تھا، اس لیے میں نے ان پر ایک نظم لکھی تھی۔ وہ نظم میں نے جمشید کے ذریعے اپنی بہت تک پہنچادی۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے مجھے بلا لیا اور شکریہ ادا کیا۔ اس طرح جمشید میرے لیے ایک رابطہ بن گئے۔ اس کے بعد تین برس تک میری اور جمشید کی گاہے بگاہے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ میں نیشنل کالج کے پرنسپل کے

قارئین متوجہ ہوں

چچا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچانہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چا دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور یہ معلومات

مرزا ناصر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سپنس جاسوسی پبلی کیشنز، سرگزشت

63-فون 35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

جولائی 2018ء

63

ماہنامہ سرگزشت

خطرے میں پڑ جائے گی۔ لہذا اسے توڑنا بہتر ہے۔

☆.....☆

انہیں اپنی والدہ سے بہت محبت تھی۔ اس لیے انہوں نے کراچی کی ساری ماؤں کے لیے ایک میٹرنٹی ہوم جہانگیر باغ کے قریب بنوایا۔ اس کے بعد انہوں نے منصوبہ بنایا کہ کراچی کے ہر علاقے میں ایک میٹرنٹی ہوم بنایا جائے، مگر اس کے لیے پیسہ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اس تاک میں رہتے تھے کہ اس سال کس شخص نے زیادہ روپیہ کمایا ہے۔ وہ اس کے پاس جا کر گزارش کرتے کہ وہ ایک میٹرنٹی ہوم بنوادے۔ دولت مند حضرات اپنی دولت کو سینے سے لگائے رکھتے ہیں اور اسے جدا نہیں کرتے۔ مگر جمشید اتنی محبت سے استدعا کرتے کہ سیٹھوں کو رقم دیتے ہیں بنتی تھی۔

انہیں پتا چلا کہ کراچی کا ایک سیٹھ بے اولاد ہے اور اب مرنے کے قریب ہے۔ اس کی جائیداد رشتے داروں میں تقسیم کر دی جائے گی۔ وہ اس کے پاس پہنچ گئے۔ اس سے درخواست کی۔ وہ مان گیا اور اس کے نتیجے میں اس نے عید گاہ میدان کے قریب ایک میٹرنٹی ہوم بنوایا۔

گل حسن کھانی اپنی کتاب ”سندھ جالافانی کردار“ میں لکھتے ہیں کہ 1919ء میں کراچی میں انفلونزا پھیل گیا (انفلونزا طبی لحاظ سے مہلک بیماری ہے) جمشید ایک بڑے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے پاس دولت و ثروت کی کمی نہیں تھی۔ وہ چاہتے تو بڑا آسائش زندگی بسر کر سکتے تھے، لیکن کراچی سے یہ مہلک بیماری ختم کرنے کے لیے انہوں نے دن رات کام کیا۔ حد یہ ہے کہ کراچی میں اچھے ڈاکٹروں کی کمی ہوگئی تو انہوں نے بمبئی سے ڈاکٹر بلوائے۔ اس خدمت کی بنا پر نوجوان طبقہ ان سے واقف ہو گیا اور انہیں پسند کرنے لگا۔

ماہی گیروں کا یہ گاؤں جو ”کلاچی جوکن“ کہلاتا تھا جمشید نرسداجی کی سستی سے کراچی شہر بن گیا۔ انہوں نے اس کا نقشہ ہی بدل دیا۔ یہاں تک کہ کراچی کو برصغیر کا سب سے منظم شہر قرار دیا جانے لگا۔ غیر متعصب، صاحب شعور سیاح، جمشید کے دنوں کے کراچی کو مشرق کا سب سے صاف ستھرا شہر کہتے تھے، اس لیے کہ یہاں کی سڑکوں کی دن میں دو بار دھلائی ہوتی تھی۔

جمشید نے ایک کتاب میں لکھا: ”اگر ہم یہ سمجھ لیں قدرت کے ہر کام، ہر قدم کا ایک مقصد ہے تو ہم سمجھ گیس گے کہ ایک مخصوص شہر میں آباد ہونے کا بھی کوئی مقصد ہے اور

جولائی 2018ء

رہے۔ اس وقت شہر کی مسلمان آبادی مزدور طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ زیادہ تر مسلمان لیاری کے علاقے میں رہتے تھے اور ان کے بچے اسکول نہیں جاتے تھے۔ جمشید نے محسوس کیا کہ وہاں لازمی پرائمری تعلیم رائج کیے بغیر آبادی کو خواندہ نہیں بنایا جاسکتا۔ سخت محنت کے بعد انہوں نے دس اسکول کھلوائے اور لازمی پرائمری تعلیم کو رائج کیا۔

اس کے علاوہ انہوں نے بندر روڈ (ایم اے جناح روڈ) پر ماما پارسی گریڈ اسکول کی تعمیر کے لیے ایک لاکھ پینتیس ہزار روپے کا عطیہ دیا۔ جب تعمیر شروع ہوئی تو انہوں نے اپنے دوستوں سے مطالبہ کیا کہ وہ بھی عطیات دیں۔ ان کے ایک دوست اردشیر ہرجی نے تین لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔ جس سے اسکول پایہ تکمیل تک پہنچ گیا۔ ماما پارسی کے علاوہ، این جے وی، میٹروپول ہول، سوہراج اسپتال اور بہت سے میٹرنٹی ہوم بھی انہی کے قائم کیے ہوئے ہیں۔

جمشید کے صدر بننے وقت کراچی میونسپل کارپوریشن کے دفاتر میکلوڈ روڈ پرٹی انشیشن کے قریب کرائے کی عمارتوں میں واقع تھے۔ جمشید کی خواہش تھی کہ بندر روڈ پر میونسپل کارپوریشن کی عمارت بنے۔ جب عمارت کا نقشہ تیار ہو گیا تو انہوں نے لوگوں سے اپیل کی کہ کارپوریشن کو قرضہ دیں۔ جیسے ہی بندر روڈ لاکھ روپے جمع ہو جائیں گے تعمیر شروع کر دی جائے گی۔ اگر معاملہ آج کے دور کا ہوتا تو صرف ایک ہی شخص اتنی مالیت کے چیک پر دستخط کر دیتا، لیکن چندہ جمع کرنے میں دیر لگی۔ بہر حال چندہ جمع ہوتے ہی کارپوریشن کی عمارت بن کر تیار ہوگئی۔

میونسپل کارپوریشن کی عمارت کے بعد انہوں نے میونسپل میوزیم کا منصوبہ تیار کیا۔ اس کے لیے بھی فنڈ نہیں تھا، اس لیے انہوں نے لوگوں سے چندہ لیا۔ جب عمارت تیار ہوگئی تو انجینئر جہانگیر سیٹھ نے انہیں معائنے کے لیے بلایا۔ انجینئر نے نقشے میں تبدیلی کر کے وسط میں ایک گنبد تعمیر کر دیا تھا۔ جمشید نے اسے ناپسند کیا اور کہا کہ اسے توڑ دیا جائے۔ انجینئر نے کہا: ”یہ گنبد عمارت کی دل کشی کو بڑھا رہا ہے۔ اگر اسے توڑ دیا گیا تو عمارت سپاٹ سی ہو جائے گی۔“

”مگر مجھے یہ گنبد پسند نہیں ہے۔ سرکاری عمارتوں میں گنبد نہیں ہونا چاہیے۔ ممکن ہے تمہارا خیال درست ہو لیکن مجھے یہ پسند نہیں ہے۔“

جب عمارت بالکل تیار ہوگئی تو پتا چلا کہ گنبد میں ایک شکاف پڑ گیا ہے، اگر اسے توڑ کر ختم نہ کیا گیا تو پوری عمارت

62

ماہنامہ سرگزشت

سیکرٹری کی حیثیت سے کام کر رہا تھا جب کہ جمشید کالج کے بورڈ کے اعزازی خازن اور معتمد تھے۔ وہی اس کالج کے سب سے بڑے مالی اور انتظامی سرپرست تھے۔

ان کی زندگی بہت مصروف تھی۔ وہ کراچی پورٹ ٹرسٹ کے ممبر اور چیئرمین آف کامرس کے صدر و بانی پارسی اسکول اور ماماپارسی اسکول کے ممبر، سینٹرل کوآپریٹو بینک کے ڈائریکٹر بھی تھے۔ یہ ساری مصروفیات کو تنہا نمٹاتے اور انہوں نے کوئی سیکرٹری تک نہ رکھا تھا۔ مگر جب وہ اس کی ضرورت محسوس کرنے لگے تو ان کی نظر انتخاب مجھ پر پڑی۔ یہ میری خوش نصیبی تھی۔

اتنی مصروفیات کے باوجود وہ ہفتے میں ایک بار میرے ساتھ گاندھی گارڈن ضرور جاتے تھے۔ کبھی بھی ہم چاندنی رات میں کلفٹن چلے جاتے تھے جہاں قدرت کی صنائی اپنے جوہن پر ہوتی تھی۔ جب میں نے جمشید پر ایک مضمون لکھا اور اپنی کے رسالے ”ینگ سٹیزن“ میں چھپوایا تو ان کا نام پوری دنیا میں پھیل گیا۔ اپنی اس سے بہت خوش ہوئیں جمشید نے بتایا کہ یہ میرا کارنامہ ہے۔

میں نے کئی ماہ تک جمشید کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کیا مگر میں نے ان سے کچھ نہیں مانگا اور نہ انہوں نے کچھ دیا۔ مگر حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ میں نے مجبوراً انہیں ایک خط لکھ ڈالا۔ دوسرے دن وہ دفتر آئے تو اپنے ساتھ چیک بک بھی لائے۔ انہوں نے چیک بک اپنی جیب سے نکالی اور چیک پر دستخط کر کے میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ان کی توجہ رقم کے خانے کی طرف مبذول کرائی تو انہوں نے کہا: ”جناب! جب میں نے اپنے والد کے کاروبار کو سنبھالا تھا تو انہوں نے بھی سادہ چیک میرے سامنے رکھ دیا تھا۔ اب کیا میں اپنی خاندانی روایت کو چھوڑ دوں؟“

میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ چنانچہ میں نے وہ چیک ان سے لے لیا۔

میرے لیے ان کی شفقت روز بہ روز بڑھتی چلی گئی۔ پھر اپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود مجھے چار برس کے لیے امریکا بھیج دیا تاکہ میں معاشرتی علوم میں اپنی تعلیم مکمل کر سکوں۔ وہاں مجھے ماہانہ خرچا ملتا رہا۔ 1937ء میں، میں نے جب سماجیات پر ایک کتاب لکھی تو اس کا انتساب کیا: ”میں یہ کتاب جمشید نروانجی کے نام نامی سے منسوب کرتا ہوں جو کراچی بلدیہ کے پہلے منسٹر اور آخری صدر ہیں۔ میرے راہبر، فلاسفر اور دوست ہیں، جن کی عنایتوں نے

مجھے سماجیات کا علم بخشا، جن کی بے مثال تربیت نے مجھے زندگی کے معنی سمجھائے۔ میں ان کے پیار اور بلندی کردار سے متاثر ہو کر ایک معتبر تحفہ پیش کر رہا ہوں۔“

وہ پارسی تھے مگر دنیا کے سب مذاہب سے محبت اور لگاؤ رکھتے تھے۔ ہندو مندروں میں جانا، سکھوں کے گردواروں میں شرکت کرنا اور عیسائیوں کی تقریبات میں جانا اور چرچ میں جا کر بیٹھنا، مسلمانوں کی مساجد میں جانا اور روزے رکھنا ان کا وصف تھا۔

وہ اسپتالوں میں جاتے تھے تو اپنی ڈائری میں مریضوں کی حاجات نوٹ کر لیا کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ ہر ماہ کی پہلی کو ایسے افراد کے لیے رقم کے لفافے بنایا کرتے تھے اور انہیں کسی کے ذریعے سے کراچی میں رہنے والوں کے گھر پہنچا دیا کرتے تھے۔ جو افراد شہر سے باہر رہتے تھے انہیں چیک یا منی آرڈر کے ذریعے رقومات بھیجا کرتے تھے۔ اس فرد کا نام تو لفافے پر لکھا ہوتا جسے وہ جانا ہوتا تھا، لیکن بھیجنے والے کا نام نادر۔ چنانچہ حاجت مند اس الجھن میں مبتلا ہو جاتا کہ اسے یہ کس نے بھیجا ہے۔ مالیات کا حساب چونکہ میں رکھا کرتا تھا، اس لیے میں جب 1946ء میں ان سے جدا ہوا تو میرا اندازہ ہے کہ وہ تقریباً ان وظائف کے ذریعے پچاس لاکھ روپے دے چکے تھے۔ بعد میں یقیناً اس میں اضافہ ہوا ہوگا۔

وہ کھلے دل کے تھے مگر جب قومی معاملہ ہوتا تھا تو کنجوسی بھی کرتے تھے۔ ایک بار ہم کراچی کا دورہ کر رہے تھے پیاس لگنے لگی تو ایک نلکے سے ہاتھ لگا کر پانی پیا، مگر اس طرح سے کہ آدھا پانی گر گیا اور آدھا پیٹ میں گیا۔ چنانچہ نلکا دیر تک کھلا رہا۔ ہم جب پی چکے تو جمشید نے آگے بڑھ کر ایک ہاتھ سے نلکے سے نکلنے والی دھار نصف کر دی۔ یوں پانی ضائع ہونے سے بچ گیا۔ وہ کہنے لگے: ”دوستو! آپ نے جس طرح سے پانی پیا ہے اس سے مجھے تکلیف پہنچی ہے۔ آپ لوگوں نے بہت پانی ضائع کیا ہے۔ اگر اس انداز سے پیئے تو پانی بچ جاتا اور کسی اور کے کام آتا۔ کراچی میں پانی کی قلت ہے۔ ہمیں دوسروں کا خیال رکھنا چاہیے۔“

انہیں پیٹ کے درد کی بھی شکایت تھی۔ وہ حتی الامکان کوشش کرتے کہ اسپتال کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔ میں نے مشورہ دیا کہ آپریشن کرائیں۔ لیکن وہ اس سے ڈرتے تھے۔ دوسرے مریضوں کو کرب میں مبتلا دیکھتے تو کہتے تھے: ”اس بیچارے کے مقابلے میں تو میری تکلیف کچھ بھی نہیں ہے۔“

میرا خیال ہے کہ وہ اپنی تکلیف پر دوسروں کی دعاؤں

کا بوجھ پالیتے تھے۔

انہیں دوسروں کی تکالیف دیکھ کر بہت پریشانی اور افسوس ہوتی تھی۔ وہ خدا سے دعا مانگتے تھے جو پوری ہو جاتی تھی۔ ایک بار وہ اسپتال گئے تو ایک بچے کے سر ہانے جا کر لٹریے ہو گئے۔ اس کے والدین سے ان کی سرسری سی شناسائی تھی۔ جمشید نے پوچھا کہ بچے کو کیا ہوا ہے تو اس کی ماں رونے لگی۔ اس نے بچکوں کے درمیان بتایا کہ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ بچے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اس کے گردے نفل ہو چکے ہیں۔ جمشید نے انہیں تسلی دی اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر مناجات پڑھنے لگے۔

اس کے بعد چلے گئے۔ دوسرے دن وہ پھر آئے اور انہوں نے پہلے دن کی طرح دعائیں مانگیں اور بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ تقریباً دس دن تک وہ اسپتال آتے رہے۔ خدا کی قدرت کہ بچہ صحت مند ہو گیا اور اس کے گردے صحیح طور پر کام کرنے لگے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ اور بھی ہے۔ ان کے پاس ایک پارسی خاتون لائی گئی۔ اس کی ہڈیاں بچپن سے ٹک رہی تھیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ اب یہ صحت یاب نہیں ہو سکتی۔ جمشید اس خاتون کے ڈاکٹر بن گئے اور انہوں نے پانچ برس تک اس کا ہومیو پیتھک علاج کیا۔ آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ خاتون صحت یاب ہو سکتی ہے۔ اس کے جسم پر زخم تھے، لیکن ان کے طویل علاج اور دعاؤں سے مریضہ تندرست ہو گئی۔

☆.....☆

فرنی ٹیل نے ایک کتاب میں لکھا ہے کہ 24 نومبر 1924ء کو میری دائیں ٹانگ میں درد ہونے لگا۔ میں نے ڈاکٹری علاج کرایا، مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اتفاقاً جمشید نروانجی کو معلوم ہوا تو انہوں نے مجھے بلایا اور طریق علاج تبدیل کرنے کو کہا۔ انہیں ہومیو پیتھکی پر زیادہ یقین تھا۔ میں نے اسے آزمایا اور اس کے بعد آیور ویدک لیکن درد ختم نہیں ہوا۔ اس کے بعد جمشید جی مجھے ہر بڑے ڈاکٹر حد یہ ہے کہ حکیم کے پاس لے گئے۔ اس سے بھی فائدہ نہیں ہوا تو انہوں نے اپنا علاج شروع کیا۔ وہ پتا نہیں کیا کچھ ملا کر لاتے تھے اور میری ٹانگ پر مل دیا کرتے تھے۔ ساتھ ہی دعائیں بھی کرتے جاتے تھے۔ ٹانگ پر اکیس زخم تھے، لیکن جمشید نے ان کی پروا نہیں کی اور نو برس تک اپنا علاج جاری رکھا۔ اکیس میں سے بیس زخم مندمل ہو گئے۔ آخری زخم کچھ بذات تھا، اس لیے

اس نے ختم ہونے میں دو برس لگا دیے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ جمشید کو طب سے لگاؤ تو تھا، لیکن انہوں نے طب پڑھی نہیں تھی اور نہ کسی ڈاکٹر حکیم سے حکمت سیکھی تھی، اس کے باوجود وہ زخموں کو مندمل کر دیا کرتے تھے۔ یقیناً خدا نے ان کے ہاتھوں میں شفا دے رکھی تھی۔ میرا گھر دو منزلہ تھا۔ جمشید جی 35، 25 بار اس کے زینوں پر چڑھے اور اترے، لیکن اہمیت نہیں ہارے۔ ابتدا میں وہ دن میں تین بار آتے تھے، اس کے بعد ہفتے میں پانچ دن۔ اس کے بعد جیسے جیسے زخم مندمل ہوتے گئے، انہوں نے ہفتے میں ایک دن آنا شروع کر دیا۔

☆.....☆

وہ صرف روحانی طور پر سچے اور نیک ہی نہیں تھے، بلکہ خدا نے انہیں دماغی صلاحیتوں سے بھی نوازا تھا۔ اس سلسلے میں آرٹھری میدان کا واقعہ گوش گزار کر لیجیے۔ بمبئی حکومت نے اس کی فروخت کے لیے اخبارات میں اشتہار دیا تو دوسرے دن جمشید نے اشتہار دیا کہ آرٹھری میدان کی زمین خریدنے والے خود اس کے ذمے دار ہوں گے۔

جب گورنر سر ایمر وزلائیڈ کو پتا چلا تو وہ پہلی ٹرین سے کراچی پہنچا اور اس نے جمشید کو بلا کر دعائی دی۔ وہ بھلا کب خاموش رہنے والے تھے۔ انہوں نے جواباً کہا کہ وہ اس معاملے کو پریوی کونسل برطانیہ میں لے جائیں گے اور کئی کروڑ کا دعوا کریں گے۔ کافی دیر تک جھک جھک بک بک ہوتی رہی۔ گورنر نے دیکھا کہ وہ کسی صورت مان ہی نہیں رہے ہیں تو اس نے جمشید سے مصالحت کر لی۔ اس طرح سے عوامی میدان فروخت ہونے سے بچ گیا اور گورنر صاحب کی جیب گرم نہ ہو سکی۔

معلوم نہیں کیسے انہیں آنے والے برے حالات کا علم ہو جاتا تھا۔ ان کے ایک واقف کار پروفیسر ایم۔ ایڈوانی نے اپنا ایک واقعہ سنایا تھا کہ یہ اس زمانے کی بات ہے کہ جب نان کو آپریشن مومنٹ (شہری نافرمانی کی مہم) اپنے عروج پر تھی۔ حیدر آباد میشل کالج کے ایک پروفیسر معین حیدر نے بھی چھٹی کی درخواست دی تاکہ تحریک میں حصہ لیں۔ پرنسپل نے یہ کہہ کر درخواست نامنظور کر دی کہ کسی بھی تحریک میں حصہ لینے سے قبل استعفا دینا ضروری ہے۔ چھٹی نہیں مل سکتی۔

معین حیدر نے پرنسپل کے کمرے سے نکلنے کے بعد چند طلبہ کو جمع کیا اور ایک جذباتی قسم کی تقریر کر ڈالی۔ طلبہ نے مردہ باد کے نعرے لگانا شروع کر دیے۔ بتدریج مجمع بڑھ گیا



محور کن کہانیاں دلچسپ مسلسل سلسلے لیے جون 2018 کا معطر شمارہ.....

پاکستان

شیریں حیدر اور رفعت سراج کے شاہکار ناول.....

محبت لفظ ہے لیکن..... حیا بخاری کا دل گداز ناولٹ.....

نگہت سیما نے ایمن مرتضیٰ کو دکھلائی ایک خوب صورت راہ
اپنے ناولٹ..... کوئی شہر یار و فساؤں کا میں.....

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اور

اختر شجاعت کے بصیرت افروز مقالے.....

ڈراما نگاری میں معتبر نام لجنڈ حسینہ معین سے کرائی
ہماریگ نے دلچسپ ملاقات

رمضان المبارک اور عید الفطر کی مناسبت سے عقیلہ حق، شمع تفسیر،
حنا بشری، مریم شیراز، نزہت جبین ضیا کی متاثر کن تحریریں

اس کی جلالہ

اس کے ساتھ، ساتھ ہماری دیگر مختصر راترزی حسین کہانیاں جن میں طیبہ عنصر مغل،
خولہ عرفان، فہمی فردوس، تمثیلہ زاہد، شمسہ الطاف شامل ہیں

علاوہ ازیں شعر و شاعری، دلچسپ اور سبق آموز تراشے، خوش ذائقہ پکوان اور سب سے بڑھ کر
گوشہ ظرافت کی صورت معیاری طنز و مزاح..... صرف آپ جیسے باذوق قارئین کے لیے.....

لوگ وہاں جمع ہو گئے کہ دکان بند کر دی جائے گی لیکن
لڑکے کو چھوڑ دیا جائے۔ پولیس نے دھمکی دی کہ اگر جمع نہ چھٹا
تو گولی چلا دی جائے گی۔ جمشید وہاں سے اپنی کار میں گزر
رہے تھے۔ انہوں نے کار کو اکر پوچھ گچھ کی۔ پھر ڈرائیور کو کار
ایک طرف کھڑی کرنے کا حکم دیا اور مجمع اور پولیس کے
درمیان دیوار بن گئے۔ پھر انہوں نے کہا کہ بچے نے ایسا کوئی
بڑا جرم نہیں کیا، قانون کی کوئی خلاف ورزی بھی نہیں کی
ہے۔ چنانچہ اسے رہا کر دیا جائے۔ پولیس اگر گولی چلائے گی تو
پہلی گولی وہ اپنے سینے پر کھانے کو تیار ہیں۔ مجمع جوش جذبات
سے شور مچانے لگا کیونکہ وہ ان سے واقف تھے کہ وہ میونسپل
کونسلر ہیں اور انہوں نے کراچی کی بہت خدمت کی
ہے۔ پولیس ٹھنڈی پڑ گئی۔ اس نے نوجوان کو رہا کر دیا تو مجمع
منتشر ہو گیا۔

☆.....☆
1937ء میں سندھ پبلسٹک سوسائٹی کے ایکشن ہونے لگے
تو ہر ایک کی خواہش تھی کہ جمشید کو چنا جائے۔ جمشید اس میں
حصہ لینے پر رضامند نہیں تھے۔ آخر کار لوگوں کے اصرار پر
راضی ہو گئے لیکن اس شرط پر کہ ایمان داری سے کام لیا جائے
گا اور حکومت نے جتنی رقم ایکشن کے لیے مختص کی ہے اس سے
زیادہ خرچ نہیں کیا جائے گا۔ غلط قسم کی کنوینٹنگ نہیں
ہوگی۔ لوگوں نے انہیں ہی ووٹ ڈالے جب کہ ان کا پونٹک
بوتھ دور تھا اور انہوں نے گاڑیوں کا انتظام بھی نہیں کیا تھا مگر
لوگوں کی محبت کے سبب وہ ایکشن جیت گئے۔

ایکشن کے دوران وہ دادو گئے تو انہیں دیکھنے کے لیے
عورتیں، مرد اور بچے ٹوٹے پڑے تھے تاکہ اپنے خیر خواہ اور
رہنما کے ہاتھ کا بوسہ لے سکیں۔ ان کے پیر تمام گیس مگر جمشید
اس سے احتراز کر رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ انہیں
آن داتا یا اوتار سمجھیں۔

جمشید کے کردار کا سب سے مضبوط پہلو ان کی مراقبے
کی عادت تھی۔ ہر دن کا آغاز اور اختتام طویل عبادت اور
مراقبے پر ہوتا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ انہیں اپنے وجود سے باہر
آنے اور روزمرہ کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لیے خاصی
کوشش کرنا پڑتی ہے۔ وہ یوگا بھی کرتے تھے۔

علم و ادب سے انہیں شغف تھا۔ شاید ہی کوئی اچھا
میگزین ہوگا جس کا سالانہ چندہ وہ نہ بھیجتے ہوں۔ انہیں
کتابیں خریدنے کا بھی شوق تھا۔ نفسیات، جنسیات،
سماجیات، سائنس اور فلسفے کی کتابیں ان کی ذاتی

اور سب نے معین حیدر کا ساتھ دینے کا تہیہ کر لیا۔ دوسرے دن
سے کالج کے طلبہ نے ہڑتال کر دی اور چند طلبہ نے پرنسپل کے
گھر کا گھیراؤ کر لیا تاکہ وہ کالج تک نہ پہنچ سکیں۔

میں اس زمانے میں کراچی میں تھا۔ جمشید نے مجھے بلا
بیجا۔ میں گیا تو انہوں نے کہا کہ فوراً حیدر آباد جاؤ۔ وہاں کچھ
گڑبڑ ہے۔ میں نے استفسار کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ
مجھے خود حالات سے آگاہی نہیں ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ اگر تم
وہاں نہ پہنچے تو معاملہ خراب ہو جائے گا۔ میں اس زمانے میں
اسٹنٹ منسٹر تھا۔ میں نے گاڑی پکڑی اور حیدر آباد روانہ
ہو گیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے سرکاری گاڑی حاصل کی اور اسے
ڈرائیو کرتا ہوا چل پڑا۔

میں چونکہ پرنسپل نعیم اللہ کو جانتا تھا، اس لیے سیدھا ان
کے گھر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں ہیر آباد مارکیٹ کے
نزدیک طلبہ کا ایک گروہ نعرے لگاتا نظر آیا۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ
وہ سب پرنسپل کے گھر کی طرف جا رہے ہیں۔ میں ان سے
پہلے وہاں پہنچ گیا اور میں نے ان سے درخواست کی کہ ان کی
جان کو خطرہ ہے، لہذا میرے ساتھ چلیں۔ میں سرکاری گاڑی
میں انہیں بٹھا کر پانچ میل دور لے گیا۔ راستے میں انہوں نے
حالات بتائے۔ میں نے کہا۔ ”مسئلے کا ایک ہی حل ہے۔“

”وہ کیا؟“ انہوں نے چونک کر پوچھا۔
”یہ کہ آپ پروفیسروں کی ایک میٹنگ بلا لیں۔ اگر
سب اس پر متفق ہوں کہ چھٹی دی جاسکتی ہے تو معین حیدر کو
چھٹی دے دی جائے۔“

انہوں نے میری بات مان لی۔ سب کو فون کیا اور
دوسرے دن کالج میں بلایا۔ سب نے جان بچانے کی خاطر
معین کو چھٹی دینا منظور کر لی۔ یوں ایک بڑا قضیہ منٹ گیا مگر
مجھے کافی دنوں تک حیرت رہی کہ جمشید نے اتنی دور بیٹھے کیسے
اندازہ لگا لیا کہ الا نہ صاحب کی جان خطرے میں ہے! وہ کوئی
مذہبی یا روحانی پیشوا نہیں تھے، لیکن آنے والے خطرات کو کیسے
محسوس کر لیتے تھے!

لوگوں کو مصیبت میں دیکھ کر وہ اپنی جان کی پروا نہیں
کرتے تھے۔ برطانوی راج کے خلاف ہندوستان میں عام
ہڑتال کا اعلان کیا گیا۔ جس کا اثر کراچی پر بھی پڑا۔ یہاں بھی
دکانیں اور کاروبار بند کر دیا گیا۔ کہیں کوئی دکان اکاؤنٹنٹ رہ
گئی تو پولیس اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے دکان داروں کو
دھمکیاں دینے لگی۔ ایک دکان پر سے انہوں نے ایک نوجوان
لڑکے کو گرفتار بھی کر لیا۔

لاہیرری میں موجود تھیں۔ البتہ مذہبی کتابوں کی طرف ان کا رجحان زیادہ تھا۔ وہ سارے مذاہب کا مطالعہ کرتے تھے۔ وہ سوشلسٹ یا کمیونسٹ قطعی نہیں تھے، مگر اشتراکی فلسفے سے متاثر ضرور تھے اس لیے کہ میں نے انہیں کئی بار کارل مارکس کا مطالعہ کرتے دیکھا تھا۔

انہیں مطالعے کا بہت شوق تھا، اس لیے وہ اپنی چوکی لاہیرری میں بچھا کر لیتے تھے۔ ان کی لاہیرری کراچی کی چند بڑی اور اچھی لاہیرریوں میں ایک تھی۔ وہ ہزاروں روپے کی کتابیں خرید لیتے تھے۔ جبکہ اس زمانے میں ایک یا دو روپے کی کتاب مل جایا کرتی تھی۔ وہ راہ چلتے یا کار میں بیٹھ کر کتابیں پڑھتے تھے۔ جو کتابیں انہیں پڑھنا ہوتی تھیں، وہ کار میں بھی رکھ لیا کرتے تھے۔ بعض اوقات کار میں اتنی کتابیں ہو جایا کرتی تھیں کہ بیٹھنے کی جگہ نہیں بن پاتی تھی۔

راہنہ ناتھ ٹیگور اور مسز سروجنی نانڈو جب بھی کراچی آتے تھے تو ان کے گھر میں قیام کرتے تھے۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ جمشید نروانجی ایک متبرک ہستی ہیں جن کی زندگی سندھ کے لیے ایک نعمت عظمیٰ ہے۔ ان جیسا کوئی دوسرا نہیں ہوگا۔

میونسپل ایکٹ جس کے تحت کراچی میونسپلٹی قائم کی گئی تھی۔ میونسپلٹی کے تمام اختیارات صدر کو سونپنا تھے۔ بمبئی کی بجلی ٹھوسبلی نے کراچی شہر کے لیے ایک خاص قانون منظور کیا، جس کے تحت میونسپل کارپوریشن قائم کی گئی۔ یہ قانون 1933ء کے آخر میں نافذ کیا گیا تھا اور کارپوریشن قائم کیا گیا اور جمشید کراچی کے پہلے میئر بنے۔ وہ نومبر 1933ء سے اگست 1934ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ اس کے بعد انہوں نے اس عہدے کو چھوڑ دیا۔

یکم اپریل 1936ء میں کراچی، بمبئی سے علیحدہ ہو گیا۔ اس علیحدگی کی خوشی میں سیمارڈی پر ایک جشن منایا گیا۔ اس جشن میں شرکت کے لیے میں اپنے جہاز سے وہاں آیا تھا۔ جشن میں جمشید کے علاوہ شہر کے معزز عہدے دار اور افسران شریک تھے۔ گورنر نے میونسپل کارپوریشن کو دلی مبارک باد دی۔

چند ماہ بعد جمشید نے ایک کتاب لکھی جس کا نام ”کراچی میونسپلٹی“ تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ کراچی کی میونسپلٹی کن نامساعد حالات میں قائم کی گئی تھی اور اس نے کس درجے ترقی کی، انڈیا میں اس جیسی کوئی میونسپلٹی نہیں تھی۔ (تقریب سے پہلے) یہ 1853ء میں قائم ہوئی تھی، جبکہ اس

کے سیکریٹری کو ماہانہ 50 روپے، انگریزی جاننے والے ایک کلرک کو 40 روپے ماہانہ، ایک منشی کو صرف 10 روپے ملا کرتے تھے۔ جبکہ خدمت گار 5 روپے پر ملازم تھے۔ میونسپلٹی کے بہت سے شعبے ہیں، جن میں انجینئرنگ، صحت، انتظامیہ، اکاؤنٹس، آڈٹ اور تعلیم شامل ہیں۔ آج اس کا بجٹ بہت زیادہ ہے خرچ اور اخراجات بھی لاکھوں میں ہیں۔

1939ء میں جب کراچی میں صنعتی نمائش ہوئی تو مرکزی دروازے پر جمشید نروانجی کی بڑی سی تصویر لگائی گئی جس کے نیچے لکھا تھا۔ ”جدید کراچی کے معمار۔“

☆.....☆

جمشید نیک اصولوں پر کاربند رہتے تھے اور اس سلسلے میں کسی بات کی پروا نہیں کرتے تھے۔ چاہے وہ بات ان کے خلاف ہی کیوں نہ کی جارہی ہو۔

1939ء میں کانگریس حکومت بمبئی میں حکمران تھی۔ ڈاکٹر گلبرٹ جو بمبئی کی کینٹ میں صحت عامہ کے وزیر تھے، نے اس بل کے پاس کرنے پر زور دیا کہ بمبئی کی حدود میں شراب بندی کی جائے اور کوئی اس قانون کی خلاف ورزی کرے تو اسے سزا دی جائے کیونکہ شراب نوشی سے لوگوں کی صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔

حزب اختلاف نے اس پر شور مچا دیا۔ دل چسپ بات یہ کہ کینٹ میں شامل بہت سے ممبران نے بھی اس پر سخت اختلاف کیا۔ دین سے شغف رکھنے والوں نے کہا کہ شراب بذات خود کوئی شیطانی چیز نہیں ہے۔ البتہ اسے کثرت سے پینے کو منع کیا گیا ہے۔ جہاں تک اخلاقیات کا تعلق ہے، شراب بندی سے لوگوں کا اخلاقی معیار بلند نہیں ہو جائے گا۔ یورپ اور امریکا میں لوگ اٹھتے بیٹھتے شراب پیتے ہیں، مگر انہیں آئے دن بیماریاں نہیں ہوتیں۔ اس لیے کہ وہ اعتدال میں رہ کر پیتے ہیں۔

جمشید کا اس سلسلے میں کیا نظریہ تھا؟ ان کے والد کی تو خود شراب کی دکان تھی، جس پر وہ شرمندہ رہتے تھے۔ انہوں نے شراب بندی کے حق میں آواز بلند کی۔ ان کا کہنا تھا کہ انڈیا میں لوگوں کا رجحان مذہب کی طرف زیادہ ہے، لہذا شراب پر پابندی عائد کر دینا بہتر ہوگا۔

چند ہفتوں کے بعد جمشید نے ایک گجراتی ماہنامے ”شروا“ میں ایک مضمون لکھا کہ ان کے ایک ملازم نے جس کی شراب کی دکان بھی تھی۔ شادی کی ایک تقریب میں شراب سپلائی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اب وہ

شراب فروخت نہیں کرے گا، اس لیے جمشید جی نے اس پر پابندی عائد کرنے کو کہا ہے۔ لوگوں نے اسے ڈرایا، دھمکایا، لیکن اس نے کسی کی پروا نہیں کی۔ جمشید لکھتے ہیں کہ اب وہ مجھے اپنا گرو لگتا ہے۔

چاہے غریب ہو یا امیر وہ لوگوں کی مدد کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے، چاہے اس سلسلے میں انہیں خود کوئی پریشانی ہی اٹھانا پڑے۔ کارپوریشن کی فینجنگ کمیٹی کا اجلاس دفتر میں بلایا گیا تھا۔ اس روز موسم بہت واہیات تھا اور کسی کو گھر سے نکلنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ چنانچہ اس اجلاس میں صرف تین ممبران حاضر ہوئے تھے۔ ایک جمشید، دوسرا چیرمین اور تیسرا ایک کلکٹر۔ اجلاس کے اختتام پر کلکٹر نے گزارش کی کہ جمشید اسے اپنی کار میں لفٹ دے دیں۔ وہ جمشید کو ارٹرز میں رہتا تھا۔

جمشید نے اسے کار میں بیٹھنے کو کہا۔ سڑکوں پر پانی بھرا ہوا تھا اور کار کے پیہوں سے پانی اڑ رہا تھا۔ گڑھوں میں پھپکا کے ہو رہے تھے۔ جب اس کلکٹر کا گھر آیا تو جمشید نے ڈرائیور سے کار روکنے کو کہا۔ کلکٹر نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ وہ احسان مندی کے جذبات سے مغلوب ہوا جا رہا تھا۔

جمشید نے کہا۔ ”ارے بھئی! میرا اتنا شکریہ ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر میں تمہاری جگہ اس مصیبت میں گرفتار ہوتا تو کیا تم مجھے لفٹ نہ دیتے؟“

☆.....☆

لوگ ان سے پوچھتے تھے کہ انہوں نے شادی کیوں نہیں کی۔ وہ اس سوال کو ٹال جاتے تھے۔ آخر کار ایک روز میں نے بھی یہی سوال کیا۔ انہوں نے مسکرا کر ٹالنے کی کوشش کی تو میں نے کہا کہ انہیں میرے اس سوال کا جواب دینا ہی ہوگا۔

انہوں نے بتایا کہ ان کی زندگی میں چند واقعات ایسے پیش آئے کہ ان کی شادی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی انہونی بات ہے کہ جب بھی بات طے ہونے لگی تو ان کی زندگی نے یوٹرن لے لیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایک لڑکی معمولی شکل و صورت کی تھی اور جس کی تعلیم بھی واجبی سی تھی۔ وہ ذہنی طور پر بھی پسماندہ تھی۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس لڑکی کی شادی ہونا ممکن نہیں ہے۔ جمشید کے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبات جاگ اٹھے۔ انہوں نے سوچا کہ معاشرہ اس لڑکی کو ٹھکرا رہا ہے۔ وہ آگے بڑھ کر اسے کیوں نہ اپنالیں پھر اسے قابل بنالیں۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 900 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 10,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 9,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: سرزائش عباس فون نمبر: 0301-2454188

سرولیشن مینجر: سید منیر حسین 0333-3285269

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیروز ٹیکسٹائل ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35804200-35804300

جولائی 2018ء

69

ماہنامہ سرگزشت

جولائی 2018ء

68

ماہنامہ سرگزشت

انہوں نے اپنی خالہ کے ذریعے پیغام اس کے گھر پہنچایا۔ چند دنوں بعد معلوم ہوا کہ جمشید کی ظاہری شکل و صورت اور اخلاقی بلندی کے سامنے وہ خود کو بیچ تصور کرتی ہے، لہذا اس نے انکار کر دیا۔ یوں جمشید ایک بار پھر کنوارے رہ گئے۔

ایک ماں اپنی لڑکی کو اپنے ساتھ لائی جو حاملہ تھی۔ یہ حمل ناجائز تھا۔ انہوں نے لڑکی سے اس لڑکے کا نام پوچھا، مگر اس نے لڑکے کا نام بتانے سے انکار کر دیا۔ ماں نے کہا کہ اس کی مدد کی جائے۔ لڑکی کا حمل ساقط کر دیا جائے۔ جمشید کو ناجائز اور غیر قانونی کاموں سے نفرت تھی۔ وہ دیر تک اس کا حل تلاش کرتے رہے لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ چنانچہ انہوں نے خود کو پیش کر دیا اور کہا کہ وہ اس لڑکی سے شادی کرنے کو تیار ہیں۔ وہ لڑکی اور بچے کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ لڑکی کی ماں ان کی بہت شکر گزار ہوئی۔ اس کے رخسار آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ اس نے دو روز کی مہلت مانگی۔ دو روز بعد جب جمشید اس کا انتظار کر رہے تھے تو ماں نے بتایا کہ ایک ڈاکٹر نے ان کی مشکل حل کر دی ہے۔ اب لڑکی کی حالت اطمینان بخش ہے اور آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی، کیونکہ وہ آپ کو بھگوان کا اوتار کہتی ہے۔ لہذا جمشید ایک بار پھر کنوارے رہ گئے۔ غالباً ان کے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہی نہیں بنی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ”تو کیا آپ کو زمانہ نوجوانی میں کسی دوشیزہ سے محبت بھی نہیں ہوئی تھی؟“

”ہوئی تھی۔“ وہ مسکرا کر بولے۔ ”میں بھی عام نوجوانوں کی طرح تھا۔ سیارہ مریخ سے تو نہیں آیا تھا۔ مگر مجھے اظہار محبت کی ہمت نہ پڑی۔ کہیں برا نہ مان جائے اور میری بے عزتی نہ کر دے اس لیے خاموش رہا اور اندر ہی اندر سلگتا رہا۔ اس کے گھر والوں نے اس کی شادی نہیں اور کر دی۔ کافی وقت گزر گیا۔ میں اور وہ اچھے دوست بن گئے۔ ایک روز لڑکی کی ماں نے پوچھا کہ اگر میں نے کوئی لڑکی پسند کر رکھی ہے تو بتاؤ تاکہ وہ شادی طے کر دیں۔ میں نے انہیں سارا قصہ سنا دیا اور پشیمان سا ہو گیا۔

پھر اس وقت میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے اس لڑکی کو پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا۔ وہ کمرے سے نکل گئی۔ میں نے اس کی ماں سے وجہ دریافت کی تو پتا چلا کہ وہ لڑکی مجھے چاہتی تھی، لیکن والدین کو ہمت نہ ہوئی کہ میرے خاندان والوں سے تذکرہ کرتے، اس لیے کہ ہم سماجی طور پر بلند مرتبے والے لوگ تھے۔ معاشرے میں ہمارا مقام بلند

تھا۔ حالانکہ میں خود کو ایسا نہیں سمجھتا تھا اور نہ اب سمجھتا ہوں۔“ وہ مسکرا رہے تھے، لیکن ان کی مسکراہٹ میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ وہ دل شکستہ اور دل گیر تھے، لیکن مسکرا کر مجھے اور خود کو دھوکا دینا چاہ رہے تھے۔

☆.....☆

ان کی زندگی انوکھے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ایک یتیم بچی ان کے پاس لائی گئی، جس کے والدین ٹریفک کے حادثے میں ختم ہو گئے تھے۔ اس کے حالات سن کر انہیں بہت صدمہ ہوا۔ انہوں نے اس کی کفالت کی اور اپنے ایک دوست سے گزارش کی کہ وہ اسے اپنے ہاں رکھ لیں۔ ہر ماہ اخراجات وہ ادا کرتے رہیں گے۔ انہوں نے بچی سے کہا کہ وہ جب بھی مصیبت میں مبتلا ہو، خدا کو یاد کر لیا کرے۔ وہ ضرور اس کی مدد کے لیے آئے گا (پارسیوں کے عقیدے کے مطابق دو خدا ہوتے ہیں، نیکی کا خدا یزداں اور برائی کا خدا یا شیطان اہرمن ہے) بچی نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کرے گی۔

کافی عرصے بعد جب جمشید اپنی کار میں ایک دوست کے گھر جا رہے تھے تو ڈرائیور نے کار ایک مکان کے سامنے لے جا کر روک دی۔ جمشید ایک کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ کار کئے پر اتر گئے۔ معلوم ہوا کہ وہ اصل مکان سے کافی فاصلے پر اترے ہیں۔ ڈرائیور نے انہیں آگے بڑھ کر اتارا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ان دونوں حضرات کے نام ایک جیسے تھے۔ جمشید نے سوچا جب وہاں تک آگئے ہیں تو ان صاحب سے ملاقات کرتے چلیں۔ وہ آگے بڑھے تو انہیں مکان کی ایک کھڑکی میں ایک دوشیزہ دکھائی دی جو بری طرح سے چیخ رہی تھی اور اس کے پیچھے ایک شخص تھا جو اس کی عزت لوٹنا چاہتا تھا۔ لڑکی کہہ رہی تھی۔ ”اے خدا! میری مدد کر۔ جمشید کا خدا کہاں گیا؟“

جمشید نے کھڑکی کے قریب پہنچ کر کہا۔ ”خدا ہر جگہ موجود رہتا ہے۔ میری بچی۔ گھبراؤ مت۔“ پھر انہوں نے دروازے کو اپنی واکنگ اسٹک سے کھٹکھٹایا اور اوچی آواز میں کہا۔ ”دروازہ کھولو۔ میں پولیس کو بلاتا ہوں۔“ پولیس کا نام سن کر وہ شخص ہچکلے دروازے سے بھاگ گیا۔ لڑکی نے دروازہ کھول دیا اور بتایا کہ اس کے والدین گئے ہوئے ہیں اور وہ گھر میں تنہا ہے۔ جمشید نے اس لڑکی کو پہچان لیا۔ یہ وہی یتیم بچی تھی جس کو انہوں نے اپنے دوست کے گھر میں پناہ دلوائی تھی۔ اس کے نقوش سو فیصد وہی تھے، جو بچپن میں تھے۔

”تم نے مجھے پہچانا نہیں بیٹی۔“ جمشید نے کہا۔ ”میں ہی جمشید ہوں جس نے تمہیں خدا کو یاد کرنے کی تلقین کی تھی۔ نور الدین کہاں ہے؟“

”وہ اپنے بڑے بھائی کے گھر گئے ہوئے ہیں۔ مجھے انہوں نے تنہا چھوڑ دیا۔“ اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ نہ آتے تو میرا نہ جانے کیا حشر ہوتا۔“ جمشید نے اسے تسلی دی۔ پھر وہ اس وقت تک واپس نہیں آئے جب تک کہ نور الدین لوٹ کر گھر نہیں آگئے۔ نور الدین نے جمشید سے مصافحہ کیا اور کافی عرصے کے بعد آنے کا شکریہ ادا کیا۔ جب اسے لڑکی فاطمہ کے واقعہ کا علم ہوا تو وہ بہت رنجیدہ ہوا۔ اس نے جمشید کا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ وہ کبھی فاطمہ کو گھر میں تنہا نہیں چھوڑ کر جائے گا۔

وہ دوسروں کے دکھ درد کو اپنا دکھ سمجھتے تھے اور کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جب وہ کم عمر تھے، ایک بار دوستوں کے ساتھ بازار گئے اور سودا سلف خریدنے لگے۔ واپسی پر سب دوست اچانک انہیں چھوڑ کر دوڑنے لگے اور کافی دور نکل گئے۔ انہوں نے چونک کر اطراف میں دیکھا تو ایک مجذوب کو اپنی طرف بڑھتے پایا۔ اسی مجذوب کو دیکھ کر وہ سب خوفزدہ ہو گئے مگر جمشید اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ انہیں اس سے کوئی خوف بھی نہ لگا۔ مجذوب نے قریب آ کر انہیں سینے سے لگا لیا اور چھوڑ دیا۔ جیسے وہ اپنے سینے کے سارے جذبے ان کی ذات میں جذب کر دینا چاہتا ہو۔

دوستوں کا کہنا ہے کہ جمشید میں جو مجذوبانہ وصف تھا، وہ اسی مجذوب کا عطا کردہ تھا۔ بہر حال انہیں مجذوبوں سے گہری دل چسپی اور ہمدردی پیدا ہو گئی۔ انہوں نے ان کی فلاح کے لیے کام کیا۔ آخری وقت تک ان کا خلوص اور ہمدردی، شیخ کی لوکی طرح ان کے دل میں تھر تھراتی رہی۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام انہی لوگوں کے ساتھ گزاریں۔

وہ انسانوں سے ہی محبت نہیں کرتے تھے، بلکہ انہیں جانوروں سے بھی محبت تھی۔ پیر علی محمد راشدی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ ”یہ 1930ء کی بات ہے کہ میں ہند روڈ پر جا رہا تھا کہ میں نے جمشید نرسوانچی کو دیکھا کہ وہ ایک گدھے کو جانوروں کے اسپتال کی طرف لے جا رہے ہیں۔ گدھا لنگڑا رہا تھا اس لیے کہ اس کی ایک ٹانگ میں زخم تھا۔ مالک اسے کھیٹ رہا تھا۔ جمشید کا ڈرائیور گاڑی لے کر ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ مجھے تجسس ہوا کہ جمشید یہ کیا کر رہے ہیں۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ ایک ڈاکٹر اس گدھے کا معائنہ کر

رہا ہے۔ جمشید اسے ہدایت دے رہے ہیں کہ وہ اس کی دیکھ بھال میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کرے۔ ڈاکٹر نے جب زخم کی مرہم پٹی کر دی تو جمشید نے گدھے کے مالک کو ہدایت دی کہ گدھے کی ٹانگ کے زخم کے مندل ہونے تک اس سے کوئی کام نہیں لے گا۔ اس کے بعد مرہم پٹی کی اجرت ادا کی اور گدھے کے مالک کو بھی کچھ رقم دی کہ وہ اس دوران جب کہ گدھا بار برداری نہیں کرتا، وہ اپنا گزارا کر سکے۔

اسے کے بروہی کہتے ہیں کہ میں نے انہیں کبھی مایوس نہیں دیکھا۔ وہ عزم و ہمت کا مجسمہ تھے۔ مگر ایک موقع پر ان کے چہرے پر مایوسی کے بادل چھانے لگے۔ یہ واقعہ ان کی موت سے تین ہفتے پہلے کا ہے۔ انہوں نے مہاجروں کے مسئلے پر حکومت کی بے اعتنائیوں کا تذکرہ کیا۔ وہ ان کی آباد کاری سے مطمئن نہ تھے۔ انہوں نے کرب سے کہا۔ ”بروہی! آنے والے چند برسوں میں ہمیں نہ صرف محتاج، ناخواندہ اور سماج دشمن افراد کی ایک بڑی تعداد کا مسئلہ درپیش ہوگا بلکہ اس سے بھی بدتر حالات کا۔ ہمارے سامنے بے شمار ذہنی اور نفسیاتی مریضوں کی دیکھ بھال کا مسئلہ بھی ہوگا۔ کیونکہ اگر ہم احتیاط کے ساتھ اس زندگی کا مطالعہ کریں جو مہاجر بچے گزارنے پر مجبور ہیں کہ نہ ان کے جسم پر کپڑے ہیں اور نہ سر پہ چھت جو انہیں تیز دھوپ، ہوا اور بارش سے بچا سکے۔ ہم یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ نسل جو آج نشوونما کی ابتدائی منزل میں ہے ہمیں مضبوط، صحت مند اور کارآمد شہری فراہم نہیں کر سکے گی۔ انہیں آنے والے سماجی نظام کا حصہ بنانا ایک ناممکن کام ہوگا۔“ انہوں نے مزید کہا۔ ”ایسی بات نہیں ہے کہ یہ مسئلہ حل نہیں کیا جاسکتا ہو اور نہ اس کے لیے بہت بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے کچھ درکار ہے تو بس ذرا تخلیقی انداز فکر اور ہمدردانہ فہم۔ میں نے ایک اسکیم تیار کی ہے جس کے ذریعے صرف ایک سال کے عرصے میں ان تمام مہاجروں کو ملک کی معاشی اور سماجی زندگی کا حصہ بنانا اور انہیں وہ اندرونی قوت اور بیرونی وسائل مہیا کرنا ممکن ہے جس سے یہ پُرسرت زندگی گزارنے کے قابل ہو سکتے ہیں مگر میری کوئی بات ہی نہیں سنتا۔“

میں نے اس سے پہلے جمشید کو اتنے گہرے لہجے میں بات کرتے نہیں دیکھا، جیسا اس دن دیکھا۔ یہ لہجہ ان کے عام لہجے سے مختلف تھا۔ میں ان کے ملال کے بوجھ تلے دب گیا اور میری زبان گنگ ہو گئی۔ کاش کہ میں ان سے پوچھ لیتا کہ ان کا منصوبہ کیا تھا، تاکہ میں خود اس پر عمل کر سکتا۔

☆.....☆

جشید اپنی ہمیشہ کے گھر میں رہتے تھے۔ بھانجی گلزارین کپاڑیہ پولیو میں مبتلا تھی۔ وہ دن بھر کام کرنے کے بعد تھک جاتے تھے، لیکن جب اس بچی کو نیند نہیں آتی تھی تو وہ اسے بہلاتے تھے۔ اس کے بعد انہیں مزید تھک جانا چاہیے تھا، لیکن انہوں نے بتایا کہ میرے کانوں میں گھنٹیاں بجنے لگتی تھیں اور میں گہری نیند سو جاتا تھا۔

اپنی بھانجی کا علاج کرانے کے لیے وہ 1950ء میں امریکا گئے۔ وہاں جا کر خود ان کی طبیعت بگڑ گئی، لیکن انہوں نے اس کی پروا نہیں کی۔ بھانجی کا علاج ہوا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

ایک برس بعد وہ بھانجی کو لے کر یورپ کے بہت سے ملکوں میں گئے، لیکن اس کا مرض دور نہ ہوا۔ علاج کے سلسلے میں جب وہ مغربی جرمنی میں تھے تو بھانجی کے پاس دن میں تین بار جایا کرتے تھے۔ ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق بھانجی کو بغیر نمک کا کھانا دیا جاتا تھا تو ناراض ہوتی تھی۔ جشید اسے سمجھاتے سمجھاتے تھے تو کھانا کھالیا کرتی تھی۔

جرمنی میں اپنے قیام کے دوران جشید کو یہ اطلاع ملی کہ پاری مذہب کو درست رکھنے اور پارسیوں کو سیدھی راہ پر چلانے کے لیے ایک تحریک چلائی جا رہی ہے، جس میں پارسیوں کی بڑی انجمنیں شامل ہیں۔ جشید نے فوراً ان لوگوں کے نام خط لکھا جو تحریک چلا رہے تھے کہ میں خود پارسی ہوں اور میں نے اپنے لوگوں کے لیے جتنا ہوسکا کیا ہے لیکن یہ وقت تحریکیں چلانے کا نہیں ہے، اس لیے کہ پاکستان کو قائم ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ پارسیوں کو گوشت نہیں کھانا چاہیے لیکن میرے خاندان کے بہت سے افراد گوشت خور ہیں۔ حد یہ ہے کہ آتش کدے کے پادری صاحب بھی گوشت خور ہیں۔ ان کے اس عمل سے مجھے بہت تکلیف پہنچتی ہے۔ گوشت خوروں کو سبزی خور کیسے بنایا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے تحریک چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں مارنا پیٹنا نہیں چاہیے۔ ان کے دلوں کو محبت سے جیتنا چاہیے۔ وہ میری بات ضرور مانیں گے اس لیے کہ میں خود سبزی خور ہوں اور شراب بھی نہیں پیتا۔ میری ماں نے بچپن ہی سے مجھے تلقین کرنا شروع کر دی تھی کہ میں شراب سے دور رہوں۔

لوگوں نے سمجھ داری کا ثبوت دیا اور تحریک ختم ہو گئی۔ جرمنی میں ان کی بھانجی کا علاج ہوا، لیکن کوئی کامیابی

حاصل نہ ہوئی۔ لہذا وہ بے نیل و مرام واپس آ گئے اور شب و روز پہلے کی طرح اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ بعد میں انہی کی دعاؤں سے بھانجی صحت یاب ہو گئی اور کافی عرصے تک زندہ رہی۔

☆.....☆

1943ء میں آپورہدیک کی پریکٹس کرنے والوں نے ایک کانفرنس کراچی میں منعقد کی۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک کمیٹی بھی تشکیل دی کہ سرطان میں مبتلا افراد کو آپورہدیک ادویہ دی جائیں۔ اس لیے کہ اس طریق علاج میں اس مہلک مرض کا علاج ہے۔ مرض اگر مکمل طور پر ختم نہیں ہوتا تو مریض کو کافی افاقہ ہو جاتا ہے۔ جشید نے اس کانفرنس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور کمیٹی کو ایک بھاری رقم بھی دی۔ کیونکہ ان کی والدہ اسی مرض میں ہلاک ہوئی تھیں۔ وہ سرطان میں مبتلا افراد سے دلی ہمدردی رکھتے تھے۔

☆.....☆

جہاں تک ہمدردی کا تعلق ہے، وہ ہر کس و ناکس سے ہمدردی اور شفقت برتتے تھے۔ وہ اپنا ایک واقعہ سناتے تھے کہ ایک بار میں ایک گاؤں سے گزر رہا تھا کہ میں نے ایک جگہ مجمع دیکھا۔ میں اپنی کار سے اتر آیا۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ کسی خاتون کے ہاں ولادت ہوئی ہے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا پھر لوگوں سے پوچھا کہ اسے اسپتال کیوں نہیں لے جاتے۔

پتا چلا کہ یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔ میں اس خاتون کے گھر میں داخل ہوا تو میں نے اسے فرش پر پڑے دیکھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھ کر سمنے لگی۔ نو مولود اس کے پہلو میں پڑا تھا۔ وہ کوڑھ میں مبتلا تھی۔ میں اس کے قریب چلا گیا تو اس نے میرا نام پوچھا۔ میں نے نام بتایا تو اس نے بچہ میرے حوالے کر دیا۔ خاتون کے ہاتھوں پر کوڑھ کا اثر نہیں تھا، لہذا میں نے بچہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

میں بچے کو باہر لے آیا۔ پھر میں نے لوگوں سے پوچھا کہ اس کا باپ کون ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ کوئی نہیں۔ چنانچہ میں اسے لے کر کراچی آ گیا اور میں نے اسے اسپتال میں داخل کر دیا اور اس کی خبر گیری کی تلقین کی۔ بچہ ناجائز تھا، لیکن اس میں اس کا تو کوئی قصور نہیں تھا، لہذا اسے پالنے کی ذمہ داری میں نے قبول کر لی۔ بغیر کسی ستائش اور صلے کی تمنا کے۔

☆.....☆

7 جنوری 1946ء میں جشید جب ساٹھ برس کے

ہو گئے تو ایک جشن منایا گیا۔ ان کے اعزاز میں جشید بے آنتی کمیٹی کے چیئرمین حاتم علوی نے تقریر کی۔ اس موقع پر شریک ہونے والے سب اسکولوں کو ان کی بڑی سی تصویر دی گئی کہ وہ اسے اسکول میں لگائیں۔ ان کے دوستوں نے ان کے بارے میں ایک کتاب لکھی تھی، جس کی رونمائی کی تقریب بھی اسی جشن میں ہوئی۔

1946ء سے ان کی موت 1952ء تک جشید ایک مختلف انسان دکھائی دیتے تھے۔ انھوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ ہندوستان دو ملکوں میں تقسیم نہ ہوا ورنہ علیحدہ ریاستیں نہ بنیں مگر جب مسلمانوں میں آزادی حاصل کرنے کا جوش و خروش بڑھتا ہوا دیکھا تو وہ خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے پاکستان ہی میں رہنے کو ترجیح دی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ دونوں حصوں میں استحکام اور سلامتی کی تحریک چلائیں گے، مگر ان کی ناگہانی موت نے ان کے خوابوں کی تعبیر مکمل نہ ہونے دی۔

ان کی موت پر ان کے ایک دوست نے کہا۔ ”جشید کی موت پر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری روح کا کوئی حصہ بھی کھو گیا ہے۔“

☆.....☆

محکمہ ڈاک و تار نے ان کی یاد میں تین روپے کا ڈاک ٹکٹ 7 جنوری 1988ء کو جاری کیا۔ اس کے علاوہ گلشن پر ان کی یاد میں ایک عمارت قائم کی جا چکی ہے۔ جس کا نام نسر و انجی بلڈنگ ہے۔ پہلے یہ یادگار کھارادر میں قائم تھی۔

ان کا انتقال 8 اگست 1952ء میں طویل علالت کے بعد صبح تین بجے ہو گیا۔ وہ آخری وقت تک کام کرتے رہے۔ ان کے ڈاکٹر بھور انکل سریا (ان کے نام پر ایک اسپتال بھی ہے) کا کہنا ہے کہ میں نے انہیں ہدایت دی کہ وہ ایک روز کام کریں اور دوسرے دن چھٹی کریں مگر وہ نہ مانے پھر یہ ہوا کہ ان کی ٹانگیں ان کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہو گئیں۔ وہ چلنے سے معذور ہو گئے تو بستر پکڑنا پڑا۔ ان کا دماغ آخری وقت میں بھی ناکارہ نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ وہ بستر علالت پر بھی فائلیں دیکھتے تھے۔ ضرورت مندوں کے فون سنتے تھے اور ان کے بارے میں احکامات جاری کرتے تھے۔ دنیا میں لوگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، لیکن ان جیسے بہت کم ہوتے ہیں، جنہیں دوسروں کی پروا ہوتی ہے، لیکن اپنی نہیں۔

ان کا ملازم رتنا نے کہا کہ ایک رات تقریباً صبح چار بجے ان کی آنکھ کھلی تو درد سے کراہنے لگے۔ میری آنکھ کھل گئی میں

ان کے سر ہانے گیا اور پوچھا کہ انہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ انہوں نے سر کو شانہ لہجے میں کہا۔ ”رتنا مرنے کے لیے کون سی گھڑی بہتر ہے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔“ وہ کہنے لگے۔ ”تم درست کہتے ہو۔ مگر یہ وقت بہترین ہے اس لیے کہ اس وقت بہت سکون اور شانتی ہوتی ہے۔“ (ان کی موت صبح چار بجے ہی ہوئی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ انہیں اپنی موت کا وقت کیسے معلوم ہو گیا تھا) جنوری میں جب ہم ان کی سالگرہ منا رہے تھے تو انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”یہ میری زندگی کا آخری سال ہے۔ میں نے تین جوتھیوں سے حساب لگوایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ میں 66 برس تک زندہ رہوں گا (پتا نہیں کیسے ان کا حساب کتاب درست ثابت ہوا) اپنی موت سے تین ماہ قبل انہوں نے مجھ سے کاغذ قلم مانگا۔ میں نے دیا تو لکھا۔ ”سب سے بڑی سچائی کسی اور چیز میں نہیں مگر تھیو سونی میں ہے۔ اسے زندہ رکھنا۔ اس کے پرچم کو بلند رکھنا، چاہے میں اپنے جسم میں رہوں یا نہ رہوں۔“

موت کے وقت ان کا چہرہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا جسے ان کی بھانجی گلزارین کپاڑیا صاف کر رہی تھی۔ وہ آخری لمحوں میں بے ہوش ہو گئے۔ یہ بے ہوشی ان کی موت پر منتج ہوئی۔

ان کی موت کی خبر سن کر سیکڑوں افراد جمع ہو گئے۔ آخری دیدار کے لیے اتنے افراد آئے تھے کہ تقریباً ایک میل لمبی لائن لگ گئی۔

(پارسیوں کے پیغمبر زرتشت ہیں۔ ان کے دو خدا ہوتے ہیں۔ اچھائی کا خدا اہورا رمزا اور برائی کا اہرمن۔ مذہبی کتاب اوستا ہے، جو قدیم سنسکرت میں لکھی گئی ہے۔ زرتشتی اپنے عقیدے کے مطابق مردوں کو دفن نہیں کرتے، بلکہ لاش کو کنوئیں پر رکھ دیتے ہیں۔ تاکہ چیل کوے آکر مردے کا گوشت کھالیں۔ جب ڈھانچا رہ جاتا ہے تو اسے کنوئیں میں پھینک دیا جاتا ہے۔ اس کنوئیں کو TOWER OF SILENCE کہتے ہیں، لہذا ان کی کوئی قبر نہیں ہے۔

جن کتابوں سے مدد لی گئی:

۱۔ سہ ماہی ”آج“، کراچی کی کہانی نمبر۔ 1995ء

۲۔ Jamshed Nusserwanji-A memorial

Jamshed- a Karma Yogin-۳

تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچتا سمجھتا، کچھڑ، پتھروں اور بر فیلے پانی کا ایک تیز و تندریلا اندر داخل ہو گیا۔ اس کے تھپڑے نے پائیک کو کسی بے جان کھلونے کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے جا کر بیچ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس پر کچھڑ اور بلے کی برسات ہونے لگی۔

پانی کی سطح خطرناک حد تک بڑھتی جا رہی تھی۔ پائیک کو سانس لینے کے لیے اپنی گردن بخبر فیلے پانی کی سطح سے اوپر کھینچ کر رہی تھی۔ یہ خیال اسے لرزائے دے رہا تھا کہ اگر پانی کی سطح اسی طرح بلند ہوتی رہی تو وہ ضرور ڈوب کر مر جائے گا۔

پھر جس تیزی سے پانی چڑھا تھا اسی تیزی سے اتر گیا۔ پائیک گاڑھے کچھڑ، پتھروں اور بلے میں گھٹنوں تک دھنسا ہوا تھا۔ اس نے اپنی ٹانگوں کو آزاد کرنے کے لیے دونوں ہاتھوں سے کچھڑ اور بلے کو ہٹانے کی کوشش شروع کر دی۔ اس دوران کرسٹی دیوار سے گزرنے والے پائپ کو گرفت میں لیتے ہوئے سلپنگ بیک اور پانی سے باہر نکل آیا تھا۔ جب اس نے اپنے پاؤں پانی سے نکالے تو پانی کی سطح نیچی ہونے لگی اور کچھڑ اور بلے آٹھ سینٹی گریڈ ٹیمپریچر سے جم کر پتھر کی طرح سخت ہونے لگا۔ اس کا پہلا خیال تھا کہ شاید زلزلہ آیا تھا اور ہٹ کی چھت گر گئی تھی۔ اسے بہت بعد میں یہ خیال آیا کہ ماؤنٹ رابینو کریڈ لیک کے مقام پر پھٹ گیا تھا اور یہ لاوے کا سیلاب تھا جو ڈوم شیلٹر تک آن پہنچا تھا۔ اگر وہ اپنے خیمے یا کسی غار میں سوئے ہوتے تو ضرور ہلاک ہو جاتے۔

خوش قسمتی سے کرسٹی نے سوتے وقت اپنے سر کی ٹارچ اپنے جیپ میں رکھ لی تھی۔ اس کی روشنی میں اس نے پائیک کو دیوار سے لگے بیٹھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر کچھڑ لگا تھا اور گندھگ اور جلتی راکھ سے جلنے کے نشانات پڑے ہوئے تھے۔

”مجھے نکالو جیمز، خدا را مجھے اس بلے سے نکالو۔“ وہ چلایا۔

کرسٹی نے بمشکل تمام اس پر سے سلپنگ بیک اتارا۔ اس کی بائیں ٹانگ آزاد کی جس کے گھٹنے کی ٹوپی ٹوٹ گئی تھی اور وہ اپنے ہاتھ سے ہی اس ٹانگ کو سیدھا کر سکتا تھا۔ گھٹنے سے نیچے اس کی ٹانگ میں ایک بڑا سا گھاؤ لگا ہوا تھا جس میں کچھڑ اور راکھ بھری ہوئی تھی۔

دن کی پہاڑی مسافت پر واقع اس بلند مقام پر پہنچا تھا۔ اب وہ برقیاتی جوتوں کے نیچے لگائی جانے والی کیلوں والی فولادی پلیٹیں پہنے ٹرائی پوڈ اور کیمرے لیے آس پاس کے مسکور کن نظاروں کو مقید کر رہا تھا۔

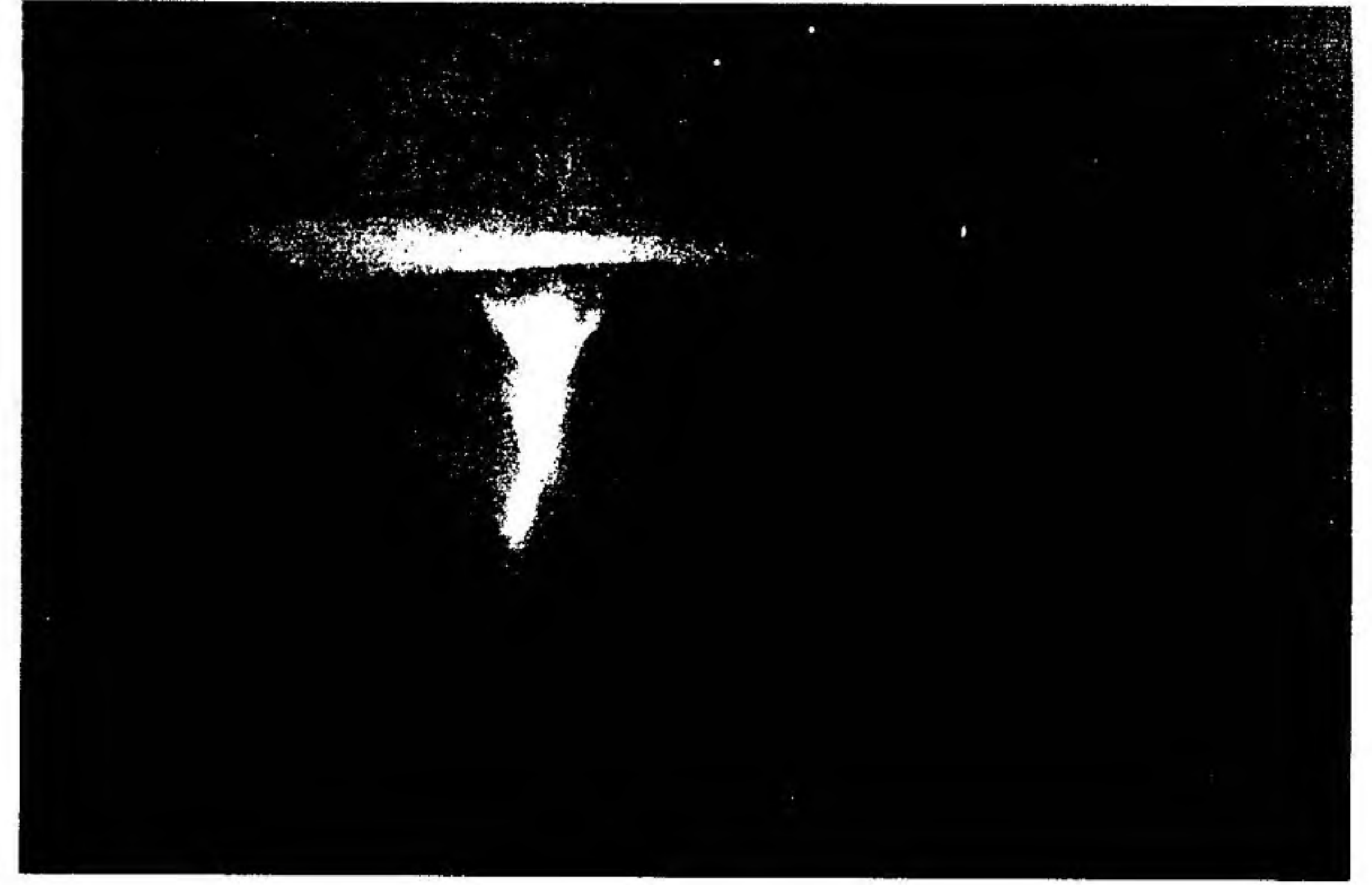
اس سے سو میٹر کی بلندی پر ایک کئے پھٹے کنارے کے ساتھ ساتھ ماؤنٹ رابینو کی ڈھالی ہزار میٹر بلند چوٹی کھڑی تھی۔ یہ زندہ آتش فشاں پہاڑ نیوزی لینڈ کا سب سے بلند پہاڑ شمار ہوتا تھا۔ اس سے چند سو میٹر نیچے سیدھ میں حسین و دلکش کریٹر لیک تھی۔ اس سے بھی نیچے اس کی نگاہ سے اوجھل اسکی انگ کے میدان تھے جن میں سے وہ اور کرسٹی گزشتہ دن گزر کر آئے تھے۔

”زندگی واقعی بڑی حسین ہے۔“ پائیک نے سرور انداز میں سوچا اور قریبی ڈوم شیلٹر کی طرف اترنے لگا۔ یہ ایک لکڑی کی ہٹ تھی جسے سائنس دان کریٹر لیک کی نگرانی کے لیے استعمال کرتے تھے۔ وہ اور کرسٹی اسی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔

آٹھ بجے رات انہوں نے اپنے گھر والوں کو پیغام بھیجے اور انہیں اپنے بخیر و عافیت ہونے کی اطلاع دی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے سروں کی ٹارچیں بجھائیں۔ پھر ہٹ کے دروازے کے قریب پلائی ووڈ کے فرش پر ایک دوسرے کے پہلو پہ پہلو اپنے سلپنگ بیگز میں گھس گئے۔ کرسٹی تو فوراً ہی گہری نیند کی وادی میں اتر گیا جب کہ پائیک جاگتے ہوئے اگلے دن کے پروگرام کو اپنے ذہن میں ترتیب دینے لگا۔

چوبیس منٹ گزرنے کے بعد اس نے باہر عجیب گھوں گھوں کر رگڑ رگڑ کی آواز سنی۔ پھر ہٹ کا دروازہ ایک زوردار دھماکے سے کھل گیا۔ اس کی ٹانگیں اس سے ٹکرائیں۔ حیران و سراسیمہ سا وہ سلپنگ بیک میں ہی گھٹنوں کے بل اٹھ گیا اور باہر دیکھنے لگا۔ اس کا خیال تھا شاید کوئی ان کے ساتھ عملاً مذاق کر رہا تھا۔ لیکن اس نے باہر جو کچھ دیکھا وہ راکھ، پتھروں اور بلے کا ایک مہیب بادل تھا جو فضا پر مسلط تھا۔ اس کے چہرے پر ٹوٹی پھوٹی چٹانوں کے ذرات آ کر ٹکرانے لگے۔ اس کے ساتھ ہی اسے ایک زبردست پھنکار سی سنائی دی جیسے کسی مہیب والو سے پوری قوت سے بھاپ نکلی ہو۔

اس وقت کرسٹی بھی نیند سے بیدار ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ پائیک ہٹ کے کھلے ہوئے دروازے میں کھڑا



آتش فشاں

فرزانہ نکھت

انسان کی زندگی پانی کا بلبہ ہے پھر بھی لوگ مہم جوئی کے نام پر خطروں سے کھیلتے ہیں۔ وہ دونوں بھی خطروں سے کھیلتے ہوئے اس سلسلہ کوہ تک پہنچے تھے کہ ایک عجیب افتاد آن پڑی۔

اکبر و سولے سے کام نہ لیتا تو دوست کی جان چلی جاتی

25 ستمبر 2009ء کی اس صبح ولیم پائیک، رابینو (Ruapehu) کی برف پوش چوٹی پر کھڑا تھا۔ اس بائیس سالہ اسکول ٹیچر نے چند دن پہلے اپنی بیچلر آف ایجوکیشن کا مقالہ جمع کروایا تھا اور اب اپنے آپ کو حیرت ناک طور پر ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

وہ ایک بہترین ایٹھلیٹ بھی تھا اور آؤٹ ڈور ٹیم میں دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ دو دن قبل اپنے ہم پیشہ عزیز دوست اکیس سالہ جیمز کرسٹی کے ساتھ ٹوٹا کر ریڈ نیپٹیل پارک میں چھ

جولائی 2018ء

74

ماہنامہ سرگزشت

جولائی 2018ء

75

ماہنامہ سرگزشت

پائیک کی دوسری ٹانگ کنکریٹ جیسے سخت کچڑ میں پھنسی ہوئی تھی۔ کرسی باوجود کوشش کے اسے باہر نکالنے میں ناکام رہا۔ اس پر اس نے کلباڑی سنبھالی اور پے در پے اس کنکریٹ جیسے سخت کچڑ پر ضربیں لگانے لگا اور بالآخر اس میں اتنا شگاف پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ اس میں ہاتھ ڈال کر گھٹنے سے نیچے تک پائیک کی ٹانگ کو ٹٹول سکتا۔ اس نے جب اس کی ٹانگ ٹٹولی تو اسے گھٹنے سے نیچے اس کی ہڈی ٹوٹی ہوئی اور باہر نکلی ہوئی محسوس ہوئی۔ چونکہ وہ بخ بستہ اور بلے میں دبی ہوئی تھی اس لیے پائیک کو کوئی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

پائیک کا کافی خون بہہ چکا تھا۔ اس حادثے نے اس کے ذہن پر برا اثر بھی ڈالا تھا اس لیے اس نے بے سرو پا باتیں کرنی شروع کر دیں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ بری طرح سے زخمی تھا اگر کرسی اس کی ٹانگ کو آزاد کر لیتا تب بھی اس کے لیے اسے اپنے ساتھ پہاڑ سے نیچے لے جانا ممکن نہ ہوتا۔

”میں تمہیں اس ملغوبے سے نہیں نکال سکتا۔“ اس نے پائیک سے کہا۔ ”میں جاتا ہوں اور مدد لے کر آتا ہوں۔“

نیوزی لینڈ الپائن کلب کی ہر قسم کے ساز و سامان سے آراستہ ہٹ پہاڑ سے کافی نیچائی پر اسکی انگ کے میدانوں کی چوٹی پر واقع تھی۔

کچھ گرم کپڑے اور بوٹ پہننے کے بعد کرسی نے برف توڑ کلباڑی ہاتھ میں لی اور چلنے کو تیار ہو گیا۔ پائیک کے چہرے سے کسی قسم کے تاثرات کا اظہار نہ ہو رہا تھا۔ اس نے کرسی سے کہا۔ ”تم میرے والد اور والدہ کو بتا دینا کہ میں ہمیشہ ان سے محبت کرتا آیا ہوں۔“

”نہیں میرے دوست یہ تم خود انہیں بتاؤ گے۔“ کرسی نے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا دوست بری طرح سے زخمی تھا لیکن اس کے خیال میں وہ زندہ بچ سکتا ہے۔

ابتدائی طبی امداد کا ماہر اور برف میں پہاڑوں پر چڑھنے اترنے کا طویل تجربہ رکھنے والا پائیک بخوبی سمجھ رہا تھا کہ وہ اس وقت شدید خطرے میں ہے۔ اس نے دل ہی دل میں یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کرسی کو ان لوگوں تک پہنچنے پھر ان کے اس کی مدد کو پہنچنے میں کتنا عرصہ لگ سکتا تھا۔ چھ گھنٹے؟ ہاں اتنا ہی وقت اگر انہیں اس تک پہنچنے میں لگے گا اگر دیر ہو جاتی تو وہ شاید ہی زندہ رہ سکتا۔

جب کرسی ڈوم شیلٹر سے روانہ ہوا تو اس وقت پائیک سردی سے بری طرح کپکپا رہا تھا لیکن ہوتھر میا کے مختلف درجات سے واقف وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ اس کی کپکپاہٹ جلد ہی دور ہو جائے گی۔ پھر اس پر ایک عجیب سا سکون طاری ہو جائے گا اور اسے نیند آنے لگے گی۔ اسی سے اسے بچنا تھا کیونکہ اگر وہ سو جاتا تو اسے پھر کبھی جاگنا نصیب نہ ہوتا۔

شیلٹر سے نکلنے کے بعد کرسی نے دیکھا کہ باہر بڑی بڑی چٹانوں کے اڑنے سے گڑھے پڑھے ہوئے تھے۔ جن میں راکھ اور برف بھری ہوئی تھی اور وہاں منجھلاوے کا دریا سا بنا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے ڈھلوان اترتا ہوا نیچے جانے لگا۔ یہ ڈھلوان بہت پھسلوان تھی لیکن اس کے کیل لگے ہوئے جوتے نیچے اترنے میں بڑے مددگار ثابت ہو رہے تھے۔ وہ اگر پھسل کر مر جاتا تو پیچھے سے پائیک کو بھی زندہ رہنا نصیب نہ ہوتا۔

اوپر ڈوم شیلٹر کی طرف جاتے ہوئے ان دونوں نے راپیو کے پہلو میں ایک کلیئیر کے قریب برف پر اسکی انگ کرنے والے دیکھے تھے۔ کرسی نے کلیئیر کے راستے نیچے اترنے کا فیصلہ کیا جو طویل مگر آسان راستہ تھا۔ اس کلیئیر پر پہنچ کر وہ چاندنی کی مدد سے گہری برف میں سے گزرتے ہوئے جلد ہی اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکتا تھا۔

کلیئیر پر پہنچ کر وہ اس کے دائیں طرف مڑتے ہوئے اسکی انگ ٹریک پر آ گیا۔ وہاں اسے کچھ دوری پر اسپاٹ لائٹ دکھائی دی۔ وہ با آواز بلند مدد کے لیے پکارا اور فوراً ہی روشنیوں میں نہا گیا۔ راپیو الپائن لفٹس کے ٹریل مینجر شین بکنگھم نے اسے دیکھ لیا تھا جو ایک سنو کیٹ ٹرک چلا رہا تھا جس پر برف پر سفر کرنے کے لیے اور اسکی انگ کے شوقینوں کے لیے راستے بنانے کی مشنری نصب تھی۔

☆.....☆

بکنگھم نے ابھی اپنی ٹائٹ شفٹ شروع ہی کی تھی کہ آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بمشکل تمام بچتے ہوئے لاوے کے سیلاب کی زد میں آنے سے بچایا تھا۔ اس وقت وہ انفجار سے برفانی راستوں کو پہنچنے والے نقصان کا جائزہ لے رہا تھا کہ اسے مدد کی پکار سنائی دی تھی۔ ”مدد! میرا سہمی بلے میں دبا ہوا ہے۔“ بکنگھم جواباً پکارا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کرسی سنو کیٹ کے کیمپ میں بیٹھا گرم ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنے کچھ کیلے کپڑے اتار دیئے تھے اور بکنگھم نے بیئر آن کر دیا تھا۔ سنو کیٹ کا ریڈیو آن تھا اور کرسی کو احساس تحفظ کے ساتھ یہ اطمینان بھی ہو رہا تھا کہ اس کا دوست ضرور بچا لیا جائے گا۔

بکنگھم نے اپنے بیس پر ریڈیو کے ذریعے کرسی اور پائیک کے بارے میں پیغام بھیجا۔ دس بجے پانچ نفوس پر مشتمل ایک امدادی پارٹی پہاڑ کی طرف روانہ ہو گئی۔ بارہ بجے آتش فشاں انفجار کے چار گھنٹے بعد سنو کیٹ کی روشنیاں ڈوم شیلٹر پر پڑنے لگیں۔

اس امدادی پارٹی نے پائیک کو اپنی جگہ پر ایک بے جان سے ڈھیر کی طرح پڑے ہوئے پایا۔ وہ زندہ تھا مگر اس کا سانس رک رک کر آ رہا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کے پاس تھوڑا ہی وقت موجود تھا اس لیے وہ فوراً ہی اس کی ٹانگ کو منجھد بلے سے آزاد کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ تھوڑے کی مدد سے جلد ہی منجھد بلے کے ایک بڑے سے ٹکڑے کو توڑ دیا گیا۔ پائیک کی ٹانگ آزاد ہو گئی مگر وہ مڑی ہوئی تھی۔ اسے سیدھا کیا گیا اور پائیک کو اٹھا کر ایک اسٹریچر پر لٹا دیا گیا۔ پھر اسے بھاری کسبلوں سے ڈھانپ دیا گیا۔ اسے سنو کیٹ میں لے جایا گیا اس کے بعد گاڑی تیزی سے وہاں سے نیچے روانہ ہو گئی۔

گیارہ بجے صبح سنو کیٹ وہاں کا پایا اسکی فیلڈ بیس پر پہنچ گئی۔ جہاں ایک ایسولینس ان کی منتظر تھی۔ اس وقت پائیک کا جسمانی نمبر پچر دو سو پچاس سی کے آس پاس پہنچا ہوا تھا اور اس کی حالت ایسی تشویش ناک ہو رہی تھی کہ وہ کسی بھی لمحے مر سکتا تھا۔

اسی لمحے پولیس والوں نے فاریسٹ ہل میں آک لینڈ کے شمالی ساحل پر واقع ایک گھر کے دروازے پر دستک دی۔

”راپیو کا آتش فشاں پھٹ گیا ہے اور آپ کا بیٹا وہاں پھنس گیا ہے۔“ ایک پولیس والے نے پائیک کے والدین بیری اور ٹریسی کو بتایا۔ ”مجھے ڈر ہے کہ وہ زندہ نہ رہا ہوگا۔“

اس سے اگلے دن پائیک کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اپنے اوپر کوئی سفید سفیدی چیز دیکھی۔ پہلے پہل تو وہ یہ سمجھا کہ شاید وہ اس وقت کسی برفانی غار میں موجود ہے لیکن پھر

آہستہ آہستہ اس کی نظروں کے سامنے سے دھند چھٹنے لگی۔ اس کا ذہن کام کرنے لگا۔ اس وقت اسے معلوم ہوا کہ وہ اس وقت وائی کاٹو اسپتال میں انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں لیٹا ہوا ہے۔

اسے آخری بات جو یاد رہ گئی وہ یہ تھی کہ جیمز کرسی اسے ڈوم شیلٹر میں چھوڑ کر مدد لینے گیا تھا اور اس کا خود اپنے بارے میں یقین تھا کہ مدد پہنچنے تک وہ ہرگز زندہ نہ رہ سکے گا لیکن وہ زندہ بچ نکلا تھا اور یہ ایک معجزے سے کم نہ تھا۔

لیکن ابھی اسے ایک اور صدمے کے لیے تیار ہونا تھا۔ اس کے لیے اسپتال والوں نے اس کے والدین کو بلوا بھیجا۔

اس کے والدین نے اس سے مل کر اس کے بچ نکلنے پر اظہار مسرت کیا۔ پھر اس کا باپ بیری اس کے چہرے پر جھک گیا اور بولا۔ ”تم اس ہولناک حادثے سے زندہ بچ نکلے، یہ اللہ کی بڑی مہربانی ہے لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ تمہیں کیسے بتاؤں لیکن تمہاری زندگی بچانے کے لیے تمہاری ٹانگ کا نا ضروری ہے۔ مجھے افسوس ہے۔“

جب کرسی نے سنا کہ اس کے دوست کی ٹانگ کاٹ دی گئی ہے تو وہ بے حد مغموم ہوا اور اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے لگا لیکن بالآخر اس نے تسلیم کر ہی لیا کہ اگر وہ ماؤنٹ راپیو میں اس قیامت کی رات خود بھی اس بری طرح سے زخمی ہو گیا ہوتا تو اس کے لیے وہاں سے مدد لینے جانا ممکن نہ ہو سکتا تھا۔ وہ اور پائیک وہیں ہٹ میں مر جاتے۔ اس خیال نے اسے کچھ ڈھارس بندھائی۔

جہاں تک پائیک کا تعلق تھا تو وہ ہمیشہ زندگی کے روشن پہلو دیکھنے کا عادی چلا آ رہا تھا۔ اس نے اپنی ٹانگ کاٹے جانے کا کوئی منفی اثر نہ لیا۔ گھٹنے سے نیچے ٹانگ کاٹ دی گئی۔ اس کی جگہ مصنوعی ٹانگ لگائی جاسکتی تھی جس کی مدد سے وہ دوبارہ چلنے پھرنے اور ماؤنٹ راپیو پر چڑھنے کے قابل ہو سکتا تھا۔

”بات صرف اتنی ہے۔“ اس حادثے کے چند ہفتوں بعد اس نے اپنے دوست سے کہا۔ ”ہم غلط وقت پر غلط جگہ پر موجود تھے۔ اس لیے جو کچھ ہوا اس پر مجھے افسوس یا غصہ نہیں۔ میرا خیال تھا میں وہاں مرجاؤں گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کے بعد سے مجھے ہر دن ایک اچھا دن معلوم ہوتا ہے۔“

اسے اسی طرح چھوڑ دو۔“

پائلٹ اس کی بات ماننے سے ہچکچا رہا تھا۔ وہ اسے مناسب نہیں سمجھتا تھا کہ اس کا طیارہ صحیح حالت میں دشمن کے ہاتھ لگے۔ اس لیے اسے تباہ کرنا ہی بہتر تھا تا کہ دشمن اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ کیونکہ اسے تذبذب کی کیفیت میں دیکھ کر طیارے کو فوری طور پر تباہ کرنے کی بجائے ایک تجویز پیش کر دی۔ ”اسے تباہ کرنے کی بجائے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم اس طرح فٹ کر دیا جائے کہ جیسے ہی کوئی دروازہ کھولے طیارہ تباہ ہو جائے۔“

”ہاں! یہ بہترین اسکیم ہے۔ آپ لڑکیوں کو کسی محفوظ مقام پر لے جائیے۔ میں بم فٹ کرنے کے بعد آپ سے آن ملوں گا۔“

کیونکہ، البانیہ اور یونان کی سرحد پر واقع اس پہاڑی علاقہ میں برطانیہ کے سیکریٹ ایجنٹ کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ اسے برطانیہ کی رائل انجینئرز کور میں لیفٹیننٹ کی حیثیت حاصل تھی۔ پائلٹ کی بات ختم ہوتے ہی وہ ان لڑکیوں کی طرف متوجہ ہو گیا جو اس طرح پُرسکون انداز میں باتیں کر رہی تھیں جیسے یہاں پکنک پر آئی ہوں۔ کیونکہ انہوں نے گہری نظروں سے ان کا جائزہ لیا اور انہیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے ایک طرف چل دیا۔ کچھ ہی دیر بعد پائلٹ بھی اپنا کام نمٹا کر ان سے آن ملا۔ اس کے آنے کے بعد ہی کیون نے اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا۔ ”مجھے یہاں ایک اہم فریضہ کی ادائیگی کے لیے بھیجا گیا تھا۔ کوشش کروں گا کہ آپ لوگوں کو ویلونا تک پہنچا دوں، کیونکہ یہی ایک قریب ترین مقام ہے جہاں سے آپ کسی بحری جہاز سے جا سکیں گے۔“

”ویلونا یہاں سے کتنے فاصلے پر ہے لیفٹیننٹ؟“ ایک نرس نے دریافت کیا۔

”ایک سو اکیاون میل، جو ہے تو ایک خطرناک مگر مختصر ترین راستہ یہی ہے۔“ اس نے جواب میں بتایا۔ ”اگر محفوظ راستہ اختیار کیا جائے تو فاصلہ دوسو میل سے بھی زیادہ پڑ جائے گا لیکن پہلے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ دشمن کے اس علاقے سے ان لڑکیوں کو کس طرح نکالا جائے؟“ کیون نے کہتے ہوئے پُرسوج انداز میں بات پوری کی۔

ان لڑکیوں کا تعلق امریکا کے محکمہ صحت سے تھا اور اٹلی کے فوجی اسپتالوں میں کام کرنے کے لیے جا رہی تھیں۔ انہوں نے کیون کو بتایا کہ تقریباً ایک گھنٹہ پہلے طیارے کے انجن میں خرابی پیدا ہو گئی تھی جو انتہائی کوشش کے باوجود دور

نیچے آ رہا تھا۔ اسے اس انداز میں نیچے آتے دیکھ کر کیون خوف زدہ سا ہو گیا۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے پائلٹ طیارے کا کنٹرول کھو چکا ہے اور وہ پہاڑی چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا، لیکن اس کا یہ خوف بے بنیاد نکلا اور ڈکونا ایک نوٹیلی چٹان کو چھوتا ہوا غیر ہموار زمین پر اتر گیا۔

کیون کی کمین گاہ اور طیارے کے درمیان تقریباً چار سو گز کا فاصلہ تھا۔ طیارے کا ایک پہیہ ایک گڑھے میں پھنس گیا تھا اور اس کا ایک بازو چٹان سے ٹکرا کر ٹوٹ چکا تھا۔ جلتی ہوئی دھات کی بو کیون کے نچھوڑے سے ٹکرا رہی تھی اور اسے توقع تھی کہ کسی بھی لمحہ شعلے بھڑک اٹھیں گے اور طیارہ جل کر راکھ ہو جائے گا۔

نہ جانے کیا سوچ کر وہ طیارے کی طرف چل دیا۔ ابھی وہ طیارے سے پندرہ بیس قدم دور تھا کہ حیرت کی شدت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

طیارے کا دروازہ کھلا اور..... نرسوں کی وردیوں میں ملفوف چار عورتیں بیٹھیں پر نمودار ہوئیں پھر بڑی تیزی سے باہر نکل آئیں۔ نظریں جمائے کیون ایک چٹان کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ جب وہ دوبارہ طیارے کے سامنے آیا تو طیارے سے آٹھ عورتیں برآمد ہو چکی تھیں اور چند دوسری عورتوں کو نیچے اترنے میں مدد دے رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد وہاں تیرہ عورتیں موجود تھیں۔ وہ سب کی سب جوان اور حسین تھیں۔

اس حادثے کے بعد ان کے چہروں پہ خوف کے لہراتے ہوئے سائے نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے تھے۔

کیون فوراً اپنی کمین گاہ سے نکل کر ان کے پاس پہنچ گیا اور خالص آئرش لہجے میں چیخ کر ان کی خیریت دریافت کی۔ لڑکیاں اسے دیکھ کر پہلے تو سہم گئیں لیکن پھر اسے اکیلا اور غیر متوجہ دیکھ کر مطمئن ہو گئیں۔ اسی دوران طیارے کا پائلٹ بھی نیچے آ گیا۔ کیون ان لڑکیوں کو کسی پناہ گاہ کی طرف لے جانے والا ہی تھا کہ پائلٹ کے ہاتھ میں دستی بم دیکھ کر وہ بری طرح چونک گیا۔ وہ شاید طیارے کو تباہ کرنا چاہتا تھا۔

”اے..... بھروسہ! یہ بے وقوفی مت کرو.....“ اس نے چلا کے پائلٹ کو ایسا کرنے سے روکا۔ ”جرمن اور مقامی باشندے یہاں سے چند میل کے فاصلے پر موجود ہیں۔ وہ اس وقت بھی تمہارے طیارے کی تلاش میں ہوں گے اور بھڑکتے ہوئے شعلے دیکھ کر وہ آسانی سے یہاں پہنچ جائیں گے، طیارے کو تباہ کر کے انہیں اس طرف متوجہ کرنے کی بجائے

برفیلہ جہنم

اے آر راجپوت

وہ تمام لڑکیاں ہوائی حادثے کی وجہ سے برفیلے میدان میں پھنس گئی تھیں اور حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے، برفیلے میدان میں نقطہ انجماد صفر سے بہت نیچے پہنچ چکا تھا اور ارد گرد دشمن فوجیوں کی چوکیاں تھیں، دور دور تک کسی آبادی کا نام و نشان نہیں تھا پھر بھی وہ ہمت ہارنے کی بجائے چلتی رہیں۔ جبکہ ان کے پاس نہ تو کھانے کو کچھ تھا اور نہ کوئی سواری تھی۔ انہیں پاپیادہ یہ سفر طے کرنا تھا۔ عزم و حوصلے کی یہ پیکر، پھول جیسی نازک لڑکیاں پیدل چلتی رہیں، تقریباً دو ماہ چلنے کے بعد انہیں وہ مقام نظر آیا جہاں سے انہیں سواری ملتی۔

اس برفیلے میدان کو پار کرنے میں دو ماہ لگے تھے

طیارے کی آواز سننے ہی کیون بری طرح چونکا تھا۔ وہ اس تیز رفتار ہڈیوں میں اتر جانے والی تباہی سے ہواؤں سے بچنے کے لیے کسی پناہ گاہ کی تلاش میں تھا۔ طیارے کی آواز سن کر کیون کو یہ سمجھنے میں مطلق دیر نہ لگی کہ یہ دشمن کا جہاز ہے جو یونان کے ساحل سے دوسو میل دور ان پہاڑوں میں اپنے کسی خفیہ اڈے پر اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیون کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑا رہا تھا۔ دفعتاً جہاز بادلوں سے نکل کر سامنے آ گیا۔ کیون نے بدحواس ہو کر ایک بہت بڑے پتھر کی آڑ میں پناہ لے لی اور جہاز کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ایک ڈکونا طیارہ تھا جو تیزی سے



نہ ہو سکی۔ پائلٹ حوصلہ ہار بیٹھا تھا اور طیارہ اتارنے کے لیے کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں تھا لیکن کوئی ایسی جگہ دکھائی نہ دی تھی جہاں طیارے کو بحفاظت اتارا جاسکتا مگر جب طیارہ بالکل ہی بے قابو ہو گیا تو خطرہ مول لیتے ہوئے اس خطرناک علاقے میں کریش لینڈنگ کرنا پڑی اور خدا کا شکر ہے کہ ان کے ساتھ کسی قسم کا کوئی حادثہ پیش نہیں آیا اور ان سب کی زندگیاں محفوظ رہیں۔

وہ لڑکیاں اب بھی اس طرح ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں جیسے انہوں نے اس حادثے کا کوئی اثر قبول ہی نہیں کیا ہو۔ کیون ان کی بلند حوصلگی کی داد دیتے بغیر نہ رہ سکا لیکن

وہ سوچ رہا تھا کہ اس برفانی علاقے میں جہاں قدم قدم پر دشمن سے ڈبھیر ہونے کا خطرہ تھا، دو سو میل کا فاصلہ طے کر سکیں گی؟ گیون کی کمین گاہ ایک پہاڑی غار میں تھی جو ہر لحاظ سے محفوظ تھی۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے ان کے لیے تیز کافی تیار کی تاکہ سردی کا کچھ اثر زائل ہو سکے۔ درجہ حرارت نقطہ انجماد سے بھی نیچے گر گیا تھا۔ کافی پینے کے دوران گیون نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ”اس علاقے کی صورت حال کے بارے میں، میں آپ لوگوں کو کسی غلط فہمی میں نہیں رکھنا چاہتا۔ ہم چاروں طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں، شمال، مغرب اور جنوب میں جرمن پھیلے ہوئے ہیں اور ان کے دستے مسلسل گشت کرتے رہتے ہیں۔ گوکہ یہ غار ہمارے لیے محفوظ ترین پناہ گاہ ہے لیکن ہم چوبیس گھنٹے یہاں مقید تو نہیں رہ سکتے، باہر نکلے تو جرمن فوجیوں سے ڈبھیر ہو جانے کا خطرہ ہے۔ مشرق میں البانیہ ہے جو جرمنوں کے ساتھ مصروف پیکار ہے لیکن ہم اس طرف جانے کا خطرہ نہیں مول لے سکتے کیونکہ وہ اتحادیوں کو بھی اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ اگر ہم ان کے ہتھے چڑھ گئے تو ہمیں فوراً ختم کر دیا جائے گا۔“

اس خوفناک انکشاف پر دو لڑکیاں ہولے سے کھانس دیں۔ پاکٹ نے اپنی جیکٹ اتار کر ان کے کندھوں پر ڈال دی اور گیون سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تو پھر، ایسی صورت میں تم کیا کرنا چاہتے ہو؟“

ایک لڑکی نے گیون کو سگریٹ پیش کیا۔ اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے جواب دیا۔ ”کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ان حالات سے کس طرح نمٹا جائے، ہم ریڈیو ٹرانسمیٹر کے ذریعے بھی کوئی مدد طلب نہیں کر سکتے کیونکہ یہاں کسی طیارے کی لینڈنگ کے لیے کوئی جگہ نہیں، البتہ یہاں سے سو میل دور دریائے ڈینیوب کے کنارے ایک چھوٹے سے میدان میں کوئی طیارہ آسانی سے اتر سکتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس برفانی علاقے میں ان لڑکیوں کے لیے سو میل کا فاصلہ طے کرنا ممکن نہیں ہوگا۔“

”مسٹر گیون! ہمیں اتنا نازک اندام نہ سمجھو کہ مصائب کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ ہمیں بدترین حالات کا مقابلہ کرنے کی بھی تربیت دی گئی ہے اور ہم فوجیوں کی طرح لاٹک مارچ بھی کر سکتے ہیں۔ اگر ہم میں ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کی قوت نہ ہوتی تو ہمیں اس طرح باہر نہ بھیجا جاتا۔ ہم مارچ کے لیے تیار ہیں۔ روانگی کب ہوگی؟ ابھی یا صبح؟“ سنہرے بالوں

والی سسٹر لوئیس نے کہا۔

گیون اس کے اس عزم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے دوسری لڑکیوں کی طرف رخ کر کے پوچھا۔

”اور آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟“

”لوئیس نے ہمارے خیالات کی ترجمانی کر دی ہے۔“

انہوں نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے لیکن یہ ذہن نشین کر لیں کہ ہم کسی پکنک ٹور پر نہیں قدم قدم پر موت کا سامنا ہوگا۔ کامیابی کا امکان ہزار میں سے ایک ہے۔ زیادہ امکانات اس بات کے ہیں کہ ہم ویلونا پہنچنے کی بجائے جرمنوں کے ہتھے چڑھ جائیں جس کا نتیجہ آپ سمجھ سکتی ہیں کہ کیا ہوگا۔“ گیون نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

☆.....☆

اس ٹھنڈی شام کی یہ سرد رات، یہاں نکلنے کے پروگرام طے کرتے ہوئے گزر گئی۔ صبح ہوئی تو درجہ حرارت اب بھی صفر سے نیچے ہی تھا۔ روانگی کی تیاری کرنے کے بعد گیون نے لڑکیوں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیا۔ تمام لڑکیوں نے سردی سے بچنے کے لیے کبل کی پٹیاں پھاڑ پھاڑ کر اپنی ٹانگوں اور جسم کے دوسرے حصوں پر لپیٹ لی تھیں، صرف چہروں کا کچھ حصہ برہنہ نظر آ رہا تھا۔

گیون ایک مہم جو انسان تھا۔ اس نے اپنے آپ کو رضا کارانہ طور پر کسی خطرناک مہم کے لیے پیش کیا تھا جس پر اسے یونان اور البانیہ کی سرحد پر ان برف پوش پہاڑی علاقے میں دشمن کی نقل و حرکت کے بارے میں اطلاعات فراہم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ اس عرصے میں وہ کامیابی سے اپنے فرائض نبھاتا رہا تھا اور اب اس نے دوسری جنگ عظیم کی سب سے انوکھی اور انتہائی خطرناک مہم کی کمان سنبھال لی تھی۔

ان تیرہ نوجوان اور حسین لڑکیوں کو بحفاظت منزل مقصود تک پہنچانا بھی اس نے اپنے فرائض میں شامل کر لیا تھا۔

تنگ پہاڑی راستے کے دائیں جانب ایک ہزار فٹ گہری ڈھلان تھی۔ گیون کے ایک ہاتھ میں اسٹین گن تھی اور وہ تقریباً پچاس گز آگے تھا۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ جرمنوں یا مقامی باشندوں سے ڈبھیر نہ ہونے پائے۔ لڑکیاں سکون اور اطمینان سے اس کے نقش قدم پر چل رہی تھیں۔ گوان کے حوصلے بلند تھے لیکن ان کے نازک جسم اس خوفناک مہم کے

لیے قطعی نہیں بنائے گئے تھے۔ ان کے لباس اور جوتے بھی موزوں نہیں تھے۔ تیز برفانی ہوا ان کے جسموں سے ٹکراری تھی لیکن ان کے چہروں پر اعتماد کی جھلک نمایاں تھی۔

کئی گھنٹوں تک انہیں رکے بغیر ان کا سفر جاری رہا۔ دوپہر کے قریب گیون نے انہیں رکنے کا حکم دیا۔ تمام لڑکیاں نڈھال سی ہو کر ایک چٹان پر بیٹھ گئیں۔ طیارے کا پائلٹ بھی ایک جگہ ڈھیر ہو چکا تھا۔ گیون انہیں وہیں چھوڑ کر جائزہ لینے کی غرض سے آگے نکل گیا کیونکہ اس بات کا اندیشہ تھا کہ ان پہاڑیوں میں کسی جگہ اچانک ہی دشمن سے آنا سامنا ہو جائے گا۔ واپس آ کر اس نے لڑکیوں کو روانگی کا حکم دیا اور وہ چلتے ہی والے تھے کہ گیون بری طرح چونک گیا۔ اس نے تمام لڑکیوں کو پتھروں کے پیچھے آڑھ لینے کی ہدایت کی اور اسٹین گن سنبھالے سامنے والی چٹان کی طرف دیکھنے لگا۔

چند سیکنڈ بعد ہی چٹان کی دوسری طرف سے دو آدمی نمودار ہوئے۔ ان میں ایک نوجوان یونانی تھا اور دوسرا برطانوی، جس نے کندھے پر کچھ لاد رکھا تھا۔ وہ دونوں گیون ہی کے ساتھی تھے جو اس کی طرح فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں ان پہاڑیوں میں موجود تھے۔ یونانی کا نام نکولس اور برطانوی کا نام ہیریٹ تھیل تھا جو سارجنٹ کے رینک کا ریڈیو آپریٹر تھا۔ گیون نے اسٹین گن دوبارہ کندھے پر لٹکالی اور نکولس کو آواز دی۔

”اے لیفٹیننٹ، تم اپنی کمین گاہ سے اتنی دور کیسے آ گئے؟“

نکولس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور حیرت سے بولا تھا۔ ”تم اتنی دور کیوں آ گئے؟“

گیون نے جواب دینے کی بجائے لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا۔ نکولس اس برف زار میں ان حسین اور جوان لڑکیوں کو دیکھ کر چونک گیا۔

”یہ..... یہ اتنی ساری حسینائیں کہاں سے ٹپک پڑیں؟“ وہ ہکا بولا۔

”ہم ویلونا جانا چاہتے ہیں اور ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ گیون نے اسے ساری بات سمجھاتے ہوئے کہا۔

نکولس فوراً ہی آمادہ ہو گیا۔ ریڈیو آپریٹر سارجنٹ تھیل بھی ویلونا جا رہا تھا اس لیے وہ بھی اس قافلے میں شامل ہو گیا۔ انہیں سفر کرتے ہوئے آٹھ گھنٹے ہو چکے تھے۔ اچانک برف باری شروع ہو گئی اور ساتھ ہی تند ہوا چلنے لگی۔ برف کے

نرم گالے زمین پر گرتے ہی ٹھوس شکل اختیار کر لیتے جس سے ان کے پیر بار بار پھسل رہے تھے۔

نکولس ان سے تقریباً دو سو گز آگے جا رہا تھا۔ اس کے عقب میں گیون اس قافلے کی رہنمائی کرتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ شام ہو چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی سردی کی شدت میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ لوگ کسی ایسی پناہ گاہ کی تلاش میں تھے جہاں رک کر سردی سے بچنے کے علاوہ کچھ آرام بھی کر سکیں۔ آخر ایک چٹان کی اوٹ میں انہیں مناسب جگہ مل گئی۔ چار گھنٹے یہاں رکنے کے بعد رات دس بجے سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔

لڑکیوں میں سے کسی نے نہ تو کوئی شکایت کی اور نہ ہی انہوں نے کم ہمتی کا مظاہرہ کیا لیکن انہیں اس بات پر حیرت ضرور تھی کہ گیون رات کو بھی رکنے کی بجائے سفر جاری کیوں رکھے ہوئے تھا۔

رات کو ہر ایک گھنٹے کے بعد دس منٹ کے لیے رک کر آرام کیا جاتا اور پھر سفر شروع ہو جاتا۔ صبح ہونے تک برف باری کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی گیون نے انہیں تیز سے تیز تر چلنے کی ہدایت کی اور پانچ منٹ آرام کا وقفہ ایک کی بجائے دو گھنٹے بعد کر دیا۔

موسم کی شدت اور مسلسل سفر کی اذیت ناقابل برداشت تھی مگر لڑکیاں حیرت انگیز حد تک قوت برداشت کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ گیون کو اس صورت حال کا اندازہ ہو رہا تھا، لڑکیوں کے پیر پھسل رہے تھے، ہاتھ جم رہے تھے اور سردی ہڈیوں کے گودوں میں سرایت کر رہی تھی۔ اب تک انہوں نے صرف بارہ میل کا فاصلہ طے کیا تھا، طیارے سے لیا جانے والا راشن ختم ہوتا جا رہا تھا۔

یونان اور البانیہ کی سرحد کی طرف بڑھتے ہوئے موسم اور بھی خراب ہو گیا۔ ان کے راستے میں ایک بلند چٹان حائل ہو گئی تھی۔ جسے بڑی دقتوں کے بعد عبور کیا گیا۔ ایسی ہی مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے سات دن میں وہ صرف تیس میل کا فاصلہ طے کر سکے۔ برف باری اور راستے کی مشکلات سے بچنے کے لیے نکولس اور گیون نے ایک اور راستہ اختیار کیا جو مختصر ہونے کے ساتھ خطرات سے بھی پر تھا اور اس مہم کے دسویں روز انہیں ایک اندوہناک حادثے کا سامنا کرنا پڑا۔

نکولس ان سے تقریباً سو قدم آگے تھا۔ وہ تنگ سی پٹی پر برف کاٹ کاٹ کر پیچھے آنے والوں کے لیے راستہ بناتا ہوا

چل رہا تھا۔ اچانک اس کا پیر پھسلا اور وہ ایک ہزار فٹ گہری کھائی میں غائب ہو گیا۔ اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ نے اس برف زار ویرانے میں بازگشت پیدا کر دی تھی۔

ان سب کے دل دہل گئے۔ کیون اس جگہ پر پہنچ کر رک گیا اور جھک کر تاریک کھائی میں جھانکنے لگا جس نے ٹکولس کو نگل لیا تھا۔ اس نے ٹکولس کے لیے دعائیہ کلمات ادا کیے جس نے ان کی خاطر اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیا تھا اور یہ سوچ کر آگے چل رہا تھا کہ کسی وقت ان میں سے کسی اور کے ساتھ بھی ایسا حادثہ پیش آ سکتا ہے۔

اب کیون اس قافلے کی رہنمائی کر رہا تھا۔ ان کی خوراک کا ذخیرہ خطرناک حد تک کم ہو گیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اگر خوراک کا یہ سہارا بھی ختم ہو گیا تو وہ برف کے اس جہنم سے کبھی نہ نکل سکیں گے۔

بارویں روز وہ ایک چٹان پر رک گیا۔ سامنے حدنگاہ تک ڈھلان وادی پھیلی ہوئی تھی جسے برف کی سفید چادر نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر وادی میں ایک چھوٹے سے مکان سے دھواں اٹھتا نظر آ رہا تھا۔

”بیل!“ کیون، ریڈیو آپریٹر سار جنت بیل سے مخاطب ہوا جو کندھے سے ریڈیو سیٹ اتار کر نیچے رکھ رہا تھا۔

”میں آگے جا رہا ہوں۔ ان لڑکیوں کی حفاظت کے علاوہ تمہیں میرے اوپر بھی نگاہ رکھنی ہوگی۔ ہو سکتا ہے اس مکان سے ہمیں کوئی مدد مل جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہاں دشمن کے سپاہیوں کی صورت میں ہماری موت چھپی بیٹھی ہو۔“

بیل کو ہدایت دینے کے بعد کیون برف میں راستہ بناتا ہوا ڈھلان پر اترنے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں اسٹین گن اس طرح تھام رکھی تھی کہ کسی بھی لمحہ اسے استعمال کر سکتا تھا۔ جیسے جیسے وہ مکان کے قریب پہنچتا جا رہا تھا، گن پر اس کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی لیکن مکان کے اندر کسی قسم کی نقل و حرکت کے آثار دکھائی نہیں دیئے۔

ایک کھڑکی کے قریب رک کر اس نے اندر سے کسی قسم کی آوازیں سننے کی کوشش کی لیکن مکان پر مکمل سکوت اور سناٹا طاری تھا۔ اس نے محتاط انداز میں مکان کے گرد ایک چکر لگا یا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دروازے پر دستک دی۔ اسٹین گن پر اس کی گرفت مزید مضبوط ہو گئی۔

چند سیکنڈ بعد دروازہ کھلا اور ایک بوڑھی عورت نمودار ہوئی۔

”میں برطانوی ہوں، جسے مدد کی ضرورت

ہے۔“ کیون نے نرمی سے یونانی زبان میں کہا۔ ”اندر آ جاؤ۔“ کہتے ہوئے بوڑھی عورت کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور اس نے راستہ چھوڑ دیا۔

کیون دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ اسٹین گن پر اس کی گرفت اب بھی موجود تھی مگر اس کے خدشات بے بنیاد نکلے۔ کمرے میں آتھان کے سامنے بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ چولہے پر ایک برتن رکھا ہوا تھا اور اس سے اٹھتی ہوئی شور بے کی خوشبو سے کیون کے منہ میں پانی بھر آیا۔

ماحول کا جائزہ لینے کے بعد وہ بوڑھی عورت کی طرف متوجہ ہو گیا اور ٹوٹی پھوٹی یونانی میں بولا۔ ”میرے ساتھ چند خستہ حال امریکن لڑکیاں بھی ہیں۔ کیا تم ہم لوگوں کی کچھ مدد کر سکتی ہو؟“

”اوہ..... کیون نہیں۔ وہ کہاں ہیں؟ تم لوگوں کی مدد کر کے ہمیں خوشی ہوگی۔“ بوڑھی عورت کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ کیون اپنے پھٹے ہوئے جوتے اور دوسری تمام تکالیف کو بھول کر دوڑتا ہوا اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا اور انہیں مکان میں لے آیا۔ لڑکیاں آتھان کے قریب بیٹھ گئیں۔ جبکہ بیل اور پائلٹ کھڑکیوں کے پاس جم گئے تاکہ غفلت کا شکار ہونے کی بجائے حالات پر بھی نظر رکھ سکیں۔

بوڑھی عورت نے بتایا کہ پہلے جرمن دستے اس طرف گشت کرتے رہتے تھے لیکن اب کئی روز سے نہ تو کوئی جرمن دکھائی دیا ہے اور نہ ہی کوئی مقامی باشندہ اس طرف آیا ہے اس لیے وہ اپنے آپ کو یہاں محفوظ سمجھیں اور اطمینان سے آرام کریں۔

اس رات اس مہم کے دوران پہلی مرتبہ وہ لڑکیاں پانچ گھنٹوں تک اطمینان و سکون سے سوئی رہیں۔ وہ نازک اندام لڑکیاں اس قسم کے مصائب کی عادی تو نہیں تھیں لیکن اب تک وہ عزم و استقلال اور قوت برداشت کا مظاہرہ کرتی رہی تھیں، جبکہ لوئیس تو مایوس کن حالات میں کیون کا بھی حوصلہ بڑھاتی رہی تھی۔

لڑکیاں سو رہی تھیں۔ بیل، پائلٹ اور کیون پہرہ دے رہے تھے۔ دس بجے بوڑھا شارٹ گن سنبھالے ان کے قریب پہنچ گیا۔

”تم لوگ بہت تھک چکے ہو، کچھ دیر آرام کر لو۔ اس وقت تک پہرے کی ذمہ داری میں سنبھال لیتا ہوں۔“

کیون اور اس کے ساتھیوں نے ایک دوسرے کی

طرف دیکھا پھر بوڑھے پر نگاہ ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں پدرانہ محبت کی چمک تھی۔ بوڑھے کی تجویز مانتے ہوئے وہ آتھان کے قریب لیٹ گئے۔

رات دو بجے کیون نے اپنے تمام ساتھیوں کو جگا دیا۔ روانگی کی تیاری کر کے انہوں نے اس مہربان جوڑے کو خدا حافظ کہا اور مکان سے نکل کر اپنی منزل کی طرف چل دیئے۔

برف باری اب بھی جاری تھی۔ روٹی کی طرح نرم برف کے بڑے بڑے گالے ہوا میں اڑ رہے تھے۔ ان کا رخ مشرق میں البانیہ کی سرحد کی طرف تھا۔ بوڑھی عورت نے روانگی کے وقت کچھ روٹیاں اور خشک گوشت کے چند ٹکڑے دیتے ہوئے بتایا تھا کہ ان کے مکان سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلے پر خریت پسند چھاپہ ماروں کا ایک کیمپ ہے اگر وہ لوگ وہاں تک پہنچ جائیں تو چھاپہ ماران کی کافی مدد کر سکتے ہیں۔

سردی کی شدت اور تنگ جوتوں کی وجہ سے کچھ لڑکیوں کے پاؤں سوچ گئے تھے جس سے چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ کیون نے اپنے کمرے میں کچھ لڑکیوں کی لمبی پٹیاں بنالیں اور ان لڑکیوں کو ہدایت کی کہ جوتے اتار کر یہ پٹیاں پیروں پر لپیٹ لیں تاکہ چلنے میں دشواری نہ ہو اور ان کو اپنا سفر جاری رکھنے میں رکاوٹ نہ ہو کیونکہ کیون ہر قیمت پر اس سفر کو جاری رکھنا چاہتا تھا۔ گوان لڑکیوں کے حوصلے اب بھی برقرار تھے لیکن حقیقتاً ان کی حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔ اس سفر کے دوران وہ زیادہ تر بھوکی رہی تھیں۔ سردی کی شدت اور خوراک کی کمی ان پر بری طرح اثر انداز ہو چکی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ نیندان پر غلبہ پانے لگی تھی۔ لیکن کیون جانتا تھا کہ اس برف میں نیندان کے لیے موت کا دوسرا نام ثابت ہوگی لیکن نیند کے غلبے سے وہ بار بار لڑکھڑاہی تھیں۔ ایسے موقع پر کسی لڑکی کو بیدار رکھنے کے لیے ایک آدھ پھیر بھی لگانا پڑتا۔

”تم لوگوں کو ہر قیمت پر بیدار رہنا اور چلنے رہنا چاہیے۔ اگر کوئی لڑکی سو گئی تو کسی کے جسم میں اتنی طاقت نہیں کہ اسے اٹھا کر لے جاسکے۔“ کیون نے ان سب کو سمجھایا۔

اس طرح گرتے پڑتے دوسرے روز وہ اس علاقہ میں پہنچ گئے جہاں اس بوڑھی عورت کے کہنے کے مطابق خریت پسندوں کا کیمپ تھا۔ جب وہ ایک غار کے سامنے پہنچے تو اچانک ہی ایک لمبا تڑنگا شخص ان کے سامنے آ گیا۔ دونوں ایک لمحہ کے لیے مبہوت سا ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے

ایکس ریڈ

اپنی ماہیت کے اعتبار سے ایٹم بم اور ایکس رے مشین بنیادی طور پر یکساں ماہیت رکھتی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ایٹمی دھماکے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تابکاری بہت ہولناک اور تباہ کن ہوتی ہے جبکہ ایکس رے مشین میں ریڈیو آکٹوٹوپس کے ذریعے حساس کنٹرول کی مدد سے ایسی ہلکی تابکار شعاعیں ایک مقررہ وقت کے لیے پیدا کی جاتی ہیں جو فوری طور پر کوئی ظاہری نقصان نہیں پہنچاتیں، ان کی مدد سے اندرونی ہڈیوں اور اعضاء کا عکس فلم پر منتقل ہو جاتا ہے۔ یہ تابکار شعاعیں جسم میں ایک بار داخل ہو جائیں تو وہیں جم کر بیٹھ جاتی ہیں۔ انہیں جسم سے نکالنے کا کوئی طریقہ ابھی تک ایجاد نہیں ہو سکا۔ آج کل ایکس رے اور اسی قسم کے دوسرے تابکار میڈیکل ٹیسٹ اور طریقے عام ہو گئے ہیں جو دنیا بھر میں مریضوں کے لیے ایک ہولناک خطرہ ہیں۔ طبی علاج اور ٹیسٹ کے سلسلے میں جو مریض بار بار تابکار شعاعوں سے گزرتے ہیں۔ اپنے جسم میں ان مہلک اور موذی ریڈی ایشنز یعنی تابکاری کی ذخیرہ اندوزی کرتے رہتے ہیں اور ایک مرحلہ وہ آ جاتا ہے کہ قسطوں میں جزو بدن بننے والی تابکاری کی سطح خطرناک حدوں کو چھونے لگتی ہے۔ بلا ضرورت اور بار بار تابکاری سے گزرنا خطرناک ہے اور اس سے حتی الامکان گریز کرنا ضروری ہے۔ دنیا بھر میں جہاں بھی ایٹمی ہتھیار، بجلی گھر یا دوسری تنصیبات ہیں، وہاں ماہرین کی نگرانی میں عملے کو ایسے حفاظتی لباس فراہم کیے جاتے ہیں جن سے تابکار شعاعوں کا گزر بالکل ختم نہیں ہوتا مگر دھیمہ ضرور ہو جاتا ہے۔ وقفے وقفے سے عملے کی کڑی جانچ پڑتال کر کے یہ دیکھا جاتا ہے کہ ہر فرد کے بدن میں تابکاری کی کتنی مقدار پہنچ چکی ہے۔ لیٹھل ڈوز تابکاری کی وہ مقدار ہے جو کسی بھی جان دار کو دردناک موت سے ہم کنار کر سکتی ہے۔

مرسلہ: قرۃ العین۔ اقراء ٹی، کراچی

رہے۔ اسٹین گن پر گیون کی گرفت مضبوط تھی اور جیسے ہی اس شخص نے اپنی رائفل سیدھی کرنا چاہی تو گیون یونانی زبان میں چلایا۔

”برطانوی..... ہم برطانوی ہیں.....“

لے تڑنگے شخص نے ایک لمحہ کو اس کی طرف دیکھا پھر رائفل نیچے کر لی اور ”دوست“ کہتے ہوئے سیلیوٹ کے انداز میں ہاتھ اٹھایا اور اس طرح اس خوفناک مہم کے دوران دوسری مرتبہ گیون اور اس کے ساتھیوں کو پناہ مل گئی۔ وہ چھاپہ مار انہیں اپنی کمین گاہ میں لے گیا۔ جہاں تین اور تیریت پسند موجود تھے۔ چھاپہ ماروں نے بتایا کہ ان کے ساتھی تقریباً ایک ہفتہ پہلے دشمن کا ایک ہوائی اڈا اڑانے گئے تھے اور اب تک نہیں لوٹے۔ غار میں ان چھاپہ ماروں کے پاس ایسے ریڈیو ٹرانسمیٹر موجود تھے جن کے ذریعے وہ اپنے ہیڈ کوارٹر کو اطلاعات فراہم کرتے تھے۔

یہاں اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہوئے سارجنٹ نیل نے اپنا ریڈیو ٹرانسمیٹر سیٹ کیا اور اتحادی فوج کے ویلونا ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ تقریباً بیس منٹ بعد وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو سکا۔ رابطہ قائم ہونے پر خفیہ اشاروں کے تبادلہ کے بعد اس نے ہیڈ کوارٹر کو وہ پیغام دیا جس نے اتحادی دنیا میں کھلبلی مچادی کیونکہ وہ اب تک یہی سمجھ رہے تھے کہ طیارہ اور تمام زینیں ختم ہو چکی ہیں۔

”اب تک زندگی سے ہمارا رابطہ قائم ہے۔“ سارجنٹ نیل نے رپورٹ دیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن انتہائی اہم حالت کا شکار ہیں۔ خصوصاً لڑکیوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اگرچہ اب تک وہ بلند حوصلگی اور قوت برداشت کا مظاہرہ کرتی رہی ہیں لیکن ان کے جسموں اور چہروں پر اذیت نمایاں ہیں۔ ہمارا رخ مشرق کی طرف ہے جہاں ہم آرکسٹروکس قصبہ میں پہنچیں گے۔ جہاں ایک ہوائی اڈا بھی موجود ہے۔ چھاپہ ماروں کے کہنے کے مطابق وہ علاقہ جرموں سے خالی کرا لیا گیا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو ہم اس قصبہ سے دوبارہ آپ کے ساتھ رابطہ قائم کریں گے۔ کیا آپ لوگ وہاں کوئی طیارہ بھیج سکتے ہیں۔“

ویلونا ہیڈ کوارٹر نے بتایا کہ اگر وہ لوگ بہ خیریت وہاں پہنچ گئے تو ان کے لیے ایک بمبار اور ایک لڑاکا طیارہ بھیج دیا جائے گا۔ نیل نے کہا کہ اگر ہوائی اڈا محفوظ ہو تو وہ طیارے ایس او ایس (S.O.S) کا سگنل دیں گے۔

انہوں نے ایک بار پھر سفر شروع کر دیا۔ ان کا رخ

مشرق میں قصبہ آرکسٹروکس کی طرف تھا۔ ان سب کی حالت بہت ہی ناگفتنی تھی۔ موسم اور بھی خراب ہو گیا تھا۔ دن کے وقت بھی تھرما میٹر کا بارہ صفر سے نیچے ہی رہتا۔ سرد برفانی ہوائیں ان کے جسموں کو چرتی ہوئی اندر تک پہنچ رہی تھیں۔

ان کے اس بھیاں تک سفر کو شروع ہوئے پورے تیس دن ہو چکے تھے۔ خوراک کا ذخیرہ قریب ختم تھا۔ اب تک صرف اسی میل کا فاصلہ طے کر سکے تھے۔ گیون کا وزن چالیس پاؤنڈ کم ہو گیا تھا اور وہ اپنے کھانے کا بیشتر حصہ بھی لڑکیوں کو دے دیتا کیونکہ ان کی بھوک اس سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اس کا نظریہ تھا کہ عورتیں دنیا کا ہر دکھ برداشت کر سکتی ہیں لیکن بھوک ان کے لیے ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ مرد بھوک برداشت کر لیتا ہے مگر دوسرے دکھوں سے گھبرا جاتا ہے۔

سارجنٹ نیل رات موقع پاکرو ویلونا ہیڈ کوارٹر سے ٹرانسمیٹر پر رابطہ قائم کر کے انہیں صورت حال سے آگاہ کر چکا تھا۔ ہیڈ کوارٹر کی طرف سے پیشکش کی گئی کہ انہیں فوجی طیاروں کے ذریعے خوراک گرائی جائے؟ مگر گیون نے سختی سے منع کر دیا کیونکہ خوراک کے تھیلے گرتے دیکھ کر جرمین یقیناً تحقیقات کریں گے اور اس طرح وہ ان کی نظروں میں آجائیں گے اور انہیں مزید خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

راستہ انتہائی خطرناک اور ڈھلانی تھا۔ جس کے دونوں طرف ہزاروں فٹ گہری کھائیاں تھیں۔ ان میں سے کسی کا کوئی غلط قدم اسے موت کے منہ میں پہنچا سکتا تھا۔ گیون چونکہ اس راستے سے پوری طرح واقف تھا اس لیے وہ ان سب سے آگے تھا تاکہ دوسروں کی رہنمائی کر سکے۔ سینکڑوں دشواریوں اور مصائب کا سامنا کرتے ہوئے آخر کار پینتالیسویں دن اس پہاڑی علاقہ کی مشرقی حد پر پہنچ گئے۔

اب ان کے سامنے برف سے ڈھکا ہوا وسیع و عریض میدان تھا اور شمال مشرق میں اس دریا کے آثار دکھائی دے رہے تھے جس کو نشان راہ بنا کر وہ اب تک یہ سفر کرتے رہے تھے۔

میدانی علاقہ ہونے کی وجہ سے اب انہیں چلنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آرہی تھی لیکن اب انہیں ایک اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس علاقے پر دشمن کے طیارے اکثر غشتی پرواز کرتے رہتے تھے۔ جن کی وجہ سے انہیں برف پر لیٹ کر اپنے آپ کو ان کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنا پڑتا۔ کئی دنوں تک طیاروں سے اس طرح کی ”آنکھ بھولی“ کھیلتے ہوئے وہ ایک مختصر سی وادی میں پہنچ گئے۔

یہاں تقریباً ایک فٹ تک برف بچھی ہوئی تھی۔ گیون کو یہاں دشمن کی سرگرمیوں کا شبہ سا ہوا اور وہ اپنی پارٹی کے ساتھ تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتا ہوا چھ میل آگے ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں کوئی طیارہ آسانی سے لینڈ کر سکتا تھا۔

یہاں پہنچ کر آس پاس دشمن کی موجودگی کے شبہات بے بنیاد ثابت ہوئے۔

گیون کی ہدایت پر سارجنٹ نیل نے ویلونا ہیڈ کوارٹر سے رابطہ قائم کر کے صورت حال کی رپورٹ دی تو انہیں بتایا گیا کہ طیارے کے انتظام میں بارہ گھنٹے لگ جائیں گے۔ وہ لوگ اس میدان کے آس پاس ہی انتظار کریں۔ گیون نے برفانی ہواؤں سے بچنے کے لیے لڑکیوں کو ایک چٹان کی آڑ میں بٹھادیا۔ لڑکیوں پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ انہیں بیدار رکھنے کے لیے ان کے نازک سے رخساروں پر بار بار تھپتھپ لگائے جا رہے تھے۔

رات جیسے تیسے بیت گئی۔ صبح کی روشنی نمودار ہوتے ہی ان کے حوصلے بھی بڑھ گئے۔ انہیں یقین تھا کہ آج کسی بھی وقت طیارے انہیں لینے کے لیے یہاں پہنچ جائیں گے اور ان کی مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ دن بھر انتظار کرتے رہے لیکن فضاء میں کسی طیارے کی گڑگڑاہٹ سنائی نہ دی۔ غروب آفتاب کے وقت پرسکوت فضاء میں ہلکی سی گڑگڑاہٹ کا ارتعاش پیدا ہوا۔ انہوں نے جلدی سے آواز کی سمت دیکھا۔ وہ چار طیارے تھے۔ دو ہلکے لڑاکا طیارے، ایک بمبار اور ایک ڈکوتا۔ نیل نے اپنا ریڈیو سیٹ سنبھال لیا تاکہ ایس او ایس (S.O.S) کا سگنل دے سکے۔

لڑاکے طیارے پہاڑیوں کی طرف تھے، وہ شاید دشمن کے کسی امکانی خفیہ اڈے کی تلاش میں تھے۔ اچانک سارجنٹ نیل کی نظریں پہاڑ کی سمت اٹھ گئیں اور وہ بدحواسی کے عالم میں چیخ اٹھا۔

”ارے..... رے..... وہ دیکھو.....!“

ان سب کی نظریں بیک وقت اس طرف اٹھ گئیں۔ پہاڑ کی چوٹی پر انہیں طیارہ شکن توپوں کی تالیں دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ منظر دیکھتے ہی گیون چلایا۔

”نیل! اپنے طیاروں سے کہو کہ فوراً یہاں سے نکل جائیں اور.....“

الفاظ ابھی پوری طرح ادا بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک لڑاکا طیارے نے زمین کی طرف غوطہ لگایا اور اس کے ساتھ ہی پہاڑ کی چوٹی پر نصب طیارہ شکن توپوں کے دہانے کھل

بیدار کرنے والے الارم تو عام سی بات ہے لیکن اب ایک انوکھی الارم کلاک بنائی گئی ہے جو کہ سلانے میں مدد دیتی ہے۔ MELLA نامی یہ الارم کلاک رات کی دھیمی روشنی بھی خارج کرتی ہے جو بچوں کو سلانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے جب کہ اس سے دھیمے سُروں کی موسیقی خارج ہوتی رہتی ہے۔ یہ آوازیں ڈیلٹا ویوز کے ذریعے دماغ کو سکون دیتی ہیں اور بچے نیند کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔

☆☆☆

امریکا میں نارتھ کیرولائنا پولیس نے ایک کار چور سکھی الانے لگی کو گرفتار کر کے اس کی تصاویر میڈیا پر جاری کیں لیکن خوب صورت اور غیر معمولی آنکھوں والے چور کی تصاویر اس قدر وائرل ہوئیں کہ اب یہ چور ایک سپر ماڈل بن چکا ہے۔ کئی ایک خاص طرح کی جینیاتی کیفیت میں مبتلا ہے جسے ہیٹرو کرومیا کہتے ہیں جس کی وجہ سے اس کی دونوں آنکھوں کی رنگت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اس کی مقبولیت کے پیش نظر امریکا کی ایک معروف ماڈلنگ فرم نے اسے بطور سپر ماڈل سائن کر لیا ہے اور آج سکھی الانے کا معاوضہ تیس ہزار ڈالر ہے۔

☆☆☆

دنیا کا کوئی بھی باشعور فرد جیل جانے کی خواہش نہیں رکھتا لیکن تھائی لینڈ میں ایک ایسی جیل ہے جس میں لوگ ایک رات گزارنے کے منہ مانگے دام دینے کے لیے تیار ہیں۔ یہ دراصل جیل کی تعمیر پر بنایا گیا انوکھا ہوٹل ہے۔ سوک اسٹیشن نامی اس ہوٹل میں جیل کی طرح سلاخیں لگائی گئی ہیں جب کہ یہاں آنے والے مہمانوں کو قیدیوں کا مخصوص لباس اور قیدی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ لوگ اپنی مرضی سے قیدی بن کر آتے ہیں اور جیل میں سوتے اور مزیدار کھانوں کا مزہ بھی اٹھاتے ہیں۔ یہاں ایک رات گزارنے کا کم از کم کرایہ 790 بھات یعنی اڑھائی ہزار روپے رکھا گیا ہے۔

☆☆☆

برطانیہ سے تعلق رکھنے والی 13 سالہ لڑکی نے اپنی معذوری کے باوجود ویمل چیئر پر جتنا سک کے کرتب دکھا کر سب کو حیران کر دیا۔ بیلی رائس نامی یہ بچی ویمل چیئر پر قلابازی کھانے والی پہلی برطانوی فیملی ایتھلیٹ بن گئی ہے۔ رائس ایک بیماری میں مبتلا ہے جس کے باعث وہ چلنے پھرنے سے معذور ہے جب کہ اپنی اس معذوری کو مجبوری بنانے کی بجائے کچھ کر دکھانے کی ٹھان لی اور ایک ماہر پیرالمپک سوئمن بن گئی۔ جب کہ اگلے سال کیلی فورنیا میں ہونے والی ویمل چیئر مونو کراس چیمپئن شپ میں بھی حصہ لے گی۔

مرسلہ: پنشنی محمد عزیز مئے۔ لڈن

گئے۔ دوسرا لڑکا طیارہ ان کی طرف جھپٹا۔ ہمارے پروں کے نیچے نصب دونوں بم دشمن کے ٹھکانے پر گرا دیئے۔ ڈکوتا وہیں سے چکر کاٹ کر واپس مڑ گیا۔

”جلدی کرو، آگے بڑھو، ہمیں فوراً اس علاقے سے نکل جانا چاہیے۔ دشمن یقیناً ہمارا پیغام سن رہا ہے اور ہم سے پہلے یہاں پہنچ کر یہ جال پھیلایا ہے۔ جتنی جلد ممکن ہو سکے یہاں سے نکل چلو۔“

گیون نے سب کو روانگی کا حکم دے دیا۔

لڑکیاں گھٹنے سہلاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں اور لڑکھڑاتے ہوئے گیون کے پیچھے چلنے لگیں۔ تقریباً ایک میل آگے جا کر انہوں نے ایک غار میں پناہ لے لی۔ ”رات کا اندھیرا پھیلنے تک ہم یہاں رکیں گے کیونکہ اس نئی صورت حال میں دن کی روشنی میں سفر کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا۔“ گیون نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اب ہمیں اور کتنا فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔“ لوئیس نے پڑمردہ سے لہجے میں پوچھا۔

”زیادہ نہیں۔“ گیون نے مصلحتاً جھوٹ بولا۔ ”یقین کر دو کہ ہم منزل کے بالکل قریب پہنچ گئے ہیں اور اب ہمارے راستے میں زیادہ مشکلیں بھی نہیں رہیں۔“

☆.....☆

رات کا اندھیرا پھیلنے ہی وہ غار سے نکل کر چل پڑے۔ لڑکیاں اب ایک ایک کی بجائے دو دو ہو کر چل رہی تھیں۔ وہ سب خاموشی سے نہایت احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے چل رہے تھے تاکہ کسی قسم کی آواز سے دشمن آگاہ نہ ہو جائے۔ دفعتاً کچھ فاصلے پر کچھ آوازیں سن کر گیون نے اپنے ساتھیوں کو روکنے کا حکم دیا۔ اس کے بعد لڑکیوں کو برف پر لیٹ جانے کی ہدایت کر کے تیل کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کر کے آگے بڑھ گیا۔ تیل جلد ہی اس کے ساتھ مل گیا اور وہ نہایت چوکس انداز میں آگے بڑھنے لگے۔

وہ ایک چٹان کی آڑ میں رک گئے۔ دوسری طرف ایک جگہ آگ روشن تھی اور تین آدمی وہاں بیٹھے آگ تپ رہے تھے۔ وہ دونوں اٹھیں گئیں سنبھالے ایک دم ان کے سروں پر پہنچ گئے۔ آگ کے گرد بیٹھے ہوئے تینوں آدمی منجمد ہو کر رہ گئے لیکن وہ فوجی نہیں عام یونانی باشندے تھے۔ اپنے آپ کو بڑھاپا نوئی ظاہر کرنے پر وہ تینوں یونانی ان سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ایک یونانی نے بتایا کہ اس علاقہ میں انہیں قدم قدم پر خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ جرمن

فوجی دستے بڑی سرگرمی سے گشت کر رہے ہیں البتہ جنوب مشرق کا راستہ ان کے لیے محفوظ رہے گا۔

وہ ایک بار پھر چل دیئے۔ انہیں اسی طرح چلتے ہوئے انچاس دن ہو چکے تھے اور لگتا تھا جیسے برف کے اس صحرائے ان کا یہ سفر کبھی ختم نہیں ہوگا۔

گیون کا اندازہ تھا کہ انہیں کم سے کم چالیس میل اور برف سے ڈھکے ہوئے ان پہاڑی راستوں پر چلنا پڑے گا جو نہ صرف دشوار گزار تھے بلکہ قدم قدم پر جرمن فوجی اور مقامی باشندے پھیلے ہوئے تھے جو ان کے خون کے پیاسے تھے اس لیے انہیں ایک لمحہ کو بھی کہیں رکے بغیر یہ طویل فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔

سات دنوں میں انہوں نے تقریباً نصف فاصلہ طے کر لیا۔ انہیں برف کاٹ کاٹ کر راستہ بنانا پڑ رہا تھا جس کی وجہ سے رفتار اور بھی سست تھی۔ ان کی خوراک اس روٹی اور گوشت کے خشک ٹکڑوں پر مشتمل تھی جو انہیں اس بوڑھی عورت نے دیئے تھے اور کچھ چھاپہ باروں سے ملے تھے۔

راتیں انتہائی زیادہ سرد تھیں۔ گیون کو پارٹی کے ممبران کو متحرک رکھنے کے لیے بے حد جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔ وہ انہوں کے حساب سے فاصلہ طے کرتے ویلوانا کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ایک شام تو وہ موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچ گئے۔ وہ بالکل اچانک ہی جرمن چوکی کے قریب پہنچ گئے تھے۔ اگر ٹیم کی ایک لڑکی دور ہی سے جرمن محافظ کو نہ دیکھ لیتی تو موت کے منہ میں جانے سے انہیں کوئی بھی نہ روک سکتا تھا۔ وہ محافظ ان کی طرف پشت کیے کھڑا تھا اس لیے وہ بھی انہیں نہ دیکھ سکتا تھا۔ یوں وہ لوگ خاموشی سے واپس پلٹ گئے۔

اس چوکی میں سات جرمن تھے۔ ایک مرتبہ گیون کا دل چاہا تھا کہ وہ فائر کا منہ کھول دے لیکن یہ سوچ کر اس نے بڑی مشکل سے اس خیال کو ذہن سے جھٹکا کہ ممکن ہے ان جرمنوں کے کچھ اور ساتھی بھی آس پاس کہیں موجود ہوں اور کچھ اپنی لڑکیوں کی درمندانہ حالت کے پیش نظر وہ اس قسم کی کسی جھڑپ کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

وہ ایک محفوظ جگہ پر رک گئے۔ ایسی صورت حال کے پیش نظر اس وقت سفر جاری رکھنا ممکن نہ تھا۔ اس بات کے امکانات موجود تھے کہ چوکی سے باہر پھیلے ہوئے جرمنوں سے ٹدھ بیٹھ ہو جائے۔

صورت حال کا صحیح اندازہ دن کی روشنی میں ہی ہو سکتا تھا۔

چوکی پر موجود جرمن رات ہی گوشت پر نکل گئے اور موقع پا کر رات دو بجے گیون اپنے قافلے کو لے کر وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔

سارجنٹ تیل کی پشت پر روزنی ریڈیو ٹرانسمیٹر سیٹ لدا ہوا تھا، جس کی وجہ سے اس کی پشت سے خون رسنے لگا تھا۔ سیٹ کی بیٹریاں ختم ہو چکی تھیں اور اب وہ اس ریڈیو ٹرانسمیٹر کو آڑے آنے والے پیغامات سن تو نہیں سکتے تھے اور نہ ہی خود کو کوئی پیغام نشر کر سکتے تھے۔

وہ منزل کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ویلوانا ان سے صرف بیس میل کے فاصلے پر رہ گیا تھا مگر راستے کی دشواریاں اور خطرات پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئے تھے۔ ان کی اس سرد اور برفانی مہم کا یہ آخری مرحلہ تھا جو انہیں ہر صورت میں طے کرنا تھا۔

وہ بے حد تھکا ہوا ہو چکے تھے۔ ہر ایک کا جی چاہتا تھا کہ قدم اٹھانے کی بجائے برف پر لیٹ جائیں اور سوتے میں ہی ٹھنڈی موت کی آغوش میں پہنچ جائیں۔ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ وہ قدم قدم پر موت سے خبردار زبانی کرتے چلے آ رہے تھے لیکن انہوں نے موت کے سامنے شکست تسلیم نہیں کی تھی۔

بے سروسامانی میں صرف ان کا عزم ان کے کام آ رہا تھا اور اب وہ محسوس کر رہے تھے کہ ان کی کھوپڑیاں بھی منجمد ہو چکی ہیں لیکن سفر ختم نہیں ہوا۔ نجانے برف کی قید سے رہائی کب ملے گی؟ رہائی ملے گی بھی یا نہیں؟

اسٹھویں دن کا سورج طلوع ہوا لیکن اس کی کرنوں میں کوئی حدت نہیں تھی۔ ان کے لیے یہ صبح پہلے سے کہیں زیادہ سرد تھی۔ وہ دریا کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ جس کی سطح منجمد تھی اور گیون سوچ رہا تھا کہ کس جگہ سے دریا عبور کیا جائے۔

اچانک اس کی نظریں سامنے کی طرف اٹھ گئیں جہاں دوسرے کنارے پر ایک لمبا بڑا ٹکڑا شخص ہاتھ ہلا کر اسے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ انہیں جنوبی سمت سے آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

گیون اسٹین گن سنبھالے جنوبی سمت چل دیا۔ دریا کے دوسرے کنارے پر موجود شخص بھی اسی طرف بڑھنے لگا۔ گیون دریا پار کر کے اس کے سامنے پہنچ گیا اور اس شخص نے دوڑ کر اسے گلے لگالیا۔ ”میں امریکی فوج کا کپٹن لائنڈ اسمتھ ہوں۔ مجھے آپ لوگوں کی تلاش کے لیے ہی بھیجا گیا ہے۔ لڑکیاں کہاں

ہیں؟“ اس شخص نے تعارف کراتے ہوئے پوچھا۔

”ان سب کی حالت بہت خراب ہے مگر زندگی سے ناٹے قائم ہیں۔“ گیون نے پہلی مرتبہ کراہتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کو ویلوانا تک پہنچانے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ جہاں ایک تیز رفتار بحری جہاز ہمارا منتظر ہے۔ وہ ہمیں اٹلی تک پہنچا دے گا۔ وہاں آپ کے لیے کچھ راشن بھی موجود ہے۔“

اسمتھ نے گیون کو مزید بتایا کہ اسے باری (اٹلی) سے بھیجا گیا ہے۔ اس دور ان لڑکیاں بھی وہاں پہنچ گئیں اور اسمتھ نے ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کے دوسری طرف سمندر ہے جہاں آپ کے آرام دہ سفر کا آغاز ہوگا۔“

اٹائے راہ ایک اور شخص راشن کے تھیلے اٹھائے ان سے آن ملا۔ وہ انھوں کو لے کر تھا۔ جنگ سے پہلے قلموں میں کام کرتا تھا اور اب پہاڑی علاقوں میں تنہا خطرناک مہمیں انجام دے رہا تھا۔ کول نے انہیں شاندار کھانا کھلایا اور پھر اپنی رہنمائی میں سمندر کی طرف لے گیا۔

ان سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا ہٹ تھا، جس سے دھواں اٹھ رہا تھا اور دوستانہ گرم جوشی کی فضا محسوس ہو رہی تھی۔ ہٹ میں موجود ریڈیو ٹرانسمیٹر سے فوری طور پر ہیڈ کوارٹر پیغام بھیجا گیا کہ پوری پارٹی سلامت ہے اور بحفاظت پہنچ گئی ہے۔

سمندر میں چھوٹا بحری جہاز ان کا منتظر تھا۔ انہیں سوار کراتے ہی جہاز حرکت میں آ گیا اور اگلے چوبیس گھنٹے میں وہ سب اسپتال میں داخل تھے۔ جہاں ان کا علاج ہو رہا تھا۔ موسم کی سختیوں اور برفانی ہواؤں نے ان کے چلیے گاڑ دیئے تھے۔ خصوصاً لڑکیاں اس حالت کو محسوس کر رہی تھیں لیکن انہیں کوئی شکایت نہیں تھی۔ انہوں نے تو برف کی قید سے رہائی پانے پر لاکھ لاکھ شکر ادا کیا تھا اور یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں تھی کہ گیون کو لوئیس بہت پیاری لگی تھی اور لوئیس نے گیون کو پسند کر لیا تھا۔ گیون نے اسے داد دی۔

”تم بڑی حوصلہ مند اور بہادر لڑکی ہو۔۔۔۔۔“

”ہو سکتا ہے۔“ لوئیس نے جواب دیا۔ ”لیکن یہ سب تمہاری رہنمائی میں ہوا۔“

”کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ آئندہ زندگی کی شاہراہ پر تم ہمیشہ میری رہنمائی میں رہو؟“

لوئیس گیون کے ان الفاظ کا مطلب سمجھ گئی اور دوسرے ہی لمحہ اس نے گیون کے شانے پر سر رکھ دیا۔



منفر و نغمہ نگار

انور فرہاد

پاکستان کی فلمی دنیا کو لاتعداد ہنرمند نصیب ہوئے جن کی کاوش نے فلم صنعت کو ترقی کا اوج عطا کیا۔ ان ہنرمندوں میں فلم ساز، ہدایت کار، موسیقار اور اداکار کے علاوہ نغمہ نگار بھی شامل ہیں۔ ایک نئے ملک کی تباہ حال فلمی صنعت کو اوپر لانے کے لیے ہر ایک نے اپنے تئیں بہترین حصہ ڈالا۔ انہی میں ایک نوجوان گیت کار بھی ہے جس نے کمسنی میں لاجواب نغمے تخلیق کیے۔ ایسے نغمے جو آج بھی پسندیدگی کی معراج پر ہیں۔ اس کے بے شمار نغموں کو بھارتی فلمی صنعت نے چرایا جو ثابت کرتا ہے کہ ہماری فلمی صنعت بہت آگے تھی۔

لازوال فلمی نغموں کے خالق کا تذکرہ

☆ ہماری سانسوں میں آج تک وہ حنا کی خوشبو مہک رہی ہے
☆ رفتہ رفتہ وہ میری ہستی کا سماں ہو گئے
☆ کچھ لوگ محبت کا صلہ مانگ رہے ہیں۔ نادان ہیں بندوں سے خدا مانگ رہے ہیں
☆ سو برس کی زندگی میں ایک پل۔ تو اگر کر لے کوئی اچھا عمل
☆ مجھے کر دے نہ دیوانہ۔ تیرے انداز مستانہ
☆ ایسے موسم میں چپ کیوں ہو کانوں میں رس گھولو۔ ہونٹ اگر خاموش ہیں بچا آنکھوں ہی سے بولو
☆ اک بار چلے آؤ پھر آ کے چلے جانا
☆ مل گئے تم تو بس یہی غم ہے۔ پیار زیادہ ہے زندگی

جولائی 2018ء

اللہ میرے ان چاہنے والوں کو سداشاد و آباد رکھے جو میری تحریر پڑھ کر خوش ہوتے ہیں اور مجھے اپنے مشوروں اور خواہشوں سے باخبر کرتے ہیں۔ ایسے ہی ایک بھائی نے گلہ کیا ہے کہ گلوکاروں اور موسیقاروں کے بارے میں تو آپ بہت لکھتے ہیں، کبھی شاعروں کے بارے میں بھی لکھیے کہ شاعر کا کلام گا کر اور بجا کر یہی گانے والے اور بجانے والے نامور سنگر اور میوزک ڈائریکٹر بنتے ہیں مگر ان کی طرح آپ بھی بے چارے شاعروں کو لفت نہیں کراتے۔

میرے پیارے بھائی! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں شاعروں کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتا ہوں جتنی موسیقاروں اور گانے والوں کو دیتا ہوں۔ میں نے شاعروں پر بھی لکھا ہے۔ شاید آپ نے بابا عالم سیاہ پوش اور شاعر صدیقی پر لکھے میرے تفصیلی مضامین نہیں پڑھے۔ جب کہ بشیر احمد پر بھی میں نے ان کی گلوکاری کے ساتھ ان کی نغمہ نگاری پر بھی اظہار خیال کیا ہے اور رخصانہ نور پر بھی بطور نغمہ نگار اور کہانی و مکالمہ نگار لکھا ہے اور آج بھی ایک شاعر کے متعلق ہی لکھنے بیٹھا ہوں۔ آپ اسے اپنی فرمائش کی تکمیل بھی سمجھ سکتے ہیں جب کہ میں ان پر لکھنے کا ارادہ پچھلے کچھ دنوں سے کر رہا تھا۔ تسلیم فاضلی میرا پسندیدہ فلمی نغمہ نگار ہے۔ یوں تو اللہ کے

فضل و کرم سے ہماری فلم انڈسٹری کو بہت بڑے بڑے اور بیٹھے بول لکھنے والے شاعروں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ قتیل شفائی، فیض احمد فیض، سیف الدین سیف، احمد راہی، فیاض ہاشمی، سرور انور، حمایت علی شاعر، سرور بارہ بکلو، حبیب جالب، تنویر نقوی، شیر کاظمی، اختر یوسف، صہبا اختر، خشب جارجی، دھیمی پریم نگری اور کلیم عثمانی جیسے شاعروں کی نغمہ نگاری نے ہماری فلموں کی کامیابی میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی خدمات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا مگر تسلیم فاضلی مجھے اس لیے زیادہ پسند ہے کہ اس کے لکھے ہوئے گیتوں، غزلوں اور گانوں میں کچھ ایسی خوبی ہوتی ہے کہ سننے والا بولوں کے ریشمی بندھن میں بندھ کر اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اسیر ہو جاتا ہے۔ ذرا ان گیتوں کے مکھڑوں کو تو دیکھئے۔

ماہنامہ سرگزشت

اس ایلیہ شاعر کے ڈی این اے میں چونکہ ایک کہنہ مشق شاعر دعا ڈائیوی کے شاعرانہ اثرات موجود تھے اس لیے وہ بچپن اور لڑکپن سے ہی شاعری کے مرض میں مبتلا ہو گیا تھا اور پھر سن شعور کی سرحد میں قدم رکھنے کے بعد اپنے بڑے بھائیوں صبا فاضلی اور ندا فاضلی کی طرح نغمہ نگار بننے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ دونوں بھائی بھارتی فلموں میں گیت نگاری کرتے تھے۔ صبا فاضلی نے کچھ پاکستانی فلموں کی نغمہ نگاری بھی کی۔



ابھی ٹھیک سے وہ جوان بھی نہیں ہوا تھا کہ قدرت نے اسے فلمی نغمہ نگاری کا موقع فراہم کر دیا۔ کرنا خدا کا یوں ہوا کہ موسیقار ناشاد سے اس نوجوان شاعر کی ملاقات ہو گئی۔ ملاقات ہوئی تو بات بھی ہوئی۔ بات ہوئی تو معلوم ہوا کہ صاحبزادے شاعری بھی فرماتے ہیں اور فلموں کے لیے گیت نگاری بھی کرنا چاہتے ہیں۔ ناشاد نے اسے ناشاد نہیں کیا، یہ نہیں کہا۔ ”جاؤ میاں! یہ کام تمہارے کرنے کا نہیں۔ ابھی تم تھیلو کو دو، لکھو پڑھو۔“ بلکہ بڑی شفقت سے اس کے کچھ اشعار سنے۔ جن سے انہیں اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوئی کہ اس میں شاعروں کی خوب موجود ہے۔ اسے موقع دے کر آزمانا چاہیے۔ ان دنوں وہ ہدایت کار اقبال یوسف کی فلم ”تم ملے پیار ملا“ کی موسیقی ترتیب دے رہے تھے۔ کہنہ مشق موسیقار نے نوجوان شاعر سے کہا۔ ”میں تمہیں اپنی نئی فلم ”تم ملے پیار ملا“ کے لیے گیت نگاری کا موقع دینا چاہتا ہوں۔“

”شکریہ“
”شکریہ تو میں تمہارا اس وقت ادا کروں گا جب تم اپنے امتحان میں کامیاب ہو گے۔ نہیں ہوئے تو میں معذرت کر لوں گا۔“
ناشاد نے اپنی ترتیب دی ہوئی دھنوں پر تسلیم فاضلی سے گیت لکھوائے۔

☆ یہ حسین دادیاں یہ ماں۔ دیکھ کر میرا دل گنگنا نے
☆ دلر بادلر با کیسا جادو کیا۔ پاگل مجھے کر دیا
☆ کمپوز کی ہوئی دھنوں پر گیت لکھنا اور وہ بھی فلم کی پمپیشن کے مطابق، آسان نہیں ہوتا۔ ناشاد نے اندازہ لگا لیا۔ اس لڑکے میں نغمہ نگاری کی صلاحیت موجود ہے۔ یہ فلم ”تم ملے پیار ملا“ 1966ء میں شروع ہوئی مگر بوجہ اس کی تکمیل میں کئی سال لگ گئے۔ ”تم ملے پیار ملا“ کے

جولائی 2018ء

ماہنامہ سرگزشت

ساتھ ہی ناشاد نے معروف فلم ساز سید شوکت حسین رضوی کی فلم ”عاشق“ سائن کی تو اس فلم کے لیے بھی انہوں نے نوجوان نغمہ نگار تسلیم فاضلی کو ہی گیت لکھنے کا موقع دیا اور تسلیم فاضلی نے انہیں اس موقع پر بھی مایوس نہیں کیا۔ اس فلم کا یہ نغمہ جو خوشی اور غم کے تاثرات کی تکرار سے آراستہ تھا اسے سن کر فلمی حلقوں کو انگشت بدنداں کر دیا۔

اے گل نو بہار جھوم جھوم جھوم

اے دل بے قرار رو رو رو

اس گیت کو میلوڈی کوئن رونا لیلیٰ اور شہنشاہ غزل مہدی حسن نے مشترکہ طور پر گایا تھا۔ یہ ان دونوں کا بھی پہلا ڈوٹ تھا۔ ”عاشق“، ”تم ملے پیار ملا“ سے پہلے ریلیز ہوئی۔ اس کی نمائش 1968ء میں ہوئی اس لیے ریلیز کے اعتبار سے تسلیم فاضلی کی پہلی فلم قرار پائی جب کہ ”تم ملے پیار ملا“ 1969ء میں اسکرین کی زینت بنی۔ اس کے تمام گیت تسلیم فاضلی نے لکھے تھے جو ہٹ ہوئے اور فلم بھی ہٹ ہو گئی۔ اس فلم کے نام سے مطابقت کا یہ عجیب واقعہ بھی اس فلم کی تکمیل کے دوران رونما ہوا کہ اس کے ہیرو ہرون محمد علی اور زیبا ازواجی بندھن میں بندھ کر حقیقی زندگی میں بھی ہیرو ہرون بن گئے۔

اگر اچھی صلاحیتوں کے حامل فنکار کو اچھا رہنما مل جائے تو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ تسلیم فاضلی اپنی کسسی کے دور میں فلمی دنیا میں داخل ہوا تھا۔ فلمی دنیا جو دور سے بہت حسین اور رنگین نظر آتی ہے حقیقتاً بڑی دشواری، بہت مشکل اور سنگین جگہ ہے۔ یہاں کسی بھی شعبے میں کسی نووارد کا قدم جمانا آسان نہیں ہوتا۔ یہاں جو جیتا وہی سکندر کہلانے کا حق دار ہوتا ہے۔ قدرتی طور پر تسلیم فاضلی زبردست شاعرانہ صلاحیتوں سے مالا مال تھا۔ اس کی سرپرستی اور رہنمائی کے لیے ناشاد جیسا کامیاب موسیقار تھا اس لیے اپنی نو عمری کے باوجود اس کے راستے کی ساری رکاوٹیں خود بخود دور ہوتی گئیں۔ اس کا ہر قدم آگے اور آگے ہی بڑھتا گیا۔ اس کی مقبولیت اور شہرت میں اضافہ ہی ہوتا گیا اور وہ ستر کی دہائی کا مقبول ترین نغمہ نگار تسلیم کیا جانے لگا۔ مسرور انور کی طرح تسلیم فاضلی کی بھی یہ بہترین خوبی تھی کہ وہ فلمی چویشن کے عین مطابق گیت تحریر کرتا تھا۔ اس سلسلے میں اسے اس قدر مہارت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ فلمی کہانی میں نغمے کی چویشن سننے ہی گیت کا مکھڑا بنا دیتا تھا۔ اس کی اس خوبی کی بنا پر اسے بے حد فاسٹ گیت نگار تسلیم

کر لیا گیا تھا۔

مختلف چویشن کی مطابقت سے تسلیم فاضلی کی کارکردگی کے مظہر مقبول نغمات کی کچھ مثالیں۔

☆ ہونٹوں پہ تیرا نام جو آیا، دنیا سمجھے گیت ہے۔ کیا جانے یہ دنیا والے یہ چاہت کی ریت ہے (آواز ناہید اختر فلم سنگم)

☆ ان کا ہی تصور ہے محفل ہو کہ تنہائی (آواز نور جہاں، فلم سہرے کے پھول)

☆ تو میری زندگی ہے تو میری ہر خوشی ہے (آواز مہدی حسن، فلم محبت مر نہیں سکتی)

☆ پوچھ لو ان گلیوں سے ان نظاروں سے۔ مجھے تم سے محبت ہے (آواز مہناز، فلم صائمہ)

☆ ساتھی کوئی ایسا ملے جو عمر بھر ساتھ دے۔ کب سے اکیلی ہوں میں (آواز مہناز، فلم پرکھ)

☆ اک بار چلے آؤ پھر آ کے چلے جانا۔ صورت تو دکھا جاؤ (آواز مہدی حسن فلم ایک رات)

☆ مراد دل نہ جانے کب سے۔ ترا پیار ڈھونڈتا ہے (آواز بشیر احمد فلم ہل اسٹیشن)

☆ ڈھونڈ رہی تھیں جانے کب سے۔ تیری صورت میری آنکھیں (آواز احمد رشدی، مالا)

☆ اے کاش کہ آجائے نظریار کی صورت (فلم محبت مر نہیں سکتی)

☆ پیار کا وعدہ ایسے نبھائیں۔ کوئی جدا کرنے نہ پائے، میں بھولوں تو میں مرجاؤں، تو بھولے تو تو مرجائے (فلم آج اور کل)

☆ پیار کریں گے پل پل، کل سے زیادہ آج کریں گے، آج سے زیادہ کل (فلم جیواور جینے دو)

☆ نیل سنگن کو گواہ بنا کے آج یہ وعدہ کرنا ہوگا۔ سنگ جیتا سنگ مرنا ہوگا (فلم دیوار)

☆ مجھے دل سے نہ بھلانا۔ چاہے رو کے یہ زمانہ (آواز مہناز، عالمگیر، فلم آئینہ)

☆ ایسے ملیں کہ پھر نہ جدا ہوں۔ دنیا رہے نہ رہے (فلم گونج اٹھی شہنائی)

☆ دل توڑ کے مت جائیو برسات کا موسم ہے (آواز ناہید اختر فلم وقت)

☆ آئی من کی رات کہ بجی پکی ہو گئی بات، تو ٹھمکا کیوں نہ لگے (آواز ناہید اختر، فلم تیرے میرے سپنے)

☆ جب ڈولی چڑھے گی میری بہنا۔ تیرا بھیا بجائے بابا (آواز مہدی حسن فلم راجا جانی)

☆ میری سالگرہ ہے بولو، بولو، پپی برتھ ڈے ٹو یو بی بی (آواز مسرت سمج، فلم طلاق)

☆ داوی اماں کو مبارک ہو پوتی۔ ایسی پیاری پوتی (احمد رشدی، فلم مجھے گلے لگاؤ)

گیتوں کے ہر نمونے جن احساسات و جذبات کی نگاش کرتے ہیں وہ شادی بیاہ، بچوں کی سالگرہ کے علاوہ

نہ بچوں کو اپنی محبت کا یقین دلانا، محبوب کو بلانا یا تلاش کرنا،

دشمن کی دلکشی سے متاثر ہو کر اپنے جذبات کا اظہار کرنا، ملن

پایا ملنے کی خوشی کی خبر سننے پر جھوم اٹھنا، محبوب کے تصور میں

گھو جانا۔ دو پیار کرنے والوں کا عہد و پیاں کرنا ہے۔ ان

چویشن پر تسلیم فاضلی کے بے شمار اشعار ہیں جن میں سے یہ

پندہی درج کیے جاسکے ہیں۔ تسلیم فاضلی کو اللہ رب العزت

نے ایسی شاعرانہ خوبی اور مہارت بخشی تھی کہ موقع محل کیسا ہی

لیوں نہ ہو۔ عین اس کے مطابق وہ ایسے اشعار لکھ دیتا تھا جو

بڑے سچیلے اور ریلے ہوتے تھے اور کانوں کے راستے دلوں

میں اتر جاتے تھے۔ عام طور پر فلموں کی کامیابی میں اچھے

اور مقبول گانوں کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ اس حوالے سے

تسلیم فاضلی کا شمار مقبول گیتوں کے تخلیق کاروں میں ہوتا

تھا۔ فلم ساز، ہدایت کار اور موسیقار اس اعتماد کے ساتھ اس

سے اپنی فلموں کے گانے لکھواتے تھے کہ وہ مقبول ہو کر ان کی

فلموں کی کامیابی کا ذریعہ بنیں گے۔

تسلیم فاضلی کو طریبہ، المیہ، مزاجیہ، عشقیہ، ہر انداز کے نغمات لکھنے میں ملکہ حاصل تھا۔ بہت کم لوگوں کو یہ بات

معلوم ہے کہ اس نے اقبال یوسف کی فلم ہل اسٹیشن کی کہانی

اور مکالمے بھی لکھے ہیں جس کے ہیرو وحید مراد تھے اور

موسیقار ناشاد، نثر نگاری میں بھی وہ کامیاب ثابت ہوا تھا

مگر موسیقاروں نے اسے اتنا موقع ہی نہیں دیا کہ وہ دیگر

فلموں کی کہانیاں اور مکالمے لکھے۔ سب اس کی شاعری کے

دیانے تھے۔ نغمہ نگاری سے ہی اسے فرصت نہیں ملتی تھی اس

لیے اس کی کہانی نویسی اور مکالمہ نگاری آگے نہ بڑھ سکی۔

ناشاد کے علاوہ دیگر موسیقار بھی تسلیم فاضلی سے

گیت لکھوانا پسند کرتے تھے جن میں ایم اشرف کے ساتھ

بھی اس کی ہم آہنگی تھی۔ جن موسیقاروں نے تسلیم فاضلی

سے اپنی کمپوز کی ہوئی دھنوں میں گیت لکھوائے ان میں نثار

بزمی، اے حمید، روبن گھوش، لال محمد اقبال، کمال احمد، ماسٹر

زندگی نامہ

اصلی نام: اظہار انور

فلمی نام: تسلیم فاضلی

پیدائش: دہلی (بھارت)

سن پیدائش: 1947ء

والد: دعا ڈائیوی (معروف شاعر)

بھائی: صبا فاضلی۔ ندا فاضلی (دونوں نے

بھارتی فلموں کے لیے نغمہ نگاری کی)

پہلی فلم: تم ملے پیار ملا لیکن ”عاشق“ نمائش

کے اعتبار سے پہلی فلم۔

پہلی ہٹ فلم: تم ملے پیار ملا

بطور کہانی نویس و مکالمہ نگار: ”ہل اسٹیشن“

ہدایت کار: اقبال یوسف

انگریزی زبان کا نغمہ: ہدایت کار جان محمد کی

فلم ”دیکھا جائے گا“ کے لیے ایم اشرف کی بنائی گئی

سندھی دھن پر لکھا جو پسند کیا گیا۔

اعزازات: متعدد پرائیویٹ اداروں کی

جانب سے ایوارڈز اور اعزازات ملے۔ جن میں

تین نگار ایوارڈ بھی شامل ہیں جو شانہ، آئینہ اور

بندش پر ملے۔

آخری فلم: زلزلہ جو تسلیم فاضلی کی وفات کے

بعد 1987ء میں ریلیز ہوئی۔

وفات: 17 اگست 1982ء کو دل کا دورہ

پڑنے پر انتقال ہوا۔

منفرد اعزاز

تسلیم فاضلی کے بہت سے گیتوں پر بہت

سے فلمی ستاروں نے لپ سنگ کی۔ یعنی ان پر جو

گانے پچھراڑے ہوئے ان پر ریکارڈ شدہ بولوں پر لب

ہلائے مگر تسلیم فاضلی کا ایک منفرد ریکارڈ یہ بھی ہے

کہ فلم ”انسان اور گدھا“ کے لیے اس کا ایک گیت

ایک گدھے پر بھی عکسبند کیا گیا جس کے بول

تھے۔ ”ڈھنک انسانیت کے سکھا دے مجھ کو اے

خدا“ اس گیت کے صدا کار احمد رشدی تھے۔

- 1- سو برس کی زندگی میں ایک پل تو اگر کر لے کوئی اچھا عمل۔
- 2- ہماری سانسوں میں آج تک وہ حنا کی خوشبو مہک رہی ہے۔
- 3- خدا کرے کہ محبت میں وہ مقام آئے۔ کسی کا نام لوں لب پر تمہارا نام آئے۔
- 4- یہ دنیا رہے نہ رہے میرے ہدم۔ کہانی محبت کی زندہ رہے گی۔
- 5- اگر تم مل جاؤ زمانہ چھوڑ دیں گے ہم۔ زمانے بھر سے رشتہ توڑ دیں گے ہم۔
- 6- ہمارے دل سے مت کھیلو۔ کھلونا ٹوٹ جائے گا۔
- 7- تیرا میرا کوئی نہ کوئی تو ناٹھ ہے۔ ورنہ کون کسی کے پیچھے آتا ہے۔
- 8- نینوں کا ہے کام سارا دونیوں کا کام۔ نین شرارت کرتے ہیں دل ہوتا ہے بدنام۔
- 9- رفتہ رفتہ وہ میری ہستی کا ساماں ہو گئے۔
- 10- تجھے پیار کرتے کرتے میری عمر بیت جائے۔ مجھے موت بھی جو آئے تیرے بازوؤں میں آئے۔

عنایت حسین، امجد بوبی، شمیم نازلی، واجد علی ناشاد، صفدر حسین، جوزی انجم، تصدق حسین، نذیر علی، ایم اے شاد، خلیل احمد کے نام قابل ذکر ہیں جب کہ ناشاد اور ایم اشرف تو تسلیم فاضلی کے والدین تھے۔ متذکرہ موسیقاروں میں سے چند ایک کے چند نمونے۔

☆ ٹھہرا ہے سماں ہم تم میں جہاں (موسیقار روبن مگوش فلم امبر)

☆ آج تو غیر سہمی پیار سے بیر سہمی۔ تجھ کو اپنا نہ بنایا تو میرا نام نہیں (موسیقار کمال احمد، فلم دلہیز)

☆ شربت کے بدلے پلا دی شراب۔ تیرا خانہ خراب، تیرا خانہ خراب (موسیقار نذیر علی، فلم عورت اک پہیلی)

☆ دل دیا بھول ہوئی دل کی دل ہی میں رہی، ہم نے بھی سوچ لیا (موسیقار اے حمید، فلم عزت)

☆ سو باتوں کی ایک بات، جینا مرنا تیرے ساتھ (موسیقار ماسٹر عنایت حسین فلم جوش)

☆ تو جو آیا دل کو قرار آ گیا۔ من میرا جھوٹا تن لہرایا (موسیقار شمیم نازلی فلم بن بادل برسات)

☆ دل نہیں تو کوئی شیشہ کوئی پتھر ہی ملے۔ کوئی تو سامان ہو دل لگانے کے لیے (موسیقار امجد بوبی، فلم اک نگینہ)

یوں تو ایسی بہت سی فلمیں ہیں جن میں ایک دھن پر ایک جیسے بولوں کے ساتھ مختلف نگرز نے الگ الگ گایا اور یہ عام طور پر فلم میں ایک بار ہوا لیکن تسلیم فاضلی کا ایک منفرد ریکارڈ یہ ہے کہ اس کے کریڈٹ پر ایسی دو فلمیں ہیں۔ پر چھائیں اور ”میرے حضور“ جن میں دو دونمات کو ایک ہی دھن پر دو مختلف نگرز کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا۔ جو کچھ یوں ہے۔

1974ء میں فلم ”پر چھائیں“ میں یہ نغمہ محمد علی اور زیبا پر الگ الگ فلم بند ہوا۔

☆ میرے دل کو یہ یقین ہے کبھی تم جدا نہ ہو گے (گلوکار احمد رشدی)

☆ میرے دل کو یہ یقین ہے کہ کبھی تم جدا نہ ہو گے (گلوکارہ مالا)

ہدایت کار لقمان کی فلم ”پر چھائیں“ میں تسلیم فاضلی کا یہ نغمہ محمد علی اور زیبا پر الگ الگ پکچر اتر گیا تھا۔

☆ کتنے نادان ہیں آج کل کے حسیں (گلوکار احمد رشدی)

☆ کتنے نادان ہیں آج کل کے حسیں (گلوکارہ تصور خانم)

”پر چھائیں“ کے موسیقار ناشاد تھے۔

اس طرح کی دوسری مثال 1977ء کی فلم ”میرے حضور“ میں نظر آئی جس کے دو نغموں کو مہدی حسن اور نور جہاں نے الگ الگ گایا۔ اس فلم کے ہدایت کار ایس سلیمان اور موسیقار ایم اشرف تھے۔

☆ کبھی میری محبت کم نہ ہوگی۔ لٹانے سے یہ دولت

لم نہ ہوگی (شاہد پر فلم بند ہوا)

☆ کبھی میری محبت کم نہ ہوگی۔ لٹانے سے یہ دولت

لم نہ ہوگی (شبم پر فلم بند ہوا)

☆ آپ کی معلومات میں اضافے کے لیے یہ بتانا ضروری ہے کہ اس گیت کی دھن مشہور غزل ”محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے۔“ سے اخذ کی گئی تھی۔

”میرے حضور“ کا یہ نغمہ آج بھی تسلیم فاضلی کے یادگار گیتوں میں شمار ہوتا ہے ہماری سانسوں میں آج تک وہ حنا کی خوشبو مہک رہی ہے۔ (شاہد پر فلم بند کیا گیا)

ہماری سانسوں میں آج تک وہ حنا کی خوشبو مہک رہی ہے (شبم پر پکچر اتر گیا)

تسلیم فاضلی کے تحریر کردہ نغمے فلم انڈسٹری کے تمام ہی فنکاروں پر عکس بند کیے گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ بہت سے آرٹسٹوں کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ انہیں تسلیم فاضلی کے گیتوں پر فارم کرنے کا موقع ملے۔ جن فنکاروں پر تسلیم فاضلی کے گیت فلم بند ہوئے ان میں دستیاب نام یہ ہیں۔

صبیحہ خانم، نیر سلطانہ، شمیم آرا، نیلو، زمر، زیبا، محمد علی، وحید مراد، حبیب، حسنہ، دیبا، کمال، اسد جعفری، اقبال یوسف، رحمان، شبم، رانی، نشو، ندیم، شاہد، روزینہ، سنگیتا، کویتا، ممتاز، بابرہ شریف، آسیہ، عالیہ، عشرت چوہدری، طلعت صدیقی، طلعت حسین، غلام محی الدین، منصور، صاعقہ، نمی، آصف خان، مسرت شاہین، نادیہ، آصف رضا، جاوید، عمران، وسیم عباس، قاضی واجد، لہری، ننھا، رنگیلا، طارق میر، نوین تاجک، ڈانٹا کرشن، بازغہ، نجمہ، ریشماں، شائستہ، قیصر، چکوری، ڈانسرفردوسی، پروین بوبی، نوروز، مزمل، امروزیہ، نازلی، مینا چوہدری، روجی بانو، راحت کاظمی، عثمان پیرزادہ، قوی خان، محبوب عالم، جمشید انصاری، مصطفیٰ قریشی، آغا طالش، تمنا۔ ان آرٹسٹوں پر پکچر اترنے والے گیتوں میں سے چند نمونے۔

☆ مصری کی ڈلی ہوں۔ نازوں کی پٹی ہوں۔ منہ بند کی ہوں بچیاں (نازلی ہمراہ محمد علی فلم گمراہ)

☆ سن ری پون سن ری گھٹا۔ کیا دن یہ سہانے آئے (روجی بانو ہمراہ وحید مراد فلم ضمیر)

☆ کیوں شرابی شراب پیتا ہے۔ اور پھر بے حساب پیتا ہے (مصطفیٰ قریشی فلم سار جٹ)

☆ آنکھ پھولی کھیل ہے ایسا۔ ایک چھپے اک

ڈھونڈے (نوین تاجک ہمراہ محمد علی فلم منزل)

☆ تجھے دل سے لگا لوں پلکوں میں چھپا لوں (ڈانٹا کرشنا فلم بندش)

☆ کوئی ہیرا تو نہ تھا اک شیشہ ہی تو تھا۔ ٹوٹ گیا تو کیسا شکوہ (قوی خان فلم بے مثال)

☆ ان متوالی آنکھوں میں۔ کجرا لگانا چھوڑ دو (محبوب عالم، فلم آنسو اور شعلے)

☆ ہم رہے پیاسے کے پیاسے۔ لاکھ ساون آگئے (صبیحہ خانم۔ فلم ایک رات)

☆ گھر کو جنت بنا کے دکھا دیں گے ہم (نیر سلطانہ فلم میری بھابی)

☆ کسی مہربان نے آ کے میری زندگی سجاد دی (زیبا، فلم شمع)

☆ خدا کرے کہ محبت میں وہ مقام آئے۔ کسی کا نام لوں لب پر تمہارا نام آئے (وحید مراد، فلم افشاں)

☆ ایسے وہ شرمائے، جیسے میگھا چھائے (رحمان، فلم دوسا تھی)

☆ ساتھی ساتھ نبھانا رہے۔ دل کو توڑ نہ جانا رہے (شبم، فلم من کی جیت)

☆ بھولا بھولا میرا نام۔ ہنسنا گا میرا کام (ندیم، فلم نادان)

☆ بہت خوب صورت ہے میرا صنم۔ خدا ایسے مکھڑے بناتا ہے کم (شاہد، فلم آبشار)

☆ ہم تم دونوں ساتھ رہیں گے۔ جب تک دن اور رات رہیں گے (روزینہ، فلم اللہ میری توبہ)

☆ راج دلارے اکھیوں کے تارے۔ صدقے میں جاؤں تو سو جا (طلعت صدیقی، فلم آر پار)

☆ ہم نے تم سے پیار کیا ہے۔ الفت کا اقرار کیا ہے (طلعت حسین، فلم انسان اور آدمی)

☆ یہ دنیا رہے نہ رہے میرے ہدم۔ کہانی محبت کی زندہ رہے گی (غلام محی الدین، فلم میرا نام ہے محبت)

☆ آجا دشمن کریں دشمنی دوستی کا یہ زمانہ نہیں (آصف خان، فلم ہیرا پھیری)

☆ لائف ہے کچھ دنوں کی۔ لگے نہ دل کو روگ (نادیہ، فلم پلے بوائے)

☆ چاند تارے گھٹا پھول شبم صبا۔ چاندنی شاخ کلیاں دھنک روشنی (آصف رضا، فلم ساتھی)

☆ کیا کہنے کتنی خوب ہے صورت جناب کی۔ قدموں کو چومتی ہے کرن آفتاب کی (جاوید، فلم ناہید)
☆ گل دے گل دے چمن گل دے جاناں۔ تو میری دیوانی میں تیرا دیوانہ (قاضی واجد، فلم آخری حملہ)
☆ بند آنکھوں میں سنے تھے۔ سنوں میں تم اپنے تھے (رنگیلا، فلم گمنام)

☆ یارو میں بڑا پریشان۔ میرے پیچھے آئے اک لڑکی جوان (منور ظریف، فلم پردے میں رہنے دو)
☆ واہ ری بھوک تیرا بھی جواب نہیں (مرزا شاہی ہمراہ ندیم کویتا، فلم محبت اور مہنگائی)
☆ حسن والے اگر مسکرا کر ہمیں۔ اپنا جلوہ دکھائیں تو ہم کیا کریں (علی رضا، فلم بے مثال)
☆ کبھی گھڑی میں آئے کبھی چھت پہ بلائے۔ مجھے کر کے اشارے گھڑی گھڑی (صوفیہ بانو، فلم پردے میں رہنے دو)

☆ میرے منے میرے لال۔ تو جیسے ہزاروں سال (طارق عزیز ہمراہ دیبا فلم ایماندار)
☆ تسلیم فاضلی کے کریڈٹ میں یہ بات بھی ہے کہ اس کے تحریر کردہ کچھ نغمے بیک وقت کئی فنکاروں پر عکسند کیے گئے۔ ایسے نغموں میں
☆ اللہ کے نام پر جھولی بھر دے (رنگیلا، قوی اور نرالا پر فلمایا گیا، فلم بے ایمان)

☆ بندہ تو گناہ گار ہے رحمان ہے مولا (فلم صورت اور سیرت کے اس حمد یہ کلام کو بھی کئی فنکاروں پر پچھرا کر کیا گیا تھا)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ تسلیم فاضلی نے کسی پنجابی فلم کے گیت نہیں لکھے تھے مگر اس نے اردو فلموں میں کچھ ایسے گانے تحریر کیے ہیں جن کے بول پنجابی میں ہیں۔ مثال کے طور پر

☆ اے گل نہ بھلا دیں چند میریے (آواز شوکت علی، فلم مٹھی بھر چاول)

☆ تیرے کچھ یہ ملائیاں نی کچا دودھ پین والے (آواز ناہید اختر، فلم عشق عشق)

☆ تسلیم فاضلی نے کچھ فلموں میں ہیرو ڈی ساگنز بھی لکھے جو کافی پسند کیے گئے۔ ایسی فلموں میں "نیشن، نوکر، پردے میں رہنے دو، دیکھا جائے گا، مہندی لگی میرے ہاتھ" کے نام قابل ذکر ہیں۔

☆ تسلیم فاضلی کے نغمات کو اس کے دور کے تقریباً سبھی معروف بے بیک سنگرز نے گایا ہے، خاص طور پر مہناز، ناہید اختر، چوہان اور مہدی حسن نے اس کے زیادہ نغمات گائے ہیں۔ تذکرہ گانے والوں کے علاوہ احمد رشدی، مسعود رانا، مالا، رونا لیلیٰ، بشیر احمد، مجیب عالم، منیر حسین، نور جہاں، تسلیم بیگم، آئرن پروین، نجم نیازی، ناہید نیازی، ریحانہ یاسمین، آئیون رفیع، رجب علی، طاہرہ سید، نیرہ نور، غلام عباس، اے نیر، اخلاق احمد، سلیم شہزاد، نسیم شاہین، نکھت سیما، روبینہ بدر، بلقیس خانم، افشاں، ناصر جہاں، شوکت علی، محمد افرامیم، عالمگیر، مسرت مسیح، تصور خانم، شمر اقبال، حمیدہ اختر، شازیہ، دینا لیلیٰ، ترنم ناز، رنگیلا، ندیم، نذیر علی، عارف لوہار، اسد امانت علی، عمران علی ناشاد نے بھی تسلیم فاضلی کے تحریر کردہ نغمات کی گائیکی کا اعزاز حاصل کیا۔ ان میں سے چند سنگرز کے گیت نمونہ ملاحظہ کیجیے۔

☆ احمد رشدی: گلاب جیسی ہے تیری صورت۔ فرشتوں جیسی تیری حیا ہے (فلم ایک پھول ایک پتھر)
☆ رونا لیلیٰ: او میرا بابو پھیل چھبلا میں تو ناچوں گی۔ او میرا بلما رنگ رنگیلا میں تو ناچوں گی (فلم من کی جیت)
☆ نور جہاں: تیرے قدموں میں گھر جانے کو جی چاہتا ہے۔ آج تو پیار میں مر جانے کو جی چاہتا ہے (فلم سوسائٹی گرل)

☆ طاہرہ سید: رات نشی ہے اکیلا دل۔ لگی ہے آگ سینے میں درد ہے منزل (فلم آر پار)

☆ ناہید اختر: ایسی چلو نہ چال کہ دل میرا آجائے۔ چہرے پر بکھیر نہ بال کہ دل میرا آجائے (فلم: آف یہ بیویاں)

☆ روبینہ بدر: کوئی کہے دلبر کوئی کہے جانی۔ ہائے اللہ میں کیوں جوان ہو گئی (فلم تیرے میرے سنے)

☆ ناصر جہاں: کسی کے گھر کا یہ بھی چراغ تھا (فلم زینت)

☆ شمر اقبال: ہزار بار منع کیا میری گلی نہ سیاں آنا۔ ہزار بار منع کیا (فلم عزت)

☆ زاہدہ سلطانہ: پیار ہے پھول زمانہ پتھر۔ مل نہیں سکتے یہ دونوں اکثر (فلم پھول اور پتھر)

☆ رنگیلا: اس دنیا میں پیار نہ کرنا۔ جیتے جی مر جاؤ گے (فلم پردے میں رہنے دو)

☆ ندیم بیک: محبوبوں کے قدرداں نہ شہر میں نہ گاؤں میں (فلم جلتے نہ کیوں پروانہ)
☆ اسد امانت علی: کیا گل بدنی گل بدنی گل بدنی ہے۔ تم آئے ہو گلشن میں نئی بات نئی ہے (فلم ابھی تو میں جوان ہوں)

☆ تسلیم فاضلی، اچھا نغمہ نگار ہی نہیں تھا بہت اچھا انسان بھی تھا۔ فلمی دنیا جہاں دوست کم اور دشمن زیادہ ہوتے ہیں وہاں تسلیم فاضلی سرایا محبت کا پیکر تھا۔ اس نے کبھی کسی فلم والے کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ فلم ساز چھوٹا ہوا یا بڑا سب کے ساتھ برابری کا سلوک کیا، سب کے لیے اپنی بہترین شاعرانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی ناکام فلموں کے بھی بہت سے گیت کامیاب ہوئے۔

☆ تسلیم فاضلی کی فنی صلاحیتوں کو دیکھ کر اکثر موسیقار اور فلم ساز و ہدایت کار اس سے عام روش سے ہٹ کر کام لیا کرتے تھے۔ اس ضمن میں مشہور فلم ساز و ہدایت کار جان محمد نے بھی ایک انوکھا تجربہ کیا۔ انہوں نے اپنی اردو فلم "دیکھا جائے گا" کے لیے ایم اشرف سے سندھی دھن بنوائی اور تسلیم فاضلی کو اس دھن پر انگریزی زبان میں گیت لکھنے کو کہا۔ تسلیم فاضلی نے طرز سن کر انگلش میں مکمل نغمہ تحریر کر دیا جس کے بول یوں تھے۔

Whats to day
What will be tomorrow
Dont think sing with me
Joy with me

ایم اشرف نے تسلیم فاضلی کا یہ انگریزی نغمہ احمد رشدی کی آواز میں ریکارڈ کیا جو بے حد مقبول ہوا۔ جان محمد کا تجربہ بھی کامیاب رہا اور تسلیم فاضلی کی انگلش گیت نگاری بھی پسند کی گئی اور اس کی اس خوبی پر بھی اہل فن نے دل کھول کر داد دی۔

☆ تسلیم فاضلی کے ایک بھائی صبا فاضلی جنہوں نے کچھ پاکستانی فلموں میں سیاست اور مستی خان میں نغمہ نگاری کی تھی انہوں نے ایک اردو فلم "ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں" کے نام سے پروڈیوس بھی کی تھی جس کے ہدایت کار اقبال یوسف، موسیقار ناشاد اور نمایاں فنکار وحید مراد اور فیمم آراء تھے مگر افسوس کہ یہ فلم مکمل ہونے کے باوجود بوجہ ریلیز نہ ہو سکی۔

☆ تسلیم فاضلی کی بھی کچھ فلمیں جو مختلف فلم سازوں اور

☆ اس کی شاعری میں اس کی زندگی کی عکاسی

☆ جس طرح ایک فلم ڈھائی یا تین گھنٹے دورانیے کی ہوتی ہے مگر اس میں سارا تماشا دکھایا پڑتا ہے۔ اسی طرح تسلیم فاضلی کی عمر بھی بہت مختصر تھی صرف 35 برس، اسی عمر میں اس نے بے شمار فلموں کے گیت لکھے اور اپنے ہم عصر نغمہ نگاروں سے بڑھ چڑھ کر شہرت حاصل کی۔ محبت کی شادی کی اور ایک بچی کا باپ بن گیا۔ اس نے فلموں کے لیے جو گیت لکھے، ایسا لگتا ہے جیسے یہ اس کے ذاتی احساسات و جذبات ہیں۔

☆ جو درد ملا اپنوں سے ملا۔ غیروں کی شکایت کون کرے

☆ مل گئے تم تو بس یہی غم ہے۔ پیار زیادہ ہے زندگی کم ہے

☆ تمہارے بنا زندگی کچھ نہیں تھی۔ تمہاری محبت نے جینا سکھایا

☆ جیت اپنی محبت کی ہوگی۔ ہار جائے گا سارا زمانہ

☆ اب کس کو سنائیں گے یہ درد کا افسانہ۔ سمجھتے تھے جسے اپنا کلا وہی بے گانہ

☆ تیرے بغیر میری زندگی ادھوری ہے
☆ اپنا جیون صبح کا تارا۔ ڈوب گئے تو ملا کنارہ

☆ ہدایت کاروں کی تحسین نامکمل رہیں۔ ایسی فلموں میں انداز، منجلی، پیاس، جنگلی اور دھوپ چھاؤں شامل ہیں۔ تاہم ان فلموں کے لیے تسلیم فاضلی کے تحریر کردہ یہ گیت پاپولر ہوئے۔

☆ دل تو ہے اک شیشے کا کھلونا۔ ٹوٹ گیا تو کیسا رونا (آواز مہدی حسن، نیرہ نور، فلم پیاس)

☆ ہم سلامت ہیں تو آپ پریشان کیوں ہیں (فلم منجلی)

☆ چلیے رک رک کے ذرا پیار نہ ہو جائے کہیں (فلم انداز)

☆ تسلیم فاضلی کو اس کی بہترین نغمہ نگاری پر متعدد ایوارڈز اور اعزازات ملے جن میں تین نگار ایوارڈز بھی شامل ہیں جو فلم شانہ، آئینہ اور بندش میں بہترین نغمہ نگار کے

ایوارڈز تھے۔

فلم والوں کے علاوہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن والوں نے بھی تسلیم فاضلی سے گیت اور غزلیں لکھوا کر نشر اور ٹیلی کاسٹ کیے۔ پی ٹی وی نے تسلیم فاضلی سے ایک گیت لکھوا کر فریدہ خانم کی آواز میں ریکارڈ کیا جو بے حد مقبول ہوا۔

میں نے بیروں میں پائل تو باندھی نہیں کیوں صدا آرہی ہے چھن چھن چھن چھن تسلیم فاضلی، مسرور انور سے بہت جو نیر نغمہ نگار تھا مگر دونوں میں کچھ باتیں قدر مشترک تھیں۔ مثال کے طور پر تسلیم فاضلی بھی مسرور انور کی طرح تاش کھیلنے کے شوقین تھے۔ جب کہ مسرور انور ہی کی طرح کسی بھی چوہیشن کے لیے جھٹ پٹ گیت لکھ دیا کرتا تھا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ تسلیم فاضلی اپنے سینئرز کا بہت احترام کرتا تھا۔ اس کے پورے فنی کیریئر میں کبھی کسی نے بھی اس کی شکایت نہیں کی۔ سب اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کے مداح تو تھے ہی اس کے اخلاق کی بھی تعریف کرتے تھے۔

فلمی گیتوں کی طرح غزلیں بھی تسلیم فاضلی بڑی نفیس تحریر کیا کرتا تھا۔ اس نے فلموں کے لیے بھی عمدہ غزلیں لکھیں، فلم ”زینت“ کے لیے اس نے ایک بڑی پیاری غزل تحریر کی جسے مہدی حسن نے ناساؤ کی کمپوز کی ہوئی دھن میں ریکارڈ کروایا جب کہ یہ غزل شاہد پر پچھراڑ ہوئی۔ یہ غزل آج بھی روز اول کی طرح مقبول ہے غزل کے بول ہیں۔

رفتہ رفتہ وہ میری ہستی کا سماں ہو گئے
تسلیم فاضلی کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اس کے گیت، گانے اور غزلیں عام فہم ہوتے تھے اس لیے بڑی آسانی سے زبان زد عام ہو جاتے تھے۔ مقبول ہو جاتے تھے۔

جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ تسلیم فاضلی نے اپنے مختصر فنی کیریئر میں ہر طرح کی شاعری کی اور اللہ کے فضل و کرم سے کامیابی حاصل کی مگر اس نے فلم ”انصاف اور قانون“ کے لیے جو ایک سبق آموز نغمہ تحریر کیا وہ اپنی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے اس کی تمام فلمی نغمہ نگاری پر بھاری ہے۔ اس کی دھن موسیقار ایم اشرف نے بنائی اور مہدی حسن اور نور جہاں کی آوازوں میں الگ الگ صدا بند ہوئی۔ یہ نغمہ شائقین نے بار بار سنے ہوں گے لیکن بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہو گا کہ اس کا تخلیق کار اس کا تحریر کرنے والا شاعر تسلیم فاضلی ہے۔

ماہنامہ سرگزشت

96

سو برس کی زندگی میں ایک

تو اگر کر لے کوئی اچھا عمل
تجھ کو دنیا میں ملے گا اس کا پھل
آج جو بوئے گا وہ کانٹے کا کل
بچی بات تو یہ ہے کہ میں نے خود بھی پہلی بار جب یہ نغمہ سنا تھا، اس وقت سے یہ میرے دل و دماغ میں پیوست ہو کر رہ گیا تھا مگر مجھے علم نہیں تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ یہ کس شاعر کی فکر جمیل ہے۔ بہت بعد میں پتا چلا تو حیران رہ گیا کہ ایک نوجوان شاعر اس کا تخلیق کار ہے۔

تسلیم فاضلی میں عام فلم والوں جیسی بری عادتیں نہیں تھیں۔ بس شغل میلے کے طور پر وہ تاش کی بازی کا شائق تھا۔ تاش کھیلنا فلم والوں کا ایک پرانا مشغلہ ہے جس میں مرد اور خواتین دونوں شریک ہوتے تھے۔ تسلیم فاضلی بھی فرصت کے اوقات میں تاش کی ایک محفل میں شریک ہوا کرتا تھا جس میں دیگر فلم والوں کے علاوہ اداکارہ نشو بھی شریک ہوتی تھی۔ نشو اپنے وقت کی بڑی طرح دار اداکارہ تھی۔ جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی خوش ذوق اور خوش ادا بھی۔ شعر و شاعری سے بھی اسے دلچسپی تھی۔ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتی تھی۔ تسلیم فاضلی کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اسے بخوبی علم تھا۔ اس کے لکھے ہوئے گیتوں پر پر فارم کر کے اسے ہمیشہ لطف آتا تھا۔ تاش کی محفل میں دونوں ایک دوسرے کے قریب تر ہوئے تو نینوں کی الجھ گئی دور۔ تسلیم فاضلی نشو کی زلف گرہ گیر کا ایسا شکار ہوا کہ ایک دن وہ اپنے دل کی بات زبان پر لانے پر مجبور ہو گیا۔

”نشو! وہ جو میری ایک غزل کا مصرعہ ہے نا..... رفتہ رفتہ مری ہستی کا سماں ہو گئے“

”ہاں! بڑی اچھی غزل ہے وہ۔“

”کچھ..... یہی کیفیت میری ہو گئی ہے۔“

”یعنی..... کوئی تمہاری ہستی کا ہے؟“

”ہاں!“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے کون ہے بھی! وہ خوش نصیب؟“

”تم..... صرف اور صرف تم۔“

نشو ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ ذرا دیر تک خاموش رہی پھر اداس لہجے میں بولی۔ ”تم یہ بات جانتے ہو نا کہ میں طلاق یافتہ ہوں اور ایک بچی کی ماں بھی ہوں۔“

”ہاں..... جانتا ہوں مجھے معلوم ہے۔ میں کوئی اجنبی

جولائی 2018ء

نہیں۔ اس دنیا کا فلمی دنیا کا باسی ہوں۔“

”تم ابھی تنگ ہو۔ تمہارے سامنے تمہارا بہترین مستقبل ہے۔ تمہیں تو مجھ سے بہتر شریک حیات مل سکتی ہے۔ مجھ میں کیا رکھا ہے اب؟“

”اگر تم مجھے اپنی زندگی کا ساتھی نہیں بنانا چاہتیں تو کھل کر کہہ دو۔ میں اس صدمے کو اپنے سینے سے لگا کر.....“

اس کے آگے اس کی زبان لڑکھڑائی گئی تھی۔ نشو نے آگے بڑھ کر اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ ”ایسا نہ سوچو۔ میرے البیلے شاعر، تمہیں بہت دنوں تک جینا ہے۔ فلم انڈسٹری کی بہت خدمت کرنی ہے۔“

”مگر..... مگر اب میں تمہارے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔“

”اچھا..... یہیں ٹھہری جو شرط وصل لیلی.....“
تسلیم فاضلی آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ مسکرایا اور پھر چند دنوں بعد ان کے سہرے کے پھول بھی مسکرانے لگے۔

تسلیم فاضلی کے لیے یہ شب و روز بہت قیمتی تھے۔ بہت انمول اور نشاط و انبساط سے بھر پور تھے جس کو اس نے دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا جو اس کی پہلی اور آخری محبت تھی۔ وہ اسے مل گئی تھی اور اس نے بھی اپنی ساری محبت، ساری چاہت اس پر نچاؤ کر دی تھی۔ تسلیم فاضلی کے بہت سے گیت ہیں جو اس کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں۔

☆ مل گئی مل گئی ہم کو پیار کی یہ منزل
☆ آئی ملن کی رات کہ سخن پئی ہو گئی بات
☆ ٹھہر اے ہاں ہم تم ہیں جہاں
☆ بند آنکھوں میں سینے تھے۔ سینوں میں تم اپنے تھے
☆ بن ترے رات تو کیا ہم سے نکلیں دن بھی نہیں
☆ دل جس کو ڈھونڈتا ہے وہ صورت تمہی تو ہو
☆ ہم تم دونوں ساتھ رہیں گے۔ جب تک دن اور رات رہیں گے

☆ مل گئے تم تو بس یہی غم ہے۔ پیار زیادہ ہے زندگی کم ہے

اگرچہ یہ اور ایسے بے شمار گیت فلمی چوہیشنز کے تحت لکھے گئے تھے مگر تسلیم فاضلی کی محبت بھری زندگی پر بھی ان کی پر جھائیاں نظر آتی ہیں۔ نشو کو اس نے دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا جو بالآخر اسے مل گئی۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی، سب سے اہم، سب سے قیمتی خوشی تھی جو اسے مل گئی تھی

ماہنامہ سرگزشت

97

مگر یہ دنیا بھی عجیب جگہ ہے اس کی اس خوشی سے کئی لوگ خوش نہیں تھے اور یہ لوگ غیر نہیں تھے، اس کے اپنے بہت قریبی عزیز اور رشتے دار تھے۔ وہ اس بات پر ناخوش تھے کہ ان کے خاندان کے ایک فرد نے ایک نوجوان نے ایک فلمی اداکارہ کو اپنا شریک حیات بنایا، خاندان کا فرد بنانے کی بھول کی۔ زبردست بھول جسے وہ ہرگز قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ نہ صرف انہوں نے اپنی بھرپور ناپسندیدگی کا اظہار کیا بلکہ تسلیم فاضلی پر دباؤ ڈالنے لگے کہ اسے چھوڑ دو، طلاق دے دو۔ ہم تمہاری شادی کسی شریف خاندان کی شہزادی سے کرادیں گے۔

ہمارے معاشرے میں پسند کی شادی کرنا لڑکی ہی کے لیے مصیبت نہیں بنتی بلکہ لڑکوں کو بھی بہت آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ تسلیم فاضلی کے لیے بھی اس کے خاندان کا یہ دباؤ بہت صبر آزمائش تھا۔ وہ بھلا ایسا کیسے کر سکتا تھا؟ نشو سے بے وفائی کیونکر کر سکتا تھا؟ نشو نے تو اسے اس ملاپ پر مجبور نہیں کیا تھا۔ وہ تو اس کے اصرار پر رضامند ہوئی تھی پھر وہ اسے یہ سزا کیوں دے؟ اسے اپنے ہی لکھے ہوئے کچھ نغمات یاد آ گئے۔

☆ یہ دنیا رہے نہ رہے میرے ہدم۔ کہانی محبت کی زندہ رہے گی
☆ ہنس کے سہہ لیں گے اگر تم میں برائی ہوگی۔ پر کہیں آنکھ لڑائی تو لڑائی ہوگی
☆ چاند کی ٹکری تاروں کا انگنا۔ جیون اپنا ایسا ہو

☆ آگے آگے محترمہ پیچھے محترم۔ ساتھ نہیں چھوڑیں گے اللہ قسم
☆ تمہارے بنا زندگی کچھ نہیں تھی۔ تمہاری محبت نے جینا سکھایا
☆ رات سنان ہے راہ ویران ہے۔ راستہ پر خطر اور انجان ہے

☆ پیار کا وعدہ ایسے نبھائیں کوئی جدا کرنے نہ پائے۔ میں بھولوں تو میں مرجاؤں تو بھولے تو تو مرجائے
☆ اے کیا پتا تھا کہ جن کی چوہیشنز پر اس نے بھی یہ گیت لکھے تھے۔ کبھی اسے بھی اسی چوہیشن کا سامنا کرنا پڑے گا۔
☆ وہ جس ذہنی کرب سے گزر رہا تھا اس سے نشو بے خبر نہیں تھی۔ بڑھی لکھی اور باشعور خاتون تھی۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ اس کی شخصیت متنازعہ ہو گئی ہے۔ اس کی سرال

جولائی 2018ء

والے اس کی وجہ سے تسلیم فاضلی کو تار چر کر رہے ہیں۔ اس سے وہ کام کروانا چاہتے ہیں جو اس کے بس کی بات نہیں۔ ایک دن اس نے تسلیم فاضلی سے کہا۔ ”یار! تم بھی بڑے عجیب آدمی ہو، اتنے بڑے شاعر ہو مگر اتنی سی بات پر اس قدر پریشان ہو۔“

تسلیم فاضلی نے نشو کو غور سے دیکھا اور دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ”یہ اتنی سی بات نہیں، بہت بڑی بات ہے۔ میرے لیے ناممکن بات ہے۔“

”ارے یار!“ نشو نے مسکراتے ہوئے لائٹ موڈ میں کہا۔ ”میں نے تو سنا تھا محبت کا The end شادی کے بعد ہو جاتا ہے اور جب محبوبہ منکوحہ بن جاتی تو جسم و جان کی مطلوبہ تسکین کا سبب اور سامان کے علاوہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ وہ پیار کے قابل نہیں رہتی۔ مجھ میں اب کیا رکھا ہے؟ میرے لیے اپنے عزیزوں کو چاہنے والوں کو کیوں دکھ دے رہے ہوں؟ ان کی مان لو۔ یہ جان لو کہ وہ تمہارے خیر خواہ ہیں۔ ویل ویشر ہیں تمہیں تمہارے خاندان کے اسٹیشن کے مطابق عزت دینا چاہتے۔“

”بند کرو، بند کرو اپنی تقریر۔“ تسلیم فاضلی نے جھنجھلا کر کہا۔ ”میں اپنے ہاتھوں اپنی محبت کا گلا نہیں گھونٹ سکتا۔“ ذرا رک کر اس نے اپنے بے قابو جذبات کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ پھر بولا۔ ”مجھے کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے بارے میں خود فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ اپنے بھلے برے کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔“

”اگر ایسی بات ہے تو۔۔۔۔۔“ نشو نے سنجیدگی سے کہا۔ ”پریشان کیوں ہو۔ کیوں اپنے آپ کو ڈپریشن میں مبتلا کرتے ہو؟“

تسلیم فاضلی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جواب بھی کیا دیتا۔ اتنا سنگین مسئلہ درپیش ہو تو بندہ کیسے پریشان نہ ہو؟ اس کی پریشانی اپنی جگہ بالکل درست تھی۔ ایک طرف اس میں یہ ہمت نہیں تھی، حوصلہ نہیں تھا کہ وہ مخالفین کے سامنے ڈٹ جاتا اور کہتا۔ ”میں نہیں چھوڑوں گا۔ نہیں چھوڑوں گا۔ نہیں چھوڑوں گا۔“

میری زندگی کی راحت ہے۔“

اس کشمکش میں اس کی پریشانیوں بڑھتی گئیں ڈپریشن میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ شاعر تھا۔ ایک حساس دل رکھنے والا شاعر۔ فکروں اور پریشانیوں نے اس کے دل کو متاثر کرنا شروع کر دیا اور ایک دن اس متاثرہ دل نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس کی دھڑکنیں خاموش ہو گئیں۔ اس نے دنیا سے کھ موڑ لیا۔ لیکن بے وفائی کا داغ اپنے اوپر گہرا نہیں دیا۔ 17 اگست 1982ء کو تسلیم فاضلی اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ فلمی دنیا کو ایک بہت بڑا صدمہ دے گیا۔ اس جوان فکر شاعر کی عمر اس وقت صرف 35 برس تھی۔ کیسی عجیب بات ہے کہ اس عمر میں تو بہت سے تخلیق کار آرٹ کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں مگر یہ کیسا انوکھا اور عجیب شاعر تھا کہ اس عمر میں اتنی انمول شاعری کر کے ایک تاریخ رقم کر دی۔ اس نے 1966ء میں فلمی شاعری کی ابتداء کی۔ اس وقت اس کی عمر 19 سال کے قریب تھی۔ وفات کے وقت اس کی عمر 35 سال تھی۔ اس حساب سے اس نے صرف 16 سال تک پاکستانی فلموں کے لیے نغمہ نگاری کی اور کسی شک و شبہ کے بغیر بہت سے سینئر شعراء سے زیادہ مقبولیت اور شہرت حاصل کی۔ شاید یہ قدرت کا نظام ہے کہ کم عمری میں انتقال کرنے والی شخصیتیں اپنی قلیل عمر میں ہی وہ کام کر جاتی ہیں یا وہ مقام حاصل کر لیتی ہیں جو زیادہ عمر پانے والے اکثر لوگوں کو اپنی طویل عمر تک خدمات انجام دینے سے حاصل ہوتا ہے۔

تسلیم فاضلی کو کھو کر نشو ایک بار پھر بے آسرا ہو گئی تھی۔ اس کا پہلا شوہر انعام درانی اس کی طالب علمی کے دور کا محبوب تھا جس سے اس نے لوگوں کی مخالفت کے باوجود شادی کی تھی مگر اس شخص نے اس کی محبت کی قدر نہیں کی اور تھوڑے ہی عرصے بعد اسے چھوڑ دیا۔ پیار کا ناطہ توڑ دیا۔ اس کے مقابلے میں تسلیم فاضلی نے اسے بے پناہ محبت دی اور اپنے قریبی عزیزوں کے زبردست پریشور کے باوجود اسے نہیں چھوڑا۔ دنیا چھوڑ دی مگر اس سے پیار کا رشتہ نہیں توڑا۔ ایسے چاہنے والے کے غم کو وہ بہت دنوں تک سینے سے لگائے رہی۔ وہ اکثر تنہائیوں میں روتی اور تسلیم فاضلی کے گیتوں کو یاد کرتی جو اس نے کبھی فلموں کے لیے لکھے تھے۔

☆ سن لے قریب آ کے میرے دل کا فیصلہ۔ تم میری زندگی ہو تم میری بندگی

☆ تو ہے میری جان میرے صنم۔ ساتھ ہوں میں

ہیرے تیری قسم ☆ ایسے ملیں گے پھر نہ جدا ہوں۔ دنیار ہے نہ رہے اب نشو کے پاس تسلیم فاضلی کی یادیں رہ گئی تھیں اور اس کی نشانی ایک بیٹی۔ جس کا نام تسلیم فاضلی نے بڑے چاؤ سے خود رکھا تھا عائشہ۔

یادش بخیر۔ یہ بیٹی۔ اب بچی نہیں رہی ہے۔ نشو نے اس کی شادی اپنی دوست ادا کا رہے فردوس کے بیٹے سے کر دی ہے۔ دونوں شاد اور آباد ہیں اور خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔

تسلیم فاضلی کے انتقال پر ملال کو اب 36 برس بیت گئے ہیں لیکن اس کے بعد اس جیسا کوئی دوسرا نغمہ نگار پاکستانی فلمی صنعت کو نصیب نہیں ہوا۔

اس نے محض 19 سال کی عمر میں فلموں کی نغمہ نگاری شروع کی۔ اس عمر میں تو لڑکے صحیح مصرعے بھی نہیں لکھ سکتے۔ کورس کی کتابوں میں اساتذہ کا جو کلام ہوتا ہے ان کی تشریح بھی ٹھیک سے نہیں کر سکتے۔ واضح رہے کہ جس دور میں تسلیم فاضلی نے نغمہ نگاری کی فیلڈ میں قدم رکھا تھا۔ بڑے بڑے اور جدید گیت نگاروں کا راج تھا۔ ایسے میں کسی نو عمر اور نو آموز کا درد اور ان کے مقابلے میں اپنی حیثیت کو منوانا، یہ کوئی کھیل نہیں تھا۔ کوئی آسان کام نہیں تھا مگر اللہ تبارک و تعالیٰ اس پر مہربان تھا۔ اس کس لڑکے نے ایسی شاعری کی فلموں کے لیے ایسے تروتازہ اور سماعت کے راستے دلوں میں اتر جانے والے گیت لکھے کہ موسیقار ہدایت کار اور فلم ساز اس کے گرویدہ ہو گئے۔ انہوں نے اس کی عمر پر وہ بیان نہیں دیا۔ اس کے کام کو دیکھا، اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کو تسلیم کیا اور اس کی خدمات حاصل کرنے لگے۔ واضح رہے کہ فلم والے سب سے پہلے اپنے فائدے کو دیکھتے ہیں۔ جس سے انہیں فائدہ نہیں ہوتا، وہ کیسا ہی طرم خان کیوں نہ ہو۔ اس کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھتے۔ تسلیم فاضلی اپنی نوعمری، نو آموزی اور نا تجربہ کاری کے باوجود ایسے گیت لکھتا تھا جو پسند کیے جاتے تھے، جن سے فلموں کا کامیابی کو سہارا ملتا تھا پھر اس میں یہ خوبی بھی تھی کہ وہ گیت نگاری میں زیادہ وقت نہیں لیتا تھا۔ ادھر اسے پچویشن بتائی جاتی، ادھر وہ گیت، گانا یا غزل لکھ کر موسیقار کے حوالے کر دیتا۔ جیسے بٹن پر انگلی رکھتے ہی مطلوبہ چیز سامنے آ جائے۔ اس کی یہی پھرئی، یہی تیزی اور بسیار نوکیلی تھی جس نے بہت تھوڑے عرصے میں اس سے ڈھیروں

گیت لکھوائے۔ ایسے گیت جو کل بھی مقبول تھے آج بھی ان کی پسندیدگی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ وہ اپنی بھری جوانی میں دنیا چھوڑ گیا مگر اس کے سدا زندہ رہنے والے نغمے اسے ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ اس کے تحریر کردہ ہر گیت بھلا کیسے فراموش کیے جاسکتے ہیں۔

☆ میرا دل نہ جانے کب سے تیرا پیارا ڈھونڈتا ہے ☆ ڈھونڈ رہی تھیں جانے کب سے۔ تیری صورت میری آنکھیں

☆ ہمارے دل سے مت کھیلو کھلونا ٹوٹ جائے گا ☆ نینوں کا ہے کام سارا دو نینوں کا کام۔ نین شرارت کرتے ہیں دل ہوتا ہے بدنام ☆ جو درد ملا اپنوں سے ملا۔ غیروں سے شکایت کون کرے

☆ جیت اپنی محبت کی ہوگی۔ ہار جائے گا سارا زمانہ ☆ اب کس کو سنائیں گے اس درد کا افسانہ۔ سمجھے تھے جسے اپنا نکلا وہی بے گانہ ☆ ہنستی ہوئی آنکھوں کا کا جل۔ اڑتی ہوئی زلفوں کا بادل

☆ میں تو نہ بولی میرے بول اٹھے کنگنا۔ نینوں نے تیرے مجھے کیا کہا بچیاں ☆ کبھی اپنا بنائے کبھی اکھیاں چرائے۔ چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے ☆ عمر یا بتی جائے کوئی رشتہ نہ آئے ☆ عشق سچا ہے تو پھر وعدہ نبھانا ہوگا۔ تجھ کو آنا ہوگا تجھ کو آنا ہوگا

☆ ہوں ہاں کرتے کرتے آہیں بھرتے بھرتے۔ کئی سال ☆ روز کہتا ہوں بھول جاؤں تمہیں۔ روز یہ بات بھول جاتا ہوں

☆ اپنا جیون صبح کا تارا۔ ڈوب گئے تو ملا کنارہ خاموش نظر خاموش ادا۔ یہ رنگ طبیعت ٹھیک نہیں یہ اور ایسے بہت سے گیت ہیں جو جب بھی سنے جاتے ہیں تسلیم فاضلی کی یاد دلاتے ہیں۔ اس کی شاعرانہ عظمت کے دیپ روشن کر دیتے ہیں۔ ایسے شاعر کو موت بھلا کیسے مار سکتی ہے؟ وہ اپنی ہمیشہ زندہ رہنے والی فلمی نغمہ نگاری کے حوالے سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔



انہیں سر نیچے کر کے ان جھاڑیوں سے باندھ کر بٹھا دیا گیا اور پھر وہ دونوں انہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر کیش دین لے کر فرار ہو گئے۔

دونوں ڈاکو جیسے ہی کیش دین لے کر فرار ہوئے، پیٹرک اپنے چہرے کے دائیں حصے کو درخت کی کھردری چھال سے رگڑنے لگا۔ اس کوشش میں اس کا گال لہو لہان ہو گیا۔ پھر بھی اس نے ہار نہیں مانی اور اپنی کوشش جاری رکھی یہاں تک کہ اس کی ایک آنکھ سے ٹیپ اتر گیا۔ پھر اس نے اپنے ساتھی کو آواز دے کر سمت بتائی، جواٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”کھڑے ہو جاؤ اور میرے قریب آؤ۔“ وہ بولا۔ ”اور گھوم جاؤ میں تمہاری پچھلی جیب سے چاقو نکال سکتا ہوں۔“ اس طرح تھوڑی سی جدوجہد سے وہ ایک دوسرے کی بندشیں کاٹ کر آزاد ہو گئے اور پھر دونوں ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے گھائی سے اوپر چڑھ کر ہائی دے پر پہنچے۔

☆.....☆

ذمکتی کی یہ واردات ایف بی آئی کے لیے ایک چیلنج تھی کیونکہ ڈاکوؤں نے ایک نہایت سنگین قومی جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ ایف بی آئی کے پاس ایک سراغ تھا۔ جب وکٹر کی آنکھوں پر ٹیپ چڑھایا جا رہا تھا تو اسے چھوٹے قد والے ڈاکو کی قیص پر لاکھ ہیڈ کے ملازم کے بیج کی ایک جھلک نظر آئی تھی۔ کوئی شک نہیں کہ اس ڈاکو نے دھوکا دینے کے لیے وہ قیص پہنی تھی کہ وہ لاکھ ہیڈ کی پلانٹ پر کام کرتا ہے۔ پھر بھی وہ وہاں سے اپنی نفیشت کا آغاز کر سکتے تھے۔

لاس اینجلس پولیس ڈیپارٹمنٹ شریف کا آفس اور ایف بی آئی کے ایجنٹ سیکڑوں لوگوں سے پوچھ گچھ کر چکے تھے اور اب وہ اس کار کو تلاش کر رہے تھے جس میں وہ دونوں فرار ہوئے تھے۔ شہر کے آخری حصے میں بنے۔ ایک مارکنگ لاٹ میں کھڑی ایک مشتبہ کار نظر آئی جس پر جلی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی، اس میں ایک گتے کا ڈبہ تھا جس پر ایک نام اور پتا لکھا ہوا تھا۔ ایجنٹ اس پتے پر غور کر رہے تھے کہ ایک خاتون مسز ایلر نے جو وہاں قریب ہی رہتی تھی اس نے پولیس کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ”آؤ! دیکھو ہمارے ہاں کیسی چیزیں ملی ہیں۔“

اس کے گھر کے عقب میں ایک اور گیراج تھا جو پچھلے چند ہفتوں سے دونو جوانوں نے کرائے پر لے رکھا تھا۔ ذمکتی کی اس واردات کی شام ایک بچے کی گیند لڑھکتی ہوئی گیراج کے دروازے کے نیچے سے اندر چلی گئی تھی۔ ایلر کے بچوں کو معلوم تھا کہ گیراج کی عقبی دیوار ایک جگہ سے ٹوٹی ہوئی ہے۔ وہ



سڑک پر اپنے ساتھی سے آلا۔ دونوں ڈاکوؤں نے دین کی کھڑکیوں سے انہیں اپنے نشانے پر رکھ لیا۔ لاچار پیٹرک اور وکٹر کو ان کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔

”پچھلی سیٹ پر جاؤ۔ اپنے سر نیچے کرلو۔ فرش کی طرف دیکھو اپنے ہاتھ سر کے پیچھے کرلو۔“ اس نے چیخ کر کہا۔

ان دونوں کے پچھلی سیٹ پر جاتے کوتاہ قامت نے اسٹیرنگ سنبھال لی اور پہاڑیوں کی طرف چل پڑا۔ جب کہ اس کے ساتھی نے دونوں کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے تھے اور آنکھوں پر سیاہ ٹیپ لگا دیا تھا۔ دین بیس منٹ تک گرد آلود تاہموار کے راستوں پر اچھلتی کودتی دوڑتی رہی اور پھر ایک جگہ رک گئی۔ یہ ایک ویران اور سنسان گھائی کا کنارہ تھا۔ انہیں ڈھلوان کی طرف سے نیچے اتارا گیا۔ وہاں جھاڑیاں تھیں۔

لمبے ہاتھ

زاہد شیخ

وہ دونوں ایک عام سے مجرم تھے۔ انہوں نے بڑی خوب صورتی سے ڈاکے کا پلان بنایا تھا، ایک ایسا منصوبہ بنایا تھا کہ ان پر کسی کو شبہ بھی نہ ہو، پولیس اندھیرے میں بھٹکتی رہ جائے۔ اسی وجہ سے کامیابی نے قدم چومے مگر تفتیش کاروں نے بھوسے کے ڈھیر سے سوئی تلاش کر لی اور قانون کے لمبے ہاتھ ان تک پہنچ ہی گئے۔

سرمزائی دروازے والوں کے لیے

سات بجے چاندی کے سکوں کے چھ بیگ اور کارڈ بورڈ کا ایک کارٹن جس میں ایک لاکھ گیارہ ہزار تین سو ڈالر کے نوٹ تھے ایک کیش دین کی پچھلی سیٹ پر رکھے ہوئے تھے۔ یہ رقم لاکھ بیس ایئر کرافٹ کے ملازموں کی ہفتہ وار تنخواہ تھی جو پہنچائی جانی تھی۔ ہالی ووڈ اسٹیٹ بینک کے دو میسینجر پیٹرک اور وکٹر دین کے آگے حصے میں تھے۔ پیٹرک نے اسٹیرنگ ویل سنبھال رکھا تھا جب کہ وکٹر اس کے عقب میں نگرانی پر مامور تھا۔ ان دونوں کے درمیان اعشاریہ تین آٹھ کے بھرے ہوئے ریوالور تھے۔ دین اپنی منزل کی سمت رواں دواں تھی۔

جیسے ہی وہ عقبی سڑک کے کنارے پہنچے ایک ایم پی کی وردی والے نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک لیا۔ پیٹرک نے فل بریک لگا کر دین روک دی اور یہ دیکھ کر وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئے کہ اس ایم پی کے اٹھے ہوئے ہاتھ میں اعشاریہ پینتالیس کا ایک ریوالور تھا جس کی نال ان کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اس سے بھی بڑھ کر عجیب بات یہ تھی کہ اس طویل قامت کے جسم پر جو درد تھی اس کی حالت بہت خستہ تھی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ شیو بھی بڑھی ہوئی تھی۔ منہ اندر کو دھنسا ہوا تھا اور وہ گھبراہٹ کے عالم میں سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔

”باہر نکلو۔“ وہ چیخا۔

اس وقت ایک دوسرا مسلح شخص جو کوتاہ قامت تھا، ایک درخت کے پیچھے سے نمودار ہوا اور صبح کی دھوپ سے چمکتی ہوئی

گرمی کی اندھیری رات تھی۔ ہر سو خاموشی کا راج تھا۔ ایسے میں دو افراد جن میں سے ایک طویل قامت اور دوسرا کوتاہ قامت تھا، آٹھ فٹ اونچی باڑ کو پھلانگ کر اندر اترے۔ یہ کسی کا بنگلا نہیں ایک فوجی قبرستان تھا۔ ان دونوں نے نیچے اترتے آس پاس کا جائزہ لیا۔ کہیں کوئی بندہ بشر نہیں تھا۔ خاموشی سے قبروں کی قطاروں کے درمیان سے آگے بڑھنے لگے۔ لمبے شخص نے ایک پھولا ہوا ہینڈل اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ اس کی چال سے گھبراہٹ عیاں تھی۔ وہ بار بار گردن موڑ کر پیچھے دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں ایک پرانی قبر پر پہنچ کر رک گئے۔ قبر پر سفید پتھر کا ایک کتبہ نصب تھا۔ انہوں نے پھاؤڑا اٹھایا اور کتبے کے پیچھے کی نرم زمین کھودنے لگے۔ جب چار فٹ گہرا ایک گڑھا کھود چکے تو اس ہینڈل کو گڑھے میں دفن کر دیا اور زمین برابر کر دی۔

”اگر انہوں نے مجھے مار بھی ڈالا تو میں نہیں بتاؤں گا کہ مال کہاں چھپایا ہے۔“ کوتاہ قامت نے سرگوشی کی۔ ”میں بھی نہیں بتاؤں گا۔“ دوسرے نے یقین دایا۔ پھر وہ جس طرح آئے تھے اسی طرح آٹھ فٹ اونچی باڑ کو پھلانگ کر رات کی تاریکی میں غائب ہو گئے۔

☆.....☆

اس دن ریاست کیل فورنیا کے شہر ہالی ووڈ میں صبح کے

اس طرف پہنچے اور وہاں الٹی گھاس پھاس ہٹائی اور اندر داخل ہو گئے۔ وہاں انہیں چاندی کے سکوں کے چھ بیک ملے۔ اس کے ساتھ ہی ایک فوجی ٹیم بھی ملی جس کی آئین پر MP کڑھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اعشاریہ 45 کا اور اعشاریہ 38 کا ایک آٹومٹک پستول ملا جو بینک کے مینیجر پیرسن اور وکٹر کے تھے۔ ایک اسپورٹ جیکٹ بھی ملا تھا جس سے لاک پیڈ کا شناختی بیج ایک پن کی مدد سے نکلتی تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بیج نمبر جعلی تھا۔ اصلی نمبر کو پھاڑ کر وہ جعلی نمبر سیاہ پینسل سے لکھ کر لگا دیا گیا تھا۔ بہر حال واشنگٹن میں ایف بی آئی کے سائنس دانوں کے پاس وہ بیج بھیج دیئے گئے لیکن اس سے کوئی مدد نہ مل سکی۔ پھر جب اسے ایک الٹرا وائلڈ لیمپ کے نیچے رکھ کر باریک بینی سے مشاہدہ کیا گیا تو سب کچھ واضح ہو گیا اور لاس اینجلس کے ایجنٹ، پلانٹ کا ریکارڈ چیک کرنے پہنچ گئے۔ ملازمین کی فائلوں سے ثابت ہوا کہ وہ نمبر کسی زمانے میں ایک لمبے قد کے ملازم جان جوزف کو دیئے گئے تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ لاک ہیڈ کا ایک ملازم اسٹینل جان جوزف کا سب سے گہرا دوست تھا۔

یہ جوڑی بہت عرصہ پہلے لاک ہیڈ چھوڑ چکی تھی۔ مگر بہت آسانی سے ان کا سراغ لگایا گیا۔ وہ لاس اینجلس میں کیلی فورنیا یونیورسٹی میں جعلی دستاویزات کے ذریعے داخل ہو گئے تھے اور اپنے آپ کو موسم گرما کے طلباء ظاہر کر رہے تھے۔ ان کے ہاسٹل کے کمروں کی تلاشی لی گئی تو واردات میں استعمال ہونے والے متعدد اوزار کے ساتھ ہی اسلر کے گیراج کی چابیاں بھی برآمد ہوئیں مگر وہ دونوں نہیں ملے۔

اب ان کی تلاش کا مسئلہ سامنے تھا۔ انہیں کہاں تلاش کیا جاتا؟ اس کے لیے انہیں ان کے انداز سے سوچنے کی ضرورت تھی۔ غالباً ان دونوں کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ انہوں نے ایک بے داغ واردات کا ارتکاب کیا تھا جس میں کسی قسم کی کوئی خامی نہیں تھی۔ لہذا وہ کچھ عرصہ روپوش رہنے کے بعد جائے واردات پر لوٹے۔ اس لیے ایف بی آئی والوں نے سوچا کہ ان کی تلاش میں دور دراز مقامات پر بھٹکنے کی ضرورت نہیں۔ ریکارڈ سے انہیں ان کی تصویریں بھی مل گئی تھیں۔ چنانچہ وہ انہیں لاس اینجلس کے شراب خانوں کے اطراف میں ڈھونڈنے لگے۔ بالآخر ہمارے دو ایجنٹوں نے اسے ایک شراب خانے میں دیکھ لیا جان جوزف ایک اونچے اسٹول پر بیٹھا شراب کی چسکیاں لے رہا تھا۔ اس نے جیسے ہی شراب کا ایک گھونٹ لینے کے لیے سر نیچے کیا ہمارے ایجنٹوں نے اسے دبوچ لیا۔ اسے بازوؤں

سے اٹھا کر دروازے کے باہر لایا گیا اور پھر اس کا اعشاریہ 45 کا ریولور قبضے میں لے لیا گیا جو بھرا ہوا تھا۔

باہر سڑک پر آ کر وہ چیخنے چلانے اور اپنی مدد کے لیے نکارنے لگا۔ وہ سخت مزاحمت کرنے کے ساتھ ہی اپنے آپ کو پاگل بھی ظاہر کر رہا تھا۔

”آئین کہاں ہے؟“ ایک ایجنٹ نے اس سے پوچھا۔

”بہت عرصے سے اسے نہیں دیکھا ہے۔“ اس نے برملا جواب دیا اور اپنے ہی جواب پر ہکا بکا رہ گیا۔

یہ احساس ہونے کے بعد کہ تیرکمان سے نکل چکا تھا۔ وہ ایک دم سے خاموش ہو گیا۔

اس کے ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں ہم نے اسٹینل کو بھی دبوچ لیا جو اس بار کے آس پاس منڈلا رہا تھا اور مسلح تھا، اگر ہم مستعدی نہ دکھاتے تو وہ یقیناً گولیاں برسائے لگتا۔

ایف بی آئی کے آفس میں ان دونوں نے سارا ملہ ایک فرضی کردار ”بنک“ پر ڈال دیا جو انہوں نے گھڑا تھا۔ بقول ان کے وہ بنک ہی تھا جس نے انہیں بلیک میل کر کے یہ واردات کرنے پر مجبور کیا تھا اور لوٹ کا سارا مال اسی کے پاس ہے۔ وہ ہمیں گمراہ کرنے کے لیے آدھی رات کو بنک کا نام لے کر چیخنے لگا۔ پھر اگلے دن عدالت میں بھی وہ بیج کے سامنے بنک کا نام لے کر چیخا ہوا، وہیں ڈھیر ہو گیا اور اس کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ یہ ایک پرانی چال تھی۔ اس نے صابن کی چھوٹی سی ٹکیہ نگل لی تھی۔

☆.....☆

مقدمہ شروع ہونے سے پہلے ہم کئی مہینے تک انہیں بہلا پھسلا کر ان سے یہ راز اگوانے کی کوشش کرتے رہے کہ انہوں نے لوٹ کی رقم کہاں چھپائی تھی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ان کا یہی موقف تھا کہ صرف بنک ہی کو معلوم ہے کہ رقم کہاں ہے پھر ایک دن جب اس کی کوٹھڑی کی تلاشی لی گئی تو اس کے بیڈ کے نیچے سے پانی سے بھرے ہوئے ایک ڈبے میں ایک ڈالر کا ایک بہت ہی گیلیا نوٹ پانی میں تیرتا ہوا پایا گیا۔ دراصل جان جوزف ایک تجربہ کرنا چاہتا تھا اور اس بچکانہ اور احمقانہ تجربے کا مطلب بالکل سیدھا سادا تھا۔ لوٹ کی رقم کسی ایسی زمین میں دفن کی گئی تھی جو گیلیا تھی اور جان جوزف یہ جاننا چاہتا تھا کہ ایک گیلیا نوٹ کو سڑنے میں کتنا وقت درکار ہوگا۔

اس کے بعد اسٹینل نے اپنی کوٹھڑی سے جس میں وہ قید تہائی بھگت رہا تھا، اپنے شریک جرم جان جوزف کو پیغام بھیجنا شروع کر دیا۔ یہ پیغام جان جوزف تک پہنچ تو جاتے تھے لیکن

اس سے پہلے سیدھے ایف بی آئی والوں کے ہاتھ لگتے۔ وہ بنک کی حیثیت سے یہ پیغامات اپنے مخبروں کے ذریعے جان جوزف تک پہنچاتا تھا لیکن اس کے مخبر وہ پیغام کسی نہ کسی طرح پہلے ایف بی آئی والوں تک نہیں پہنچا دیتے۔ اس طرح انہیں بنک کی اصلیت کا پتا چل گیا۔ انہیں پیغامات کے ذریعے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ خود کو پاگل ظاہر کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے اور یہ بھی کہ اگر انہیں طبی سزا ہوئی تو وہ فرار ہونے کا منصوبہ تشکیل دیں گے۔

انہی پیغامات میں انہیں وہ چیز مل گئی جس کی تلاش تھی۔ یعنی رقم کے معاملے پر تبادلہ خیال۔ بعض پیغامات میں 18 اور پھر کاغذ کا حوالہ دیا گیا تھا اور یہ لکھا گیا تھا اگر ہمیں وفاق کے کسی جیل میں بھیج دیا گیا تو جائزے کی بارش کاغذ کو سڑانے میں دیر نہیں لگائیں گی۔ ایک اور پیغام میں تحریر تھا۔ ”ایک فائدہ یہ ہے کہ میری بہن صرف سترہ سال کی ہے اور یہ لوگ اس پر مقدمہ نہیں چلا سکتے لیکن آخر وہ کس طرح وہاں جائے۔“ اسٹینل نے جالا کی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جگہ کا نام تحریر کرنے سے گریز کیا تھا لیکن اس کے پیغام سے یہ معلوم ہو گیا کہ لوٹ کی رقم کسی گیلیا زمین میں دفن کی گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ کسی سترہ سالہ نوجوان لڑکی تک پہنچنا ہوگا۔

انہوں نے اپنی تلاش کا آغاز کر دیا اور آغاز سائنٹا مونیکا کے پہاڑوں کے دامن میں واقع یونیورسٹی کے کیسپس سے کیا جہاں یہ جوڑی رہتی تھی۔ یہ وہ مقام تھا جو مغربی لاس اینجلس کو لاک ہیڈ پلانٹ سے جدا کرتا تھا۔ چونکہ ان مجرموں نے یہاں داخلہ لیا تھا، لہذا انہوں نے کیسپس میں کھدائی کی اور انہیں کامیابی حاصل ہوئی۔ پھولوں کی کیاری کی کھدائی کے نتیجے میں انہیں پانچ ہزار ڈالر ملے جو ایک ایک ڈالر کے نوٹ کی شکل میں تھے۔ اس رقم کے بارے میں ان دونوں سے پوچھ گچھ کی گئی تو انہوں نے قسم کھا کر کہا کہ باقی رقم بنک لے گیا۔ ایف بی آئی والوں کو یہ بھی معلوم ہوا کہ جان جوزف اور اسٹینل اکثر گھائی سے ہو کر چہل قدمی کے لیے جاتے تھے۔ ایک نقشے سے ان راستوں کی نشاندہی ہو گئی جو پہاڑ کے درختوں کے درمیان سے ہو کر چکر کھاتے ہوئے جاتے تھے۔ ان راستوں پر نمبر لگے ہوئے تھے۔ ایک پر نمبر 18 لکھا ہوا تھا۔ یہ ایک الگ تھلگ اور سنسان روٹ تھا جو کیسپس کے نزدیک سے گھائی کی طرف چلا گیا تھا جہاں بینک کے مینیجر کو بے یار و مددگار چھوڑ کر مجرمان فرار ہو گئے تھے۔ یہ جان کر ان کے رگ و پے میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی کہ وہ منزل کے کتنے قریب پہنچ گئے تھے لیکن

اس کے بعد؟

ایف بی آئی والوں نے ایک بلند مقام سے جو کالج کے ہاسٹل کا مغربی حصہ تھا، معلوم واقعات کو ذہن میں از سر نو ترتیب دینے کی کوشش کرتے ہوئے، پگڈنڈیوں کا سروے کیا اور بانی کام تصور پر چھوڑ دیا۔ ان مجرموں نے یقیناً گھائی کے روٹ 18 پر غز کیا تھا اور لوٹ کی رقم اس گیراج میں رکھنے کے بعد اس پرانی کار کو تقریباً ایک میل دور چھوڑ دیا ہوگا۔ پھر رات میں وہ رقم کسی گیلیا زمین میں دفن کر دی ہوگی۔ ایجنٹوں نے مضافات کا معائنہ کر کے یہ دیکھا کہ صرف ایک راستہ فوجی قبرستان تک جاتا تھا جس کے گرد آٹھ فٹ اونچی باڑھی۔ حالیہ رپورٹ ان کے اس تصور سے بالکل ہم آہنگ تھی۔ کسی قبر کا کتبہ یاد رکھنا آسان ہوتا ہے لیکن ایک لڑکی کے لیے آٹھ فٹ اونچی باڑ کو پھلانگنا ناممکن ہوتا۔

فوجی قبرستان پہنچ کر ایف بی آئی والوں نے لاتعداد قبروں کی لاتعدادی قطاروں کے درمیان اس جگہ کو ڈھونڈنے لگے جہاں لوٹ کی رقم دفن کیے جانے کا امکان تھا۔ یہ ایک انتہائی محنت طلب کام تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ایک ایک قبر کے عقب سے گزرتے ہوئے بالآخر ایک ایسی قبر کے کتبے کے پیچھے پہنچے جس کے مطابق اس فوجی کی وفات 1922ء میں ہوئی تھی۔ کتبے کے عقب میں پتوں کا ایک ڈھیر تھا جس کی کوئی وضاحت نہیں کی جاسکتی تھی۔

ایف بی آئی والوں نے کھدائی شروع کر دی اور جلد ہی ایک چرمی تھیلی اور ایک بیک برآمد کر لیے۔ جب انہیں کھولا گیا تو ایک لاکھ ڈالر کی ہری ہری گڈیاں برآمد ہوئیں۔ بعد میں جان جوزف کو یہ بات بتائی گئی کہ فوجی قبرستان سے لوٹ کی ساری رقم بازیافت کر لی گئی ہے تو اس نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی گئی۔ بالآخر اس نے اقبال جرم کرتے ہوئے سب کچھ اگل دیا۔ اس کے اقبال جرم کی وجہ سے اس کی سزا پینتیس سال سے کم کر کے بیس سال کر دی گئی۔ اس کا شریک جرم اسٹینل شروع میں اپنی بے گناہی کے موقف پر ڈٹا رہا لیکن آخر میں اس نے بھی اقبال جرم کر لیا، لہذا اس کی سزا میں بھی تخفیف کی گئی اور اسے اکیس سال قید کی سزا سنائی گئی۔

1945ء میں ہونے والی اس بینک ڈکیتی کا کیس شاید کبھی نہ حل ہو پاتا لیکن ایک الٹرا وائلڈ لیمپ کی روشنی نے اسے حل کرنے میں مدد کی اس کے ساتھ ہی سختی اور فرض شناس آفیسروں کی استقامت رنگ لائی۔



جنگجو ملکہ

سید احتشام

عالمی پیمانے پر جنگجو ملکہ قلوپطرہ کو کہا جاتا ہے لیکن یہ ملکہ بھی کسی طور گم نہ تھی۔ تاریخ دار اسے "آتش ابریشم" کہتے ہیں۔ خوب صورتی میں سب سے آگے تھی لیکن میدان جنگ میں وہ خونخوار درندہ کی طرح اپنے دشمنوں پر جھپٹتی اور گردن اڑا دیتی۔ اس نے بڑی سے بڑی سلطنت کو للکارہ کیونکہ اسے کتے ہوئے نرخرے سے ابلتا خون دیکھ کر سکون ملتا تھا۔

ایک حسین شیرنی صفت ملکہ کا ذکر

دریائے فرات دو دریاؤں کے مغرب میں واقع ہے جو میسوپوٹامیا (قدیم عراق) کی حد بندی کرتے ہیں۔ دوسرا دریا دجلہ ہے جو دریائے فرات سے مل کر شط العرب، تشکیل دیتا ہوا، خلیج فارس میں جا گرتا ہے۔ "میسوپوٹامیا" ایک یونانی لفظ ہے جس کے معنی دو دریاؤں کے درمیان ہیں۔ یہ بحیرہ روم کے مشرق میں واقع ایک قدیم خطہ تھا جو شمال مشرق میں جبل زاغروس اور جنوب مشرق میں عرب کے سطح مرتفع سے گھرا ہوا تھا۔ اس خطے میں موجودہ عراق کا بیشتر علاقہ اور موجودہ ایران، شام اور ترکی کے کچھ علاقے شامل تھے۔ عرب کے لوگ دجلہ و فرات نیز اس کے درمیان واقع خشکی کو الجزیرہ کہتے تھے جسے بعد میں زرخیز ہلال کہا جانے لگا جہاں میسوپوٹامیا کی تہذیب پروان چڑھی۔

ملکہ شام کے وسط میں عرب کا ایک قدیم شہر پامائرہ ہوا کرتا تھا۔ یہ دمشق کے شمال مشرق میں 215 کلومیٹر (134 میل) اور دریائے فرات کے جنوب مشرق میں 180 کلومیٹر (110 میل) کے فاصلے پر واقع ایک نخلستان ہے۔ یہ قدیم

زمانے میں ایک اہم شہر ہوا کرتا تھا جو عرصہ دراز سے شام کے صحرا کو عبور کرنے والوں کا آخری پڑاؤ تھا۔ اس شہر کی بنیاد دو صدی ق م کے دوران رکھی گئی تھی۔ یہ شہر 1929ء کے آس پاس غیر آباد ہو گیا اور 1980ء میں یونیسکو نے اسے عالمی ثقافتی ورثہ قرار دے دیا۔ یہ آج بھی اپنے عالیشان محلوں کے کھنڈر کے سبب مشہور ہے۔

شہر پامائرہ کو عربی میں Tadmor کہتے ہیں جس کا مطلب ہے، وہ شہر جسے شکست نہیں دیا جاسکتا۔ پامائرہ کے لوگ میسوپوٹامیا، شام، عرب اور یونان کے بے شمار دیویوں اور دیوتاؤں کی پرستش کیا کرتے تھے۔ انہوں نے بہت سی عبادت گاہیں اور یادگاریں تعمیر کیں جو مروجہ دو کو دفنانے یا مردوں کی نمائندگی کرنے کے فن سے تعلق رکھتی ہیں۔ پامائرہ کے لوگ آرامی زبان بولتے تھے لیکن بعد میں یونانی زبان بولنے لگے۔ یہ خطہ ارضی بعد میں رومن امپائر کا ایک حصہ یا صوبہ بن گیا۔ 260 تا 273 ق م کے دوران اوڈنیاٹس اور اس کی بیوی زینوبیہ نے پامائرہ کو سلطنت پامائرہ کے دارالخلافہ کے طور پر استعمال کیا۔ روم کی تاریخ میں اس دور کو تیسری صدی کا بحران کہتے ہیں۔ اسلامی فتوحات کے زمانے میں خلیفہ اول حضرت ابو بکر کے عہد خلافت میں حضرت خالد بن ولید نے پامائرہ فتح کر لیا تھا جس کے بعد سے اس کی اہمیت ایک تجارتی مرکز کی حیثیت سے ہونے لگی اس زمانے میں کئی عربی قبائل پامائرہ میں بستے تھے لیکن سولہویں صدی کے بعد اس شہر نے اپنی اہمیت کھودی اور سلطنت عثمانیہ کے دور میں 1929ء تک یہ شہر مکمل طور پر ویران ہو گیا، آج پامائرہ کے کھنڈر کے قریب ہی جنوب میں اسی نام کا ایک نیا شہر آباد ہے۔

آخری بطلیموسی ملکہ قلوپطرہ سن 30 ق م میں فوت ہوئی تھی۔ بعض تاریخی حوالوں کے مطابق قلوپطرہ نے خود کو ایک زہریلے سانپ سے ڈسوا کر اپنی جان لے لی تھی تاکہ فاتح رومن شہنشاہ آکٹیویس، جو 27 ق م کے بعد آکٹس کہلایا جانے لگا تھا، اپنی عظیم الشان فتح کا جشن منانے کے لیے اسے پابہ جولائے روم کی سڑکوں پر نہ گھمائے، قلوپطرہ کی موت کے تین سو سال بعد مشرق کی ایک اور ملکہ کے نصیب میں شاید یہی لکھا تھا کہ فاتح رومن اسے پابہ سلاسل روم کی سڑکوں پر گھمائیں اس کا جلوس نکالیں، اپنی فتح کا جشن منائیں اور سرعام اس کی تذلیل کریں۔ تاریخ آکٹس کے مطابق فاتح رومن شہنشاہ آریلین نے پامائرہ کی ملکہ زینوبیہ کو گرفتار کر کے اسے سونے کی زنجیروں میں جکڑ کر روم کی سڑکوں اور گلیوں میں گھمایا اور اپنی فتح کا جشن منایا تھا۔ یہ

زینوبیہ کون بھی اور رومنوں نے اس کے ساتھ یہ ذلت آمیز سلوک کیوں کیا تھا۔ اس بارے میں تاریخ سے معلوم کرتے ہیں۔

☆.....☆

زینوبیہ 240 میں پامائرہ (ملکہ شام) میں پیدا ہوئی تھی جو اس زمانے میں روم کا ایک صوبہ ہوا کرتا تھا، زینوبیہ کا پورا نام جولیا آریلین زینوبیہ تھا، لہذا اس اعتبار سے وہ ایک رومن شہری تھی۔ یہ رومن شہریت اس کے باپ کے خاندان کو شاید دوسری صدی کے اواخر میں مارکس اوریلیس کے دور میں دی گئی تھی۔ اس کا باپ اپنا سلسلہ نسب شہنشاہ سپٹیمس کی بیوی جولیا ڈونا سے جوڑتا تھا۔ زینوبیہ کو یونانی اور لاطینی میں تعلیم دی گئی تھی۔ اگرچہ اسے ان میں دشواری پیش آتی تھی لیکن وہ مصری اور آراسی زبان روانی سے بولتی تھی اور مصر کی ملکہ قلوپطرہ سے اپنا سلسلہ نسب جوڑتی تھی، مشہور عربی مؤرخ طبری کے مطابق اس کی پرورش لڑکوں کی طرح ہوئی تھی۔ وہ لڑکوں کے ساتھ کشتی لڑا کرتی تھی۔ جب وہ ایک نوجوان لڑکی تھی تو اسے اپنی فیملی کے ریوڑوں اور گلہ بانوں کا انچارج مقرر کر دیا گیا تھا لہذا وہ مردوں پر حکمرانی کرنے کی عادی ہو گئی تھی۔ طبری کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ وہ شہ سواری میں طاق ہو گئی تھی اور اس میں زبردست ذہنی و جسمانی صلاحیت اور قوت برداشت پیدا ہو گئی تھی جس کے لیے وہ بعد میں مشہور ہوئی۔ یہ بھی ریکارڈ پر ہے کہ وہ اپنی فوج کے ساتھ نہ صرف میلوں پیدل مارچ کر سکتی تھی بلکہ کسی بھی مرد کے مقابلے میں شکار کرنے کی اہل تھی۔ معروف مؤرخ رچرڈ کین اپنی مشہور زمانہ کتاب میں رقم طراز ہے۔

"زینوبیہ شاید تاریخ کی وہ واحد عورت تھی جس کی اعلیٰ ذہانت نے اس غلامانہ خدمت گزاری اور تساہل سے سمجھوتا نہیں کیا جو ایشیا کی آب و ہوا اور وہاں کے طرز معاشرت نے عورتوں پر مسلط کر رکھی تھی۔ اپنا سلسلہ نسب مصر کی ملکہ قلوپطرہ سے جوڑنے والی زینوبیہ جسے تاریخ میں قلوپطرہ ثانی کہا جاتا ہے حسن میں قلوپطرہ کے ہم پلہ اور پاکدامنی اور شجاعت میں اس سے بہت بڑھ کر تھی۔ ایک عرب بیچ کے گھر میں پیدا ہونے والی یہ غیر معمولی لڑکی انتہائی پرکشش اور خوش جمال ہونے کے علاوہ نہایت دلیر واقع ہوئی تھی۔ اس کی رنگت سانولی تھی اور اس کے دانت اتنے سفید اور چمکدار تھے کہ ان پر سچے حوتیوں کا گمان ہوتا تھا۔ اس کی آواز دنگ اور شیریں تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک بہت ہی ہمدرد اور شفیق خاتون تھی۔ وہ لاطینی

زبان سے ناواقف نہیں تھی بلکہ اس میں اتنی ہی طاق تھی جتنا یونانی، مصری اور شاہی زبانوں میں۔ اس نے تیسری صدی کے مشہور و معروف فلسفی لائیکس کے آگے زانوئے تلمذ کیا تھا جس نے اسے اعلیٰ و ارفع زبان دانی کے ساتھ ہی ہومر اور افلاطون کے فلسفے کی تعلیم دی تھی۔ وہ مشرق کی تاریخ سے کماحقہ واقفیت

رکھتی تھی۔“

عربی ذرائع بھی جو تعصب کی بنیاد پر اس کی شجاعت اور دلیری کا ذکر کم اور چالاک اور منصوبہ سازی کا ذکر زیادہ کرتے ہیں، اسے ایک قابل ذکر ملکہ ضرور گردانتے ہیں۔ دوسری طرف روس کی ملکہ کیتھرائن، زینوبیہ کی شجاعت اور ذہانت کی معترف تھی اور اس خواہش کا اظہار کرتی تھی کہ کاش وہ زینوبیہ ہوتی۔ قدیم تاریخ میں جہاں اس کی دیگر خصوصیات بار بار دہرائی گئی ہیں وہیں اس کے پاک دامن اور باعصمت ہونے کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

☆.....☆

زینوبیہ کی شادی اٹھارہ سال کی عمر میں 258ء میں ملک شام کے رومن گورنر کوکیتی سکچس اوڈیناٹس سے ہوئی تھی جس سے اس کا بیٹا وبلٹس تھا۔ زینوبیہ اوڈیناٹس کی دوسری بیوی تھی، پہلی بیوی سے اس کا ایک بیٹا اور وارث ہیروڈس تھا اوڈیناٹس ایک نہایت خوش حال، معاشی اعتبار سے مستحکم اور پھلتے پھولتے ہوئے خطے بالخصوص پامائہ پر حکومت کرتا تھا جو مشرق اور مغرب کے درمیان واقع شاہراہ ریشم پر واقع ایک اہم تجارتی مرکز ہوا کرتا تھا۔ روم جانے والے یا وہاں سے آنے والے سوداگروں کو ٹیکس ادا کرنے یا محض آرام کرنے کے لیے پامائہ میں رکتا پڑتا تھا لیکن 227ء کے آس پاس ملک فارس کے ساسانی ٹیکس لگانے کے بہانے آئے دن اس روٹ کو ہلاک کر دیا کرتے تھے۔ ریشم روم میں بے حد مقبول تھا، جو ملک چین سے وہاں پہنچتا تھا، لہذا روم کے لوگ اور سوداگران بھی تجارت میں آئے دن کی اس رکاوٹ سے سخت نالاں تھے۔ اسی دوران ساسانی بادشاہ شاپور اول نے موجودہ ترکی کے شہر اینٹیوک پر قبضہ کر لیا جو اس زمانے میں صوبہ شام کا پایہ تخت ہوا کرتا تھا۔ یہ روم کا ایک انتہائی اہم تجارتی مرکز تھا اور شاپور کی یہ حرکت روم کے لیے ناقابل برداشت تھی۔

260ء میں رومن شہنشاہ ویلمیرین نے ساسانیوں پر حملہ کر دیا لیکن اسے شکست ہوئی اور ساسانیوں نے اسے قید کر دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شاپور اس کی پیٹ پر پیر رکھ کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا کرتا تھا۔ اسی قید و بند کے دوران ویلمیرین کی موت واقع ہو گئی اور شاپور نے اس کی لاش میں بھروسہ کر کے چوک پر نمائش کے لیے رکھ دیا۔ ویلمیرین کا بیٹا کیلیئس اس صورت حال سے نمٹنے سے قاصر تھا چنانچہ اوڈیناٹس نے ساسانیوں کو مزہ چکھانے کے لیے اپنی فوج کو حرکت دی۔ اس کا یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ شاپور کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اوڈیناٹس

نے اسے شکست فاش دی اور دریائے فرات عبور کر کے اس کی فوج کو کھد یڑتا ہوا ملک شام سے بھی اکھاڑ پھینکا۔ اگرچہ اوڈیناٹس نے اپنے آپ کو روم کا وفادار ظاہر کرنے کے لیے روم کے مفاد میں ویلمیرین کو بچانے کی کوشش کی تھی لیکن مورخین کے خیال میں اس کے دیگر محرکات تھے۔ درحقیقت اس نے شاپور کے ساتھ اتحاد تشکیل دینے کی کوشش کی تھی جسے شاپور نے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا اور اسی وجہ سے اوڈیناٹس اس کا دشمن ہو گیا تھا لیکن جب ہم شاپور کی شرائط کی کو دیکھتے ہیں تو اوڈیناٹس اپنے حملے میں حق بجانب نظر آتا ہے۔

اوڈیناٹس نے روم کی جو خدمات انجام دی تھیں اس کے عوض اسے سلطنت روم کے مشرقی حصے کا گورنر بنا دیا گیا تھا۔ 261ء میں جب غاصب کرانٹس نے کیلیئس کی حکمرانی کو چیلنج کیا تو اوڈیناٹس نے اسے شکست دی اور ہلاک کر دیا۔ اس واقعے کے بعد اسے اتنی عزت اور طاقت حاصل ہو گئی کہ وہ روم سے تقریباً آزاد اپنی مملکت پر موثر طریقے سے حکومت کر سکتا تھا۔ 266/67ء میں ایک شکار کے دورے کے بعد ایک تنازعہ میں اس کے بھتیجے نے اسے اور اس کے بیٹے ہیروڈی کو ہلاک کر دیا۔ بعض ذرائع کا دعویٰ ہے کہ انہیں زینوبیہ نے قتل کروایا تھا تا کہ اس کا بیٹا وبلٹس بادشاہ بن جائے لیکن بعد کے مورخین نے اسے دعوے کو مسترد کر دیا۔ ان کے مطابق خود شہنشاہ کیلیئس اوڈیناٹس کے قتل کا ذمہ دار تھا۔

زینوبیہ کا بیٹا وبلٹس چونکہ ابھی چھوٹا تھا، لہذا زینوبیہ سلطنت کی والی بن گئی اور اس نے سلطنت کی باگ ڈور سنبھال لی۔ اس نے اپنے دربار میں فلسفیوں اور دانشوروں کو اکٹھا کر لیا جن میں اس کا استاد کیلیئس بھی شامل تھا جس پر بعد میں یہ الزام لگایا گیا کہ اس نے زینوبیہ کو روم سے ناپٹھ توڑنے پر اکسایا تھا۔ اب تک پامائہ اور روم کے درمیان تعلقات کمزور ہو چکے تھے کیونکہ اوڈیناٹس کی فوج کشی جتنا روم کے حق میں تھی اتنا ہی خود اس کے حق میں بھی تھی۔

زینوبیہ نے اقتدار سنبھالنے کے بعد اپنے شوہر کی پالیسیاں جاری رکھیں۔ روم میں پھیلی ہوئی بد امنی اور انتشار کے دوران جس نے تیسری صدی کے بحران کے خدو خال نمایاں کیے، چھپیں شہنشاہ آئے تھے اور یکے بعد دیگرے قتل کر دیئے گئے تھے۔ اوڈیناٹس نے بھی شاید یہ سوچا ہوگا کہ وہ ساسانیوں کے شہروں میں لوٹ مار کر کے اپنے لیے دولت کے انبار لگا کر اور کیلیئس پر اپنی اہلیت اور قدرو قیمت ثابت کر کے اگلا شہنشاہ بن سکتا تھا۔ زینوبیہ نے بھی شاید اس کی موت کے بعد یہی سوچا

ہوگا کہ اس کا بیٹا یا وہ خود روم پر حکمرانی کر سکتی ہے چنانچہ وہ اپنے شوہر کی مملکت کو اسی طرح چلانے لگی جس طرح وہ چلایا کرتا تھا۔

268ء میں کیلیئس کا قتل ہو گیا اور کلاؤکیس روم تخت نشین ہوا لیکن وہ کچھ ہی عرصے کے بعد بخار میں مبتلا ہو کر چل بسا اور 270ء میں کوئنٹیس سریر آرا ہوا۔ اس دوران زینوبیہ نے یہ دیکھ کر کہ روم اپنے گونا گوں مسائل میں اسی قدر الجھا ہوا تھا کہ اسے اس کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں تھی، اس نے جنرل ذبڈاس کو فوج کا سربراہ بنا کر رومن مصر بھیج دیا تا کہ وہ اس پر اپنا ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ تاہم وہ اس معاملے میں بہت محتاط تھی۔ وہ روم کے ساتھ محاذ آرائی نہیں چاہتی تھی۔ اسی دوران ایک شامی مصری تیا جینیئس نے رومن امپائر کے خلاف ایک ایسے وقت میں بغاوت کر دی جب روم کا گورنر کسی مہم پر گیا ہوا تھا۔ ایسی صورت میں زینوبیہ کی مصر کی جانب پیش قدمی کو روم کے مفاد میں تصور کیا جاسکتا تھا لیکن ایسا لگتا ہے کہ تیا جینیئس، زینوبیہ کا آلہ کار تھا جسے اس نے وقت سے پہلے فوج کشی کا ایک بہانہ بنا کر بھیجا تھا۔ شامی پہلے پہل تو اپنی بغاوت میں کامیاب رہے لیکن جلد ہی روم کی فوج نے جو اپنی مہم سے واپس آ رہی تھی، انہیں مصر سے باہر نکال دیا لیکن وہ اس پر بھی مطمئن نہ تھی، لہذا اس نے سرحد کے پار اور شام کے شمالی حدود تک ان باغیوں کا پیچھا کیا جہاں شامی باغیوں نے اچانک پلٹ کر ان پر جوابی حملہ کر دیا، رومن فوج کے لیے یہ جوابی حملہ قطعی غیر متوقع تھا لہذا وہ اپنا دفاع نہ کر سکی۔ شامی باغیوں نے رومن فوجیوں کو بڑی تعداد میں قتل کر دیا۔

269ء میں زینوبیہ نے مصر کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد اس نے یونان سے لے کر مصر تک کے ساحلی علاقوں کو جن میں ترکی، شام، لبنان شامل تھے اور ایشیائے کوچک کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ روم میں بد امنی، بھوک و افلاس، بد حالی اور طوائف الملوکی بدستور عروج پر تھی، لہذا خوش حال اور دولت مند پامائین امپائر کا انتخاب ان علاقوں کے صوبائی حکمرانوں کے لیے بہت پرکشش ہو گیا تھا اور چونکہ روم اپنے اندرونی خلفشار اور اختلافات نیز بیرونی حملہ آوروں سے نمٹنے میں بری طرح الجھا ہوا تھا، لہذا اسے زینوبیہ کی پھلتی ہوئی سلطنت پر توجہ دینے کی یا تو فرصت نہیں تھی یا پھر ہمت نہیں تھی۔ اگرچہ یہ بالکل واضح تھا کہ زینوبیہ روم کے مقابلے میں اپنی سلطنت قائم کر رہی تھی تاہم اس نے رومن امپائر کے سامنے ٹھل کر آنے سے گریز کیا اور رفتہ رفتہ غیر محسوس طریقے سے اپنی سلطنت کو رومن

امپائر سے الگ کرنے کی راہ پر گامزن ہو گئی۔

☆.....☆

اس وقت تک آریلیین روم کا شہنشاہ بن چکا تھا۔ زینوبیہ نے ایسے سکے بنوائے جن پر ایک طرف وبلٹس اور دوسری طرف آریلیین کی شبیہ کندہ تھی جس سے ان دونوں کی مصر پر مشترکہ حکمرانی کو ظاہر کرنا مقصود تھا۔ اس نے پامائہ وہی آریلیین کے نقش کندہ کر کے رکھوائے نیز سرکاری خط و کتابت میں اس کا نام شامل کیا تاہم ایسے ہی وقت میں اس وبلٹس کے لیے آکٹس اور اپنے لیے آگٹا کے شاہی القاب اپنائے جس کا استحقاق صرف روم کے شاہی خاندان کو حاصل تھا۔ اس نے ساسانی فارسیوں (ایرانوں) سے گفت و شنید کر کے تجارتی معاہدے کیے اور روم سے صلاح و مشورہ حتیٰ کہ روم کے مفاد کا خیال رکھے بغیر مزید علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ 271ء تک وہ ایک وسیع و عریض سلطنت پر حکمرانی کرنے لگی تھی جو دور حاضر کے پورے عراق اور شام سے لے کر ترکی، مصر اور یونان تک پھیلی ہوئی تھی، گویا روم کے بعد رومے زمین پر دوسری سب سے بڑی فوجی طاقت بن چکی تھی۔

اگرچہ دوسرے رومن شہنشاہ اس طرف توجہ دینے سے قاصر تھے کہ زینوبیہ کیا کر رہی ہے یا پھر ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ وہ اس معاملے میں کوئی قدم اٹھاتے لیکن آریلیین ایک بہت ہی مختلف قسم کا حکمران تھا۔ وہ ایک معمولی سپاہی سے جنرل کے عہدے تک پہنچا تھا اور اب وہ روم کا شہنشاہ تھا جسے فوج نے منتخب کر کے تخت پر نہیں بٹھایا تھا جیسا کہ اس دور میں ہوتا رہا تھا۔ وہ پہلے ایک سپاہی اور بعد میں سیاست داں تھا۔ جب اس نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی تھی تو پہلے اسے وحشی اور جنگجو جرمن قبائل وینڈس، المانی اور گوٹس سے جنگ کر کے انہیں شکست دینی پڑی تھی۔ 272ء تک وہ ان سے نمٹ کر زینوبیہ سے مشرقی صوبوں کو واپس لینے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس نے کسی ایسی یا نمائندے کو خط کے ساتھ زینوبیہ کے پاس بھیجا اور نہ ہی اس سے کوئی وضاحت طلب کی نہ ہی اس نے زینوبیہ کی طرف سے کسی جواب کا انتظار کیا بلکہ اپنی پوری فوج کے ساتھ پامائین امپائر کی طرف پیش قدمی کرنے لگا۔

اس نے ایشیائے کوچک پہنچ کر ان تمام قصبوں اور شہروں کو تخت و تاراج کر دیا جو زینوبیہ کے حامی اور وفادار سمجھے جاتے تھے۔ اس پیش قدمی کے دوران وہ جگہ جگہ ڈاکوؤں کے حملوں کو پسپا کرتا ہوا تیا نا پہنچ گیا جو مشہور فلسفی اپولونیئس کا آبائی

ہیٹ اسٹروک: علامات و احتیاطی تدابیر

تحریر: ہومیو ڈاکٹر و حکیم محمد عرفان روق کوندل

ہیٹ اسٹروک (الوگنا کیا ہے): زیادہ دیر تک گرمی کے سامنے رہنا، براہ راست دھوپ میں کام کرنا اور جس والی جگہ پر رہنے سے جسم کا قدرتی درجہ حرارت متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ انسانی جسم کا ایسی صورت حال کو برداشت نہ کر پانا ہیٹ اسٹروک یعنی لوگ جانے کا باعث بنتا ہے۔ انسانی جلد شدید گرم اور خشکی کا شکار ہو جاتی ہے۔

الوگنا ہیٹ اسٹروک کی علامات: بہت زیادہ پیاس لگنا، وقفے وقفے سے بے ہوشی طاری ہونا، سر درد کرنا، چکر آنا، جسم میں کمزوری اور نقاہت کا شدید احساس، اعصاب میں کھنچاؤ کی کیفیت کا پیدا ہونا، جلد کا گرم اور سرخ ہونے کے ساتھ خشک ہو جانا، الٹی اور متلی کی شکایت ہونا، شدید صورت حال میں سانس کا متاثر ہونا۔

الوگنا ہیٹ اسٹروک سے محفوظ رہنے کی احتیاطی تدابیر: گھر سے باہر کم سے کم جائیں۔ سایہ دار جگہوں پر رہیں۔ چائے، کافی، کولڈ ڈرنکس کا استعمال نہ کریں۔ دل کو طاقت اور ٹھنڈک پہنچانے والی جڑی بوٹیاں جیسے صندل، گلاب وغیرہ کے عرقیات سے تیار کردہ شربت کا استعمال معمول بنائیں۔ گھر سے باہر نکلیں تو سر کو ڈھانپ کر رکھیں۔ شارٹس پہننے سے گریز کریں اور کپڑے لمبی آستینوں والے پہنیں۔ متاثرہ شخص کو فوری طور پر ٹھنڈی اور ہوادار جگہ پر منتقل کریں۔ ہلکے رنگوں والے اور ڈھیلے دھالے لباس زیب تن کریں۔ گرمی سے فوراً ٹھنڈی طرف اور ٹھنڈے فوراً گرمی کی طرف نہ جائیں۔ چھوٹے بچوں کا خاص طور سے خیال رکھیں اور وقفے وقفے سے پانی پلاتے رہیں۔ طلبہ و

طالبات اسکول سے واپسی پر سر پر گیلیا کپڑا رکھیں اور چھتری کا استعمال لازمی کریں۔

قرشی جام شیریں ٹھنڈک پہنچائے گرمی بھگائے: جیسا کہ مضمون میں درج ہے کہ ہیٹ اسٹروک کی صورت میں لیکونڈ (پانی والی چیزوں) کا استعمال کریں اور ایسے قدرتی جڑی بوٹیوں کے عرقیات سے تیار کردہ مشروبات کا استعمال کریں جو نہ صرف گرمی میں ٹھنڈک کا احساس دیں بلکہ بے چینی، گھبراہٹ کو دور کر کے فرحت، تسکین اور سرد تازگی کا بھی باعث بنیں۔ قرشی نے آپ کے ان تمام مسائل کو فوری طور پر حل کر دیا ہے۔ جام شیریں قرشی کا ہر دلعزیز مشروب نہ صرف پاکستان میں بلکہ پاکستان سے باہر بھی ہر کسی کا پسندیدہ ہے۔ جام شیریں صندل، گلاب، آشنہ اور خس کے عرقیات سے تیار کیا جاتا ہے۔ جو انسانی جسم اور صحت پر فرحت بخش اثرات مرتب کرتے ہیں۔ جام شیریں کو اعلیٰ ترین مشینری پر جدید ترین طبی اصولوں کے مطابق تیار کیا جاتا ہے نیز اس کی تیاری میں 265 کو ایلٹی ٹیسٹ کیے جاتے ہیں تاکہ اس کے معیار میں کسی بھی طرح کی کمی واقع نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دس میں سے چھ فروخت ہونے والی بوتلیں قرشی جام شیریں کی ہوتی ہیں۔

قرشی جام شیریں کے استعمالات: قرشی جام شیریں جو سارا سال استعمال ہوتا ہے اسے ضرورت اور موقع کی مناسبت سے مختلف طریقوں سے پیا جاسکتا ہے۔ ذیل میں اس کے استعمال کے چند طریقے درج ہیں۔

☆ ٹھنڈا جام شیریں شربت دودھ کے ساتھ ☆ ٹھنڈا جام شیریں لیموں کے ساتھ۔

☆ ایسے بچے جو دودھ پینے سے منہ چراتے ہیں ان کے لیے قرشی کا جام شیریں انتہائی اہم انتخاب ہے۔ مائیں اپنے بچوں کو دودھ میں جام شیریں ڈال کر پلائیں بچے اسے بڑے شوق اور مزے سے پیتے ہیں۔

لیکن یہ دراصل آریلیں کی ایک زبردست جنگی چال تھی۔ رومنوں کی صفوں میں بے ترتیبی پھیل گئی تھی اور وہ بگٹ بھاگ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر زیڈاس جوش و جذبے سے بھر گیا۔ اسے اپنی آواز اور کامرانی کا یقین ہو گیا۔ اس نے اپنی فوج کو ان کا پیچھا کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ پامائرین فوج رومنوں کا پیچھا کرنے لگی۔ یہ تعاقب خاصا طویل ہوتا چلا گیا لیکن زیڈاس کی فوج کو اپنے وزنی زرہ بکتر پر فخر تھا اور فخر کا یہ تقاضا تھا کہ دشمنوں کا تعاقب جاری رکھا جائے۔ اس طویل تعاقب کے دوران گرمی کی شدت سے ان کا وزنی زرہ بکتر ان کے لیے وبال جان بن گیا۔ وہ رومن فوج کا تعاقب کر رہے تھے اور آگ برساتا ہوا سورج ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس کی نیش نے انہیں بے حال کر دیا تھا۔ وہ تھکن سے چور تھے پھر بھی تعاقب جاری رکھنے پر مجبور تھے۔

آریلیں کی فوج پیشگی منصوبہ بندی کے تحت ایک خاص مقام پر پہنچ کر رک گئی اور جب پامائرین فوج وہاں پہنچی تو رومن فوج اچانک پلٹ کر پوری فوت سے ان پر ٹوٹ پڑی۔ زیڈاس کی تھکی ہوئی فوج اس کی حالت میں اس اچانک جوابی حملے سے ہکا بکا رہ گئی۔ اس میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ وہ اپنے آپ کو سنبھال پاتی۔ آریلیں کی یہ جنگی چال ان کے لیے انتہائی

کرنے پر مجبور ہو گیا۔ زیڈاس کو رومنوں پر دو طرح سے برتری حاصل تھی۔ ایک تو اس کے گھڑ سوار اور گھوڑے بھاری بھر کم زرہ بکتر پوش تھے جب کہ آریلیں کی فوج کے جسم پر ہلکا پھلکا زرہ تھا۔ دوسرے یہ کہ سورج آگ برساتا رہا تھا اور زیڈاس اچھی طرح جانتا تھا کہ رومن اس شدید گرمی کے عادی نہیں تھے۔ یہ تپش اور حدت ان کے لیے ناقابل برداشت ہوگی۔ آریلیں کو اپنی کمزوریوں کا بخوبی علم تھا، لہذا وہ پہلے ہی اپنی کمزوریوں کو طاقت اور زیڈاس کی برتری کو اس کی کمزوری میں بدلنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

روایتی جنگ کے مطابق پہلے تو چھوٹے چھوٹے متحارب گروہوں کو لڑنے کا موقع دیا گیا۔ پھر زیڈاس نے اپنے شہ سواروں کو رومن فوج پر حملے کا حکم دیا تاکہ آریلیں اپنے شہ سواروں کے ساتھ اپنا دفاع کر سکے، دونوں طرف سے فوجیں گویا ہوا کے دوش پر سوار ایک دوسرے کی طرف لپکیں لیکن اس سے پہلے کہ وہ ایک دوسرے کی صفوں میں داخل ہوتیں اور گھمسان کارن پڑتا، اچانک ایک عجیب و غریب منظر دیکھنے میں آیا۔ رومنوں نے اپنے گھوڑوں کو تیزی سے موڑ لیا۔ انہوں نے پسپائی اختیار کر لی تھی اور میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے تھے

ماہنامہ میرگزشت

گئے تھے۔ آریلیں کی اس مہم کے آغاز میں زینوبیہ کو تحریر کیے جانے والے خطوط بھی من گھڑت اور جعلی تصور کیے جاتے ہیں جن میں آریلیں نے اس سے ہتھیار ڈالنے کا مطالبہ کیا تھا اور زینوبیہ نے نہایت نخوت سے اس کا جواب دیا تھا۔ ان خطوط سے آریلیں کی رحم دلی اور زینوبیہ کی رعونت کو اجاگر کرنا مقصود تھا۔ ایسے میں کہ جب آریلیں کی پیش قدمی جاری تھی، زینوبیہ اطلاع پا کر اپنی فوج کو اکٹھا کر چکی تھی۔ 272ء میں یہ دونوں فوجیں شہر ڈیفنسی کے باہر ایک مقام ایمائے میں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہو گئیں۔ یہ تاریخ میں جنگ ایمائے کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مقام دور حاضر کے ترکی کے شہر انتبوک کے نزدیک واقع تھا جو جنگ کے لیے آئیڈیل مانا جاتا تھا۔ زینوبیہ اس وقت انتبوک میں تھی۔ ادھر میدان جنگ میں اس کے سپہ سالار زیڈاس کو اپنے بھاری بھر کم زرہ بکتر پوش گھوڑوں اور گھڑ سواروں اور پیادہ فوج پر مکمل بھروسہ تھا۔ اس نے اپنے گھڑ سوار دستوں کو میمنہ اور میسرما میں کچھ اس طرح صف آرا کیا تھا کہ وہ حملہ کرنے کی بہترین پوزیشن میں تھے جب کہ پیادہ فوج وسط میں تھی۔ جب آریلیں اپنی فوج لے کر وہاں پہنچا تو صورت حال کچھ ایسی تھی کہ وہ دفاعی پوزیشن اختیار

مقام تھا اور زینوبیہ جس کی عقیدت مند تھی۔ تیاننا پہنچنے پر اس نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ اپولونیس اس کے پاس آیا اور اس نے آریلیں کو مشورہ دیا کہ اگر وہ فتح حاصل کرنا چاہتا ہے تو زینوبیہ سے رحم دلی سے پیش آئے۔ چنانچہ کاریلیں تیاننا کو جوں کا توں چھوڑ کر وہاں سے کوچ کر گیا۔ یہ رحم دلی بہت ہی عمدہ پالیسی ثابت ہوئی کیونکہ وہ دوسرے شہروں میں جہاں بھی گیا وہاں کے لوگوں نے یہ سوچ کر کوئی مزاحمت نہیں کی کہ شہنشاہ کے غیض و غضب کو دعوت دینے اور اس کا شکار ہونے سے بہتر ہے کہ بے چوں و چرا اس کے آگے ہتھیار ڈال دیئے جائیں کیونکہ وہ ایک رحم دل انسان ہے۔ چنانچہ کسی بھی شہر نے اس کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھائے بلکہ اس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی خیر سگالی اور تابعداری کے پیغام بھیجنے لگے اور اس طرح آریلیں کی مزاحمت کا سامنا کیے بغیر جلد ہی ملک شام پہنچ گیا۔

☆.....☆

آیا زینوبیہ نے آریلیں سے اس سے پہلے کوئی رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی یا نہیں، اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ آریلیں کے پامائرہ پہنچنے پر ایسے خطوط کے بارے میں رپورٹس ملتی ہیں لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ وہ خطوط بعد میں لکھے

ماہنامہ میرگزشت

تباہ کن ثابت ہوئی۔ رومن انہیں بے دریغ قتل کرنے لگے۔ میدان لاشوں سے پٹ گیا۔ صرف چند شہسوار ہی اپنی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو سکے۔

اپنے شہسواروں کی تباہی و بربادی کی خبر جب زیڈاس تک پہنچی تو وہ سمجھ گیا کہ اس کی پیادہ فوج کا ان سخت کوش اور جری رومنوں سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی فوج کو انتہوک تک پسپا ہونے کا حکم دے دیا۔ ملکہ زینوبیہ اور زیڈاس نے یہ دیکھ کر کہ اب انتہوک کا سقوط ہو کر رہے گا، اپنی فوج کو کمک پہنچائی اور رات کی تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سب کو انتہوک سے نکال کر ایسپیا (حمص) پہنچا دیا جو دمشق سے ایک سو ایک میل کے فاصلے پر واقع مغربی شام کا ایک شہر تھا (اور ہے)۔

آریلیں پامائین فوج کا قتل عام کرنے کے بعد حمص پر حملہ آور ہوا جہاں ملکہ زینوبیہ اور زیڈاس اپنی فوج کے ساتھ اکٹھا ہوئے تھے۔ یہاں بھی آریلیں نے وہی جنگی چال چلی جو وہ پہلے بھی چل چکا تھا لیکن اس دفعہ ایک اضافے کے ساتھ اس نے اپنی پیادہ فوج کو دشمنوں سے لڑنے کے لیے لکڑی کے موٹے موٹے مضبوط ڈنڈے دے دیئے تھے۔ پامائین فوج کو ان ڈنڈوں سے لڑنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا، لہذا وہ اپنا دفاع کرنے میں سخت ناکام رہی اور اسے عبرتناک شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ آریلیں نے ان سب کو قتل کر دیا۔ زیڈاس کے بارے میں بھی یہی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بھی اس حملے میں مارا گیا تھا کیونکہ اس واقعے کے بعد تاریخ میں کہیں بھی اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے لیکن زینوبیہ وہاں سے پامائین فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ آریلیں نے حمص میں ملکہ زینوبیہ کا خزانہ لوٹنے کے بعد اس کا تعاقب کیا لیکن جب وہ پامائین پہنچا تو زینوبیہ اپنے بیٹے کے ساتھ شہر سے پھر فرار ہو چکی تھی۔ اس نے آریلیں کو ایک بار پھر غچہ دے دیا تھا۔

☆.....☆

زینوبیہ ساسانیوں (ایرانیوں) کی طرف سے مدد کی امید کر رہی تھی لیکن جب کوئی مدد نہیں پہنچی تو ملکہ زینوبیہ اور اس کا بیٹا ایک انتہائی تیز رفتار اونٹنی پر سوار ہو کر ساسان فرار ہو گئے جب کہ مورخین نے اس بات کو مسترد کر دیا ہے کہ زینوبیہ ساسانیوں سے مدد کی امید کر رہی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ پروپیگنڈا آریلیں نے کیا تھا تاکہ عوام کو زینوبیہ کی طرف سے بدگمان کیا جاسکے کہ وہ روم کے سب سے بڑے دشمن سے مدد مانگ رہی تھی۔ بہر حال جب ملکہ زینوبیہ اور اس کا بیٹا دریائے

فراط عبور کرنے کی کوشش کر رہے تھے تو آریلیں وہاں پہنچ گیا اور اس نے انہیں گرفتار کر لیا۔ اس واقعے کے بعد زینوبیہ کے ساتھ کیا پیش آیا یہ ایک سرستہ راز ہے جس پر سے آج تک پردہ نہیں اٹھایا جاسکا۔

☆.....☆

یہ حیرت کا مقام ہے کہ تاریخ ایک عظیم الشان ملکہ کے انجام سے بے خبر ہے جو غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل تھی۔ بہت سے مورخین نے اس واقعہ پر اپنے اپنے طور پر اظہار خیال کیا ہے۔ بعض ذرائع کا کہنا ہے کہ زینوبیہ اور بلاطیس کو جب روم واپس لایا جا رہا تھا تو وہ دریائے باسنورس (ترکی) میں ڈوب گئے جب کہ دیگر ذرائع کے مطابق زینوبیہ کو روم واپس لایا گیا اور آریلیں نے اسے سونے کی زنجیروں میں جکڑ کر روم کی سڑکوں پر گھمایا اور یوں اپنی فتح کا جشن منایا۔ اس کے بعد اسے روم میں دریائے ٹائبر کے قریب رہنے کے لیے ایک حویلی دے دی گئی تھی لیکن کچھ ذرائع کے مطابق زینوبیہ کو بے شک روم واپس لایا گیا تھا لیکن جلوس کی شکل میں اسے روم کی سڑکوں پر ہرگز نہیں گھمایا گیا تھا بلکہ اس نے ایک دولت مند رومن شہری سے شادی کر لی تھی۔ زینوبیہ کے انجام سے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن جو قدیم تاریخی حقائق اکٹھا کیے گئے ہیں ان کے مطابق زینوبیہ کو بالآخر گرفتار کر لیا گیا تھا، اسے آریلیں کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور واپس روم لایا گیا تھا۔ جہاں تک اسے سونے کی زنجیروں میں جکڑ کر روم کی سڑکوں پر گھمانے کا تعلق ہے یہ سراسر لغو اور من گھڑت ہے۔ یہ داستانیں بعد میں گھڑی گئی تھیں۔ آریلیں، زینوبیہ کی کم سے کم تشہیر چاہتا تھا کیونکہ یہ امر خود اس کے لیے بڑی سبکی اور شرمندگی کا باعث تھا کہ اسے ایک عورت کو زیر کرنے کے لیے اتنی زیادہ محنت کرنی پڑی تھی۔ تاہم تمام ذرائع اس بات پر متفق ہیں کہ اس کی گرفتاری اور اسے واپس روم لائے جانے کی تفصیلات کچھ بھی رہی ہوں، اس نے ایک دولت مند رومن شہری یا سینئر سے شادی کر لی تھی اور بقیہ زندگی اپنے بچوں کے ساتھ دریائے ٹائبر کے کنارے اپنی حویلی میں گزار دی تھی جب کہ بیشتر مورخین اور جدید اسکالرز کا اس بات پر اتفاق ہے کہ 274ء میں آریلیں کے جشن فتح کے موقع پر زینوبیہ کا جلوس نکالا گیا تھا لیکن مورخ زوسیمس واحد ذریعہ تھا جس کے مطابق ملکہ زینوبیہ روم پہنچنے سے پہلے ہی فوت ہو چکی تھی۔ وہ اس سفر کے دوران بیمار پڑ گئی تھی کیونکہ وہ فاقے کرنے لگی تھی اور اسی حالت میں وہ موت کی بانہوں میں چلی گئی۔ بعض ذرائع کے مطابق اس نے

جولائی 2018ء

110

ماہنامہ سپرگزشت

روم واپسی کے سفر کے دوران زہر کھالیا تھا۔ صرف ایک مورخ ملا لاس کا بیان ہے کہ آریلیں نے زینوبیہ کا سر قلم کر دیا تھا جب کہ دیگر مورخین کا کہنا ہے کہ آریلیں نے اسے بخش دیا تھا۔ تاریخ کے مطابق ملکہ زینوبیہ 274ء کے بعد اپنی حویلی میں وفات پا گئی تھی۔ اس وقت اس کی عمر صرف چونتیس سال تھی لیکن اس کی موت کا کوئی سبب بیان نہیں کیا گیا ہے۔

☆.....☆

الم ناک انجام سے قطع نظر زینوبیہ کی زندگی قدیم تاریخ میں بلاشبہ نہایت اہمیت کی حامل اور رنگ رنگ ہے۔ چودھویں صدی کے آغاز سے اب تک اس پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں، نظمیں لکھی گئی ہیں اور ہالی ووڈ میں فلمیں بنائی گئی ہیں۔ وہ ایک نہایت دنگ ملکہ تھی۔ شکار میں مہارت کا یہ عالم تھا کہ وہ تیر کمان سے شیروں کا شکار کیا کرتی تھی۔ وہ نہ صرف بلا کی شہسوار تھی بلکہ امن میں ملک چلانے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ یہ اس کی ذہانت اور دلیری کا بین ثبوت ہے کہ اس نے 267ء میں پامائین کی حکومت کی باگ ڈور سنبھالی، 269ء میں وہ مصر پر حملہ آور ہوئی اور اس نے اسے فتح کر لیا۔ اس کے بعد وہ اپنی سلطنت کو پھیلاتی چلی گئی۔ اس نے مصر کے علاوہ یونان سے لے کر ترکی، شام، عراق، لبنان گویا پورے ایشیائے کوچک پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس کی فتوحات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل تھی۔ اس میں انتظامی صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس نے اتنی وسیع سلطنت پر پانچ سال تک نہایت شان و شوکت سے حکومت کی۔ مورخوں کا کہنا ہے کہ اس کا نظم و نسق نہایت عمدہ تھا جس کی وجہ سے اس کے دور حکومت میں ہر طرف امن و سکون تھا اور خوش حالی تھی۔ اس کے برعکس روم انتہا درجہ کی بد حال، بد امنی، خلفشار اور انتشار سے گزر رہا تھا۔ آریلیں کے تخت نشین ہونے تک آئے دن شہنشاہوں کو قتل کیا جاتا رہا تھا، روم کا سب سے بڑا دشمن خود روم تھا۔ آریلیں بھی کچھ عرصے کے بعد اپنے جرنیلوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

تمام مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ زینوبیہ اپنی رعایا سے بہت ہمدردی سے پیش آتی تھی اور مذہبی اقلیتوں کا تحفظ کرتی تھی۔ وہ اپنے مثالی نظم و نسق کی بدولت ایک ایسے وسیع خطہ ارضی پر حکومت کرتی رہی جہاں بھانت بھانت کی تہذیبیں پنپ رہی تھیں، مختلف مذاہب کے ماننے والے اور مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے رہتے تھے اور جہاں مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں۔ کسی عورت کے لیے سب کو ساتھ لے کر چلنا ایک مشکل

کام ہو سکتا تھا لیکن چونکہ زینوبیہ ملک شام میں پیدا ہوئی تھی اور اسی ماحول کی پروردہ تھی، لہذا اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ فلسفیوں اور دانشوروں کی شیدائی تھی اور ان سے رہنمائی حاصل کرتی تھی۔ اس کے دربار کا ماحول فلسفیانہ تھا۔ وہ رنگ و نسل اور مذہب میں کوئی تفریق روا نہیں رکھتی تھی۔ اس نے اپنا تعلق کسی بھی مذہب سے نہیں جوڑا تھا۔ بہت سے مورخین نے اس کے مذہب کے حوالے سے خیال آرائی کی ہے۔ بعض کا دعویٰ ہے کہ وہ عیسائی مذہب سے تعلق رکھتی تھی۔ کچھ کا خیال ہے کہ وہ یہودی تھی دیگر کا دعویٰ ہے کہ اس نے یہودیت اختیار کر لی تھی۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

مورخین کا اس بات پر بھی مکمل اتفاق ہے کہ زینوبیہ ایک مہذب ملکہ تھی۔ وہ فلسفیوں اور دانشوروں میں گھری رہتی تھی۔ اس کا دربار ان کے لیے کھلا رہتا تھا۔ وہ ان کا بے حد احترام کرتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اسے حکمرانی کا مزید موقع مل جاتا تو اس خطے کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ بعض مورخین نے اسے ایک باغی ملکہ قرار دیا ہے لیکن بیشتر مورخین نے اس الزام کو مسترد کر دیا ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ زینوبیہ نے کبھی علم بغاوت بلند نہیں کیا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس نے رومن امپائر سے الگ اپنی سلطنت قائم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اسے بغاوت نہیں کہا جاسکتا۔ ملک شام میں آج بھی اسے ایک ہیرو کا مقام حاصل ہے۔ شام نے 1997ء میں اپنی اس ہیرو کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے کرنسی نوٹ پر اس کی شبیہ چھاپی تھی۔

پامائین کے عظیم الشان محلوں کے کھنڈر پوری دنیا کی توجہ کا مرکز ہیں۔ یونیسکو نے ان کھنڈر کو عالمی ثقافتی ورثہ قرار دیا ہے۔ ملک شام کے ریگستان میں واقع یہ نخلستان ایک عظیم الشان شہر کے کھنڈر پر مشتمل ہے جو قدیم تاریخ کا ایک سب سے اہم ثقافتی مرکز ہوا کرتا تھا۔ بیس ہزار مربع میٹر کے رقبے پر دروردور تک پھیلے ہوئے محلات کے بلند و بالا ستون اور شہتیر ایک ایسا پر جلال منظر پیش کرتے ہیں جس کی پوری دنیا میں نظیر نہیں ملتی۔ بد قسمتی سے 2015ء میں ملکہ زینوبیہ کے اس فقید المثال آبائی شہر اور اس کے عظیم الشان محلات پر داعش نے دھماکے کر کے ان کے بہت سے حصوں کو تباہ کر دیا جس پر مغربی دنیا میں کہرام مچ گیا۔ 2017ء میں شام نے اس پر اپنا قبضہ بحال کر کے وہاں ملکہ زینوبیہ کا ایک مجسمہ نصب کر دیا جو اس کے عہد رفتہ کی یاد دلاتا ہے۔

جولائی 2018ء

111

ماہنامہ سپرگزشت



شمشال ٹورنٹو

ندیم اقبال

یہ اعزاز صرف سرگزشت کو حاصل ہے کہ اس نے سفر ناموں کے انداز کو بالکل بدل دیا۔ اگر یوں کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا کہ سفر نامہ نگاری میں ایک نئے عہد کا اضافہ کیا اور ان خرافات کو یکسر نظر انداز کر دیا جو خشک تھے۔ سفر نامہ پر کہانی کا گمان ہو اس کا انتہائی مکمل توجہ رکھی۔ سفر نامے میں تاریخ و جغرافیہ اور دیگر معلومات بھی ہوں۔ اس کا بھی خیال رکھا۔ ندیم اقبال کے سفر نامے میں بھی ایسا سب کچھ نظر آتا ہے۔

ذوق مطالعہ کی خاطر بالکل الگ انداز کا سفر نامہ

اسکاٹش گرلز کے جھرمٹ میں گھرے سر جی، شہباز، مطیع اللہ اور مفتی آگے بڑھ رہے تھے کہ سامنے سے کچھ لوگ بھاگتے ہوئے آتے دکھائی دیے۔ انہیں دیکھ کر بازار میں افراتفری سی پھیل گئی۔ بلکی سی بھگدڑ مچی لیکن فوراً ہی سب کچھ نارمل ہو گیا۔ بات یہ تھی کہ سیاحوں کا ایک گروپ جو کالوں پر مشتمل تھا۔ اس میں سے کسی نے کوئی ایسی حرکت کر دی تھی جو چینی نژاد لڑکی کو بری لگی اور اس کی حمایت میں کچھ چینی آگئے۔ کالے جان بچا کر بھاگے تو

بھگدڑ مچ گئی لیکن قانون کے ایک محافظ نے سب کچھ نارمل کر دیا۔ اس لیے کہ عوام قانون کا احترام جانتے ہیں اور قانون کے محافظ قانون پر چلتے ہیں۔ کچھ دیر پہلے ہم بھی گھبرا اٹھے تھے لیکن پرسکون تھے۔ بازار سے باہر جانے والے راستے پر چلتے ہوئے میں نے جو لین سے کہا۔ ”غلامی کے بارے میں کچھ سنا ہے؟“

بولی۔ ”ہاں سناؤ۔“

”پہلے یہ بتاؤ کہ غلامی میں کتنے کردار ہوتے ہیں؟“

میں نے اس سے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“

”دو کردار ہوتے ہیں۔ ایک ماسٹر اور ایک غلام۔“

ان کا رشتہ بھی عجیب ہوتا ہے۔ ایک کی نگاہیں اٹھی ہوتیں اور دوسرے کی اپنے قدموں میں۔ کہنے کو تو دونوں انسان ہیں مگر حسن اتفاق سے ایک افریقا میں پیدا ہوا اور دوسرا کہیں اور۔ پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں جب آباد کار یورپ سے امریکا اور کینیڈا آئے تو وہ مقامی لوگوں سے پہلے لڑے۔ ریڈ انڈینز کے مختلف قبائل یہاں کروڑوں کی تعداد میں آباد تھے۔ وہ جنگ سے اور یورپین کی لائی ہوئی بیماریوں سے کروڑوں ہی کی تعداد میں مر گئے۔ ان کو بہت زیادہ غلام چاہیے تھے۔ ان کے پاس بحری بیڑے تو تھے ہی تو یورپین پھر بندوبست اور توپیں لے کر افریقا میں جا گئے۔ رات کو کسی افریقین بستی پر حملہ کرتے۔ بوڑھوں کو قتل کر دیتے۔ جوان عورتوں اور مردوں کو پکڑ لیتے۔ بچوں کو وہیں چھوڑ دیتے۔ جوان لوگوں کو گرفتار کر کے نارتھ امریکا لے آتے۔ جیتے جاگتے انسانوں کے گلوں میں غلامی کا طوق پہنا دیا جاتا۔ غلاموں کے سوداگر انہیں نارتھ امریکا میں جانوروں کی طرح لیے پھرتے۔

جہاں اب لارنس بارکیٹ ہے، یہاں جانوروں کے علاوہ غلاموں کی بھی منڈی لگتی تھی۔ ”یہ بتاتے ہوئے میری آواز بھرا گئی۔ جو لین بھی آزدہ ہو کر پتھرائی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے یعنی بات جاری رکھی۔ ”میں نے دو اشتہار دیکھے ہیں جو ان دنوں غلام منڈی کے باہر لگے ہوتے تھے۔ اشتہار میں ایک سیاہ فام اونچے، سٹیپ پر کھڑا ہوتا تھا۔ Winning step نہیں بلکہ Looser step پر، کندھے جھکے ہوئے، آنکھوں میں موت جیسی ویرانی، لٹکتے جھومتے بازو اور تصویر کے نیچے لکھا ہوتا کہ بولی سوڈا لڑ سے یا پانچ سوڈا لڑ سے اشارت ہوگی جو جسمانت

میں قدرے مضبوط ہوتا، اس کی قیمت زیادہ ہوتی، اس طرح جس طرح ہم بکرے کو خریدتے ہیں، زیادہ تر یہ غلام مسلمان تھے۔ اب بھی سیاہ فام لوگوں کے نام میں آمنہ، فاطمہ، عبداللہ اور زبیر آتا ہے مگر غلامی کی تیز دھار تلووار نے اس سے سب کچھ کھرچ ڈالا نہ ان کا مذہب رہا اور نہ شخصیت۔“

جو لین کچھ اداس تھی، بولی۔ ”میں نے پڑھا تھا کہ غلامی زیادہ تر رومن دور اور یونان میں ہوتی تھی۔ مسلمانوں میں بہت کم تھی اور دوسرا ان کے مذہب نے آہستہ آہستہ غلامی کو ختم کر دیا۔ مسلمانوں میں جب غلامی ختم ہو رہی تھی تو یورپ میں شروع ہو رہی تھی۔“

وہ صحیح تجزیہ کر رہی تھی۔ مجھے اس میں منافقت یا تعصب نہیں دکھائی دیا۔ میں نے اس کی تائید کی اور کہا۔ ”یہی اصل تاریخ ہے۔ جب مسلمانوں نے تہذیب و تمدن حاصل کر لیا تھا تو اس وقت بھی یہ سب سیکھنے کے مراحل میں تھے۔“ میں نے اسے بتایا۔ ”افریقا میں مقامی طاقت ور گروہوں نے اپنے ہی لوگ پکڑ پکڑ کر یورپین کو بیچنے شروع کر دیے۔ پچاس لاکھ افریقی تو صرف امریکا میں پکڑ کر لائے گئے۔ کینیڈا اور یورپ میں بھی بے تحاشا لائے گئے تھے۔ یہ لوگ صبح سے شام تک گئے، کافی، تمباکو اور کارٹن کے کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ سونے اور کونسلے کی کانوں میں کام کرتے تھے۔ رات میں لکڑی کے ایک کیمین میں انہیں رکھا جاتا۔ بارہ بارہ مرد اور عورتیں ایک ہی کیمین میں ہوتے۔ ان کو شادی کرنے کی اجازت نہ تھی اس لیے انہوں نے بغیر شادی کے اپنی ضرورتیں پورا کرنی شروع کر دیں اور بے تحاشا بچے پیدا ہونے لگے۔ خاندانی نظام تہہ وبالا ہو گیا۔ آج ایک عورت کسی ایک سے آنکرائی تو کل کسی اور سے اور یہی رسم چل نکلی تو آج تک ختم نہ ہوئی۔ وہ کمرے میں سردیوں کی برف زدہ راتوں میں صرف ایک کبل میں سوتے، لکڑی کی دیواروں کے درزوں سے سردی اندر آتی تو یہ پوری رات کپکپاتے رہتے۔ یہ شادی کر سکتے نہ جایدا خرید سکتے تھے۔ ان کی عدالت میں گواہی بھی نہیں تھی۔ یہ ان علاقوں میں بھی نہیں جاسکتے تھے جہاں گورے ہوتے تھے۔ پچھلی صدی کی ساٹھ کی دہائی تک ان کی بستیوں میں سینما گھر اور اسٹیڈیم میں سٹیٹس بھی علیحدہ ہوتی تھیں۔ انہیں سال میں دو لباس ملتے اور ایک جوتا، یہ ان کی کل جایدا تھی۔“

”اور پھر ابراہم لنکن نے 1861ء میں غلامی کو غیر قانونی قرار دیا۔ ساؤتھ کی ریاستوں میں غلام زیادہ تھے تو



پھر شمالی اور جنوبی ریاستوں میں اسی غلامی کے مسئلے پر سول وار ہوئی۔ نارتھ کی ابا سائن جیت گئیں جن کو ابراہم لنکن لیڈ کر رہا تھا۔“ جولین نے یہ بات بتائی۔

”ہاں تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے اور آج انہی غلاموں کی نسلوں نے وہی غلامی کا زہر اپنے اندر رکھا ہوا ہے۔“

ہم اسی دوران ایٹن سینٹر پہنچ چکے تھے۔ ہمارے ساتھی پیچھے تھے۔ اتنے میں ایک سیاہ فام نوجوان جس کے گلے میں سفید لاکٹ تھا، چری جیکٹ اور سر پر ٹوپی، مجھے دھکیلتا ہوا ایٹن سینٹر کے دروازے کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ میں گرتے گرتے بچا۔

میرا اندازہ یقین میں بدل گیا کہ ان کے اندر غم، غصہ اور انتقام ابھی تک بھرا ہوا ہے۔

”واقعی یہ نارتھ امریکا کی تاریخ کا ایک بڑا انسانی المیہ تھا مگر اس پر بہت کم بات ہوتی ہے۔“ جولین بولی۔

میں نے کہا۔ ”اور نہ بھی ہوگی یہاں کروڑوں ریڈ انڈینز جانوروں کی طرح مار دیئے گئے۔ سب بھول گئے۔“

جولین چونک کر بولی۔ ”ہم نے تو لارنس ہال دیکھنا تھا؟“

”باتوں میں یاد ہی نہ رہا، حالانکہ راستے میں آیا تھا اگر کہو تو واپس جا کر دیکھ لیں۔“ میں بولا۔

جولین نے کہا۔ ”سیاحت کا بڑا اصول یہ ہے کہ ہمیشہ آگے بڑھتے رہیں۔“

”اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا۔ ایک بار پیچھے مڑے تو واپس مشکل ہو جاتی ہے۔“ میں نے کہا تو اس نے تائید میں سر ہلادیا۔

اتنے میں ہمارے ساتھی بھی باتیں کرتے آ پہنچے۔ ایک لڑکی سر جی سے کہہ رہی تھی۔ ”آپ میرا ہاتھ کب دیکھیں گے؟“

وہ بولے۔ ”سب کا ہاتھ دیکھوں گا۔ پر کہیں تک کر بیٹھیں تو سہی۔“

میں نے شہباز سے پوچھا۔ ”یہ ہاتھ دیکھنے والی کیا کہانی ہے؟“

وہ بولا۔ ”مطیع اللہ نے جو کہہ دیا تھا کہ انہیں پامسٹری آتی ہے تب سے یہ سب ان کے پیچھے پڑی ہیں اور روحانی علم کے بارے میں بھی جاننا چاہتی ہیں۔“

جولین میرے کان میں بولی۔ ”یہ واقعی پامسٹری

جانتے ہیں؟“

میں نے ہنس کر کہا۔ ”بالکل بھی نہیں جانتے، مجھے خدشہ ہے کہ اپنا پول خود ہی نہ کھول دیں۔“

وہ بھی ہنس پڑی اور بولی۔ ”تب تو مزہ نہیں آئے گا۔ جھوٹی سہی مگر اچھی یادیں لے کر تو واپس جائیں گے۔“

ہم ایٹن سینٹر میں داخل ہوئے۔ بڑا دروازہ جس پر رش تھا۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ سبھی سیاح تھے اور سبھی اتنے خوش تھے۔ ہر دکھتا چہرہ پر مسرت تھا۔ لڑکیوں نے طرح طرح کے فیشن کیے ہوئے تھے۔ ہمارے دائیں جانب زنانہ کپڑوں کا ایک بڑا اسٹور تھا۔ سب لڑکیوں نے ادھر ہی کارخ کیا۔

میں نے سب کو روکا اور کہا۔ ”ہم یہاں زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے گزار سکتے ہیں۔ ابھی شام کے چھ بجے ہیں اور آٹھ بجے ہم نے ٹیٹھن فلیس اسکوائر جانا ہوگا۔ اگر آپ ہر شاپ میں جائیں گی تو ہم وہاں وقت پر نہیں پہنچ سکتے۔“

لڑکیوں نے آپس میں بات کی اور یہ فیصلہ کیا کہ وہ باقاعدہ شاپنگ بعد میں کریں گی اور آج صرف جائزہ لیا جائے گا۔

اگر میں یہ نہ کہتا تو لڑکیوں نے سارا وقت مال میں گزار دینا تھا اور خریداری بھی شاید نہیں کرنی تھی۔

ہم مال میں داخل ہوئے تو سب لڑکیوں سمیت ہمارے منہ سے واؤ نکلا۔

ابھی تک میں ایک دو مال دیکھ چکا تھا مگر یہ تو مال نہیں پورا شہر آباد تھا۔ میں شروع میں آیا تو مفتی مجھے اسکا ربرو ٹاؤن سینٹر لے گیا تھا مگر ایٹن سینٹر میں اس جیسے کئی مال سما سکتے تھے۔

ہم سے زیادہ اسکاٹ لڑکیاں محو حیرت تھیں کہ اتنا بڑا شاپنگ مال بھی ہو سکتا ہے۔ دراصل یورپ کے مال نارتھ امریکا کے شاپنگ مالوں سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ وہاں مالوں سے زیادہ روڈ یا اسٹریٹ پر دکانوں کا زیادہ رواج ہے۔ یہ مال تو ڈاؤن ٹاؤن میں ہے اور لوگ سب وے سے با آسانی یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ ورنہ ایسا مال کہیں ڈاؤن ٹاؤن کے باہر ہوتا تو مال سے تین گنا زیادہ پارکنگ کا ایریا مختص کرنا پڑتا۔ اس مال کی وسعت دیکھ کر میں خود دم بخود تھا۔

آٹھ منزلہ شاپنگ مال میں نیچے کے چار فلور رینیل شاپس کے لیے مخصوص تھے اور اوپر دفاتر تھے۔

ہم ایک بڑے اور طویل ٹخن میں تھے جہاں بہت

اوپر شپس کی گول چھت تھی۔ رنگ برنگے فرش اور درود یوار جن میں اپنا عکس بھی نظر آتا تھا۔ دو جانب فلور در فلور اور ایک لائن میں شیشوں کے پیچھے بجی سجائی دکانیں تھیں جن کے اندر اور باہر بھی رش تھا۔ چھت سے کرشل کی بڑی بڑی مچھلیاں اور پرندے لٹک رہے تھے۔ روشنی ایسی کہ اگر رات ہو تو دن کا سماں نظر آئے۔ قیمتی فانوس لٹک رہے تھے۔ جگہ جگہ خوش نما پودے اور چھوٹے درخت بڑے بڑے گملوں میں ایستادہ تھے۔ جا بجا فوارے چل رہے تھے اور شفاف تالاب جن کی تہہ میں بے تحاشا سکے پڑے تھے۔

اس کارڈور میں جہاں ہم کھڑے تھے اس کے سائیڈوں پر بیچ رکھے تھے۔ بیچ میں اسٹال لگے تھے جہاں فائن جیولری، پرفیوم اور چھوٹا چھوٹا سامان بک رہا تھا۔ بڑے بڑے ستونوں نے مال کی شان میں کچھ اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ یہاں کسی بھی شاپ کو ڈھونڈنا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ اسی لیے جگہ جگہ کسٹمر سروس تھی۔ مال کے نقشے بنے تھے، جہاں نمبروں کے نیچے دکان کا نام لکھا تھا۔ آپ نقشے کی مدد سے با آسانی اپنے مطلوبہ اسٹور میں پہنچ سکتے ہیں۔

مال میں سبزی گوشت اور گروسری کے علاوہ ہر شے کی دکان تھی۔ میں دکان کہتا تو مفتی مجھے کہتا کہ شاپ کہو۔ دکان سے شاپ کا تاثر خراب ہوتا ہے۔

ہم فرسٹ فلور پر تھے اور نیچے ہیمسٹ میں بھی یہی صورت حال تھی۔ زیادہ تر دکانیں یعنی شاپس برانڈڈ چیزوں کی تھیں۔ ملبوسات، الیکٹرونک، جیولری، جوتے، ڈیکوریشن، گفٹ، کھلونوں وغیرہ کی شاپس کی بھرمار تھی۔ نوڈ کورٹس بھی بنے تھے جہاں لوگ ریلین میز کرسیوں پر صاف سترے ماحول میں کچھ کھاتے پیتے نظر آ رہے تھے۔

ہم سب تو کچھ دیر کے لیے اسی ماحول میں کھو گئے۔ آتے جاتے لوگوں کو دیکھ کر کسی کا دل نہیں بھر رہا تھا۔ بھڑکیلے اور نام نہاد لباس پہنے لڑکیاں خوشبوئیں، کھیرنی پاس سے گزر جاتی تھیں۔ اسکاٹ لینڈ کی لڑکیاں بھی حیرت سے یہ چہل پہل دیکھ رہی تھیں۔

ہم تذبذب میں تھے کہ دائیں جانب سے شروع کریں یا دوسری طرف سے۔ ہم تو صرف گھومنے آئے تھے اس لیے کہیں سے بھی ونڈو شاپنگ شروع کرتے تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کچھ کہتے ادھر سے اور کچھ کہتے ادھر سے۔ آخر سر جی اور میکی بائیں جانب برآمدے میں بڑے تو ہم بھی ان کے پیچھے چل پڑے۔

جا بجا برقی زینے اور لفٹیں یہ حوں کو اوپر نیچے متواتر لاتی جا رہی تھیں۔

سر جی بولے۔ ”اوپر چلیں؟“

میں نے پوچھا۔ ”کیوں؟“

وہ بولے۔ ”سیر ہو جائے گی۔“

خان بولا۔ ”سر جی! بہکیں نہیں۔ اب آپ لیڈ نہ کریں بلکہ لڑکیوں کو فالو کریں۔“

خان کا مشورہ مفید تھا اور پھر ہم نے لڑکیوں سے کہا۔ ”آپ لوگ جہاں جانا چاہیں، ہم سب آپ کے پیچھے پیچھے ہیں۔“

جتنے بھی اسٹور تھے ان کے نام مشکل سے تھے پھر سینکڑوں نام یاد رکھنا بھی مشکل تھا۔

لارنس مارکیٹ میں ایسا لگ رہا تھا کہ ساری دنیا کو کھانے پینے کا شوق ہے اور یہاں صورت حال یہ تھی کہ ساری دنیا نے فیشن پر ٹوٹی پڑی تھی۔

وہاں کھوتی پھرتی عورتوں اور لڑکیوں نے فیشن میں اپنے آپ کو رنگا ہوا تھا۔ کوئی اسکرٹ میں ہے تو کوئی شارٹس میں اور کچھ نے پینٹس پہنی ہیں۔ اوپر فیشن کے لیے بنیان پر کوئی دیدہ زیب جیکٹ ڈالی ہے۔ بال کھلے ہوں یا بند، دونوں میں دلکش نظر آتی تھیں۔ میک اپ ہمیں، خوشبوؤں میں رچی بسی اور اداؤں میں بجلیاں گرانی چلی آتی تھیں۔ شہباز نے کہا کہ اتنی حسین لڑکیاں ہیں کہ آتے بھی اچھی لگتی ہیں اور جاتے بھی۔

مطیع نے شہباز سے کہا۔ ”شرم کرو، آنکھوں کا بھی روزہ ہوتا ہے۔“

مفتی بولا۔ ”روزے تو سات ماہ بعد ہیں۔“

مطیع بولا۔ ”حیا اور شرم کی عادت ابھی سے ڈالیں گے تو روزوں میں پچھلی باری طرح مشکل نہیں ہوگی۔“

معلوم نہیں پچھلی بار اسے کون سی مشکل درپیش آئی تھی مگر اب سر جی میکی سے نظریں بچا کر ارد گرد زیادہ دیکھ رہے تھے۔

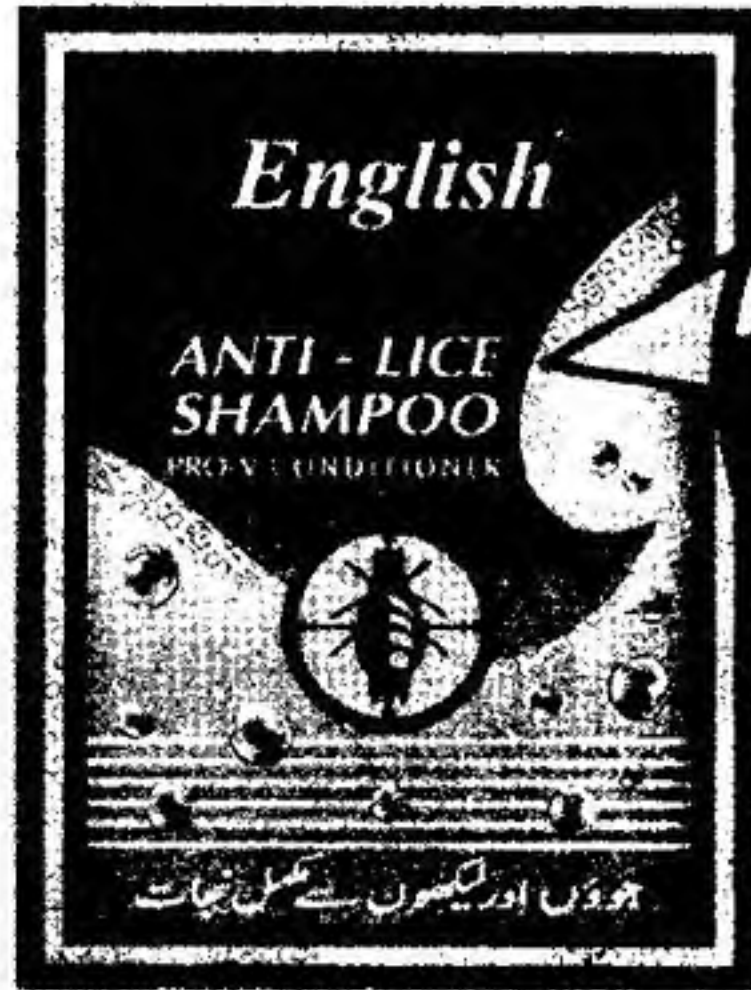
میں نے کہا۔ ”سر جی، اپنا تاثر خراب نہ کریں ورنہ یہ بھی ہاتھ سے جائے گی۔“

سر جی بے بسی سے بولے۔ ”اسی لیے تو میں خواتین کے ہمراہ شاپنگ پر نہیں جاتا۔ دیکھنے کا لطف بھی ختم ہو جاتا ہے۔“

اب ہم برآمدے میں کھوم رہے تھے۔ ہر فلور کی

English

سر نہ کھجائیں.. Healthy ہو جائیں!



اصل کی پہچان
HOLD GRAPHIC PRINT

5 منٹ میں جوؤں اور لیکھوں سے مکمل نجات

A Quality Product of
Sarwana & Sohzihi

antilice

@SnScare

سامنے اسے بغور دیکھتے رہے اور ہونٹ بھیجنے کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے تو میکی کوئی دوسرا نیکلس اٹھا لیتی۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں سر جی ادائیگی کرنے پر اصرار نہ کرنے لگ جائیں۔

سیل گرل بھی اتنے سارے گا ہک دیکھ کر کسی کو خالی نہیں لوٹنا چاہتی تھی۔ وہ ہر سیٹ پر پچاس فیصد کی رعایت بھی دے رہی تھی۔ بقول جو لین قیمت بھی بہت مناسب تھی۔

ادھر سر جی راضی ہی نہیں ہو رہے تھے۔ سیل گرل میکی کے بجائے اب انہیں قائل کرتی نظر آرہی تھی۔ وہ مسکرا کر ایک ادا سے سر جی کو سیٹ دکھاتی اور سر جی مسرور ہو کر اسے مسکراہٹ واپس کرتے اور پھر ہار نکال کر خود ہی میکی کے گلے سے لگا کر جائزہ لینے لگتے۔ تادیر میکی کے گلے سے لٹکے رہتے اور پھر نفی میں سر ہلا کر کوئی دوسرا ہار اٹھا لیتے۔

میں نے سر جی سے کہا۔ ”اپنی اصل محبت کے ساتھ بھی اسی طرح وصال کی لذتوں سے مخمور رہا کرتے تھے؟“

ان کے چہرے پر محبت کا ایک رنگ ابھر آیا اور پُرسوز لہجے میں بولے۔ ”اس کا آہنی دل میرے جذبہ سوز دروں سے پھل گیا ہے۔ لگتا نہیں کہ یہ حینہ مہ جین مجھے اتنا چاہے گی۔“

میں نے کہا۔ ”سر جی! ہوش میں آئیں اور وہاں اگر آپ نے ادائیگی کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“

انہوں نے میری سنی ان سنی کر دی اور ایک نیا ہار لے کر دوبارہ اس کے گلے سے جھول گئے۔ میں نے بے بسی سے اپنا سر پکڑ لیا۔

مجھے گہرے سبز موتیوں سے چمکتا چاندی کا ایک ہار اور ٹاپس پسند آئے اور میں نے وہ سیٹ سائیڈ پر رکھ دیا۔

میکی نے آخر کار فیصلہ سناتے ہوئے سر جی کو ایک سیٹ دکھاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یہ بہت پسند ہے۔“

سر جی۔۔ آخری بار اس کے گلے سے تادیر لگے رہے اور پھر میکی کی تائید میں سر ہلا دیا۔

اب لڑکیوں نے سیل گرل سے قیمتیں اور زیادہ کم کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ کہتی تھیں کہ پانچ سیٹ خرید رہے ہیں تو کم از کم ساٹھ فیصد رعایت ہونی چاہیے۔

مجھے یقین کی حد تک اُمید تھی کہ وہ ساٹھ کی ستر فی صد رعایت پر بھی دے دی گئی اور یہی ہوا کہ وہ ساٹھ پر فوراً مان گئی۔ ہم سب نے اپنی اپنی ادائیگی کی اور صرف سر جی نے میکی کے

ریٹنگ سے لوگ جھکے نیچے چلتے لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوتے اور نیچے والے اوپر والوں پر خوش ہو رہے تھے۔

ہمارے ساتھ لڑکیاں کسی دکان میں داخل ہوتیں، اشیاء دیکھتیں، قیمتیں جانچتیں اور تبصرے کرتی نکل آتیں تو ہم بھی ان کے ساتھ دکان سے باہر آ جاتے۔ وہ بتا رہی تھیں کہ یورپ میں چیزوں کا معیار بہتر ہوتا ہے اور قیمت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔

جو لین نے مجھ سے کہا۔ ”جیولری شاپ سے میں نے کچھ خریدا ہے، اجازت ہے؟“

میں نے ہنس کر کہا۔ ”شوق سے خریدا، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

ہم ایک جیولری شاپ کے سامنے کھڑے تھے۔ سر جی بھی میکی کے پیچھے اس جیولری شاپ میں لڑکیوں کے ساتھ کھس گئے تھے۔

جو لین بولی۔ ”آپ نے کسی کے لیے کچھ بھی نہیں خریدا؟“

میرے ذہن سے یہ خیال چمکا تھا کہ سرین ہر بار میرے لیے کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہے، میرے کپڑے، شیڈنگ کا سامان، علیحدہ تولیہ اور روزانہ ضرورت کی چیزیں وہ خرید کر لاتی ہے تاکہ جب میں اس کے گھر جاؤں تو مجھے کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ یہ نہیں کہ میں بدلے میں کچھ دینا چاہتا تھا۔ میں اس لیے کچھ دینا چاہتا تھا کہ وہ اس کا حق رکھتی تھی۔

جو لین سے میں نے کہا۔ ”اگر کچھ پسند آیا تو لے لوں گا۔“

اس نے مجھے جیولری شاپ میں چلنے کا اشارہ کیا اور میں نے اس کی تقلید کی۔

بے تحاشا روشنیوں میں شوکیسوں اور الماریوں میں رکھے چاندنی کے زیورات اور نگینے جگمگا رہے تھے۔ ان پر نظر بھی نہیں ٹھہرتی تھی۔ جگمگ کرتے نیکلس، کانوں کے ٹاپس اور دوسرے زیورات بھرے پڑے تھے۔

سر جی کے علاوہ تمام لڑکیاں وہاں موجود تھیں۔ وہ بڑے شوق اور جوش سے جیولری دیکھ رہی تھیں۔ کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی لڑکی بھی چاندنی کی طرح چمک رہی تھی۔ وہ بڑھ بڑھ کر نیکلس، انگوٹھیاں وغیرہ نکال نکال کر انہیں دکھا رہی تھی۔

اب میکی کوئی نیکلس اٹھا کر گردن کے نیچے لگاتی اور سر جی کی ”ماہرانہ رائے“ طلب کرتی۔ سر جی نیکلس کے

ہار کی ادائیگی مجھ سے نظریں چرا کر کی۔ میں گھورتا رہ گیا اور وہ سولی چڑھ گئے۔

لڑکیاں سر جی کی سخاوت پر بہت مرعوب نظر آرہی تھیں اور میکی پھولے نہیں سارہی تھی۔

میں نے سوچا کہ ہوسکتا ہے میکی سر جی کو اچھی لگنے لگی ہو اور میکی کو بھی سر جی کی کوئی ادا بھاگنی ہو۔ اگر ایسا ہے تو کوئی تحفہ دینا کیوں کر برا ہوگا مگر مجھے وہ واقعہ بھی یاد آ جاتا جب سر جی نے کین سینٹر میں ایک چینی لڑکی کو خواہ مخواہ میں مہنگا پر فیوم تھما دیا تھا اور خود اس سے چاکلیٹ لے آئے تھے۔

یہ نارتھ امریکا کا سب سے بڑا مال اس طرح بھی ہے کہ سالانہ کروڑوں لوگ اسے دیکھنے اور شاپنگ کرنے آتے ہیں۔ اس تعداد سے زیادہ اس کا وزٹ کرتے ہیں جتنے ڈزنی ورلڈ (فلوریڈا) اور ڈزنی لینڈ (لاس اینجلس) دونوں کو ملا کر دیکھنے آتے ہیں۔ میں ڈزنی ورلڈ اور ڈزنی لینڈ دونوں کو دیکھ چکا ہوں۔ اپنے قارئین کو یہ اندازہ دینا چاہتا ہوں کہ ڈزنی ورلڈ کے چار پارکس ہیں۔ چاروں ایک دوسرے سے جڑے ہیں اور ایک سے دوسرے پارک جانے کے لیے ٹرین چلتی ہے۔ ڈزنی ورلڈ کا صرف ایک پارک جو لپیکاٹ کے نام سے مشہور ہے اس کی پارکنگ ہر وقت بھری رہتی ہے۔ اس کی پارکنگ اتنی بڑی ہے کہ مجھے پارکنگ شاید درمیان میں ملی تھی اور مین گیٹ تک جانے کے لیے ہم نے بس لی تھی۔ اب پڑھنے والے خود اندازہ لگالیں کہ ہر روز اٹھن سینٹر کو کتنے لوگ دزٹ کرنے آتے ہوں گے۔

ہم برآمدوں میں چلتے روشن چمکتی ہوئی شاپس کے اندر جھانک رہے تھے۔ ہر شاپ کے اندر ایک ہجوم تھا۔ لڑکیاں کسی شاپ میں بھی جاتیں اور واپس تیرے کرتی برآمد ہوتی تھیں۔ میں نے شہباز اور مطیع سے کہہ دیا تھا کہ جب بھی لڑکیاں کسی شاپ میں جائیں تو سر جی کو آپ لوگ زبردستی روکے رکھیں۔

خان قیصر نے سر جی سے ایک دفعہ پوچھا جب لڑکیاں کسی ملبوسات کے شوروم میں گئی تھیں۔ ”میکی میں کیا ملتا ہے آپ کو جو اس کے ساتھ نہیں ہو گئے ہیں۔“

مطیع بولا۔ ”ان دونوں کو شاید پہلی بار کسی نے لفٹ کرایا ہے۔“

سر جی بولے۔ ”ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ محبت کے

دشت میں ہمارے بھی گھوڑے سرپٹ دوڑتے رہے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”وہ پھر گھنٹوں بعد آپ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائے گی۔ پھر کیا اس کے پیچھے اسکاٹ لینڈ جائیں گے۔“

”جب آپ لوگ اس کی جدائی کی بات کرتے ہیں تو میرا کلیجہ کٹ جاتا ہے۔ اس کی جدائی کا سوچ کر۔ میرا قلب ضعیف لرزنے لگتا ہے۔“ سر جی روہانے ہو گئے تھے۔

مطیع پھڑک کر بولا۔ ”یہ پھر سے محاورے بولتی ہے۔ اس خانہ خراب کو بولا بھی تھا کہ بازاری اردو بولو مگر یہ ہم سے بھی کتابی اردو بولتی ہے۔“

سر جی بولے۔ ”اس نشاط کی کیفیت میں میری دماغی حالت دیگر گوں کرنے پر آپ لوگ تلے ہیں۔ آپ لوگوں کو کیا معلوم کہ جب اس کے دریائے محبت کی کوئی موج میرے اندر کے شعلوں پر پڑتی ہے تو بے قرار دل کو چین ملتا ہے۔“

شہباز جھلا کر بولا۔ ”تیرا بیڑا ترے سر جی۔ یہ سپا پہلے تو نہیں دیکھا میں نے اور یہ کیا دیگر گوں دیگر گوں لگا رہی ہے اور کس دنیا کی بات کر رہے ہیں جہاں نہانے سے چین ملتا ہے۔“

”جس طرح پتھر میں جو تک نہیں لگتی اسی طرح شہباز کا سب دل موم نہیں ہوگا۔“ سر جی کو غصہ آ رہا تھا۔

اس سے پہلے بات برہتی کہ لڑکیاں اسٹور سے نکل آئیں اور سر جی کی نظریں میکی کے صحت مند چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔

سب خالی ہاتھ تھیں مگر بے حد خوش دکھائی دیتی نظر آتی تھیں۔ میں بھی کسی نہ کسی اسٹور میں چلا جاتا مگر اتنے بڑے اسٹوروں میں ڈھونڈنے سے بھی کوئی ایسی چیز نہ ملتی جو اپنے مطلب کی ہو۔

آگے ایک بڑا فوارہ آیا۔ بیچ میں اونچائی پر پانی پھینکتا فاونٹین اور ارد گرد اس کے چھوٹے چھوٹے فوارے تھے۔ شفاف پانی کے تالاب میں ان گنت سکے پڑے تھے۔ وہیں بہت سے نورس بیٹھے کسی نہ کسی کام میں مصروف تھے۔ کوئی سسے ڈال رہا تھا اور کوئی ان کو دیکھے جا رہا تھا۔ ایک عمر رسیدہ جوڑا قریب بیٹھا اوپر کے فلور سے ریلنگ سے ٹیک لگائے لڑکیوں سے بات کر رہا تھا۔ غالباً وہ ایک ساتھ آئے تھے اور خود تھک کر اشاروں سے بات کر رہے تھے۔ ایک چھوٹی

خوب صورت بچی تالاب میں سے سکے اٹھانے کی کوشش کرتی تھی اور ماں اسے پیچھے سے جکڑی ہوئی ہنس رہی تھی۔ ایک لڑکا لڑکی بیٹھے تھے۔ دونوں خاموش مگر گاہے بگاہے ایک دوسرے کو چوم لیتے تھے۔ چاروں طرف سے تہمتے تھے، خوب صورت اور بے فکر چہرے ایک دوسرے میں مدغم ہو کر چل رہے تھے۔ سر جی نے درخواست کی کہ میکی تھک گئی ہو گی ذرا دیر کو ستالیں۔

پھر جس کے ہاتھ جو بھی آئی اس کے ہمراہ اپنی جگہ بنا کر بیٹھ گیا۔ سر جی میکی کے ہمراہ اسی کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئے۔ مجھے غصہ آیا کہ سر جی اتنے کھل گئے ہیں کہ ہمارے سامنے ہی ہاتھ تھامے بیٹھ گئے۔ پھر معلوم ہوا کہ اس کے ہاتھ کی لکیریں ہتھیلی پر تلاش کر رہے ہیں۔ میکی کا پھیلا ہاتھ ایسے تھا کہ کسی نوزائیدہ بچے کا چھوٹا سافید اجلا تکیہ ہو۔ سر جی کو میکی کا ہاتھ پکڑے جب دیکھا تو سب کے ہمراہ بیٹھی لڑکیاں پھر پھڑا کر اڑیں اور سر جی کے گھونسلے پر جا بیٹھیں۔ اب سب کے ہاتھ سر جی کے سامنے کھلے تھے مگر جولین ٹس سے مس نہ ہوئی کیونکہ اسے سر جی کی اصلیت کے بارے میں معلوم تھا۔ اب بہت سی عریاں ٹانگیں اور لٹکارے مارتے چہرے سر جی کو گھیرے ہوئے تھے اور بیچ میں سے ان کی آواز آتی تھی۔ ”ایک ایک کر کے ایک کر کے۔“

مفتی کہنے لگا۔ ”جیسے ہم سادہ اور قناعت پسند سمجھتے تھے۔ سارا میلہ تو اسی نے ہماری آنکھوں کے سامنے لوٹ لیا۔“

”شہباز مطیع اللہ سے کہنے لگا۔ ”تم ہی نے ایسی کہانی سنائی کہ سب تعیلیاں سر جی کے گرد منڈلانے لگیں۔“ پھر کہنے لگا۔ ”کس نے کہا تھا کہ تم سے کہ انہیں بھوت اور انسان کے بیچ کوئی مخلوق بنا کر پیش کرو۔“

مطیع اللہ بولا۔ ”کہو تو بازی پلٹ بھی سکتی ہے مگر آج سر جی کی خاطر صبر کے چند گھونٹ بھر لو۔“

ادھر سر جی کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ لڑکیوں میں گھرے تھے اس لیے شکل تو نظر نہیں آرہی تھی مگر فقرے کچھ یوں تھے۔

سر جی۔ ”بچپن میں ایک بار بیمار ہوئی، اور ماں بہت پریشان ہو گئی تھی۔“

میکی۔ ”ہاں جب میں گریڈ تھری میں تھی۔ میں نے شاید بہت کھا لیا تھا اور پیٹ میں درم آ گیا تھا۔“

سر جی۔ ”سوچتی بہت ہیں آپ۔“

ہم کہ تھہرے اجنبی

یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ ہم پاکستان میں پیدا ہوئے، بڑے بڑھے اور ہماری مادری زبان اردو کہلاتی ہے مگر پھر بھی ہم اپنی اس اردو زبان سے نا آشنا ہوتے جا رہے ہیں اور دن بدن ہم کو یہ احساس مارے ڈال رہا ہے کہ ہم کو ابھی اردو زبان سمجھنے کی اشد ضرورت ہے۔ نیز یہ انکشاف بھی ہوتا جا رہا ہے کہ ہم اپنی زبان میں اگر بالکل نہیں تو بھی کافی حد تک کورے واقع ہوئے ہیں۔ کیونکہ بعض الفاظ کا الٹ پھیر ہماری باتوں کو نہ صرف مضحکہ خیز بنا دیتا ہے بلکہ بعض اوقات نوبت لڑائی جھگڑے تک بھی جا پہنچتی ہے اور ہم اپنی اس ٹوٹی پھوٹی اردو میں نادانی کے باعث کئی دفعہ ایسی سنگین غلطیاں کر بیٹھتے ہیں کہ سامنے والا شخص ہمارے جملے سن کر آگ بگولہ ہو جاتا ہے۔ لہذا اس آج کل کی اردو سے ہم کو کما حقہ واقفیت کا ہونا لازمی عنصر بن چکا ہے، مثلاً حال ہی میں ایک صاحب نے دوران ملاقات کچھ اس طرح کی گفتگو کی جو نہ صرف ہمارے چھوٹے سے ذہن کے اوپر سے گزر گئی بلکہ ہم کو بیچ اپنی زبان دانی پر شرمندگی محسوس ہونے لگی کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ یار آج کل میں نے بڑی کھٹ راکیں پال رکھی ہیں اور پھر اوپر سے لوگ مجھے الگ مفت کی پھٹکیں بھی بلا وجہ دے جاتے ہیں۔ تو ہم کو اپنی اس اردو دانی پر ماتم کرنے کو جی چاہا۔

مرسلہ: قرۃ العین حیدر۔ اقراء سٹی، کراچی

میکی۔ ”ہاں لیکن اتنا بھی نہیں۔“

سر جی۔ ”نہیں میں دوسری لڑکی کو کہہ رہا ہوں۔“

دوسری لڑکی۔ ”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ سوچتے سوچتے کہاں سے کہاں نکل جاتی ہوں۔“

سر جی۔ ”دولڑکے زندگی میں آئے تھے مگر دونوں دھوکے باز نکلے۔“

میکی۔ ”ایک تھا دو نہیں، وہ بھی گھبرا گیا تھا۔“

سر جی۔ ”نہیں، میں دوسری سے کہہ رہا ہوں۔“

دوسری لڑکی۔ ”بالکل دو تھے۔ ایک دھوکے باز تھا اور دوسرے کو میں نے خود چھوڑ دیا تھا۔“

سر جی۔ ”زندگی بہت حسین ہے۔ جب بھی یہ موقع دے فائدہ اٹھالیں۔“

مکی۔ ”موقع تو میں ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔“
 سرجی۔ ”یہ میں خود سے کہہ رہا ہوں۔“
 مکی۔ ”اوہ اچھا۔“
 سرجی۔ ”آپ اتنا پریشان کیوں رہتی ہیں؟“
 ”مکی۔ ”مجھ سے کہہ رہے ہیں۔“
 سرجی۔ ”ہاں آپ سے۔“
 مکی۔ ”میرا وزن بڑھتا جا رہا ہے۔ صرف یہی پریشانی ہے۔“
 سرجی۔ ”آہستہ آہستہ گھٹ جائے گا۔“
 پہلی لڑکی۔ ”ہاتھ دیکھیں، ٹھیک نہیں کریں۔“
 سرجی۔ ”آہستہ جلد آپ کی زندگی میں بہت بڑی خوشی آنے والی ہے۔“
 مکی۔ ”میری زندگی میں؟“
 سرجی۔ ”آپ کی زندگی میں تو آچکی ہے۔ میں دوسری سے کہہ رہا ہوں۔“
 پھر ایک اور لڑکی نے پہلی لڑکی کو سائیڈ پر کیا اور سرجی کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ تھما دیا۔
 ”کچھ دیر بعد سرجی بولے۔ ”آپ تو بہت خوش نصیب ہیں۔“
 مکی۔ ”مجھے کہہ رہے ہیں؟“
 سرجی۔ ”آپ کے علاوہ کوئی اور بھی تو خوش نصیب ہو سکتا ہے۔“
 دوسری لڑکی۔ ”آپ یہ بتائیں کہ میری ڈگری وقت پر مکمل ہو جائے گی۔“
 ”سرجی شاید اس کے ہاتھ زور سے مسل رہے تھے اسی لیے کہہ رہی تھی ذرا آہستہ۔۔۔۔۔“
 سرجی بولے۔ ”کرتوت ٹھیک رہے تو ہو جائے گی۔“
 دوسری لڑکی۔ ”کیا مطلب؟“
 سرجی۔ ”یعنی پوری توجہ پڑھائی کی طرف رکھو۔“
 دوسری لڑکی۔ ”یہ تو میرے ڈیڈ بھی مجھے کہتے ہیں۔“
 سرجی نے اس کا ہاتھ چھوڑ کر پہلی کا دوبارہ تھام لیا۔
 میں پوری توجہ سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ میرے دوسرے ساتھی شاپنگ مال کی خوب صورتی پر بات کر رہے تھے۔

سرجی کا یہ ڈراما تب ختم ہوا جب ایک لڑکی سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں والی ان کے سر پر آکھڑی ہوئی۔ میں ڈر گیا کہ کوئی پولیس کا انڈر کور ہے اور ابھی سرجی دھوکا دہی کے

الزام میں دھر لیے جائیں گے۔
 ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولی۔ ”آپ لوگ توراں (ٹورسٹ) ہیں؟“ یہ بول کر جلتنگ بجاتی ہنسی ہنسی گئی۔
 میں اتنی خوب صورت ہنسی سن کر متوجہ ہوا۔ ایک نہایت حسین لڑکی، کھلے سیاہ بال، سیاہ چمکتی آنکھیں اور اجلی رنگت والی سرجی یا لڑکیوں سے پوچھ رہی تھی۔ سیاہ اسکرٹ پر سیاہ قمیص پہنے نہایت جاذب نظر رہتی تھی۔ میرے ساتھ جو لین بھی ادھر متوجہ ہو گئی۔
 اس کے کندھے سے لٹکتا ایک سیاہ چرمی بیک اور گلے میں کیرالکا تھا۔
 سرجی گھبرائے تھے ایسے کہ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے ہوں۔ لڑکیوں کے چہرے پر سوالات تھے۔
 میں نے کہا۔ ”آدھے کینیڈین اور آدھے اسکاٹ لینڈ کے ٹورسٹ ہیں۔“
 وہ متواتر مسکرائے جاتی تھی۔ کچھ لوگوں میں ایسی کشش ہوتی ہے کہ چہرے سے نظریں نہیں ہٹتیں۔ ہم سب کی یہی حالت تھی۔
 وہ بولی۔ ”میرا نام جانا ہے۔“
 نام سن کر میں چونک گیا۔ سادہ اور جانا پہچانا نام تھا۔
 جان، جانا، جانا، جانی وغیرہ تو ہر پاکستانی نے ضرور سنا ہو گا۔

خان بولا۔ ”بہت ہی خوب صورت نام ہے۔“
 جواب میں وہی مختصر مگر دل بھاتی ہنسی سنائی دی۔ وہ بولی۔ ”میں یوکرائن سے آئی ہوں۔ ٹورسٹ ہوں اور رائٹر بھی ہوں۔ سفر کرتی ہوں اور کتاب لکھتی ہوں۔ مختلف سیاحوں کے ساتھ بیٹھ کر ان سے باتیں کرتی ہوں اور پھر کتاب میں لکھتی ہوں۔“

یہ کہہ کر اس نے ایک کتاب بیک سے نکالی۔ ان کی اپنی زبان میں تھی تو اسی لیے سب نے ایک نظر دیکھ کر اسے لوٹا دی۔ ایک لڑکی نے اسے بیٹھنے کو کہا تو وہ ہمارے درمیان ہی بیٹھ گئی اور پھر ایسا لگا کہ محفل میں شمع روشن ہو گئی ہو۔
 اس کے حسن کو اس کی انگریزی نے زیادہ دلکش بنا دیا تھا۔ ٹورسٹ کو توراں کہتی تھی۔ بلڈ کو بلا اور ٹورنو کو ٹورنو۔
 وہ بولی۔ ”میں اپنے قمر (کیمرہ) سے آپ لوگوں کی ایک تصویر اتار لوں۔“

میں نے لڑکیوں سے پوچھا تو انہیں بھی ہماری طرح کوئی اعتراض نہ تھا۔ میں نے جانا سے کہا کہ تم بیٹھو۔ میں

تصویر لیتا ہوں۔
 وہ پھر سے ہنسی اور کیرا مجھے پکڑا دیا۔ تھوڑا سا سمجھایا اور میں نے تصویر کھینچ لی۔
 دوبارہ ہنس کر بولی۔ ”لوت آف ٹھیکس۔ لوت آف ٹھیکس۔“

پھر بولی۔ ”کینیڈین کون ہیں اور اسکاٹش کون کون ہیں۔“
 ”مطیع مزے لیتے ہوئے بولا۔ ”تاڑتے ہوئے کینیڈین ہیں اور بے پردا بیٹھیں اسکاٹش ہیں۔“
 وہ بھی چمکارے لیتی بولی۔ ”میں بھی نہیں (آئی دونت اندل ستیلے)۔“

پھر خان نے اپنے گروپ کی کہانی سنائی کہ کس طرح سے ہم سیاحوں کا روپ بدل کر ڈاؤن ٹاؤن پہلی بار دیکھنے آئے تھے اور کس طرح سے ان لڑکیوں سے ملاقات ہوئی اور پھر یہ بھی بتایا کہ سرجی کس طرح سے اپنے کھوئے عشق کو مکی کے روپ میں دیکھنے لگے اور آخر میں مطیع کی بھوت والی کہانی سنائی اور کہا۔ ”اس طرح سے ہماری دوستی لڑکیوں سے ہو گئی اور سرجی بے حد خوش ہیں۔“

بچ میں لڑکیوں نے اپنے تاثرات بتائے کہ کس طرح سے ہمیں مشرق کی گراں گراں کہانی سننے کو ملی اور یہ بھی کہا کہ ہماری دوست مکی بھی بے حد خوش و خرم ہے۔

جانا بیٹھی یہ سب حیرت سے سنتی رہی۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ بہت دلچسپی سے سن رہی ہے۔ اسی دوران جو لین مجھے کہیاں مارتی رہی اور سرجی شرماء کے سر جھکائے بیٹھے رہے۔ سب سن کر جاناں سکتے کی حالت میں بیٹھی رہی اور پھر آہستگی سے بولی۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

”یقین تو نہ آتے ہوئے بھی ہم نے کر لیا اور اب تم بھی کر لو۔ دیکھو دونوں کس طرح سے جڑے بیٹھے ہیں۔“
 میں نے مسکرا کر کہا۔

اس نے اچانک سرجی کے گھٹنے پر اپنا ہاتھ رکھا اور منت سماجت کرتے ہوئے بولی۔ ”آپ دونوں کی اکٹھے ایک تصویر لے لوں۔“

سرجی تو جاناں کے لمس ہی سے کپکپانے لگے اور فقرے منہ ہی میں پھنس کر رہ گئے۔ میں نے کہا۔ ”سرجی کو ہم تصویر کے لیے راضی کر لیں گے۔ تم مکی سے پوچھ لو۔“
 اس نے مکی کی جانب طلب کرنی نظروں سے دیکھا تو

مکی نے اوکے کہہ کر ہاں کر دی۔
 پھر دونوں کی تصویر ایسے پھینچی گئی کہ مکی نے اپنا بازو سرجی کی گردن کے گرد حائل کیا ہوا ہے اور سرجی کا انگ انگ مسکرا رہا ہے۔

مجھے اندازہ تھا کہ جاناں کی کتاب کا ایک خوب صورت باب تو ان کی کہانی سے ہی سج جائے گا۔
 میں نے جاناں سے پوچھا۔ ”وہ یوکرائن سے سیدھا ٹورنو آ رہی ہے۔“

وہ کہیں کھوئی تھی۔ ہڑبڑا کر بولی۔ ”نہیں میں اوتاوا (اوتاوا) سے آ رہی ہوں۔“ جواب دے کر پھر سے اس کے گلابی چہرے پر سوچ کے سائے لہرانے لگے۔

مجھے یقین تھا کہ وہ ابھی بھوت کی کہانی میں پھنسی ہوئی ہے پوچھا کہ کیا سوچ رہی ہو تو جواب دیا۔ ”سرجی کے کینیڈا آنے کے بعد بھوت نے ان کی مکی کو نقصان نہ پہنچایا ہو؟“
 ”مطیع بولا۔ ”معلوم نہیں کہ نقصان پہنچایا یا فائدہ مگر ایک سال پہلے وہ سرجی کو اپنے تین بچوں سمیت بیکری پر ملی تھی۔“

جاناں مطمئن ہو کر اپنا سر ہلانے لگی۔ مطیع پھر سے بولا۔ ”بھوت زبان کے کپے ہوتے ہیں۔ وہ سرجی کو جب ٹورنو کی فلائٹ میں چھوڑنے آیا تو یہی کہہ رہا تھا کہ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا مگر تم جیسے انسانوں کو مرد کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ اپنا پیار کسی اور کو سونپ کر اب مستقبل بنانے کینیڈا جا رہے ہو۔ شرم بھی نہیں آتی تم کو۔“

سرجی یہ سن کر بوکھلا گئے اور اسی بوکھلاہٹ میں بولے۔ ”بھوت نے یہ تو نہیں کہا تھا بلکہ اپنی زیادتیوں کی معافی مانگ رہا تھا۔“

میں نے بات سمیٹتے ہوئے کہا کہ اب چلنا چاہیے۔ اپنے آخری سپاٹ کی جانب اور مال بھی ایک گھنٹے میں بند ہو رہا ہے۔ یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ جاناں نے پوچھا۔ ”آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”ٹیتھن فلیس اسکوائر۔“
 شہباز نے پوچھا۔ ”وہاں کیا سیارہ ہوگا۔“
 میں نے جواب دیا۔ ”ابھی سب سیاح اسی مقام پر اکٹھے ہوں گے اور کیا ہوگا۔“

جاناں پہلے کھلکھلائی اور پھر بولی۔ ”میں آپ لوگوں کے ہمراہ چل سکتی ہوں۔“
 میں نے کہا۔ ”اس ہنسی کے بدلے سرجی کی جان

مانگتی تو سب مل کر وہ بھی نکال کر دے دیتے۔“ اور پھر وہ تادیر بستی رہی۔

ہم باہر نکلے تو اترا آئی تھی مگر ایک عجیب سا ہمارا انتظار تھا۔

گورنر کی سی ایسی پھیل چکی تھی مگر روشنیوں نے دن کا سماں باندھ دیا تھا۔ عمارتیں ایسے جگمگا رہی تھیں کہ جیسے روشنیوں سے بھرے بڑے بڑے ڈبے ایک دوسرے پر احتیاط سے رکھ دیئے گئے ہوں۔ اونچی اونچی عمارتیں سر سے پیر تک اسی ڈبوں سے روشن مگر خاموش کھڑی تھیں۔ سو سو فٹ سے بڑی اسکرینیں جن پر صرف اشتہارات چلتے تھے۔ وسیع و عریض بل بورڈز ایک کے بعد ایک کمرشل آتا جاتا تھا۔ عمارتوں، اسکرینوں اور بل بورڈز کی روشنیاں آنکھوں کو خیرہ کرتی تھیں۔ ہم اسکاٹی اسکرپر بلڈنگز میں گھرے کھڑے تھے۔ ایک بار تو سب ہی یہ منظر دیکھ کر سکتے میں آ گئے۔ ہم اپنی حیرت اور خوشی کا اظہار کھلے عام بھی نہ کر سکتے تھے کہ نہ جانے لڑکیوں پر کیا تاثر پڑے گا۔ ان کی جانب دیکھا تو وہ بھی حیرت سے منہ کھولے روشنیوں کی آبشاریں دیکھ رہی تھی۔ نیلی، پیلی، گلابی، سرخ اور سفید روشنیاں اپنے گرد و نواح کو نور میں ڈبو رہی تھیں، جاناں نے اپنا کیمرا نکال کر تصویریں لینا شروع کر دیں۔ ایسا منظر تو ہم پہلے نیویارک میں بھی دیکھ چکے تھے یہاں عمارتیں نئی اور شیشوں سے بنی تھیں۔ نیویارک کا ڈاؤن ٹاؤن سو سو سالہ پرانی عمارتوں سے آباد ہے۔

ہم اپنے حواس میں واپس آئے۔ دور دور تک یہی روشنیاں اور جگمگ کرتی دنیا تھی۔ انسانی ترقی دیکھ کر انسان اشکبار تھا۔

ہم میگ اسٹریٹ پر جنوبی سمت آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ میں ارد گرد دیکھتا، سب مناظر اپنے ذہن میں سموتا چلا جا رہا تھا۔ ان عمارتوں کے بڑے بڑے ستون زمین پر گڑے تھے اور وہاں قدرے اندھیرا تھا۔ میری نظر پڑی تو ایک بے گھر عورت فٹ پاتھ پر ستون کی آڑ لے کر لیٹی تھی۔ آس پاس ایک پرانا کبل اور ایک پھنسا پرانا بیگ تھا جو اس نے سر تلے رکھا تھا۔ آدھا کبل عمارت کے چکیلے فرش پر اور آدھا اس کے اوپر تھا۔ میں سب سے آگے تھا تو مجھے ایک دم بریک لگ گئے۔ بڑے بڑے بل بورڈز اور عمارتوں کی رنگین روشنیاں اس پر پڑ رہی تھیں اور وہ واضح نظر آرہی تھی۔ میں رکا تو سبھی میرے پاس آ گئے۔ شہباز بولا۔ ”یہ تو

بوڑھی عورت سو رہی ہے۔ ہم نے سمجھا معلوم نہیں کیا دیکھ کر سکتے میں آ گئے ہو؟“

جاناں میرے ساتھ کھڑی تھی۔ کیمرا نکال کر تصویر لے لی۔ ہمارا گروپ ذرا آگے کھڑا خوش گپیوں میں مصروف تھا اور ہم دونوں وہیں کھڑے تھے۔ لگتا تھا کہ جاناں کو بھی بری طرح کوئی نہیں لگی ہے۔ خلاف معمول وہ اب کی بار نہیں ہنسی تھی۔ وہ اپنی ٹوٹی پھوٹی انگلیں میں بولی۔ ”ایک لمحے کے لیے اگر یہ سوچیں کہ وہاں میں اسی طرح لیٹی ہوں یا تم۔ ذرا یہ سوچو کہ ہم اس حالت میں کیا سوچ رہے ہوں گے؟“

میں نے ایک گہری سانس لی اور چند لمحوں کے سکوت کے بعد بولا۔ ”اگر میں ہوں تو میرے گرد روشنیاں نہیں، اندھیرا ہوگا۔ میرے اندر کچھ یادیں ہوں گی مگر وہ بھی دب چکی ہوں گی۔ کوئی کبک ہوگی مگر اس کا تو میں عادی ہو گیا ہوں گا۔ یہاں محبت، گھر سب سے بیگانہ ہو چکا ہوں گا۔ آنسو خشک اور جذبات دفن ہو چکے ہوں گے۔ بس یہ سوچتا ہوں گا کہ رات تو کسی طرح کٹ جائے گی مگر اگلا دن کیسے کٹے گا۔“

میری آنکھیں نم ہو گئی تھیں اور وہ مجھے بغور دیکھ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”تم بتاؤ کیا سوچتی اگر اسی طرح لیٹی ہوتی۔“

وہ بولی۔ ”جو تم نے محسوس کیا ہے اس سے زیادہ نہیں تو میں بھی محسوس نہ کروں گی اور جو تم نے کہا ہے وہ میں دہرانا نہیں چاہتی مگر میرے بھی یہی جذبات ہیں جو تم نے بڑے عمدہ طریقے سے بیان کر دیئے۔“

یہ سن کر میں نے قدم بڑھائے تو وہ بھی میرے ہمراہ تھی۔ میں خاموش تھا تو بولی۔ ”ایسے مناظر میں نے بہت سے ملکوں میں دیکھے ہیں۔ ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ زیادہ سوچ نہیں بلکہ آس پاس چلتی پھرتی زندگی کی طرف زیادہ توجہ دو۔“

میں اس کو کیا بتاتا کہ یہ چلتی پھرتی زندگی بھی تو موت کی جانب بڑھ رہی ہے۔ پھر روز محشر ہوگا اور مجھ سے یہ سوال پوچھا جائے گا کہ وہاں کھڑے چند ڈائلاگ تو بول آئے تھے مگر عملی طور پر کیا کیا تھا؟ حالانکہ ہم نے تم کو استطاعت بھی دی تھی۔ اس کو کچھ دے بھی دیتے تاکہ وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتی کہ رات تو کٹ جائے گی اور اگلا دن بھی۔ پھر میں نے جیب سے کچھ نوٹ نکالے اور اس کے

قریب رکھ دیئے۔

ہم چلتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے پاس سے گزرے تو جولین بھی ہم دونوں کے ہمراہ ہوئی۔ کومین اسٹریٹ پر دائیں جانب مڑے تو کچھ آگے انسانی ہجوم، ہنگامہ اور شور شرابہ برپا تھا۔ لوگ اسی جانب کھینچے چلے جا رہے تھے۔ زیر اثر کراسنگ پر سیاہوں کے ہجوم سڑک پار کرنے کے انتظار میں تھے۔

ذرا دور بلند روشن عمارتوں کے پیچھے سی مین ٹاور کی آسمان میں چھید کرتی چوچ کھڑی تھی۔ اس پر روشنی جل بجھ رہی تھی۔ پھر ایک ہنسی گونجی جس نے کسلندی کا خاتمہ کر دیا۔ یہ جاناں تھی جو کہہ رہی تھی۔ ”اوہ مائی گود (گاڈ) کیا خوب صورت نظارہ ہے۔“

ہمارے بائیں جانب اونچی اونچی خوب صورت عمارتیں تھیں اور دائیں جانب اولڈ سٹی ہال تھا اور اس کے سامنے ایک بڑا چوک تھا جہاں سیاہوں کا رش تھا۔ چوک کے پیچھے نیو سٹی ہال کی بلند اور Curve بناتیں بلند عمارتیں روشنیوں میں نہائی کھڑی تھیں۔ ان دونوں بلڈنگز کے ارد گرد بھی بلند عمارتوں کے ٹاور تھے جو ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں بلوں سے روشن تھے۔

زندہ اور پرجوش لوگوں سے چوک بھرا تھا اور اولڈ سٹی ہال سمیت چوک پر زرد اور پیلی روشنیوں نے ایک سماں باندھ دیا تھا۔ زرد روشنیوں سے سکون اور اطمینان کا احساس جاگتا ہے اسی لیے وہاں اس کے علاوہ کوئی اور رنگ نہ تھا۔ اور یہی تھن فلیس اسکوئر تھا۔

ٹورنو ڈاؤن ٹاؤن میں آج کے دن کے بعد بہت مرتبہ گیا ہوں۔ پھر اور شیشوں والی یہ بلندی عمارتیں، صاف و شفاف سڑکیں۔ فٹ پاتھ یا چمکتی دکتی دکانیں مجھے کبھی متاثر نہیں کرتیں۔ مگر ڈاؤن ٹاؤن میں جا بجا سڑک اور فٹ پاتھوں کے بیچ ایسے گم شدہ کھڑے ملتے ہیں جہاں آپ چند لمحے آسودگی سے باآسانی گزار سکتے ہیں۔ یہ ٹکڑے بہت چوڑے اور لمبے ہوتے ہیں۔ درخت لگے ہیں، خوب صورت اینٹوں کے پختہ فرش ہیں، بیچ پڑے ہیں اور ساتھ پھولوں کی کیاریاں ہیں۔ آس پاس بے خوف کبوتر زمین پر دانہ چکے نظر آرہے ہیں۔ کبھی کبھار کبوتر کسی کے کندھے پر آ بیٹھتے ہیں۔ وہ گوشہ دن میں درخت کے سایوں اور سورج کی کرنوں سے سجا ہوتا ہے۔ رات میں یہاں زرد لائٹ اسے روشن رکھتی ہے۔ ارد گرد کی روائ دنیا میں یہ گوشہ باہر

کے شور کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ ایسی جگہوں پر میں بیٹھا اپنے آپ میں گم ہو جاتا ہوں۔ پاس کی بیچ پر کوئی اور اپنی دنیا سجائے بیٹھا ہے۔ شوریدہ ماحول میں بے ایسے آسودہ مقامات آپ کو سکون بخشتے ہیں۔ فلیس اسکوئر ایسا کوئی تنہا گوشہ تو نہ تھا مگر بلند روشن عمارتوں کے بیچ مشینی لوگوں کا انہیں بلکہ زندگی سے بھرپور تہیہ لگاتے انسانوں کا ایک عارضی بڑاؤ تھا۔

فلیس اسکوئر کی خاص بات یہ ہے کہ اس کے پاس اولڈ سٹی ہال کی پرانی خوب صورت عمارت سنہری روشنیوں میں ڈوبی کھڑی ہے۔ اس چوک میں ایک بہت بڑا تالاب ہے جس پر تین محرابیں اپنے ستونوں پر کھڑی ہیں۔ پانی کے ارد گرد بیچ پڑے ہیں اور پھر ایک وسیع احاطہ ہے جہاں کا فرش، بڑے اور خوب صورت پتھروں سے بنایا گیا ہے۔ احاطے کے ایک جانب مختلف شاہیں ہیں، ٹوائلس ہیں اور شاید کچھ دفاتر ہیں۔ دوسری جانب ایک سبزہ زار ہے۔ خوب صورت تراشے ہوئے درخت میں بیٹھنے کے لیے بیچ ہیں پتھروں سے بنے پھولوں بھری کیاریوں کے احاطے ہیں۔

اس وقت وہاں انسانوں کا ہجوم تھا۔ ہر رنگ اور قومیت کا سیاح اور مقامی افراد وہاں جمع تھے۔

ارد گرد روشن اور بلند عمارتوں کا انبوہ تھا اور ان عمارتوں کا عکس تالاب کے پانیوں میں اتر رہا تھا۔ اسکوئر کے دوسری جانب بلند اور روشن نیو سٹی ہال کی عمارتیں تھیں۔ ہر ایک عمارت Curve میں تعمیر کی گئی تھی۔

ڈاؤن ٹاؤن کی عمارتوں کے علاوہ یہاں سب سے خوب صورت نظارہ اولڈ سٹی ہال کا تھا اور وہ ہر قومیت کے انسانوں کے مشاہدے کا تھا۔

کچھ لوگ کھڑے تھے۔ بہت سے جوتے اتار کر فرش پر بیٹھے تھے۔ بہت سوں نے چادریں بچھا رکھی تھیں۔ بیچ سارے بھرے پڑے تھے۔ کوئی تصویر بنا کھڑا ہے اور کوئی تصویر اتار رہا ہے۔ سب لوگ پورا دن چل چل کر یہاں آرام بھی کرتے تھے اور ماحول سے لطف اندوز بھی ہوتے تھے۔

فرش اتنا صاف و شفاف تھا کہ مٹی کا ایک ذرہ بھی نظر نہ آتا تھا جس میں ایسے فرش پر بیٹھنے میں کوئی قباحت محسوس نہ ہوتی۔ ہمارے ساتھ لڑکیاں بہت خوش نظر آرہی تھیں۔ میرے ساتھی اپنے کھلے چہروں کے ساتھ تہیہ لگا رہے

تھے۔ وہ سب ایک ہی سمت میں اپنے چہرے کیے بیٹھے تھے۔ چند نیم درز ہو گئے اور چند ایسے ہی بیٹھے گئے۔ جاناں کو اسکرٹ پی وجہ سے بیٹھنے میں دشواری پیش آرہی تھی اور آخر کار وہ ٹانگیں لپیٹ کر ہنستی ہوئی بیٹھ گئی۔ اس کی ہنسی کون کر آس پاس کے سیاح اسی کی جانب متوجہ ہوئے اور پھر بار بار اسے دیکھنے لگے۔

سرجی اور خان قیصر نے پہلے ایک دوسرے کے کانوں میں کھسر پھسر کی اور پھر کچھ کہے بغیر اٹھ کر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ہاتھوں میں شوارے، کولڈ ڈرنکس، پلاسٹک کی شیشیاں اور تاش اٹھالائے۔ شیش بچھا کر سب کو دوبارہ بٹھایا اور سرجی نے شوارے بانے۔ معلوم نہیں میگی کے لیے دو کیوں لائے تھے۔ میں نے پوچھا۔ ”اس کے لیے دو کیوں لائے ہیں۔“

بولے۔ ”وہ جس نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کہ اسے بھوک لگی ہے۔“ معلوم نہیں وہ سرجی کو کن نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ سرجی جب اسے کولڈ ڈرنک پیش کر رہے تھے تو میں نے پوچھا۔ ”وہ کیا پیاسی نظروں سے بھی دیکھ رہی تھی؟“

اور سرجی نے ذرا اثر ماکر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اب میرے ساتھیوں کی کئی لڑکیوں کے ساتھ بے تکلفی ہو گئی تھی۔ وہ کسی بات پر ہنسنے تو ایک دوسرے کے ہاتھ پر زور سے ہاتھ بھی مارتے تھے۔ ان کے ہر مسرت اور ہرجوش چہرے دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم سب ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہیں۔

اب کچھ تاش پر کوئی گیم کھیل رہے تھے اور کچھ انہیں کھیلتے دیکھ رہے تھے۔ سب نے جوتے اتارے تھے اور آرام سے بیٹھوں پر بیٹھے تھے۔ جاناں نوٹو گرائی کرنے لگی تھی۔ وہ ہم لوگوں کی تصویریں بھی اتار رہی تھی۔ موسم خشک تھا اور مجھے ٹھنڈ لگنے لگی۔ اس خشکی میں لڑکیاں نیکروں میں بھی بے حد آرام سے بیٹھی تھیں۔ تین لڑکیاں اور خان تاش کھیل رہے تھے۔ میرے دوست خان سے ذرا دور اور لڑکیوں کے قریب بیٹھے تاش کی بیگم پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

سرجی اور میگی الگ بیٹھے بھوتوں اور جنوں کی کہانیاں ایک دوسرے سے سن رہے تھے۔ مطیع اللہ ہمیشہ کی طرح چنگاری لگا کر اب تاش کھیل رہا تھا۔ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ اس کی لگائی چنگاری اب شعلہ جوالا بن چکی ہے۔

میں ایک سائیڈ پر بیٹھا سیاہوں کو دیکھنے لگا تھا۔ ہر

ایک اپنے آپ میں مست تھا۔ میں پانی کے وسیع تالاب میں فواروں کو پانی اوپر پھینکتے دیکھ رہا تھا جن پر رنگارنگ کی روشنیاں منعکس ہو رہی تھیں۔ مختلف رنگوں سے مزین بلند فواروں نے ایک عجیب سا باندا ہوا تھا۔ تالاب کے ایک جانب بڑے بڑے سفید حروف میں لفظ TORONTO۔ میرے خیال میں یہ بڑے حروف اس سارے ماحول میں کوئی خاص رنگ نہیں بھر رہے تھے بلکہ ماحول سے مطابقت ہی نہیں رکھتے تھے۔ کچھ سرسبز میدان تھے جہاں درخت لگے تھے۔ مشرقی سمت میں نیوٹی ہال کی Curve لیتی دو عمارتیں تھیں۔ دونوں آئینے سامنے تھیں۔ ایک 27 منزلہ اور دوسری 20 منزلہ تھی۔ نیوٹی ہال 1965ء میں مکمل ہوا تھا۔ یہاں شہر کے میئر کا دفتر اور کونسل ہال ہے۔ اس وقت شہر کا میئر ٹیٹھن فلپس ہوتا تھا۔ اسی نے نیوٹی ہال بنوایا تھا۔ اس سے پہلے 1895ء سے میئر آفس اولڈٹی ہال میں ہوا کرتا تھا جو اب کورٹ ہاؤس ہے۔

نیوٹی ہال میں کئی فلموں کی شوٹنگ بھی ہو چکی ہے اور اسی میٹھن فلپس اسکوائر میں بھی کئی ایک فلمیں بن چکی ہیں۔ ایک فلم میں تو نیوٹی ہال کو نیوٹرن بم سے تباہ ہوتے بھی دکھا دیا گیا ہے۔ نیوٹی ہال کا ڈیزائن جس آرکیٹیکٹ نے بنایا تھا وہ نیوٹی ہال کے افتتاح سے ایک سال پہلے یعنی 1964ء میں مر گیا تھا۔ نیوٹی ہال کو آسمان یعنی اوپر سے دیکھیں تو دو عمارتیں انسانی آنکھ کی طرح دکھتی ہیں۔ اسی لیے ان عمارتوں کو Eye of Government بھی کہا جاتا ہے۔

نیوٹی ہال اور اولڈٹی ہال کے بیچ اسکوائر پبلک کے لیے بنایا گیا۔ یہ ایک وسیع احاطہ ہے جہاں سردیوں میں اسکیٹنگ ہوتی ہے۔ گرمیوں میں فیسٹیول، کنسرٹ ہوتے ہیں۔ لیزر شو تو عموماً ہوتے رہتے ہیں۔ نیوایز کو یہاں شدید آتش بازی ہوتی ہے۔ یہ اسکوائر روشنیوں اور کرسٹل ٹری کے بلبوں کی وجہ سے اس سے بھی زیادہ روشن رہتا ہے۔

میں ان سیاہوں کو دیکھ رہا تھا جو اپنے اپنے مسائل بھول کر خوش خرم بیٹھے کھڑے یا گھومتے پھر رہے تھے۔ کوئی فرش پر بیٹھا مزے سے برگر کھا رہا ہے اور کوئی سائیکل سنبالے تھا کھڑا ہے۔ ایک گروپ ہے جس میں خواتین حضرات ہیں وہ جوتے اتارے آرام سے بیٹھے ہیں۔ لڑکیوں کی تعداد زیادہ نظر آرہی تھی شاید اس لیے کہ سب کی نظریں لڑکیوں پر مرکوز تھیں۔ بچوں کی بھی اچھی

جولائی 2018ء

124

ماہنامہ سرگزشت

خاصی تعداد تھی اور جہاں جہاں فیملیز بیٹھی تھیں وہاں بچوں کے اسٹالر بھی پارک تھے۔ دیسی اور چائیز تو دور سے پہچانے جاتے ہیں اور ان کے علاوہ ہمارے لیے تمام گورے تھے۔

ایک دیسی فیملی بچوں کے ہمراہ چادر بچھائے بیٹھی ہے۔ عمر رسیدہ خواتین نے اپنے جسم چادروں سے لپیٹ رکھے ہیں۔ ان میں جوان عورتیں اور مرد بھی ہیں۔ یہ پاکستانی لگتے تھے۔ آج چھٹی کا دن تھا تو والدین کو ڈاؤن ٹاؤن دکھلانے اپنے ساتھ لے آئے مگر وہ بوڑھے مرد اور خاتون بے زار اور بچھے بچھے بیٹھے ہیں۔ سکھ بھی بگڑیاں باندھے گھوم پھر رہے ہیں۔ ہمیں اردو پنجابی اور چائیز زبان زیادہ سنائی دے رہی تھی۔

سنا ہے کہ تقریباً پندرہ لاکھ سیاح ہر سال فلپس اسکوائر میں آ بیٹھے ہیں۔ مجھے مطیع کی منطق سمجھ نہ آئی جو یہ کہتا تھا کہ اگر پندرہ لاکھ آتے ہیں تو پندرہ لاکھ چلے بھی تو جاتے ہیں۔ پھر ق (فرق) کیا پڑا۔

جاناں بھی واپس آ گئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ”تمہاری نوٹو گرائی کیسی رہی؟“

وہ بولی۔ ”ویری گڈ (گڈ)۔“
پھر ہنسی تو میں نے کہا۔ ”ایک بار پھر ہنسو۔“
وہ پھر ہنسی اور بولی۔ ”دوبارہ کیوں ہنسوں؟“
یہ کہہ کر وہ پھر ہنسی تو میں بھی ہنسنے لگا اور بولا۔ ”تمہیں ہنسنے کی فرمائش کرنا بھی ٹائم کا زیاں ہے۔ کیونکہ یہ ہنسنا تو تمہاری عادت ہے اور ہنسنے ہوئے دیکھ کر دل کرتا ہے کہ ہنستی رہو۔“ پھر ہم دونوں ہنسنے لگے۔ جو لین بھی پاس آ بیٹھی۔

پوچھا۔ ”کیا باتیں ہو رہی ہیں؟“
جاناں بولی۔ ”یہ مجھ سے کہتا ہے کہ تم ہنسنے ہوئے اچھی لگتی ہو۔“

جو لین بے تاثر چہرے سے بولی۔ ”اس کی ہنسی اچھی لگتی ہے یا یہ خود۔“

میں جاناں سے یہ پوچھتے پوچھتے رک گیا کہ اس ہنسی کی وجہ سے تمہیں کتنے لوگوں نے کہا ہوگا کہ تم اچھی لگتی ہو مگر یہ پوچھ کر شاید جو لین دکھی ہو جاتی۔ اتنا تو مجھے بھی معلوم تھا کہ کسی ایک لڑکی کے سامنے دوسری کی بے تحاشا تعریف پہلی کے دل پر گراں گزرتی ہے۔

جاناں بولی۔ ”اس وقت کسی چورچ (چرچ) کی نوٹو لی جائے تو بہت اچھی تصویر آتی ہے۔“

ماہنامہ سرگزشت

125

میں نے کہا۔ ”باقی تو سب تاش میں غرق ہیں، کیوں نہ ہم تینوں اکٹھے کوئی نوٹو اسپاٹ ڈھونڈنے جائیں۔“
وہ دونوں تیار ہو گئیں۔ جاناں نے کہا کہ پہلے پارک کا ایک چکر لگائیں گے اور پھر آس پاس کا علاقہ دیکھتے ہیں۔ ہم کھڑے ہوئے تو ایک لڑکی سے جڑا بیٹھا مطیع بولا۔

”تم لوگ اتنی رات کو کدھر جا رہی ہو؟“
”بچپن کو سیر کرانے لے جا رہا ہوں کوئی اعتراض؟“ میں نے جواب دیا۔

”ہمیں کیا اعتراض ہوگا۔ انگریزوں کا بے حیا ملک ہے۔ کھلے عام لڑکیوں کو گھمانے پر یہاں کیا پابندی ہے۔“
یہ کہہ کر دوبارہ سے اسی لڑکی سے چپک کر بیٹھ گیا۔
ہم تینوں ہجوم میں سے گزرتے ہوئے پارک کی طرف چل دیے۔

ادھر قدرے خاموشی ہوئی تھی۔ درختوں سے ٹکرا کر آتی اور ہم سے لپٹ جاتی۔ آس پاس کا سارا جہان زمین سے آسمان تک روشنیوں میں ڈوبا تھا۔ شاید بلند روشن عمارتیں بھی اپنے پہلو میں تنہائی اور تاریکی کو حیرت سے دیکھتی تھیں۔ اونٹار یولیک سے آتی ہواؤں سے درختوں کی ٹہنیاں جھومتی تھیں۔ میرا جی کرتا تھا کہ پورے دن کی بھاگ دوڑ کے بعد کسی درخت کے تنے کے نیچے آنکھیں بند کر کے اکیلا بیٹھ جاؤں۔ یہ بے تحاشا روشنیاں کسی کو کیا خوشی دے سکتی ہیں جو ان معطر ہواؤں کا لمس دے رہا تھا۔ انسان نے اپنا دماغ استعمال کیا اور ایسے اسکا کی اسکرپر کھڑے کر دیے۔ ان میں روشنیوں کی بھر مار ایسے کردی کہ سوسال پہلے کا انسان یہ نظارہ دیکھ لے تو ہارٹ اٹیک سے مر جائے۔ مگر اللہ کی نعمتیں دیکھیں کہ سورج پورے کرۂ عرض کو حرارت اور روشنی پہنچاتا ہے، ہواؤں نے سب کو یکساں حصہ دے رکھا ہے۔ سورج سرد پڑ جائے اور ہوا میں راستہ بدل کر کوئی اور رخ اختیار کر لیں تو اس کائنات کا کیا بنے گا۔ ہوائیں رکیں تو بادل نہیں آئیں گے، بادل نہ اٹھے تو برسات نہ ہو گی، برسات نہ ہوئی تو دریا خشک ہو جائیں گے، دریا خشک ہوئے تو بجلی نہیں بنے گی اور بجلی نہ بنی تو یہ عمارتیں اندھیرے میں ڈوب جائیں گی۔ پھر بھی انسان اتراتا ہے کہ دیکھو یہ سب میرے کمالات ہیں۔ کچھ بد نصیب اور نا سمجھ سائنس اور مذہب کا موازنہ کرتے ہیں۔ ان دونوں کا کیا موازنہ؟ سائنس تو مذہب کا حصہ ہے۔ مذہب کا تو یہ موضوع ہی نہیں کہ سائنس سچی ہے یا جھوٹی۔ وہ تو اللہ پاک نے اپنی پاک

جولائی 2018ء

کتاب میں فرما دیا ہے کہ کائنات تمہارے سامنے ہے، جتنا اسے کھول سکتے ہو، اس کے بھید پالو، غور و فکر کرو، جھٹلانے والے کچھ لوگ بار بار سائنس کو بیچ میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ اسلام آباد میں فزکس کے ایک پروفیسر صاحب اکثر فزکس کے علاوہ ہر چیز پر بات کرنے کی وی پر آ بیٹھتے ہیں۔ انہوں نے شاید جس موضوع پر ڈاکٹریٹ کی تھی اس کو فزکس خود جھٹلا چکی ہوگی۔ ایک باری وی پر کسی نے کہا کہ دنیا میں جو بھی کام ہو رہا ہے تو اس کے پیچھے اللہ ہے۔ وہ صاحب کہنے لگے کہ پانی میں سیاہی گھولیں تو سیاہی اور پانی کے مالیکیول ایک دوسرے سے مل کر بانڈ بناتے ہیں تو مخلول بن جاتا ہے۔ کیا اس کے پیچھے بھی اللہ ہے؟ اس پروگرام کا میزبان وہ شخص تھا جس نے علم انوں کے حق میں کالمز لکھ کر شریعت کو رٹ میں جگہ بنائی ہوئی ہے۔ وہ بھی تائیدی انداز سے سر ہلا رہا تھا۔ ان لوگوں نے سیاست کرنی ہے تو شوق سے کریں مگر اللہ کی پادرو کو چیلنج نہ کریں۔ اس پروفیسر صاحب کے سامنے میں ہوتا تو ضرور پوچھتا کہ اگر پانی میں ایک آکسیجن اور دو ہائیڈروجن کا تناسب نہ ہوتا تو آپ سیاہی کیا، نمک کو بھی حل نہیں کر سکتے تھے۔ یہ خاصیت تو اللہ ہی نے رکھی ہے کہ پانی میں عناصر کا کیا تناسب ہوگا۔ یہی تو قانون قدرت ہے کہ سارا نظام ایک مسلسل عمل سے ایک خوب صورتی سے چل رہا ہے۔ ایک بھی چیز ادھر سے ادھر ہو جائے تو چاند زمین سے اکٹرا لے۔

مجھے حیرت کا جھٹکا تب لگا جب دیکھا کہ پارک میں ایک درخت کی سرگوشیاں کرتی ٹہنیوں تلے اللہ کو معبود جاننے والے ایک انسان نے ابد سے رہتی دنیا تک قائم رہنے والا نعرہ اللہ اکبر بلند کیا اور نماز کے لیے قبلہ رو ہو کر ہاتھ باندھ لیے۔

میں ٹھک گیا۔ وہ نماز پڑھ رہا تھا اور میں غافل بھٹک رہا تھا۔ وہ گھومنے پھرنے آیا مگر مالک کو نہیں بھولا۔ وقت دیکھا اور مقام پایا تو چپکے سے خاموش جگہ پر آ کر درخت تلے بندگی کا حق ادا کرنے لگا۔ میلے سے ہٹ کر ذرا سے ویرانے میں نماز ادا کی جا رہی تھی۔ یہ وہی نماز ہے جو میدان کارزار میں پڑھی گئی، گھوڑوں کی پشت پر پڑھی گئی، خندقوں کے اندر اور دریاؤں کے کنارے پڑھی گئی۔ بلند پہاڑوں کی بریلی چوٹیوں پر اور میدانوں میں پڑھی گئی۔ دشت میں پڑھی گئی اور صحراؤں میں پڑھی گئی۔ چھپ کر پڑھی گئی اور کھلے عام پڑھی گئی۔ جسم بیکار ہو گیا تو اشاروں سے پڑھی

گئی، یہاں تک کہ کربلا میں زیر شمشیر پڑھی گئی۔ میں کوئی دلفظ نہیں جس نے کتابوں کا بوجھ کندھوں پر اٹھایا ہو۔ نہ نیکیاں گنتا ہوں اور نہ ان کا حساب رکھتا ہوں مگر مشکل میں گھرتا ہوں تو عباد اپنے معبود کے سامنے جھک جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ وعدہ تو دینے کا تو نے کیا تھا۔ میری ضرورت آپڑی ہے تو اچھا نہیں لگتا کہ تیرے علاوہ کسی اور سے مانگوں۔ باقی تو خود جانتا ہے کہ تیرے بندے کی ضرورت کیا ہے۔ یہ یقین رکھنے کے علاوہ میں دل کی گہرائیوں سے اقرار کرتا ہوں کہ جو لطف سجدے میں ہے وہ دنیا کی کسی آسائش میں نہیں۔

ہم کو یمن اسٹریٹ پر آئے۔ سامنے شیرٹن ہوٹل کی بلند عمارت تھی۔ ہم مشرقی سمت میں بنگ اسٹریٹ پر مڑ گئے۔ ہم حیران تھے کہ اتنی کم جگہ پر اتنی بلند عمارت کیسے کھڑی کی گئی ہوگی۔ یہاں پر کوئی بلند عمارت تعمیر کی جاتی ہے تو اس زمین کے ارد گرد پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ پھر دیکھتے ہیں کہ زمین سے عمارت بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔ نہ سڑک ہلاک ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی گرد اٹھتی نظر آتی ہے۔ رات کی تاریکی میں تعمیراتی سامان آتا ہے اور رات ہی کو فالتو سامان نکالا جاتا ہے مگر یہاں تو ایک نہیں درجنوں ایسی عمارتیں سر بلند کیے کھڑی تھیں۔

جاناں میرا اور جولین کا فوٹو کھینچ کر بولی۔ ”تمہیں یقین ہے کہ یہاں کوئی چورچ (چرچ) ہے؟“

میں بولا۔ ”یقین تو نہیں صرف امید ہے۔“

وہ ہنس پڑی اس سے پہلے کہ میں اس سے ہنسنے کی فرمائش کرتا۔

میں نے جولین سے پوچھا۔ ”تھک تو نہیں گئی ہو؟“

وہ بولی۔ ”تم بتاؤ تھکی ہوں یا نہیں۔“

میں نے آسمان کی جانب دیکھ کر کچھ حساب کتاب لگایا اور کچھ دیر سوچا اور سوچ کر بولا۔ ”تھوڑی تھوڑی تھکی ہو۔“

وہ اور جانناں ایک دوسرے کا... ہاتھ پکڑ کر ہنسنے لگیں اور جولین بولی۔ ”ہاں تھوڑی تھوڑی بس۔“

اتنے میں زیر اسٹریٹ پر اشارہ سبز ہوا اور ہم بہت سے دوسرے سیاحوں کے ہمراہ سڑک کو اس کرنے لگے۔ ہم اس سڑک پر چل رہے تھے جو ڈاؤن ٹاؤن ٹورنٹو کو ایک حسن بخشی ہے۔ ہم جدید خوب صورت اور روشن بلند عمارتوں کے سائے میں چل رہے تھے۔

میں نے جانناں سے پوچھا کہ وہ ٹورنٹو کے بعد کہاں جائے گی۔ وہ ہنس کر بولی۔ ”برٹش کولمبیا (برٹش کولمبیا)۔“

”اکیلے گھومتے ڈر یا تنہائی محسوس نہیں ہوتی۔“

جولین نے پوچھا۔

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ”نہیں کبھی نہیں، میں آپ لوگوں کی طرح کے دوست بنا لیتی ہوں۔“

میں نے خدشہ ظاہر کیا۔ ”یہ خطرناک بھی تو ثابت ہو سکتا ہے۔“

وہ بولی۔ ”میں پبلک مقامات سے دور نہیں جاتی۔ اکثر وہاں جاتی ہوں جہاں سیاحوں کا رش ہو۔“

”پیسے بھی تو بہت خرچ ہوتے ہیں۔ وہ کون دیتا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ”میں بلاگ لکھتی ہوں۔ کتابیں تحریر کرتی ہوں اور آرٹیکل لکھتی ہوں۔ میرا خرچ اس سے نکل آتا ہے۔“

”مجھے بھی لکھنا سکھا دو تا کہ میری بھی آمدن شروع ہو سکے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

وہ بولی۔ ”جو دیکھو وہی لکھ دو۔ جو محسوس کرو اس کو الفاظ دے دو۔“

اس نے دو فقروں میں مجھے بہت بڑا سبق دے دیا۔ آگے ایک اور کراسنگ آیا اور اس کے بعد سڑک کے پار، ایک بڑے احاطے میں کسی قدیم گرجا گھر کی ہلکی روشنیوں میں لپٹی خوب صورت عمارت تھی۔ اس کی برجوں کے اوپر بہت بلندی پر صلیب کا نشان آویزاں تھا۔ مکمل طور پر قیمتی مگر سادہ پتھروں سے بنا چرچ بہت پر وقار اور شاندار نظر آ رہا تھا۔ اس کے گرد گھاس کے چھوٹے چھوٹے قطعے تھے وہاں لوہے کے بیج بھی پڑے تھے۔

جولین نے میرا بازو پکڑا اور بولی۔ ”وہ رہا جانناں کا چرچ۔“

میں نے اس سے کہا۔ ”میں چرچ ڈھونڈنے نہیں نکلا تھا۔ میرا اتنے زیادہ شور میں دم گھٹ رہا تھا۔ اس لیے چلا آیا۔“ وہ خاموش ہو گئی۔

میں اس کے لہجے میں چھپی تنہی کو سمجھ رہا تھا۔ جانناں سے پہلے اس کے ساتھ باتیں چل رہی تھیں۔ جانناں آئی تو اس نے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ یہ ایک طرح کی بے رخی تھی جو عورت کیا مرد بھی محسوس کرے گا۔

میں نے جولین کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

”وہاں بیچوں پر بیٹھتے ہیں۔“ اور وہ مسکرا کر چل پڑی۔

جانناں کہہ رہی تھی کہ فوٹو گرافی کے لیے اس چرچ کی لوکیشن بہت خوب صورت ہے، آس پاس کوئی بلند عمارت ہے۔ اس کی روشنیاں جو اس چرچ کے رعب و دبدبے کو نگل جائیں۔

بات اس کی صحیح تھی کہ وہ جگہ مکمل خاموش اور تنہائی میں گھری تھی۔ چرچ کی مہم سنہری روشنیاں کئی خفیہ مقامات سے نکل کر آس پاس کی فضا میں تیر رہی تھیں۔ درختوں پر پتوں کی سرسراہٹ ہواؤں سے تھی اور ان درختوں تلے رکھے بیج کسی کے انتظار میں پڑے ہوئے تھے۔

ہم دونوں بیچ پر بیٹھ گئے جہاں اندھیرے اور اجالے کا ملاپ ہو رہا تھا۔ جانناں چرچ کو فریم میں رکھ کر فوٹو گرافی کرنے لگی۔ میں نے جولین سے پوچھا۔ ”تم لوگ کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟“

وہ بولی۔ ”زیادہ دور نہیں۔ اپر ٹاؤن کے ایک ہوٹل میں ہم ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہم چار تو ڈاؤن ٹاؤن کو آگئے مگر تین لڑکیاں تھکی ہوئی تھیں اسی لیے واپس ہوٹل چلی گئیں۔“

”واپس اسکاٹ لینڈ جا رہی ہیں؟“

”ایک ہفتے بعد ہماری ٹورنٹو سے فلائٹ ہے۔ ہم پرسوں اوٹاوا اور کیوبک جا رہے ہیں۔“ وہ بولی۔

مجھے یہ جگہ بہت پسند آ رہی تھی جو احساس نیویارک میں سینٹرل پارک جانے میں آپ کے اندر آتا ہے، ویسا ہی یہاں تھا۔ ڈاؤن ٹاؤن یعنی ایک ہنگامے کے بیچ پُر سکون گوشے۔

جولین کہنے لگی۔ ”گو ہم سیاست لڑکیاں ہیں مگر پھر بھی ہر چیز ایک ہی طرح سے ہو رہی تھی۔ آج بریک کی ہے اور ہمارے لیے مختلف ہوا ہے۔ آپ لوگوں کی اچھی کمپنی ہمیں ملی۔ خوب باتیں ہوئیں، اچھے کھانے کھائے۔“ پھر ہنس کر کہنے لگی۔ ”سرجی اور میگی کا مختصر اور دلچسپ رومانس بھی دیکھ لیا۔“

میں نے پوچھا۔ ”یہ میگی کیا بیچ سرجی سے پیار کرنے لگی ہے؟ یقین نہیں آتا۔“

وہ بولی۔ ”یہ تو معلوم نہیں کہ پیار کرنے لگی ہے یا نہیں مگر یقین کیوں نہیں آتا؟“

”اس لیے کہ مغرب والے پہلے ساتھ ہو کر وقت گزارتے ہیں۔ اگر طبیعت یکساں ہو تو پیار بھی کرتے ہیں

اور شادی بھی۔“
 ”آپ ہمارے بارے میں ہم سے بڑھ کر کیسے جانتے ہیں؟“
 ”مگر یہ بھی تو عجیب لگتا ہے اور ایک گھنٹے بعد ہاتھ میں ہاتھ دے دیا۔“
 ”پیار ہونے کے لیے ایک گھنٹا تو پھر بھی بہت ہے۔“ وہ بولی۔
 ”میں نے کہا۔“ مجھے ایسا لگتا ہے کہ دونوں اداکاری کر رہے ہیں۔“
 ”شاید میکی بہت گھاگ لڑکی ہے۔ وہ میرے خیال میں سفر کی کوئی دلچسپ کہانی بنا رہی ہے۔“ جولین بولی۔
 ”مجھے بھی ایسا لگ رہا تھا کہ سرجی اور میکی دونوں جانتے بوجھے ایک دوسرے سے کھیل رہے ہیں۔ اتنے میں قریب ہی دلفریب ہنسی کی آواز آئی۔ وہ جاناں تھی کہہ رہی تھی۔ وٹ اے بیوٹی فل (What a beautiful) جولین نے پوچھا۔“ چرچ خوب صورت ہے یا پھر یہ ماحول؟“
 وہ بولی۔ ”یہ نضا اور مقام چرچ سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔“ پھر گہرا سیدھا کرتے ہوئے بولی۔ ”آپ دونوں کی ایک ایک تصویر بناؤ؟“ ہم دونوں نے کوئی جواب نہ دیا اور اس نے کمرے کا بٹن کلک کر کے تصویر کھینچ لی۔
 وہ پھر بیچ پر ساتھ آ بیٹھی۔ میں نے پوچھا۔ ”ہماری تصویروں کا کیا کرو گی؟“
 وہ بولی۔ ”آپ کو میل کروں گی۔ اپنا ایڈریس دے دینا۔“
 میں بولا۔ ”اچھا؟“
 جواب دیا۔ ”خط بھی لکھوں گی۔ آخر دوستی ہو گئی ہے جواب دو گے؟“
 میں خاموش ہو گیا۔ جولین بھی مجھے دیکھنے لگی۔
 میں نے جاناں سے پوچھا۔ ”تم کئی ملکوں کے کئی شہروں میں جا چکی ہو۔ ہر شہر میں ہر مقام پر کوئی نہ کوئی دوست بھی بنا لیتی ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ تم سب کو تصویریں بھیجو اور سب سے خط و کتابت رکھ سکو؟“
 پہلی بار وہ نہیں ہنسی بلکہ خاموش ہو گئی۔
 میں نے پوچھا۔ ”کیا برا لگا؟“

وہ بولی۔ ”برائیں لگا، میں یہ سوچ رہی ہوں کہ جب بھی میں نے تصویریں بھیجنے کی بات کسی سے کی تو دوسرے نے فوراً ایڈریس دے دیا لیکن میں نے بھی نہیں بھیجیں اور آج تم نے ایک طرح سے مجھے بتا دیا کہ تم اپنا ایڈریس نہیں دے رہے۔“
 میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ کر مسکرانے لگی اور بولی۔ ”یقین کرو کہ ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ کسی نے مجھے انکار کیا ہو، ورنہ ہر کوئی اپنا ایڈریس دے کر میرا ایڈریس بھی مانگتا ہے۔ میں نے تو کسی کو اپنا ای میل بھی نہیں دیا۔“
 ”میں نے انکار نہیں کیا بلکہ سوال پوچھا ہے۔“ میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔
 ”ایک ہی بات ہے۔ بات سمجھنے کی ہو تو سمجھ آ جاتی ہے مگر ہم خود انجان بن جاتے ہیں۔“ وہ اب کی بار یہ کہہ کر ہنسی تھی۔
 میں نے کہا۔ ”ہم راستے کے چلتے مسافر ہیں۔ اگلے موڑ پر اپنی اپنی راہ لیں گے۔ جتنا سفر اٹھتے تھا جو بہتر طریقے سے طے کر لیں تو یہ بھی بہت ہے۔ میں یہ بھی یقین سے کہتا ہوں کہ کل ہماری تصویریں ایک بار دیکھ کر ہمیں یاد بھی نہیں کرو گی بلکہ ذرا سا سوچ لو گی اور پھر شاید ہی ان تصویروں کو دوبارہ دیکھو۔ اس کے بعد ان کی جگہ نئی تصویریں آ جائیں گی اور اس کے بعد نئی اور پھر نئی اور ہماری تصویریں سب سے نیچے ہمیشہ کے لیے دب جائیں گی اور پھر سب بھول جائے گا۔“ میں بولا۔
 میں دل میں سوچ رہا تھا کہ سب بھول بھی گیا تو میرا ایڈریس دینے سے انکار تو یاد رہے گا اور اس نے یہی بات کی۔ ”سب بھول جاؤں گی مگر تمہاری یہ سچی بات ہمیشہ یاد رہے گی۔“
 میں نے کہا۔ ”اگر تم وعدہ بھی کرتی کہ میں خط لکھوں گی تو اردو میں اپنے یہ دو اشعار سناتا۔“
 وہ بولی۔ ”ہاں سناؤ۔“
 مجھ کو یاد رکھنا تھا، نہ تم نے یاد آتا تھا یہ مطلب تو تسلیاں تھیں، یہ ساتھ کہاں پر آتا تھا؟
 میں نے ترجمہ کیا اور وہ دونوں مسکرانے لگیں۔
 جاناں بولی۔ ”بہت دیپ (Deep) بات کی ہے۔“ مسکرائی پھر بولی۔ ”اب کسی سے ایڈریس نہیں لوں گی۔ صرف اسی سے لوں گی جس سے رابطہ رکھنا ہوگا۔“
 جولین بولی۔ ”یقیناً تم شادی شدہ ہو۔“

”ہاں دو بچے بھی ہیں۔ میری جان ان میں پھنسی ہے۔ اپنی بیوی کو بے پناہ چاہتا ہوں۔“ میں نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔
 ”تو زندگی میں اور کوئی نہیں آیا؟“ جاناں کریدنے لگی۔
 میں بولا۔ ”آتے جاتے رہے مگر اب جو آئی وہ جانے کے لیے نہیں دل میں گھر کر بیٹھی ہے۔“
 حیرت سے بولی۔ ”میں بھی نہیں؟“
 ”تم واقعی نہیں سمجھو گی کیونکہ مشرق بہت پراسرار ہے۔ وہاں انہونی باتیں ہوتی ہیں۔“ میں کہہ کر ہنسنے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ”واپس چلتے ہیں۔ سب انتظار کر رہے ہوں گے۔“
 ہم واپس پہنچے تو وہاں کوئی نہ تھا۔ معلوم نہیں سب کہاں بھٹک رہے تھے۔
 کہاں جا سکتے تھے۔ ادھر آس پاس ہی ہوں گے۔ یہ سوچتے ہوئے ہم فرش پر بیٹھ گئے۔ میٹس بھی لے گئے تھے۔
 جولین کو ٹھنڈ لگ رہی تھی تو میں نے اپنی جیکٹ اسے دے دی۔ اس نے بھی انکار نہ کیا اور اپنے کندھوں پر ڈال لی۔ ہمارے ارد گرد بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ تھک کر بھی سب خوش نظر آ رہے تھے۔ سب کی نظریں رنگ بدلتے نواریں پر تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے پھر شو شروع ہوا، نواریں کے اوپر آسمان پر چلتی پھرتی تصویریں تھیں۔ ساؤنڈ افیکٹ سے ان کے ڈائلاگ ہم سن رہے تھے۔ یہ تصویریں یا متحرک کردار کبھی ہمارے اوپر آ جاتے اور کبھی دور چلے جاتے۔ کوئی کہانی تھی جو دکھائی جا رہی تھی۔ ہماری کہانیوں میں ہمیشہ شہزادہ گلغام کسی شہزادی کو چھڑوانے دیو کے دیار میں جا نکلتا ہے اور ان کے ہاں شہزادہ اپنی سینڈریلا کا ایک جوتا اٹھائے اسے ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ گلغام کو اپنی شہزادی جہاں آراء مل جاتی ہے اور یہاں سنڈریلا اپنے شہزادے کے ہمراہ آخر میں رقص کر رہی ہوتی ہے۔ تہذیبیں مختلف ہیں مگر دونوں کی خوشی ملاپ میں ہے۔ ظالم کو شکست دینے پر دونوں تہذیبیں تالیاں بجاتی ہیں کیونکہ خصلتیں ایک ہیں مگر ظلم و نا انصافی بھی دونوں کرتے ہیں کیونکہ طاقت کا نشہ سب کی فطرت میں ہے۔
 رنگین کردار فضا میں تھرکتے تھے اور ہم دلچسپی سے اسے دیکھتے تھے۔
 اولڈ سٹی ہال کی محرابیں، مخروطی چھتیں، مینارے، ایک

پینلز پبلشنگ ہاؤس لاہور، ایک منفرد اور قدیم بھولا سرا اشاعتی ادارہ ہے۔ اس ادارے کے مالک عبدالرؤف ملک اپنی زندگی کی نو دہائیاں گزار کے دسویں دہائی میں قدم رکھ چکے ہیں۔ وہ یکم اکتوبر 1926ء کو لاہور ہی کے ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے جو اہل حدیث مسلک سے منسلک تھا۔ اس زمانے میں جمعیت اہلحدیث کے سربراہ مولانا داؤد غزنوی تھے۔ ان کے چھوٹے صاحبزادے ابوبکر غزنوی مرحوم عبدالرؤف ملک کے ہم عمر تھے اور دونوں پہلی جماعت سے بی اے تک اکٹھے پڑھتے رہے۔ ملک صاحب زمانہ طالب علمی سے مختلف سیاسی تحریکوں میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں طلبہ کی مختلف ترقی پسند تنظیموں سے وابستہ رہے۔ پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جوائنٹ سیکریٹری بھی منتخب ہوئے اور اس حیثیت سے تحریک پاکستان میں سرگرم حصہ لیا۔ قائد اعظم محمد علی جناح کے ساتھ تین بار ملاقات اور باہمی گفتگو کے مواقع بھی نصیب ہوئے اور ان کے ساتھ چند تصاویر آج بھی ”نظریہ پاکستان“ کے میوزیم میں محفوظ ہیں۔ عبدالرؤف ملک کو ان کے مذہبی اور سیاسی پس منظر نے اجتہادی اور جہادی غور و فکر کی طرف مائل کیا جو بتدریج انہیں ریڈیکل اور مارکسی نظریات کا مطالعہ کرنے کی طرف لے گیا۔ اس طرح ان کا رابطہ اس دور کے معروف کمیونسٹ رہنماؤں اور انقلابیوں سے ہوا اور وہ دسمبر 1945ء میں متحدہ ہندوستان کی بڑی فعال کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے رکن بن گئے۔ آزادی کے بعد وہ کمیونسٹ پارٹی پاکستان کے کل وقتی رکن بنے۔ پارٹی کے سیکریٹری جنرل کامریڈ سجاد ظہیر نے انہیں پارٹی کے اشاعتی ادارہ پینلز پبلشنگ ہاؤس کا انچارج مقرر کیا تھا۔

مرسلہ: انیس الرحمن۔ لاہور

سوتین میٹر بلند گھٹنا گھر، گول کھڑکیاں۔ سب روشنی میں نہائیں ہمارے سامنے تھیں۔ اس کے گرے براؤن پتھر چمک رہے تھے۔ وہ پانچ منزلہ عمارت پورے ماحول پر جادی تھی۔ نظریں کہیں بھی بھٹکتی رہتیں مگر آخر ٹھہرتیں اسی پر تھیں۔ گو وہ صرف سو سال پرانی تھی مگر ارد گرد کی جدید عمارتوں نے اسے بے حد قدیم بنا رکھا تھا۔

جولین نے مجھ سے پوچھا۔ ”یہ اولڈ سٹی ہال کتنا اولڈ ہے؟“

میں نے کہا۔ ”جاناں بتائے گی کیونکہ اسے مجھ سے زیادہ معلوم ہوگا۔“

”یہ اولڈ سٹی ہال ہے۔ پہلے ٹورنٹو سٹی گورنمنٹ کے دفاتر یہاں پر تھے مگر اب یہ کورٹ ہاؤس ہے اور صوبائی حکومت نے سٹی گورنمنٹ سے کرائے پر لی ہوئی ہے۔“

جاناں نے معلومات بہم پہنچائیں۔

جولین بولی۔ ”اور؟“

جاناں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اور کیا اتنی معلومات میرے لیے بہت ہے۔“

میری جانب مڑ کر جولین بولی۔ ”آپ بتائیں۔“

”یہ 1899ء کو سٹی کونسل کے حوالے کی گئی اور اس میں دس سال کام ہوتا رہا۔ اس وقت اس پر پچیس ملین ڈالر خرچ ہوئے تھے۔ 1966ء میں سٹی کونسل نے سامنے دو عمارتیں تعمیر کیں تو یہ صوبائی حکومت کو کرائے پر دے دی گئی اور اس نے یہاں کورٹ ہاؤس بنایا۔ پہلے کورٹ ہاؤس لارنس مارکیٹ میں ہوا کرتا تھا۔“ میں نے بتایا۔

جولین ہنستے ہوئے بولی۔ ”اور؟“

میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔ ”اور ایک براؤن بالوں اور سبز آنکھوں والی پیاری سی لڑکی شاید تھک چکی ہے۔ وہ سونا چاہتی ہے اور وہ کسی سے بار بار کہتی ہے کہ مجھے بیڈ ٹائم اسٹوری سنائیں تو تب سوؤں گی مگر مجھے معلوم ہے کہ رات بھر اسے فیری ٹیل کہانیاں بھی سناتے رہو تو یہ پھر بھی کہے گی اور..... اور.....“

ان دونوں کے قہقہے بلند ہوئے۔ جاناں بولی۔

”انتر سنگ۔“

میں نے جولین سے کہا۔ ”پیاری سی لڑکی کافی تو پلا دو۔ معلوم نہیں وہ سب کب آتے ہیں۔“

وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ”چلو سامنے سے لے آتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”جاناں کو لے جاؤ۔ یہ نہیں تھکی کیونکہ ابھی تک ہنس رہی ہے۔“

وہ دونوں ہنستے ہوئے کافی لینے چلے گئے۔

ہماری مختصر رفاقت ایک بے ضرر دوستی میں بدل گئی تھی۔ مجھے آج بھی وہ لڑکیاں یاد آتی ہیں کیونکہ ہم چند گھنٹوں کے لیے ہنستے ہوئے ملے تھے اور ہنستے ہوئے جدا ہو گئے تھے مگر جاناں سے ایک بار اور اسکاٹ لینڈ میں ملاقات ہوئی تھی۔

میں دس سال کا ہوں گا تو لاہور گیا تھا۔ ہمارے فلیٹ کے سامنے والے فلیٹ میں ایک خاندان رہتا تھا۔ وہاں دو بھائی میری عمروں کے تھے۔ ہماری دوستی ہو گئی تھی۔ ہم شاہ عالمی میں گھوما کرتے تھے۔ پتنگ اڑا کرتے، ٹی وی ایک ساتھ بیٹھ کر دیکھتے۔ میرے بڑے بھائی لاہور میں تھے اور جیب خرچ کے لیے اچھے خاصے نوٹ مجھے تمنا دیتے تھے۔ میں انہیں اپنے دوستوں کے ہمراہ خرچ کرتا اور وہ مجھے فضول خرچی سے باز رہنے کی نصیحتیں کرتے۔ وہ مجھے معلوم نہیں کیوں بہادر سمجھتے تھے۔ ایک لڑکے کے ساتھ مجھے لڑانے لے گئے۔ اس سے کہنے لگے کہ ہم کو تو تم نے مارا تھا مگر ہمارے اس دوست سے لڑ کر دکھاؤ جو سرحد سے آیا ہے۔ سامنے والا لڑکا پانی کے ایک حوض کے قریب لنگوٹ باندھ کر کھڑا نہانے جا رہا تھا۔ وہ حقارت سے میری جانب بڑھا اور میں نے خوف کے عالم میں اسے اٹھا کر حوض میں پھینک دیا۔ وہ گیلا ہو کر غصے میں باہر نکلا تو میں نے سوچا کہ یہ تو اب مجھے خوب مارے گا۔ میں نے اس سے دور رہنے کے لیے دوبارہ سے اسے حوض میں پھینک دیا اور دوبارہ وہ نہ نکلا بلکہ اندر ہی کھڑا گالیاں دینے لگا۔ گالی سن کر میں بھڑ گیا اور ساتھ پڑی اینٹ اٹھالی۔ وہ تو پانی میں غوطہ لگا کر غائب ہو گیا اور مجھے میرے دونوں دوستوں نے پکڑ لیا۔ باعزت و احترام واپس لائے۔ راستے میں بیان کھلایا اور ہماری دوستی اور زیادہ ہکی ہو گئی۔ سالوں گزر گئے مگر میں ان کے نام بھولا اور نہ چہرہ۔ اب بھی یاد آتے ہیں اور بہت یاد آتے ہیں۔ مختصر دوستیاں بھی کبھی بہت گہری ہوتی ہیں۔

لاہور سے واپس ڈیرہ آنے پر میں کافی عرصہ پینیل کے پتوں پر چینی ڈالے پان کی طرح چباتا رہتا تھا۔ وہ تو تپ چھوڑا جب ایک بار پکڑا گیا اور ماں سے خوب مار کھائی تھی۔

وہ دونوں کافی کے گلاس پکڑے واپس آئیں اور

ساتھ بیٹھ گئیں۔ گو کافی مجھے کبھی بھی اچھی نہیں لگی مگر یہ بھی جانتا ہوں کہ ماحول کافی سے ہی بنتے ہیں۔

میں نے گرم کافی کا تلخ گھونٹ بھر کر کڑواہٹ سے لینے سے پوچھا۔ ”کچھ اسکاٹ لینڈ کے بارے میں بتاؤ۔“

ناید کبھی آنے کا موقع ملے۔“

”کیا بتاؤں؟“ جولین سوچتے ہوئے بولی۔

”اچھا یہ بتاؤ ہم اسکاٹ لینڈ (اسکاٹ لینڈ) کیوں آئیں؟“ جاناں نے پوچھا۔

”اس لیے کہ میں وہاں ہوں۔“ جولین نے سادہ سا جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ”اور؟“

”اور یہ کہ اسکاٹ لینڈ کے بارے میں کہتے ہیں کہ دنیا اس کے آگے ختم ہو جاتی ہے۔ آگے سمندر اور پھر آگے تاریک پول۔“

جاناں نے پوچھا۔ ”اور؟“

”اسکاٹ لینڈ کا ایک تہائی ہائی لینڈ ہے۔ پہاڑ ایسے ہیں کہ جیسے گرے، گرین اور براؤن قالین ان پر بچھے ہوں۔ وادیاں سرسبز ہیں اور جھیلیں اگر دیکھنی ہیں تو آپ لوگ اسکاٹ لینڈ ضرور آئیں۔“

میں نے کہا۔ ”یہ تو ہم جانتے ہیں کہ گلاسگو اور ایڈنبرا اس کے بڑے شہر ہیں، ان شہروں میں دیکھنے کو کیا کیا خاص مقامات ملتے ہیں؟“

”ہمارا ملک بہت پُر امن ہے۔ دو سال سے ہم نے کوئی جنگ نہیں لڑی، لوگ جلدی دوست بن جاتے ہیں۔ اسکاٹ لینڈ یورپ کا واحد علاقہ ہے جہاں ابھی تک گھروں میں فیملی سسٹم برقرار ہے۔ پورا گھرانہ مل جل کر ایک ہی گھر میں رہتا ہے۔ ایڈنبرا بہت پرانا شہر ہے۔ تمام تعمیرات قدیم اور دلکش ہیں۔ پرانے چرچ، گھٹنا گھر ابھی تک اصل حالت میں موجود ہیں۔ بیشتر عمارتیں تین چار چھ منزلہ اور پرانی ہیں۔ نو نوگرانی کے لیے اسکاٹ لینڈ یورپ کا خوب صورت ترین مقام ہے۔“ جولین نے تفصیل سے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ”سنا ہے کہ سوئزر لینڈ کی طرح وہاں کی معیشت میں بھی دودھ، مکھن، مویشی، بھیڑیں، گندم کا بہت عمل دخل ہے۔“

کہنے لگی۔ ”ہاں، بہت زیادہ۔ گو کہ زیادہ لوگ میدانی علاقوں میں رہتے ہیں مگر آپ ہائی لینڈ جائیں تو وہاں سرسبز اور لہلہاتے کھیت، جانوروں کی غذا سے انی چراگا ہیں اور ان

میں چرتے جانور۔ یہ سب ہر دیکھنے والے کو حیران رکھتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”فٹنگ کا تو مجھے تم بتا چکی ہو۔ سمندر، جھیلیں اور دریا قسم قسم کی پھلی سے بھرے پڑے ہیں۔“

جاناں نے پوچھا۔ ”گھر بڑے بڑے ہیں یا چھوٹے؟“

”گھر چھوٹے مگر آرام دہ اور بہت دلکش نظر آتے ہیں۔“

جب آپ انہیں قطار در قطار کھڑا دیکھیں۔“

”چالیس سال پہلے یہاں کے لوگ اپنا ملک چھوڑ گئے تھے کیونکہ نوکریاں نہیں تھیں مگر اب صورت حال قابو میں ہے۔“

میں نے مسکرا کر کہا۔ ”اور؟“

وہ بولی۔ ”اور بھی بہت کچھ ہے مگر اب نہیں بتاؤں گی۔ جب آپ لوگ آئیں گے تو خود دیکھانے لے جاؤں گی۔“

جاناں نے اس سے ایڈریس لے لیا۔ ای میل اور فون نمبر سب ڈائری میں ڈال دیئے۔

”نیلی اور گہری جھیلیں ہیں جن میں چھوٹے چھوٹے سرسبز جزیرے ہیں۔ ان جزیروں پر لارڈز کے محلات تھے۔ اب یہ محلات ہوٹل بن چکے ہیں۔“

پڑھی ہوئی معلومات کو خیالوں میں لاتے ہوئے میں نے کہا۔ جولین بولی۔ ”میں تو ان محلات میں کبھی نہیں رہی مگر ان میں کچھ وقت، کچھ شامیں اور راتیں گزارنا کسی کے لیے بھی ایک خواب اور فینٹسی سے کم نہیں ہوگا۔ وہ جزیرے جن پر بے شمار درخت، پھول اور لش گرین گھاس ہے۔ جزیروں پر جھیل کنارے بے شمار درخت اور ایسے قلعے ہیں جہاں آپ ساری دنیا سے کٹ کر صرف جھیل کے روبرو ہوتے ہیں۔ بوس ہر وقت موجود ہوتی ہیں اور جب بھی جی چاہے آپ جھیل کے پتوں بچ بوٹ بند کر کے بیٹھ جائیں۔ تم آنا ضرور۔ میں تمہیں لے چلوں گی۔“

اس نے اپنا فون نمبر اور ای میل ایڈریس جاناں سے کاغذ لے کر اس پر لکھ کر دے دیا۔ اس سے میں نے کہا کہ اسکاٹ لینڈ جب بھی آیا تو رابطہ کروں گا۔

میں انہیں پاکستان کے پارے میں بتاتا رہا اور وہ مجھے اپنے اپنے ملکوں کی سیر کرائی رہیں۔ خاص کر جولین کے ساتھ آج زیادہ وقت گزرا تھا۔ اس لیے اس کی بے شمار خوبیاں بھی مجھ پر کھلی تھیں۔ سنجیدہ، بردبار اور کم گو۔ ہر بات

میں معنی نہیں تھی اور زبان سے کوئی بات ادھر ادھر کی ادا نہیں ہوتی تھی۔ جاناں شوخ و خشک تھی۔ اپنی خوب صورت ہنسی اور شکل کا اسے بھی ادراک تھا اور استعمال بھی خوب کرتی تھی۔

جاناں سے ٹائم پوچھا تو معلوم ہوا کہ رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ آخری سب دے ٹرین ایک بجے جاتی تھی۔ ان لوگوں کی کوئی خبر نہ تھی کہ کہاں گھوم پھر رہے ہیں۔ فلیس اسکوائر پر بھیڑ کم پڑ چکی تھی مگر پھر بھی بہت سے لوگ ہمارے قرب و جوار میں بیٹھے تھے۔ جوتے سامنے رکھے ہیں اور چادروں پر پاؤں پھیلائے بیٹھے ہیں۔ یہ سب ٹورسٹ ہیں۔ لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے سے لگ کر اپنی اپنی سوچوں میں گم ہیں جو اکیلے بھی بیٹھے ہیں وہ بھی کچھ سوچ کر مسکرا رہے ہیں جو بانہوں میں بانہیں ڈالے بیٹھے ہیں، وہ بھی مسکرا رہے ہیں۔ یہ وہ ٹورنٹو ہے جس کے بارے میں پاکستان میں بیٹھ کر پھروں سوچتا تھا اور یہی وہ ٹورنٹو ہے جہاں آج بیٹھا پاکستان کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اس کے لوگوں سے، اس کی زمین اور ہوا سے مجھے اتنی محبت ہوگی اس کا تو مجھے گمان بھی نہ تھا۔ اپنے دیس کے لوگوں کو کیا بتاؤں کہ جب بھی اس کا سوچتا ہوں آنکھیں نم ہو جاتی ہیں، سدا آباد رہے میرا وطن، سدا خوش رہیں میرے ہم وطن۔ کچھ دیر بعد پیچھے سے خان قیصر کی لاہوری پنجابی میں آواز آئی۔ ”تم کڑیوں کو لے کر یہاں بیٹھے ہو۔ ہم تمہیں پورے ڈاؤن ٹاؤن میں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔“

مڑ کر دیکھا تو سب موجود ہیں مگر سر جی اور میکی نظر نہیں آ رہے۔ میں نے تشریش سے ان کے بارے میں پوچھا تو خان ہی نے جواب دیا۔

”وہ تو ہمارے ساتھ گئے ہی نہیں تھے۔ وہ تو آپ لوگوں کے جانے کے بعد ہی کہیں منہ کر گئے۔“

”اور سر جی اپنا بڑا سفری بیگ بھی ساتھ لے گئے؟“ میں نے پوچھا۔

شہباز نے جواب دیا۔ ”ہاں وہ سر جی کے ساتھ بڑا بڑا لگ رہا تھا تو میکی نے اٹھا لیا تھا۔“ وہ لوگ پلاسٹک کی شیشیں بچھا کر قریب ہی بیٹھ گئے۔

جاناں بولی۔ ”مجھے صبح جلدی اٹھنا ہے۔ میرا ہوٹل قریب ہی ہے۔ میں اب چلتی ہوں۔“ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ ہنسی تو جیسے کوئل بول اٹھی۔ پھر بولی۔ ”بہت اچھا وقت آپ لوگوں کے ساتھ گزرا۔ مجھے

ہمیشہ یاد رہے گا۔“

مفتی جو ایک لڑکی کے سائیڈ میں کھڑا معلوم نہیں کہاں پہنچا ہوا تھا وہ بولا۔ ”آپ بہت خوب صورت ہیں۔ ہمیں بھی یاد رہے گی۔“

پھر باری باری وہ شہباز اور خان کے علاوہ سب سے گلے ملی۔ مجھ سے ملی تو پتا چلا کہ وہ گالوں سے گال بھی ملارہی ہے مجھ سے ملائے، ہنسی اور پھر چلی گئی۔

ہم دوبارہ بیٹھ گئے۔ جولین نے مجھے خاموش بیٹھے دیکھا تو کہا۔ ”اس کو اپنا فون نمبر اور ای میل کیوں نہیں دے جب کہ وہ مانگ بھی رہی تھی؟“

میں نے کہا۔ ”یہ اس کا پروفیشن ہے اور پروفیشنل لوگ ہماری طرح جذباتی نہیں ہوتے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ ہمیں یہاں سے جاتے ہی بھول جائے گی۔“

لڑکیاں بتا رہی تھیں کہ ہم ادھر ادھر آوارہ گھوم رہے۔ پھر ایک پارک میں جا بیٹھے اور وہاں مطیع نے ہمیں پاکستان کے لطیفے سنائے۔ وہاں ایک بینڈ کا کنسرٹ ہو رہا تھا، ہم نے وہ سنا اور ڈانس کر کے خوب ہنگامہ کیا۔

میں نے مطیع سے پوچھا۔ ”کیسا ہنگامہ کیا؟“ اردو میں بولا۔ ”یہی کہ شہباز بھانے کر کے لڑکی کو اٹھا لیتی، اس کو پھر چھوڑتی تو وہ بھاگ جاتا تو یہ پھر اٹھ لیتی۔“

”اور مفتی نے کیا ہنگامہ کیا؟“ ”مفتی (مفتی) اٹھا نہیں سکتی تھی تو لڑکی کو گدگدیاں کرتی تھیں۔“

”اور خان؟“ ”لڑکیوں نے خان سے شروع میں کہہ دیا ہے۔ ہمارے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔“

”اور تم؟“ ”سو ات کا پٹھان ان کافروں کو کہاں گھاس ڈالتی ہے۔ بس کبھی کبھار غلطی سے جوش میں آ کر گلے لگ گئی تھی۔“

ہم گپ شپ کر رہے تھے کہ سامنے سے سر جی اور میکی آتے دکھائی دیئے۔ میکی نے سر جی کا بیگ اٹھا رکھا تھا اور دونوں بہت خوش و خرم دکھائی دیتے تھے۔

وہ قریب آئے تو میں نے سر جی سے کہا۔ ”وقت دیکھا ہے؟“ لنگے بھی گھروں کو سدھا رکھے اور ہم آپ کا انتظار کر رہے ہیں؟“

خان مسکرا کر بولا۔ ”کہاں سے آرہے ہیں؟“ میکی بولی۔ ”یہ مجھے ڈاؤن ٹاؤن کی ویران گلیاں دکھانے لے گئے تھے۔ کہتے تھے کہ یہاں اکثر ٹی وی ڈراموں کی شوٹنگ ہوتی ہے مگر پھر یہ راستہ بھول گئے۔“

”ڈراموں کی شوٹنگ؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

سر جی شپٹا کر بولے۔ ”ہاں پچھلے دنوں بھی ایک ڈراما میں نے دیکھا تھا۔ ساری شوٹنگ یہیں آس پاس ہی ہوئی تھی۔“

میں مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ مطیع بولا۔ ”سر جی تو لوکیشن بھی دیکھ آئے؟“ مفتی بولا۔ ”اب چلنے کا کیا پروگرام ہے؟“

”سائنس تو لینے دو۔ آتے ہی ہمیں نشانے پر رکھ لیا ہے۔“ سر جی بولے اور پھر میکی کو لے کر ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ ہجوم آہستہ آہستہ اسکوائر سے چھٹ رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ زمین پر کوئی لفافہ، کوئی گند بلکہ ایک تنکا بھی نہیں ہے۔

سیاح خود ہی وہاں کی صفائی کر رہے تھے۔ سوچتا تھا کہ یہ تربیت انہوں نے کہاں سے حاصل کی ہوگی۔ جواب بھی میرے پاس تھا کہ مغرب کے اسکولوں میں بچے جب پری اسکول میں داخل ہوتے ہیں تو سب سے پہلے انہیں اپنی جسمانی صفائی اور پھر جگہ کی صفائی کی تربیت کلاس ہی میں دے دی جاتی ہے۔ کلاس میں چیزیں فرش پر بکھیر دی جاتی ہیں اور بچہ ہر چیز کو اپنی جگہ قرینے سے رکھتا جاتا ہے اور کاغذ کے ٹکڑے وغیرہ ڈسٹ بن کی نذر کر دیتا ہے۔ ان بچوں کے پاس کوئی کاپی پینسل نہیں ہوتی بلکہ کلاس روم میں تعلیمی کھلونے وغیرہ ہوتے ہیں۔

ایک لڑکی نے کہا۔ ”جانے سے پہلے اگر کوئی کچھ کہنا چاہیے؟“

سب سوچ میں پڑ گئے۔ اس بات پر ایک خاموشی سی چھا گئی۔ بلاشبہ ہمارے ساتھ لڑکیوں نے بھی ایک دوسرے کی کمپنی کو بہت انجوائے کیا تھا۔ اتنے بھرپور ساتھ کے بعد اچانک ہمیشہ کے لیے پھڑنا بھی اداس کر دیتا ہے۔ دونوں باتیں یقینی تھیں کہ جدا بھی ہونا تھا اور افسردہ بھی۔ لڑکیاں ہمارے ساتھ ایسے کھل مل گئی تھیں کہ نہ جانے کب سے ہمارا آپس کا ساتھ ہے۔ سر جی کچھ سوچ کر بولے۔ ”یہ سچ ہے کہ میں ایک لڑکی کو چاہتا تھا جو میکی کی طرح دکھتی تھی۔ میں نے میکی کو سچ بتا دیا ہے کہ مطیع کی بھوت والی کہانی صرف گپ

تھی۔ دوستی یا کسی بھی رشتے میں جھوٹ نہیں ہونا چاہیے، کوئی بھی رشتہ یا تعلق جھوٹ پر بنتا ہے تو وہ پائیدار نہیں ہوتا۔ مجھے خوشی ہے کہ میکی نے بھی میرے سچ کو سراہا اور بھوت کہانی پر بہت ہنسی۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہم دوبارہ بھی ملنے ہیں یا نہیں مگر مجھے یقین ہے کہ جب بھی ہم ایک دوسرے کو یاد کریں گے تو عزت و تکریم سے یاد کریں گے۔“

سر جی کا اعتراف سن کر پہلے تو میں حیران رہ گیا مگر بعد میں ان کے لیے عزت میرے دل میں اور بڑھ گئی۔ تمام لڑکیاں اور ہم سب دوست بھی سر جی کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

میں نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ ”اتنے اچھے دن کا اتنا خوب صورت اختتام ہوگا، اس کا مجھے گمان بھی نہ تھا۔ میں دل سے کہتا ہوں کہ آج کا دن بہت خوب صورت اور یادگار تھا۔ میں اسے کبھی نہیں بھولوں گا۔“

میکی بولی۔ ”سر جی نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ وہ شادی شدہ ہیں اور تین بچوں کے باپ ہیں۔ یہ سچے انسان ہیں۔ بہت مخلص اور خیال رکھنے والے۔ عام مردوں کی طرح فکرت نہیں ہیں۔ میں سر جی سے رابطہ رکھوں گی اور یہ بھی رکھیں گے۔ ہماری دوستی ایک مضبوط دوستی ہوگی۔“

ایک لڑکی کہنے لگی۔ ”اتنا ڈرامائی اختتام بھی آج کے دن کا ہوگا؟ میں صرف یہ کہہ پاؤں گی کہ آج کا دن بہت اچھا تھا۔ اچھے لوگ تھے اور اچھا وقت گزرا۔“

پھر سب نے کچھ نہ کچھ کہا۔ آخر میں جولین بولی۔ ”میں ایک اداس دل کے ساتھ آپ سب سے جدا ہو رہی ہوں۔ ابھی کچھ اور دن ہم کینیڈا میں ہیں اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ سارے دن میں آپ لوگوں کو مس کروں گی۔ آپ اگر اسکاٹ لینڈ آئیں تو ضرور رابطہ کریں۔ دوبارہ ملنے کا انتظار کروں گی۔“

گپ شپ اور مذاق میں بنا ایک تعلق سنجیدگی اختیار کر گیا اور آخری لمحوں میں دوستی میں بدل گیا۔ پھر ہم ایک دوسرے سے ملے۔ سب اداس تھے۔ مغموم تھے اور ایک دوسرے کی جانب زیادہ دیکھتے بھی نہ تھے۔ میرا خیال تھا کہ رخصت ہوتے وقت سر جی کوئی ڈراما کریں گے مگر وہ مسکراتے رہے۔ لڑکیاں چلی گئیں اور جب ہم واپس اپارٹمنٹ پہنچے تو سب خاموش اور تھکے ہوئے تھے اور رات کا ایک بج رہا تھا۔

(جاری ہے)

جولائی 2018ء

جہان دیگر

شیراز خان

یہ دنیا، پیاری سی دنیا اپنے اندر کیسے کیسے عجائبات رکھتی ہے جو سامنے آئے تو ہم دانتوں تلے انگلیاں دبالتے ہیں۔ ایسے ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ انہی میں سے چند انوکھی، حیران کردینے والی باتیں۔

ان مقامات کا تذکرہ جو عقل کو کند کر دے

یہ دنیا بہت عجیب ہے، بہت دلچسپ بھی ہے۔ ہم اگر پوری دنیا کو گھوم پھر کر دیکھنے کا موقع حاصل کر لیں تو بقول میر: ”سرسری تم جہان سے گزرے۔ ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا۔“

ہماری آنکھیں حیرت سے کھلی رہ جائیں۔ ہم پر ایسے ایسے بھید آشکار ہوں کہ ہم گنگ ہو کر رہ جائیں۔ نہ صرف مناظر ہمیں متوجہ اور حیرت زدہ کرتے ہیں۔ بلکہ واقعات بھی پریشان کر کے رکھ دیتے ہیں۔ کیوں ہوا ایسا؟ کیوں کر ہوا؟ ہم اس جہان سے اگر سرسری گزر جائیں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ سب کچھ نارمل ہے لیکن اگر ہم غور سے دیکھیں تو بہت کچھ ہے۔ چلیں کچھ واقعات کی ابتداء کرتے ہیں۔

یہ زمانہ 1587ء کا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب مختلف ممالک کے لوگ اپنے اپنے وطن سے ہجرت کر کے کہیں اور قسمت آزمائی کرنا چاہتے تھے۔ کسی کو سونے کی تلاش تھی۔ کوئی نئی کالونی آباد کرنا چاہتا تھا۔ اسی کھوج میں بہت سے لوگ جان و ہاٹ کے ساتھ شامل ہو گئے، وہ ایک مہم جو تھا۔ اس کا کام یہی تھا کہ وہ انجانی زمینوں کی سیر کرتا رہے اور نئے نئے مواقع تلاش کرے۔

لوگ اس کے بارے میں جانتے تھے کہ وہ ایک

باہمت انسان ہے اور جس بات کا ارادہ کر لیتا ہے اس کو مکمل کر کے رہتا ہے۔

اس بار اس نے اعلان کیا کہ وہ راون کے آئی لینڈ کی طرف جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ کیوں کہ وہاں امکانات بہت زیادہ ہیں۔

جان انگلینڈ کا باشندہ تھا۔ لوگوں نے اس کے اعلان کو سنا اور اس کا ساتھ دینے کو تیار ہو گئے۔

رون کے آئی لینڈ موجودہ کیرولینا میں تھا۔

اب سامان سفر کی فکری ہوئی۔ طے پایا کہ اس پہلے سفر میں عورتوں اور بچوں کو نہیں لیا جائے گا۔ بلکہ صرف مرد حضرات چلیں گے اور وہاں امکانات دیکھ کر واپس آ کر اپنے گھر والوں کو لے جائیں گے۔

یہ قافلہ پچاس افراد پر مشتمل تھا جس کا لیڈر خود جان تھا، کیوں کہ یہ تحریک اسی کی تھی۔

یہ سفر ایک پرانے بحری جہاز سے شروع ہوا تھا۔ اس کی حالت اگرچہ زیادہ بہتر نہیں تھی لیکن اتنا ضرور تھا کہ وہ جہاز منزل تک پہنچا سکتا تھا۔

سفر شروع ہوا۔ سمندر میں اگرچہ طغیانی بھی تھی اس کے باوجود یہ جہاز خیر و خوبی کے ساتھ کیرولینا کے ساحل پر پہنچ گیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہاں ویرانی ہوگی کون رہتا ہوگا؟ لیکن جب انہوں نے ساحل پر کچھ لوگوں کو دیکھا تو حیران رہ گئے۔

ساحل والوں نے بھی جہاز کو لنگر انداز ہوتے دیکھ لیا تھا۔ وہ سب دوڑتے ہوئے جہاز والوں کے پاس آ گئے۔

جان اور اس کے ساتھیوں نے اس قسم کے ویران علاقوں میں رہنے والوں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا کہ اس طرح کے لوگ وحشی ہوتے ہیں۔ وہ کسی اجنبی کو برداشت نہیں کرتے۔

لیکن یہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ بلکہ وہ لوگ بہت مددگار اور دوست مزاج ثابت ہوئے تھے۔

وہ جان اور اس کے ساتھیوں کو اپنے ساتھ اپنے مہمان کے طور پر لے گئے۔ جان اور اس کے ساتھی ان کی زبان سے نا آشنا تھے وہ لوگ جوبان بول رہے تھے۔ وہ یورپ میں اس وقت بولی جانے والی کسی زبان سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔

ایک گھنٹے کے سفر کے بعد وہ لوگ انہیں اپنے ساتھ ایک بستی میں لے آئے۔ جان یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ

وہ ایک منظم قسم کی بستی تھی جس میں دکانیں بھی تھیں۔ پختہ گھر بھی بنے ہوئے تھے۔ شجرکاری بھی بہت سلیقے سے کی گئی تھی۔

جان اور اس کے ساتھی یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ اس بستی کی لڑکیاں بہت خوب صورت تھیں۔ شوخ و چنچل جوگلیوں میں رنگین تیلیوں کی طرح اڑتی پھر رہی تھیں۔ ان اجنبی لوگوں کو دیکھ کر وہ لڑکیاں ان کے ارد گرد جمع ہو گئی تھیں۔

ان میں سے ایک لڑکی ایسی بھی جس کی نگاہیں جان پر رہی لگی ہوئی تھیں۔ وہ ایک جوان اور بہت خوب صورت لڑکی تھی۔ خود جان بھی اس وقت بہت ہینڈ سم تھا۔ اس کی عمر تیس بیس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے گھٹنر یا لے بال ایک خاص انداز سے اس کی پیشانی پر پڑے رہتے تھے۔ جان نے ان خوب صورت نگاہوں کی پسندیدگی محسوس کر لی تھی۔

اس نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ اسی بستی میں قیام کرے گا اور پھر یہیں سے زندگی کے نئے سفر کی ابتداء کرے گا۔

اس نے رات کے وقت اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ انہیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ سب کے سب اسی مقصد سے تو اپنے وطن سے نکلے تھے۔ سب کا یہی خیال تھا کہ وہ یہیں اپنا مستقل ٹھکانا کر لیں گے۔

اس رات جان کو بہت دیر تک نیند نہیں آ سکی تھی۔ اس لڑکی کا خیال آتا رہا تھا۔

صبح وہی لڑکی اس کے دروازے پر کھڑی تھی۔ ان لوگوں کو دو مختلف جھوپڑیوں میں ٹھہرایا گیا تھا۔ دونوں جھوپڑیاں بہت بڑی بڑی تھیں۔ جان جب صبح اپنی جھوپڑی سے باہر نکلا تو وہی لڑکی دروازے پر کھڑی تھی۔ اس نے جان کو دیکھ کر کہا: ”اجنبی صبح بخیر۔“

”تم انگریزی جانتی ہو۔“ جان نے حیرت سے پوچھا۔ ”ہاں یہاں بہت سے لوگ انگریزی جانتے ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”لیکن کیسے؟“ ”یہاں تم جیسے مسافر آتے رہتے ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”ہم نے ان ہی سے تمہاری زبان سیکھی ہے۔“

جان کے لیے یہ ایک خوشگوار بات تھی۔ اس نے لڑکی کا نام پوچھا۔ اس نے اپنا نام سلویا بتایا تھا۔ یہ بھی ایک جانا پہچانا نام تھا۔ اس دن وہ بہت دیر تک اس لڑکی

سچ کی تلاش

حبیب اللہ کلکانی کامل کے نزدیک شمالی کے رہنے والے تھے۔ وہ تاجک برادری سے تعلق تھے۔ اس وقت (1929ء) میں افغانستان پر امان اللہ کی بادشاہت تھی۔ امان اللہ مغربی ثقافت سے بہت متاثر تھے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب ترکی میں اتاترک مغربی اصلاحات و ثقافت نافذ کر چکے تھے۔ امان اللہ نے بھی انہیں نافذ کرنا چاہا۔ ترک عوام نے چار و ناچار حکومتی اقدام کو قبول کر لیے لیکن افغان عوام اپنی اسلامی اقدار کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔ کامل میں افغانی رد عمل کی لہر اٹھی اور آٹا نا تمام ملک اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ امان اللہ کی فوج کا ایک بڑا حصہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔ جلد ہی یہ طوفان شمالی تک پہنچ گیا۔ افغانی ہمیشہ سے قبائل اور گروہوں کی صورت میں رہے ہیں اور اپنے سردار یا جرگہ کا فیصلہ مانتے ہیں۔ یہ صورت حال اب تک برقرار ہے۔ شمالی میں حبیب کلکانی اپنے قبیلے کا ایک مضبوط اور بہادر سردار تھا۔ تمام متحارب گروہ اپنے سرداروں کی سرکردگی میں بادشاہ امان اللہ کے خلاف متحد ہو گئے۔ جب حالات قابو سے باہر ہونے لگے تو امان اللہ اپنا تخت اپنے بھائی عنایت اللہ کے سپرد کر کے کامل سے فرار ہو گیا۔ کچھ روایات کے مطابق ان متحارب گروہوں کے سرداروں کی طرف سے نئے بادشاہ عنایت اللہ کو خط بھیجا گیا کہ یا تو وہ امان اللہ کی نافذ کردہ نام نہاد اصلاحات واپس لے لے یا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔ وہ خط کے جواب میں تخت ہی سے دست بردار ہو گیا۔ ان متحارب گروہوں میں سب سے مضبوط سردار حبیب اللہ تھے لہذا متفقہ طور پر انہیں حکومت کے لیے منتخب کیا گیا۔ حبیب اللہ بادشاہت کے نظام کے خلاف تھا اس لیے اس نے خادم دین رسول اللہ غازی حبیب اللہ کہلوانا پسند کیا۔ بعد ازاں نادر شاہ نے طاقت اکٹھی کر کے حبیب اللہ اور ان کے ساتھیوں سے حکومت چھین لی۔ ان پر بغاوت اور لوٹ مار کے الزامات لگا کر پھانسی دے دی اور تمام ساتھیوں سمیت ایک گڑھے میں پھنکوا دیا۔

مرسلہ: قرۃ العین۔ اقراء شی، کراچی

کے ساتھ رہا۔ وہ بہت اچھی لڑکی ثابت ہوئی تھی۔ اس نے جان سے پوچھا۔ ”اب تم واپس تو نہیں جاؤ گے نا؟“

”نہیں، میں جلد سے جلد واپس جاؤں گا۔“ جان نے بتایا۔ ”تاکہ میں اسی طرح جلد سے جلد وہاں کے معاملات نمٹا کر تمہارے پاس آسکوں۔“

جان کے ساتھ آنے والوں کا بھی یہی ارادہ تھا۔ ان سبھوں کو یہ علاقہ بہت پسند آیا تھا۔ وہ سب اسی جہاز سے واپس آ گئے۔ اب انہیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس بستی میں انگریزی جاننے والے اچھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ وطن واپس پہنچ کر ان سبھوں نے اپنی دریافت کے بارے میں بتا دیا۔ ایک نیا امکان دنیا کے سامنے آ گیا تھا۔ ایک بڑی نوآبادی وجود میں آنے والی تھی۔ انہیں واپسی کی جلدی تھی۔ کیوں کہ ان میں سے ہر ایک کسی سے پیمانہ وفا باندھ کر آیا تھا۔

ایک مہینے کے بعد ان کی واپسی ہوئی۔ اس بار ان کے ساتھ میں چالیس نئے افراد بھی تھے۔

یہ سب بہت بے تابی سے ساحل پر اترے تھے لیکن اس بار انہیں ساحل پر کوئی دکھائی نہیں دیا۔ ایک سناٹا تھا۔ وہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ بڑھتے چلے گئے لیکن کچھ بھی نہیں۔ حیرت انگیز طور پر اس بستی کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔

ایسا کچھ بھی نہیں تھا جس سے یہ بتا چل سکے کہ یہاں کوئی بستی بھی ہوا کرتی تھی۔ بستی کے گھر وہاں کے لوگ سب کے سب نہ جانے کہاں غائب ہو چکے تھے۔ زمین کھا گئی تھی یا آسمان نکل گیا تھا۔ کوئی آثار نہیں۔

ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ دیکھ کر گئے تھے وہ خواب تھا یا اب کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔

یہ دنیا کی چند بڑی مسٹری میں سے ایک ہے۔

☆.....☆

ماضی بعید میں ایسا ہوا کرتا تھا کہ جب کسی کو موت کی سزا دینی ہو تو اس کی کمر میں ایک بڑا سا پتھر باندھ کر اسے سمندر میں پھینک دیا جاتا تھا۔

وہ بے چارہ ہاتھ پاؤں بھی نہیں مار پاتا تھا اور سمندر کی تہ میں ڈوبتا چلا جاتا تھا۔

لیکن جب کوئی پتھر ہی تیرنا شروع کر دیتا تو پھر کیا ہوتا۔

جی ہاں! دنیا میں ایسے بھی کچھ علاقے ہیں جہاں

بڑے بڑے پتھر اپنی جگہ سے چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ پانی میں بھی تیرتے ہیں۔ یہ کوئی عام پتھر نہیں ہوتے بلکہ سینکڑوں پاؤں وزن کی ہوا کرتے ہیں اور ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو کوئی طوفان بھی اپنی جگہ سے گردش نہیں دے سکتا۔ پھر بھی وہ سیکڑوں فٹ تو گھسٹتے چلے جاتے ہیں۔

ایسے پتھر نواداد غیرہ کے ساحل پر پائے جاتے ہیں۔ اس اسرار کا آغاز اس وقت ہوا جب ساحل کے پاس رہنے والے ایک قبیلہ کے افراد نے ساحل پر ایک بہت بڑا پتھر دیکھا۔

اس ساحل کے آس پاس غیر مہذب قبائل آباد تھے۔ وہ ہفتے میں ایک دن سمندر کی پوجا کرنے اور اسے بھینٹ چڑھانے کے لیے ساحل پر آیا کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو سمندر ان کے گھروں میں گھس آئے گا۔ ان کی بستیاں برباد کر دے گا۔ اسی لیے وہ ہفتے میں ایک بار ساحل کی طرف آیا کرتے۔

اس بار انہوں نے ایک بڑی چٹان ساحل پر دیکھی۔ یہ چٹان وہ پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے وہ دکھائی نہیں دی تھی۔ ان کے عقیدے کے مطابق سمندر دیوتا ان کے لیے وہ چٹان چھوڑ گیا تھا۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ ایک ہفتے کے بعد وہ چٹان اپنی جگہ سے بہت دور دکھائی دی۔ وہ سمجھ گئے کہ سمندر دیوتا کے بچے اس چٹان کو کھیلنے کھیلنے ادھر سے ادھر لے جا رہے ہیں۔ اس چٹان کے علاوہ دوسری چٹانیں بھی اسی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتی پائی گئیں۔

اب کیا تھا۔ ان لوگوں کو ایک اور دیوتا مل گیا تھا۔ وہ دیوتا جو ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا رہتا ہے۔

موجودہ دور میں بھی ان چٹانوں کی ستم ظریفیاں برقرار ہیں۔ ان کا سفر جاری رہتا ہے وہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک چلتے رہتے ہیں۔ ان کی تعداد درجنوں میں ہے۔

☆.....☆

اس صورت حال پر ریسرچ ہو چکی ہے۔ سائنس دان گروپ کی شکل میں آتے اور تحقیق کرتے ہیں۔ طرح طرح کے مفروضے قائم کیے جاتے ہیں کہ یہ دیویکل پتھر خود بخود کیسے ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جاتے ہیں۔ بہر حال یہ سب اسی دنیا میں ہوتا رہتا ہے۔ یہ ایک بھید بھری دنیا ہے۔

☆.....☆

یہ بھی ایک عجیب اسرار ہے۔ اس کا مرکز پہلے تو تاؤس تھا لیکن اب یہ پوری دنیا میں جانا جاتا ہے۔

یہ ایک ایسی جھنجھٹا ہٹ ہے جیسے ڈیزل کے انجن سے نکلتی ہے۔

یہ پراسرار آواز دنیا کے بہت سے علاقوں میں سنی جاتی ہے۔ ایک طرف کینیڈا میں تو انتہائی جانب یورپ کے کچھ علاقوں میں۔ ایک جانب برطانیہ میں تو دوسری طرف امریکا اور میکسیکو میں۔

یہ ایسی آواز ہے جیسے ہزاروں افراد کچھ گا رہے ہوں۔ کوئی انجانا سا گیت۔ جس میں ایک طرح کا تقدس اور جوش پایا جاتا ہے۔

یہ کیا ہے۔ ہزاروں افراد ایک ساتھ مل کر کیوں ایسی جھنجھٹا ہٹ پیدا کر رہے ہیں۔ یہ کون ہیں جو کسی انجانے دیوتا یا دیوی کے حضور اس کی تعریف کے گیت گا رہے ہیں۔ بھی بھی آوازیں صاف بھی ہو جاتی ہیں اور کچھ بول بھی سنائی دیتے ہیں لیکن وہ بول ایسی زبان میں ہوتے ہیں جو موجودہ دور کی کسی زبان سے نہیں ملتی۔

☆.....☆

ان آوازوں کے بارے میں طرح طرح کے مفروضے قائم کیے گئے لیکن وہ صرف مفروضے ہی ہیں۔ ان پراسرار آوازوں کی حقیقت ابھی تک سامنے نہیں آ سکی ہے۔

☆.....☆

یہ دنیا بہت عجیب ہے۔

یہ طرح طرح کی کہانیوں سے بھری ہوئی ہے۔ پراسرار واقعات کا ایک سلسلہ ہے جو دنیا کے ہر ملک میں ہے۔

یہ واقعات سائنس دانوں کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ان کی سچائی کا سراغ لگانے میں اپنی زندگی کھپا دیتے ہیں۔ ان ہی کی کوششیں ہیں کہ آج ہم دنیا کے بے شمار اسرار سے واقف ہو چکے ہیں۔

☆.....☆

ان بے شمار اسرار میں گمشدہ براعظموں کا معاملہ بھی ہے۔ نہ جانے کتنی داستانیں بیان کی جاتی ہیں۔

☆.....☆

ان میں سب سے مشہور اٹلانٹس ہے جو کسی زمانے میں یونان کے ارد گرد تھا۔ پھر کسی حادثے نے اسے سمندر کی آغوش میں اتار دیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بہت تہذیب یافتہ لوگ تھے جو سمندر میں چلے گئے۔ اس جزیرے کے آثار دریافت کر لیے گئے ہیں۔

☆.....☆

اسی طرح ہمارے یہاں وادی سندھ کی قدیم

تہذیب تھی جس کا شاہکار مونیوڈرو ہے۔ جس کی گلیاں نکاسی کا نظام آج بھی دیکھنے والوں کو حیران کر دیتا ہے لیکن آج بھی یہ ایک مسٹری ہے کہ اس شہر کے لوگ ایک دم سے کہاں غائب ہو گئے، کہاں چلے گئے؟ اگر یہ کسی قسم کی ہجرت تھی تو کیسی ہجرت تھی۔ یہ سب تو مشہور خطے ہیں۔ اب کچھ ایسے خطوں کو بھی دیکھیں جن کے بارے میں لوگ کم واقف ہیں۔

☆.....☆

تیس ہزار قبل مسیح سے سولہ ہزار سال قبل مسیح تک یہ ملک بھارت کے جنوبی سرے پر بیان کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ملک یا جزیرہ کسی انجانے حادثے کی وجہ سے غائب ہو گیا یا ڈوب گیا تھا۔ اس شہر کو بحر ہند کا اٹلانٹس کہا جاتا ہے۔ دیکھا کسی حیرت انگیز دنیا ہے۔

☆.....☆

آدم کا پل۔ جی ہاں! یہ اسی نام سے اب تک جانا جاتا ہے۔

یہ پایاب چونا پتھر کا ایک سلسلہ ہے جو بھارت کی ریاست تامل ناڈو کے جزیرہ یا منان سے سری لنکا کے جزیرہ منارنگ جاتا ہے۔

☆.....☆

ماہرین کے خیال میں یہ پل کسی زمانے میں بھارت اور سری لنکا تک زمینی راستے کا کام دیا کرتا تھا۔

☆.....☆

ہندو عقیدہ کے مطابق رام نے جب سیتا کو سری لنکا کے راجاراون کے جنگل سے چھڑانے کے لیے سری لنکا پر حملہ کیا تو فوج کو وہاں تک لے جانے کے لیے ہنومان نے وہ پل بنایا تھا جب کہ دیگر مذہب والوں کا کہنا ہے کہ جزیرہ سے باہر آنے کے لیے آدم نے یہ پل بنایا تھا۔

☆.....☆

یہ پل اب ڈوب چکا ہے لیکن اس کے آثار باقی ہیں۔ ایک اور علاقہ بھی ہے جس کو سنڈ لینڈ کا نام دیا گیا ہے۔ یہ بھی غائب ہو چکا ہے اس کے ارد گرد انڈونیشیا اور سماٹرا وغیرہ تھے جو آج بھی ہیں۔

☆.....☆

سوال یہ ہے کہ جب سے یہ دنیا بنی ہے۔ نہ جانے کتنی تہذیبیں جنم لے کر فنا ہو چکی ہیں۔ نہ جانے کیسے کیسے ترقی یافتہ لوگ یہاں ہوں گے لیکن اب ان کا نشان تک باقی نہیں ہے۔

☆.....☆

اسی لیے کہا گیا کہ اللہ بس باقی ہوں۔

ہتھیار

منظر امام

انسان کو اللہ تعالیٰ نے خلیفۃ الارض بنا کر دنیا میں بھیجا مگر ساتھ میں شیطان بھی آگیا۔ جس نے انسانوں کو بھٹکانے کا بیڑا اٹھا رکھا تھا۔ حکم ربانی ہے کہ انسانیت کی خدمت کرو جب کہ شیطان نے انسانیت کی تباہی کا سامان پیدا کرنے پر زور دیا۔ یہ شیطان کے پجاری انسان کو قتل کرنے کے لیے مہلک سے مہلک ہتھیار تیار کرنے لگے۔

قتل و خون ریزی کے لیے کیسے کیسے ہتھیار ہیں اسی کا تذکرہ

یہ انسان بھی کیا ہے۔ ایک دوسرے کو ممکن حد تک زندہ رکھنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ اس کے لیے فضلیں اگاتا ہے۔ دوائی بناتا ہے۔ ایک دوسرے کا علاج کرتا ہے۔ کوئی ناگہانی ہو جائے تو ایک دوسرے کی مدد کے لیے بھی پہنچ جاتا ہے۔ آگ سے گھرے ہوئے مکانوں میں سے لوگوں کو باہر نکال لاتا ہے۔ سیلاب آجائے تو ڈوبتے ہوؤں کو بچانے کے لیے خود اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی وہ دوسری طرف انسان و مارنے کے لیے طرح طرح کے ہتھیار بھی بناتا ہے۔ تیر، تلوار سے لے کر ایٹم بم تک اور اس سے بھی آگے۔

ذرا انسانی تاریخ اٹھا کر دیکھیں، کتنے لوگ انسانوں کے درمیان ہونے والی جنگوں میں مارے جاتے ہیں۔ ذرا سی بات ہوئی ایک دوسرے پر فوج کشی کر دی۔ بستیوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ گولہ بارود کی برسات کر دی۔ یہ سب شروع

ماہنامہ سرگزشت

138

سے ہوتا آیا ہے۔ انسانی تاریخ میں شاید ہی ایسا کوئی دور رہا ہو جب مکمل سکون ہو، اگر کہیں سکون ہے تو دوسری طرف موت کا بازار گرم ہے۔ اگر ایک طرف پھول بانے جارہے ہیں تو دوسری طرف موت دی جا رہی ہے۔ ہتھیار اور انسان کا ہمیشہ سے ساتھ رہا ہے۔

پہلے اس نے ہتھیار اپنے بچاؤ کے لیے بنائے تھے۔ کیونکہ اب سے لاکھوں سال پہلے کا انسان طرح طرح کی آفتوں میں گھرا ہوا تھا۔

ہر طرف دیو ہیکل جانور گھومتے پھرتے تھے جو موقع پاتے ہی اسے اچک لے جاتے۔ انسان نے ان سے مقابلہ کرنے کے لیے پہلے تو عام پتھروں کا سہارا لیا ہوگا پھر جب عقل آئی تو اس نے پتھروں کو گھس گھس کر نوکیلا بنا لیا، جو عام پتھروں کے مقابلے میں زیادہ مہلک تھا۔

بہت عرصے کے بعد اس نے ہڈیوں کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا یعنی ہتھیاروں کی تاریخ بہت قدیم رہی ہے۔ یہ ہتھیار اپنے بچاؤ کے لیے ہوتے تھے۔ پھر انسان نے ان ہتھیاروں سے دوسروں کو مارنا شروع کر دیا اور آج تک مارتا چلا آ رہا ہے۔

آئیں ذرا ہتھیاروں کی تاریخ دیکھتے ہیں۔ 15000 برس پہلے پتھروں کو پھینک کر یا دور سے مارنے کے اصول پر انسان نے تیر کمان کا بنیادی اصول وضع کیا۔ جانوروں کے سے تانت بنا کر کمان بنائی اور تیر کی نوک بہت تیز کر لی جو کسی بھی جسم میں اتر سکتی تھی۔

2500 BC۔ انسان نے تانبے کا استعمال سیکھ لیا، اس نے لوہے کا استعمال بھی جان لیا اور بے ڈھنگی قسم کی تلواریں بھی بنانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کلباڑیاں بھی بنانی شروع کر دی ہیں۔ اسی دور میں تانبے کے خود بھی بنائے گئے تاکہ دشمن کے وار سے بچ سکیں (یعنی یہ وہ زمانہ ہے۔ جب انسان ایک دوسرے سے جنگ کرنے لگا تھا)

1800 BC۔ انسانی ذہن نے خاصی ترقی کر لی ہے۔ وہ گھوڑوں کو سواری کے طور پر نہ صرف استعمال کر رہا ہے بلکہ گھوڑوں کو جنگ کے میدان میں بھی لے آیا ہے۔

اس نے دو گھوڑوں والی تھہ بنالی ہے جو بہت تیز رفتار ہے اور جس پر سپاہی سوار ہو کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

1500 BC۔ جنگ کے میدان میں جو تیر استعمال ہو رہے تھے ان کی پہنچ زیادہ دور تک نہیں تھی لیکن

جولائی 2018ء

اب انسان نے ایسے تیر اور کمان بنائے ہیں کہ جو دو سو سے تین سو گز دور تک مار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ براعظم ایشیا میں گھڑ سوار اور تھہ سوار دسے ایسے ہی تیروں کو استعمال کر رہے ہیں۔

(یہاں یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ اب دیو ہیکل جانوروں کا عہد گزر گیا۔ اب سارے ہتھیار انسان اپنے جیسے انسانوں کے خلاف استعمال کر رہا ہے)

1100 BC۔ تیر اور کمان کی ٹیکنالوجی میں اور ترقی ہو گئی اب تیروں کی پہنچ اور دور تک ہونے لگی۔

800 BC۔ ایک زبردست انقلاب۔ آسوریوں نے لوہے کو فولا دینا کی ٹیکنالوجی حاصل کر لی ہے۔

اب آسوری جو تیر بنا رہے ہیں۔ وہ بہت مہلک اور مضبوط ہیں۔ ان سے دشمنوں کی صفوں میں تباہیاں زیادہ تیزی سے پھیلائی جا رہی ہیں۔

340 BC۔ اب ہتھیاروں میں بہت تبدیلیاں آچکی ہیں۔ مقدونیہ والوں نے ہتھیاروں کو نئی جہت دی ہے۔ یہ عہد قلم دوم اور سکندر اعظم کا ہے اب زرہ، بکتر، ڈھالیں، طرح طرح کی تلواریں، تیر، نیزے وغیرہ استعمال ہونے لگے ہیں۔

اب تلواریں زیادہ غضب ڈھا رہی ہیں۔ رتھوں کو بہت سبک رفتار کر لیا گیا ہے۔ اب باقاعدہ ایک مملکت دوسری مملکت سے ٹکرانے لگی ہے۔

یعنی انسانوں نے اپنے جھگڑوں کا دائرہ بہت وسیع کر لیا ہے۔

299 BC۔ رومن حکمرانوں نے اپنی تلواروں کو اور مہلک بنا لیا۔ انہوں نے اپنے ہتھیاروں کے بل پر ایک مضبوط سلطنت قائم کر رکھی۔

ہندوستان میں ایک اور قسم کے ہتھیار سے کام لیا جا رہا ہے۔

یہ ہے انسانی زہریلی لڑکیوں کا ہتھیار۔ جنہیں ویش کنیا کہا جاتا ہے۔ چندر گپت مور یہ کے عہد میں یہ ہتھیار اپنے عروج پر تھا۔

ہوتا یہ تھا کہ جب کوئی بچی پیدا ہوتی اور وہ خوب صورت بھی ہوتی تو اسے راج محل میں بلا کر اس کی پرورش شروع کر دی جاتی۔

اسے زہریلا بنانے کے لیے بہت تھوڑی مقدار میں سکھیا دی جاتی اور آہستہ آہستہ سکھیا کی مقدار بڑھاتے چلے

ماہنامہ سرگزشت

139



جاتے۔

محل میں اس کی پرورش بہت شاندار طریقے سے کی جاتی۔ اس کا خوب خیال رکھا جاتا۔ اس کو رقص وغیرہ کی تربیت دی جاتی اور جوان ہو جانے پر وہ اتنی زہریلی ہو چکی ہوتی کہ صرف اپنی سانسوں سے کسی کو مار سکتی تھی۔

اس زہریلی لڑکی کو دشمن راجاؤں کے پاس کسی بہانے سے بھیج دیا جاتا اور دشمن راجا اس کی سانسوں کے زہر سے ہلاک ہو جاتا۔

چانکیہ نے اپنی مشہور کتاب ارتھ شاستر میں اس طریقے کا ذکر کیا ہے۔ چانکیہ چندر گپت کا مشیر اور وزیر تھا۔

جولائی 2018ء

ہندو میٹھا لوجی میں بھی اس قسم کی کنیاؤں کا ذکر ہے۔
قدیم ہندو روایت میں ایک خاص کنیر سلوچنا کا ذکر ملتا ہے جو
صرف دیکھ کر مار سکتی تھی۔

آہستہ آہستہ یہ روایت ختم ہوتی چلی گئی لیکن
ہندوستان کی کہانیوں اور فلموں میں اب بھی اس کے چرچے
ہوتے رہتے ہیں جیسے اوم پرکاش شرما کی مشہور کتاب ”ایک
اور وٹ کنیا“ 2007ء کے ایک ناول میں ایسی زہریلی
لڑکیوں کا ذکر ہے جو نوجوانوں میں ایڈز تقسیم کرتی ہیں۔ اس
موضوع پر فلمیں بھی بن چکی ہیں۔

1943 میں بننے والی فلم لیلیا اور۔ 1991ء میں
بننے والی فلم جس میں پوجا بیدی نے اہم کردار ادا کیا تھا۔
2013ء میں ایکٹا کپور کا ٹی وی سیریل پودھا اکبر
میں بھی زہریلی لڑکی موجود ہے۔

برطانیہ میں 1976ء سے 1987ء تک ایک
میوزک بینڈ بہت مقبول رہا ہے۔ اس بینڈ کا نام ہی زہریلی
لڑکیاں تھیں۔

ہم 299 BC تک آئے تھے۔ اب ذرا آگے کا
جائزہ لیتے ہیں، یہ وٹ کنیا نہیں تو درمیان میں آگئی تھیں۔
250 BC چینوں نے کراس کمان ایجاد کر لی۔
اب تیر اندازی بہت فاصلے سے کی جاسکتی ہے۔ اس ایجاد
نے میدان جنگ میں لڑنے والوں کے لیے آسانیاں پیدا
کر دیں۔

674 عیسوی مسلمانوں کے ایک بحری بیڑے نے
مجنیق کا استعمال کیا۔ یہ بازو لٹیتوں کے خلاف جنگ میں کیا
تھا۔ اس کی مدد سے پتھروں کے بڑے بڑے گولوں کی بارش
ہوتی تھی۔

1040 عیسوی۔ چینوں کا ایک انقلابی قدم، پہلی
بار انہوں نے گن پاؤڈر (بارود) کا استعمال کیا۔ دشمنوں پر
اب آگ کی بارش ہو سکتی تھی۔

1139 عیسوی۔ یورپ میں کراس بوکا استعمال۔ یہ
استعمال چین والے صدیوں پہلے 250 عیسوی میں کر چکے
تھے۔

1200 عیسوی۔ برطانیہ (ویلز) کی جنگ میں
تیروں کو دور تک پھینکنے کے لیے ایک بہت بڑی کمان
استعمال کی۔

1298 عیسوی۔ برطانیہ میں اونچی کمان جس نے
دشمنوں کو بہت نقصان پہنچایا۔

1327 عیسوی۔ ہتھیاروں کی تاریخ میں ایک
انقلابی قدم۔ پہلی بار توپ کا خاکہ تیار کیا گیا۔

1395 عیسوی۔ چودھویں صدی کے درمیان پٹہ
دار (فولڈر ہونے والی) بندوقیں استعمال ہونے لگیں۔

1450 عیسوی۔ فرانس نے میدان جنگ میں دو
عدد ہلکی توپوں کا استعمال کیا۔ اس مہلک ہتھیار نے فرانس کی
خیم میں نمایاں کردار ادا کیا۔

1453 عیسوی۔ ترکوں نے جنگ کے دوران
دشمنوں کے شہر پر منجنیق سے 19 ٹن وزنی پتھر برسائے۔

1610 عیسوی۔ فرانس میں ایک ایسے ہتھیار کا
استعمال ہوا جس سے فائرنگ کی جاسکتی تھی۔

1688 عیسوی۔ فرانسیسی فوج نے پہلی بار
Bayonet راکٹ کا استعمال کیا۔

1775 عیسوی۔ جنرل گاگا نے امریکی حریت
پسندوں کے خلاف برطانیہ کی مدد کے لیے ایسے اوزار بیچے جو
دشمنوں کے ہتھیاروں کو ناکارہ بنا سکیں۔

1807 عیسوی۔ اسکاٹی لینڈ کے الیگزینڈر نے
پرکوشن کپ ایجاد کر لیا۔ یہ ایک اہم پیش رفت تھی۔

1846 عیسوی۔ پیرس کے ایک بندوق ساز نے
بندوقوں کے لیے ایک نیا اور زیادہ اثر والا کارتوس بنالیا۔

1848 عیسوی۔ پہلی بار ایک جنگ میں لوڈنگ گن
کا استعمال ہوا۔

1884 عیسوی۔ اب تک یہ ہوتا آیا تھا کہ جب
بندوق سے کارتوس فائر ہو جاتا تو پھر دوسرا کارتوس بھرنا
پڑتا تھا۔ ہیرام میکسم نے خود کار سٹم متعارف کروایا جو مشین
گن کی ابتدائی شکل تھی۔ اس میں کارتوس خود بہ خود خالی جگہ
کو پُر کر دیتے تھے۔

1892 عیسوی۔ فریڈرک لوگارٹ نے جنگ میں
اپنی بنائی ہوئی مشین گن کا کامیاب مظاہرہ کیا۔

1405 عیسوی۔ جرمنوں نے برطانیہ اور فرانس کے
بحری جہازوں کو روکنے کے لیے پہلی آبدوز یا بوٹ سمندر
میں اتار دی۔

1406 عیسوی۔ برطانیہ نے ایک طاقت ور بحری
بیڑہ سمندر میں اتار دیا۔

1907 عیسوی۔ امریکا نے اپنی بحریہ کی طاقت کا
مظاہرہ کیا۔

1911 عیسوی۔ نیوٹن نے ایک ایسی ہلکی مشین گن

متعارف کروائی جس کو بہ آسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ
لے جاسکتے تھے۔

1913 عیسوی۔ اولمپیا کے ایئر شو میں پہلی بار ایک
لڑاکا طیارے نے پرواز کی۔

1915 عیسوی۔ نئی ایجاد ٹینک چرچل کے سامنے
پیش کی گئی، چرچل نے اس ایجاد کی بہت تعریف کی۔

1915 عیسوی میں ہالینڈ کے ایک ڈیزائنر نے ایسی
مشین گن متعارف کروائی جس کے ذریعے لڑاکا طیارے
اب اور تیز رفتاری سے گولیاں برسانے لگے۔

1915 عیسوی جرمن طیاروں کو جدید مشین گنوں
سے آراستہ کر دیا گیا۔

1925 عیسوی۔ جینیوا میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رو
سے جنگ میں جراثیمی ہتھیاروں کا استعمال ممنوع ہو گیا
(ہائے اس زدو پشیاں کا پشیاں ہونا) اس معاہدے کے
باوجود جراثیمی ہتھیار استعمال ہوتے رہے ہیں۔

1939 عیسوی۔ آئن اسٹائن نے ایٹم بم کی تیوری
پیش کی۔

1942 عیسوی۔ ایک برطانوی انجینئر نے جرمنوں
کے خلاف ایک گھومتے ہوئے بم کا استعمال کیا۔

1942 عیسوی۔ امریکا کے رابرٹ کو نیو کلیئر
ہتھیاروں کے پروجیکٹس کی ذمہ داری دے دی گئی۔

جون 1944 عیسوی۔ لندن کی فضاؤں میں پہلی بار
اڑتے ہوئے بم دیکھے گئے۔

ستمبر 1944ء۔ پہلی بار V3 راکٹ سے لندن پر
حملہ ہوا۔

1944 عیسوی۔ جاپان کے پائلٹ کی خود کش
لینڈنگ۔

1945 عیسوی۔ امریکی سائنس دانوں نے میکسیکو
کے صحرا میں ایٹم بم کا تجربہ کیا۔

6 اگست 1945۔ امریکا نے جاپان کے شہر ہیروشیما
پر ایٹم بم گرا دیا۔ 80 ہزار افراد ہلاک۔

9 اگست 1945۔ ناگاساکی پر دوسرا ایٹم بم گرایا
گیا۔ ہزاروں ہلاکتیں۔

1949 عیسوی۔ پہلے روسی ایٹم بم کا کامیاب
تجربہ۔

1951 عیسوی۔ امریکا نے اپنے ہائیڈروجن بم کا
تجربہ کیا۔

13 جولائی 1931ء کو سینٹرل جیل سری نگر میں
مقدمے کی سماعت کا دن تھا۔ کشمیریوں کا باہر احتجاج
جاری تھا۔ کشمیری قیادت لوگوں کو پراسن رہنے کی اپیل
کر رہی تھی۔ بے قابو ہجوم دیکھ کر ڈوگرہ حکومت حواس
باختہ ہو گئی۔ بجائے معاملہ سلجھانے کے گورنر نے ہجوم پر
گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ اتفاق سے مسلمان نماز ادا
کرنے کے لیے باغیچے میں پہنچ چکے تھے۔ پہلی گولی اذان
دینے والے کو لگی وہ نیچے گر پڑا اس کی جگہ دوسرے نے
لے لی۔ اسی طرح 22 افراد نے اذان مکمل کی اور جام
شہادت نوش کیا۔

مرسلہ: اظہر نورین۔ کراچی

1953 عیسوی۔ پہلا روسی ہائیڈروجن بم کا میاب
تجربہ۔

1962 عیسوی میں کیوبا میں ایٹمی میزائل پلانٹ کی
تنصیب جس کے خلاف پوری دنیا میں ہنگامہ ہوا۔

1962 عیسوی۔ روس کے خروشیف اور امریکی
صدر کینیڈی کے درمیان معاہدہ۔ جس کے تحت کیوبا کا
پلانٹ بند کر دیا۔

1962ء سے 2014ء تک اندازہ لگائیں کہ یہ دنیا
کتنے مہلک ہتھیاروں سے بھری گئی ہوگی۔

اور اب تو لیزر گنز، نہ نظر آنے والے ہتھیار، ڈرون
اور نہ جانے کیا کیا ہیں، جو حیرت ہوں کہ یہ دنیا کیا سے کیا ہو
جائے گی۔

یہ کہانی کہاں سے شروع ہوئی تھی، ایک مجبوری سے
ایک ضرورت سے کہ جنگی جانوروں سے خود کو بچانا ہے۔
اس کے بعد کہاں تک آگئی۔

انسان نے انسان کو مارنے کے کیسے کیسے سامان
ایجاد کر لیے۔ ایک دوسرے پر فوقیت لے جانے کی تمنا نے
انسانیت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔

ایک دفعہ شاید چرچل سے یہ پوچھا گیا کہ جناب یہ
فرمائیں تیسری جنگ عظیم کن ہتھیاروں سے ہوگی۔

تو اس مرد دانے نے کیا جواب دیا۔ اس نے کہا کہ میں
یہ تو نہیں بتا سکتا کہ تیسری جنگ عظیم کن ہتھیاروں سے ہوگی
لیکن چوتھی جنگ عظیم پتھروں اور ڈنڈوں سے ہوگی۔

یعنی انسان وہیں پہنچ جائے گا جہاں سے اس نے اپنا
سفر شروع کیا تھا۔

☆



پلندہ ثابت ہو گئے۔ اس نے جن لوگوں، اسکولوں کے نام بتائے اور جو پتے لکھوائے ان کا سرے سے یا تو کوئی وجود ہی نہیں تھا یا پھر وہ اس کی تفصیلات سے قطعی مطابقت نہیں رکھتے تھے لیکن ایسی کوئی منطق نہیں تھی جو اسے اپنا بیان بدلنے پر مجبور کر سکتی۔ میکسیکو کے مشہور ماہر نفسیات ڈاکٹر جوز اور ماہر بحرمیات ڈاکٹر الفانسو، چھ مہینے تک اس کا نفسیاتی امتحان لیتے رہے۔ شروع شروع میں مورنارڈ ان دونوں ڈاکٹروں کی طرف سے مشکوک نظر آتا تھا لیکن رفتہ رفتہ وہ ان سے بے تکلفی سے باتیں کرنے لگا اگرچہ اس نے انہیں ایسی کوئی بات نہیں بتائی جو اس کے نزدیک اہم تھی، وہ اپنے بارے میں خود ہی بہت کچھ بتانے لگا۔

دونوں ڈاکٹروں نے اسے صحیح معنوں میں ایک غیر معمولی شخص پایا۔ وہ روانی سے کئی زبانیں بول سکتا تھا۔ عورتوں کے لیے پُرکشش تھا اور مردوں کے نزدیک پسندیدہ۔ اس کی ذہانت اعلیٰ درجے کی تھی۔ بہت بردبار تھا اور اچھی اداکاری کر لیتا تھا۔ اسے قمار بازی، کوہ پیمائی اور موٹر بوٹ چلانے سے بہت دلچسپی تھی۔ کئی معاملات میں اس کی ہنرمندی اور چابکدستی غیر معمولی تھی۔ وہ اندھیرے میں چارمنٹ سے بھی کم وقت میں ماؤزر رائل کے حصے الگ کر کے انہیں دوبارہ آپس میں جوڑ سکتا تھا۔ وہ اسٹالن کے نظریات کا کٹر حامی تھا۔ وہ کئی مرتبہ اپنی ماسکو ٹریننگ سے بے وفائی کر چکا تھا۔ باتوں کے دوران اس نے ایک موقع پر کامو کا ذکر کیا۔ مغرب میں کامو کو شاید ہی کوئی جانتا ہو لیکن وہ NKVD میں ایک ہیرو کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کی تاریخ سوویت یونین کے ان اسکولوں میں پڑھائی جاتی تھی جہاں جاسوسی کی غرض سے کسی ملک میں خفیہ طریقے سے داخل ہونا اور تباہی پھیلانا سکھایا جاتا تھا۔

جب اس کے تلفظ کا امتحان لیا گیا تو یہ بات سامنے آئی کہ اگرچہ اس کی فرانسیسی عمدہ تھی لیکن اس میں اسپینش لب و لہجہ کی جھلک تھی۔ شواہد سے بھی یہ ثابت ہو گیا کہ وہ اسپینش کمیونسٹ پس منظر کا حامل تھا اور پھر ستمبر 1950ء میں ماہر بحرمیات ڈاکٹر الفانسو کو میڈرڈ پولیس ڈیپارٹمنٹ کی پرانی گرد آلود فائلوں میں ایک ایسے فنکر پرنس مل گئے جو مورنارڈ کے فنکر پرنس سے ہو بہو مطابقت رکھتے تھے۔ اس شخص کا نام ریمن مرکیڈر تھا۔ وہ 1935ء میں ایک نوجوان کمیونسٹ کی حیثیت سے بارسلونا میں گرفتار ہوا تھا۔ فائل میں اس کی تصویریں بھی تھیں۔ اس طرح یہ ثابت ہو گیا

جلاد وطن بزرگ لی اوٹروٹسکی کے ارتکاب قتل کا اقبالی بیان دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”قتل کا یہ واقعہ 2 اگست 1940ء کو میکسیکو سٹی کے مضافات میں واقع ٹروٹسکی ولاء میں پیش آیا تھا جس کی دیواریں اسٹیل سے بنی تھیں، جہاں سخت پہرہ رہتا تھا اور کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ اس بہیمانہ سیاسی قتل کے جرم میں مورنارڈ کو بیس سال کی سزا ہوئی تھی جو اسے میکسیکو کے مرکزی جیل میں کاٹی تھی۔

بیس سال قید کاٹنے کے بعد یہ سفاک قاتل 1960ء میں جیل سے رہا ہوا۔ اس پورے عرصے میں وہ اپنی شناخت، قتل کے محرکات اور سیاسی وابستگیوں کے بارے میں کچھ بھی بتانے سے انکار کرتا رہا تھا۔ اس کی زبان بندی اور اپنی شناخت ظاہر نہ کرنے کے موقف پر سختی سے ڈٹے رہنے کے باوجود آنے والے ماہ و سال میں اس کی شناخت کی کڑیاں بتدریج آپس میں ملتی چلی گئیں۔ وہ درحقیقت ایک اسپینش تھا اور اس کا نام ریمن مرکیڈر تھا جو 1964ء میں پچاس سال کا تھا اور قتل کرنے کے ہنر میں ماسکو سے تربیت یافتہ تھا۔ اس نے دنیا بھر میں سب سے خوف ناک سیکرٹ پولیس آرگنائزیشن، ایس ایس ایس، سوویت اسٹیٹ سیکورٹی جو اس زمانے میں NKVD کہلاتی تھی کے احکامات پر عمل کرتے ہوئے ٹروٹسکی کا قتل کیا تھا لیکن چونکہ وہ نہایت شدو مد سے اپنی اصلی شناخت ظاہر کرنے سے انکار کرتا آرہا تھا لہذا اس قتل کے منصوبہ سازوں نے بھی یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ اس جرم سے ان کا کوئی تعلق تھا یا یہ کہ وہ کسی بھی طرح اس میں ملوث تھے۔

جب وہ گرفتار ہوا تھا تو اس کے پاس سے تین صفحے کا ایک بیان برآمد ہوا تھا جو فرانسیسی زبان میں تیار کیا ہوا تھا۔ اس پر پینسل سے دستخط کیے گئے تھے اور تاریخ ڈالی گئی تھی۔ اس بیان میں یہ تحریر تھا کہ وہ ایک پرانی بیلجیم فیملی سے تعلق رکھتا تھا، یہ کہ وہ پیرس میں جرنلزم کی تعلیم کے دوران ٹروٹسکی کی تحریک کے دوران گرفتار ہو گیا تھا۔ اس نے ٹروٹسکی سے ملاقات کی تھی اور پہلی ہی ملاقات میں اسے ٹروٹسکی سے نفرت ہو گئی تھی اور جب اس بوڑھے اشتراکی نے اسے اس بات پر مجبور کرنے کی کوشش کی کہ وہ سوویت یونین جائے اور اسٹالن کو قتل کرنے کی منصوبہ بندی کرے تو اس نے بالآخر ٹروٹسکی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کر لیا۔

اپنی گرفتاری کے بعد اس نے اپنے بیان میں جو تفصیلات بتائیں اور جو دعوے کیے وہ بہت جلد جھوٹ کا

سیاسی قتل

نیرہ احتشام

ٹروٹسکی ایک بہت بڑا نام ہے، اس نے کمیونزم کے خلاف ایک محاذ بنا رکھا تھا۔ اس کی اس جسارت پر کمیونسٹ برہم تھے، اس کے دشمن بن چکے تھے۔ مگر امریکی اور برطانوی حکومتیں اس کے لیے ڈھال بن کر کھڑی تھیں۔ کہیں کوئی کمیونسٹ اسے اغوا نہ کر لے اس وجہ سے اس کی حفاظت کے لیے کمیونسٹ مخالف قوتوں نے سخت پہرے بنھا رکھے تھے۔ دوسری جانب کمیونزم کے حامیوں نے بھی اس کے اغوا کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔ دونوں جانب رسہ کشی جاری تھی کہ ٹروٹسکی کا قتل ہو گیا، قاتل کون تھا؟

عالمی سیاست کی بساط پر کھیلایا گیا ایک خونی ڈراما

”میں نے اپنا رین کوٹ اتار کر میز پر رکھ دیا تاکہ اس کی جیب میں رکھی ہوئی برف توڑنے والی ہتھوڑی آسانی سے نکال سکوں جو ایک طرف سے بے حد نوکیلی تھی۔ جب ٹروٹسکی نے میرا مضمون پڑھنا شروع کیا تو میں نے ہتھوڑی نکالی اور آنکھیں بند کر کے اس کے سر پر ایک شدید ضرب لگائی۔ اس کے منہ سے ایک طویل دلخراش چیخ بلند ہوئی۔ ”آ..... آ..... آ.....“ ایسی دردناک اور طویل چیخ جو میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ وہ پاگلوں کی طرح اٹھا اور مجھ پر جھپٹ پڑا۔ اس نے میرے ہاتھ پر کاٹ لیا۔ دیکھو اس کے دانت کے نشان اب بھی موجود ہیں۔ میں نے اسے زور سے دھکا دیا اور وہ فرش پر گر پڑا۔“

اپنے وقت کا سب سے مشہور اور پراسرار جاسوس اور قاتل جو اپنے آپ کو جیکیز رونا روڈ کہتا تھا، اشتراکیت کے

کہ مورنار ڈور حقیقت ریمون مرکیز تھا۔
☆.....☆

بارسلونا میں ریمون کا مکان ڈھونڈنا مشکل نہ تھا۔ وہاں اس کا بوڑھا باپ ڈون مرکیز موجود تھا جو ریٹائرمنٹ کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اسے ٹروٹسکی کے قاتل کی تصویر دکھائی گئی۔ اس نے تصویر کو بہت اچھی طرح دیکھا اور پھر کہا۔ ”ہاں، یہ میرا بیٹا ہے۔“

ڈون مرکیز کو اپنے بیٹے کے جرم کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ ”وہ بہت عرصہ پہلے فیملی سے خارج کر دیا گیا تھا۔“ اس نے مزید کہا۔ ”میں اس سے دوبارہ رابطہ بحال نہیں کرنا چاہتا۔“

بعد میں سابق کمیونسٹوں کے انکشافات سے بھی مورنار ڈور مرکیز کے بارے میں مزید حقائق دنیا کے سامنے آ گئے۔

ریمون مرکیز 1913ء میں بارسلونا میں پیدا ہوا تھا۔ وہ اپنے والدین کا منجھلا بیٹا تھا۔ ڈون مرکیز ایک

قد امت پسند، نیک انسان تھا لیکن زیادہ خوش حال نہ تھا۔ ریمون کی ماں کیری ایک نہایت پرکشش، تنک مزاج، جوشیلی، متلون مزاجی، سماجی کارکن تھی۔ اسے 33 سال کی عمر میں مہم جوئی کا شوق چرایا جو جوش اور جذبے میں بدل گیا اور وہ انقلابیوں سے تعلقات استوار کرنے لگی اور 1925ء میں فرانس چلی گئی۔ وہ ایک رنگین مزاج اور دل پھینک عورت تھی۔ یہاں اس نے کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس کے متعدد فرانسیسی کمیونسٹ لیڈروں سے معاشرتی چلے۔ وہ خفیہ پیغام رسانی کا کام انجام دینے لگی۔

ریمون جو کبھی ماں کے پاس رہتا تھا اور کبھی باپ کے پاس، اپنی ماں کا بے حد فرما بردار تھا۔ کیری نے جلد ہی اسے بھی کمیونسٹ پارٹی میں کھینچ لیا۔ 1936ء میں جب اسپین میں خانہ جنگی شروع ہوئی تو ریمون اور اس کی ماں وہ اولین رضا کار تھے جو جنرل فرینکو کے خلاف لڑی جانے والی جنگ میں بھی شریک تھے۔ اس موقع پر ایک نیا عاشق کیری کی زندگی میں داخل ہوا۔ وہ NKVD کا ایک جنرل لیونڈ تھا جو جنرل کوٹوف کے نام کے تحت جاں باز کمانڈوز کی تنظیم کر رہا تھا۔ اس یونٹ کا کام اسپین میں تباہی پھیلانا تھا۔ اس کے شاگردوں میں سے ایک ریمون مرکیز تھا۔ اس وقت نہ تو ریمون اور نہ ہی کیری کو یہ معلوم تھا کہ لیونڈ NKVD کے اس اسپیشل ڈویژن کا ایک نمایاں آفیسر تھا جس کا کام غیر ملک کی

سرزمین پر سوویت کے سیاسی حریفوں کا خاتمہ کرنا تھا اور ٹروٹسکی ان کا نمبر ایک ٹارگٹ تھا۔

☆.....☆

لی اون ٹروٹسکی، لینن کا وہ دست راست تھا جس نے لینن کے ساتھ مل کر نومبر 1917ء کے بائوٹیک انقلاب کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اس وقت اسٹالن کی کوئی نمایاں حیثیت نہیں تھی۔ وہ محض لینن کا ایک وفادار پیروکار تھا لیکن لینن کی موت کے بعد اس نے ساز باز کر کے ٹروٹسکی کو سیاست سے عملی طور پر الگ کر دیا اور پھر 1929ء میں اسے سوویت یونین سے جلا وطن کر دیا۔ تب سے ٹروٹسکی ایک شکار کی سی زندگی بسر کرتا آ رہا تھا۔ اسٹالن کے قاتل ہر جگہ اس کا پیچھا کرتے رہتے تھے۔ اس کے وفادار لوگوں کو ایک ایک کر کے اٹھا لیا گیا۔ اس کے سیکریٹری کو اسپین میں قتل کر دیا گیا۔ اس کا بیٹا پیرس میں اچانک فوت ہو گیا۔ ٹروٹسکی کو یقین تھا کہ اسے زہر دیا گیا تھا۔ آخر میں ٹروٹسکی نے 1937ء میں میکسیکو میں پناہ حاصل کر لی۔

اب ریمون اور کیری، لیونڈ یا جنرل کوٹوف کے ساتھ ماسکو میں تھے اور ریمون دہشت گردی کی نہایت اعلیٰ درجے کی ٹریننگ لے رہا تھا۔ ابھی ایک بہت بڑے سیاسی قتل کے منصوبے کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی اور یہ معاملہ زیر غور تھا کہ میکسیکو میں ٹروٹسکی کا قصہ تمام کرنے کے لیے کسی قسم کا آدمی درکار ہوگا۔ ان کا پہلا انتخاب یقیناً ریمون ہو گا جس کی مادری زبان اسپینش تھی۔ سوویت سیکرٹ پولیس نے اپنے مخصوص طریقے سے یہ فیصلہ کیا کہ ریمون غیر محسوس طریقے سے ٹروٹسکی کے گھر والوں کے ساتھ ربط ضبط بڑھائے گا اور اس کے لیے وہ پہلے ان کی ایک نوجوان اور خوب روکھ پر، سیویا پر ڈورے ڈالے گا جو امریکی سماجی کارکن اور ٹروٹسکی کے یو ایس گروپ کی ایک وفادار ممبر تھی۔ NKVD نے ریمون کے لیے 1938ء کے موسم گرما میں سلویا سے پیرس میں اتفاقیہ ملاقات کا اہتمام کیا۔ یہ ملاقات بے حد کارگر ثابت ہوئی۔ اس کے نتیجے میں سلویا اس وجہہ اور پرکشش نوجوان کی محبت میں گرفتار ہو گئی جس کے پاس خرچ کرنے کے لیے بہت رقم تھی۔ اس کے خیال میں ایسا سا بھی اس کی دعاؤں کا نتیجہ تھا۔ دونوں جلد ہی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے۔

☆.....☆

جولائی 2018ء

144

ماہنامہ سرگزشت

ریمون نے فریک جیکسن کے فرضی نام سے ایک جعلی پاسپورٹ پر سلویا کے ساتھ پیرس سے نیویارک کا سفر کیا۔ اصل پاسپورٹ ایک کینیڈین کا تھا جو انٹرنیشنل بریگیڈ کے ساتھ، اسپین میں ہلاک ہو گیا تھا۔ حیرت انگیز طور پر جیکسن کے نام کی ججے بھی غلط تھی لیکن کسی کا دھیان اس طرف نہیں گیا۔ اس نے اور سلویا نے گریچ وینچ میں ایک عارضی اپارٹمنٹ لے لیا اور تب جیکسن نے سلویا کو بتایا کہ اسے میکسیکو میں ایک جاب کی پیشکش ہوئی ہے۔ لہذا جنوری 1940ء میں سلویا اس کے ہمراہ وہاں آ گئی۔ میکسیکو میں لیونڈ اس قتل کو سپرد اتر کرنے کے لیے موجود تھا اور اس کے ساتھ کیری بھی تھی۔

اس مرحلے پر کیری نے اپنے ایک دوست کو یقین دلایا تھا کہ ریمون کا کردار صرف اور صرف ایک جاسوس کا تھا۔ اسے ٹروٹسکی ولا میں سیکورٹی سسٹم کی نوعیت کا پتا چلنا تھا۔ یہ ولا میکسیکو کی مضافات میں واقع تھا۔ ریمون نے سلویا کے ذریعے ولا میں انٹری حاصل کر لی۔ اس نے شروع کے چند وزٹ میں ٹروٹسکی سے ملنے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ ادھر ادھر گھوم پھر کر اپنے خفیہ کیمرے سے مختلف جگہوں کی تصویریں لیتا رہا۔ اس کی یہ تصویریں ماسکو بھیج دی گئیں جو NKVD کی ایک خاص فائل میں رکھ دی گئیں۔

24 مئی 1940ء کی صبح کے اولین پہر میں میکسیکو میں سوویت جاسوس کمانڈوز نے ٹروٹسکی کی رہائش پر دھاوا بول دیا۔ پولیس اور فوج کی وردیوں میں ملبوس بیس آدمیوں کا ایک گروپ پھانگ سے اندر گھس آیا اور سب مشین گنوں سے بیڈروم پر اندھا دھند گولیاں برسانے لگا لیکن ٹروٹسکی، اس کی بیوی اور پوتا حیرت انگیز طور پر اس حملے میں محفوظ رہے کیونکہ انہوں نے خود کو بستر سے نیچے گرا دیا تھا۔ ایک ماہ کی تفتیش کے بعد میکسیکن پولیس نے لگ بھگ دو درجن افراد کو گرفتار کر لیا اور بعد میں بعض افراد پر مقدمہ بھی چلا لیکن ریمون مرکیز شبہ سے بالاتر رہا۔

اس حملے کے صرف چار دن کے بعد ریمون نے مسز ٹروٹسکی کو چند مشترکہ دوستوں کے ہمراہ خود ڈرائیو کر کے ویرا کروز لے جانے کی پیشکش کی اور یہی وہ موقع تھا کہ جب وہ پہلی بار اپنے مستقبل کے شکار سے ملا۔ وہ ولا میں داخل ہوا اور احاطے میں موجود ٹروٹسکی سے بڑے ادب اور احترام سے پیش آیا۔ دونوں کے درمیان مختصر گفتگو ہوئی۔ اس نے ٹروٹسکی کے پوتے کو ایک چھوٹے سے گلائیڈر کا تحفہ

ماہنامہ سرگزشت

145

جولائی 2018ء

محبت ایک اعلیٰ المقت ہے جس کے کئی رنگ ہیں اور ہر رنگ قوس قزح کے رنگوں کی طرح حسین اور دلکش ہے محبت مختلف کیفیات و واردات سے مملو ہوتی ہے جنہیں اس کے موسموں سے عبارت کیا جاتا ہے ان موسموں میں ہجر و وصال، مسرت و عسرت، حیرت و استعجاب اور سوز و گداز وغیرہ شامل ہیں محبت کے موضوع میں اتنی وسعت ہے کہ دنیا و مافیاء کے تمام تر موضوعات اس میں سما سکتے ہیں اور یہ تمام تر موضوعات کا سرنامہ ہے باقی جذبات و احساسات ذیلی اور معاون نوعیت کے ہیں ان افکار سے مرصع شاعری ہر عہد میں اعتبار ذوق رہی ہے اور رہے گی یہ تخیلات ہر عہد میں افتخار زریں قرار پاتے ہیں اور ان کی اہمیت مسلمہ و مصدقہ سمجھی جاتی ہے ایسی شاعری ہر رت میں سدا بہار اور تروتازہ رہتی ہے اگرچہ جدید شعری رویوں میں محبت سے انحراف اور اختلاف کا رویہ اختیار کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے لیکن اس کی اہمیت کم ہونے کی بجائے مزید نکھر کر سامنے آئی ہے جس سے یہ استخراجی نتیجہ سامنے آیا ہے کہ جواں جذبوں کی اہمیت سے انکار اور فرار ممکن نہیں ہے اکثر و بیشتر شاعرات کا کلام محبت کے حسین احساسات سے مزین ہوتا ہے جس کی اصل حقیقت یہ ہے کہ نسائی شاعری میں داخلی اظہار بھرپور انداز میں پایا جاتا ہے محبت چونکہ داخلی کیفیت کا نام ہے کیونکہ محبت کی نمونہ انسان کے دروں سے ہوئی ہے اس لیے شاعرات کے ہاں رومان نگاری کے وسیع تر امکانات پائے جاتے ہیں۔

اقتباس: شاعرات ارض پاک۔ از شبیر ناقد مرسلہ: نوید قر۔ کراچی

دیا۔ کوئی فولادی اعصاب کا مالک شخص ہی ایک مسلح حملے کے بعد جس کا وہ کرتا دھرتا تھا، اتنا پرسکون نظر آ سکتا تھا۔

اب ماسکو نے فیصلہ کیا کہ صرف فرد واحد کے ذریعے ہی ٹروٹسکی کو قتل کیا جاسکتا ہے اور اس کام کے لیے ریمون مرکیز سے بہتر بھلا کون ہو سکتا ہے۔ کیری نے NKVD سے مل کر اپنے بیٹے کے لیے زیادہ سے زیادہ تحفظ فراہم کرنے اور اس کے وہاں سے زندہ فرار ہونے کا اہتمام کیا۔ اس منصوبے کے تحت ریمون نے ٹروٹسکی کے گھرانے سے میل جول بڑھانے کی رفتار تیز کر دی۔ جولائی کے پچھلے تین ہفتوں

میں وہ ٹروئسکی سے پانچ بار ملا اور جب بھی گیا کوئی نہ کوئی تھمہ لے کر گیا۔ 17 اگست کو وہ اپنے ایک مضمون کی اصلاح کرانے کی غرض سے ٹروئسکی سے ملا جو وہ لکھ رہا تھا۔ ٹروئسکی اس پر راضی ہو گیا تھا کہ وہ اس کے مضمون کو چیک کرے گا۔ ریمنون نے ٹروئسکی سے اس کے اسٹڈی میں اس سے گیارہ منٹ تک گفتگو کی۔ اس موقع پر کوئی تیسرا شخص وہاں موجود نہیں تھا۔ بعد میں ٹروئسکی نے اپنی بیوی سے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اسے اس نوجوان کا رویہ عجیب لگا تھا۔

☆.....☆

20 اگست کی شام کے پانچ بج کر بیس منٹ پر ریمنون، ٹروئسکی ولا پہنچا۔ وہ اپنا مضمون مکمل کر کے ٹروئسکی کو دکھانے لایا تھا۔ وہ ایک خاکی رین کوٹ اٹھائے ہوئے تھا جس کے اندر ایک لمبا خنجر سلا ہوا تھا اور ایک جیب میں برف توڑنے والی ہتھوڑی تھی جس کے دستے کو کاٹ کر چھوٹا کر دیا گیا تھا تاکہ اسے چھپانے میں آسانی ہو۔ اس کے پتلون کی جیب میں اعشاریہ 45 کا ایک آٹومیک ریولور تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ اس ہتھوڑی کے ایک ہی وار سے اپنا مشن مکمل کر لے گا جس سے کوئی آواز بھی نہیں ہوگی اور وہ خاموشی سے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو بھی گئی تھی تو وہ اپنا ریولور استعمال کرے گا اور گولیاں برساتا ہوا وہاں سے فرار ہو جائے گا۔

پہرے داروں نے اسے پہچان کر وولا کا پھانگ کھول دیا۔ ایک پہرے دار رہنمائی کرتا ہوا اسے ٹروئسکی کے پاس لے گیا جو احاطے میں اپنے پالتو خرگوشوں سے کھیل رہا تھا۔ وہ کئی بار آچکا تھا اس لیے پہرے داروں نے تلاشی بھی نہیں لی اور وہ ہتھیاروں کے ساتھ اندر آنے میں کامیاب ہو گیا۔ مسز ٹروئسکی نے اسے دیکھا۔ اس کے رین کوٹ پر ایک نظر ڈالی اور تبصرہ کیا کہ ایسے روشن دن میں وہ رین کوٹ کیوں پہنے ہوئے تھا۔

”آپ جانتی ہیں کہ موسم کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ بارش ہو سکتی ہے۔“

ٹروئسکی کے تاثرات سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس وقت اپنے خرگوشوں سے جدا ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بادل خواستہ اپنے دستانے اتارے اور گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ ریمنون اس کے پیچھے چلتا ہوا اسٹڈی میں آیا۔ ٹروئسکی نے دروازہ بند کر دیا اور اپنی میز پر آ بیٹھا۔ میز پر اس کے ہاتھ سے صرف چند انچ کے فاصلے پر اس کا بھرا ہوا ریولور تھا۔

ریمنون اس کے بائیں طرف الارم سسٹم کے سوئچ اور اس کے درمیان دیوار بن کر کھڑا ہو گیا۔

ٹروئسکی نے اس سے مضمون لیا اور پڑھنے لگا۔ ٹھیک اسی موقع پر ریمنون نے اپنی ہتھوڑی نکال لی اور آنکھیں بند کر کے اس کی کھوپڑی پر بھرپور وار کیا۔ ہتھوڑی کا نوکیلا سرا تین انچ تک ٹروئسکی کی کھوپڑی میں دھنس گیا۔ اس کے منہ سے ایک بھیا تک جھج نکل گئی۔ وہ پاگلوں کی طرح اٹھا اور اپنے قاتل سے گتھم گتھا ہو گیا۔ مسز ٹروئسکی بھاگتی ہوئی اسٹڈی میں داخل ہوئی اور دیکھا کہ اس کا شوہر کمرے میں لڑکھڑا رہا تھا۔

”دیکھو، ان لوگوں نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔“ وہ بولا اور فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

اب ٹروئسکی کے پہرے دار اندر گھس آئے تھے۔ ریمنون اپنی جگہ کھڑا ہانپ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک پستول جھول رہا تھا۔ سارے محافظ ریمنون پر پل پڑے۔ مسز ٹروئسکی اپنے شوہر سے مخاطب ہوئی جواب بھی اپنے ہوش و حواس میں تھا۔ ”اس کا کیا کیا جائے؟“ اس نے قاتل کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ لوگ تو اسے مار ڈالیں گے۔“

”نہیں..... اسے قتل کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔“ ٹروئسکی کراہا۔ ”اسے ہر قیمت پر بولنے پر مجبور کیا جائے۔“

ٹروئسکی کو فوراً اسپتال لے جایا گیا۔ وہ راستے ہی میں بے ہوش ہو گیا۔ اس کا آپریشن کیا گیا لیکن وہ چھبیس گھنٹے کے بعد دم توڑ گیا۔

وہاں سے ایک بلاک کے فاصلے پر کیری ایک کار میں بیٹھی ہوئی تھی جسے شوہر چلا رہا تھا۔ وہ ایک ایسی ماں لگ رہی تھی جو اپنے بیٹے کے دفتر سے آنے کے انتظار میں اضطراب کا شکار ہو۔ جنرل لیونڈ ایک دوسری کار میں پاس ہی موجود تھا۔ جب پولیس الارم سنائی دیا اور ایک ایسی بولینس سڑک پر تیزی سے نمودار ہوئی تو وہ سمجھ گئے کہ ریمنون فرار نہیں ہو سکا ہے۔ کیری وہاں سے فوراً ایئر پورٹ پہنچ گئی اور ایک جعلی پاسپورٹ پر کیوبا پر واز کر گئی۔ جنرل لیونڈ رات بھر ڈرائیو کر کے ایک پوکھو پہنچ گیا جہاں بندرگاہ پر ایک سوویت مال بردار جہاز اس کا انتظار کر رہا تھا۔

چند ہفتوں کے بعد کیری ماسکو میں جنرل لیونڈ سے جا ملی وہاں NKVD کے سربراہ نے خود اسے اسٹالن کے سامنے پیش کیا۔ اسے آرڈر آف دی لینن سے نوازا گیا جو کیونزیم کا سب سے اعلیٰ اعزاز تھا اور اس کے بیٹے کو سوویت

یونین کا ایک ہیرو قرار دیا گیا۔ ماسکو میں کیری بڑے فخر سے اپنے دوستوں سے ان اعزازات کا ذکر کرتی تھی۔

☆.....☆

کیری نے جنگ کے ماہ و سال سوویت یونین میں گزارے جہاں اس کا عاشق جنرل لیونڈ اور کریملن کے اعلیٰ حکام اسے یقین دلاتے رہے کہ اس کے بیٹے کو بچانے کے لیے ایک آپریشن عمل میں لایا جائے گا۔ اسٹالن اس پر آمادہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن آخر میں اس نے کیری کو اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ ریمنون کو فرار کرانے کی کوشش کر سکتی ہے۔ کیری مارچ 1945ء میں ماسکو پہنچی لیکن اپنا ہدف حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ یہاں تک کہ وہ اپنے بیٹے کو دیکھ بھی نہیں سکی۔ NKVD نے اس پر سخت پابندیاں عائد کر دی تھیں تاکہ ٹروئسکی کے قاتل کی شناخت نہ ہو سکے۔

اب سفید بالوں والی بہتر سالہ کیری پیرس میں زندگی گزار رہی ہے۔ اس کی ساری خوش فہمی وقت کے ریلے میں بہہ گئی ہے۔ سوویت یونین میں گزارے گئے ماہ و سال نے اس کی آنکھوں پر سے کیونزیم کی پٹی ہٹا دی۔ اس نے ماسکو میں ایک موقع پر اپنے ایک اپنی دوست سے کہا۔ ”تمہاری بات درست ہے۔ ہمیں دھوکا دیا گیا۔ یہ جنت نہیں، جہنم ہے۔“

سلویا کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کے عاشق نے ٹروئسکی کو قتل کر دیا تھا تو اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا اور اسے صحت یاب ہونے میں کئی سال لگ گئے۔ ریمنون کو جیل میں جب اس بات کا علم ہوا تو وہ روپا لیکن بعد میں سلویا میں اس کی ساری دلچسپی ختم ہو گئی۔ ٹروئسکی کی بیوہ جنوری 1962ء میں پیرس میں فوت ہوئی۔ جنرل لیونڈ بھی مر چکا ہے۔

ریمنون مرکیڈر ایک مثالی قیدی بن گیا تھا۔ وہ جیل میں ریڈیو مرمت کرنے کا کام کرنے لگا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا منافع بخش کاروبار تھا۔ وہ میکسیکو کی جیل کے قواعد سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے خاصی پُر آسائش زندگی بسر کر رہا تھا جن کے تحت قیدیوں کو بہترین غذاؤں اور کتابوں کی فراہمی سمیت بہت سی مراعات حاصل تھیں۔ اب ریمنون بھاری بھر کم ہو گیا تھا اور ہر فکر و غم سے آزاد کوئی بہت بڑا بزنس من لگتا تھا۔ قید کے دوران وہ تمام عرصہ خفیہ ذرائع سے کیونسٹوں کے نیٹ ورک سے رابطے میں تھا۔ مئی 1960ء میں قید سے رہا ہونے کے بعد وہ چیکو سلواکیہ چلا گیا اور اپنی پردے کے پیچھے ایسا غائب ہوا کہ پھر اس کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔

1960ء کی دہائی کو پاکستانی موسیقی کے سنہرے دور کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ اس دور میں ملکہ موسیقی

روشن آراء بیگم، استاد امانت علی خاں، استاد فتح علی خاں، استاد نواز اکٹ علی خاں، استاد سلامت علی خاں، استاد شریف خاں پونچھ والے ستار نواز، کلارنٹ نواز سوہنی خاں، پیانو بجانے والے ماسٹر صادق علی، استاد نبی بخش خاں، سارنگی نواز، استاد حیدر بخش، استاد ناظم علی سارنگی نواز، استاد شوکت علی اور استاد طالب حسین خان طبلہ نواز کلاسیکی موسیقی کے تابندہ ستارے تھے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ براعظم میں کلاسیکی موسیقی ہندوؤں کی وجہ سے پھیلی پھولی جب کہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ جب مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے تو ہندوؤں میں دھرم، پد، چھند، کبت اور دوبا گانے کا رواج تھا۔ راجا خاں سنگھ کے درباری بخش اور مجھو نے دھرم اور پد کو ملا کر کرنا شروع کیا جس سے دھرم پد کی گائیکی شروع ہوئی۔ دھرم کے معنی ٹھہرا ہوا اور پد کے معنی لفظ یا مرتبہ۔ دھرم پد کے مزاج میں ٹھہراؤ اور دب دب ہے۔ اس کے چار حصے ہیں۔ (1) استھائی (2) انترا (3) سنجاری (4) ابھوک۔ پندرہویں صدی میں جون پور کے شاہانہ شریقی میں سلطان حسین شرنی نے ایک نئے ڈھنگ کا گانا ایجاد کیا اور اس کا نام خیال رکھا۔ ایک روایت یہ ہے کہ حضرت امیر خسرو نے دوسری ایجادات کے ساتھ خیال بھی ایجاد کیا۔ شاہد احمد دہلوی کا کہنا ہے کہ ممکن ہے یہ طریقہ امیر خسرو ہی نے وضع کیا ہو مگر خیال کی ترویج کا سہرا سلطان حسین شرنی کے سر ہی ہے۔ مسلمان گویوں نے خیال (گائیکی) کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے یعنی (1) الپ (2) استھائی (3) انترا (4) ترانہ۔ الپ کو ایرانی موسیقی میں اہم سمجھا جاتا تھا۔ اسے ادا یا پیش بھی کہتے تھے۔ خیال گائیکی کی لطافت اور ریاض نے اسے اس بام عروج تک پہنچا دیا ہے جہاں اسے مسلمان گھرانوں کی میراث ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ کلاسیکی موسیقی سولہویں صدی سے لے کر انیسویں صدی کے اواخر تک استادوں کی موسیقی بن چکی تھی یعنی ان صدیوں میں اکابر موسیقار، کنت کار، طبلچی اور پکھادچی مسلمان استاد تھے۔ جنہوں نے ہندوستانی موسیقی کو وہ ہیئت اور اسالیب عطا کیے جو فی زمانہ بھارت اور پاکستان کی موسیقی میں رائج ہیں۔

مرسلہ: تبسم بٹ۔ لاہور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تار عنکبوت میں پھنسا چلا جا رہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

فوزیہ سے رابطہ ہو نہیں پارہا تھا۔ کالیا کے ساتھ اس سے ملنے وہ اس کے گھر پہنچ گیا تب اسے معلوم ہوا کہ وہی میں ڈاکٹروں کا سینما رہے نیروپشٹ پر۔ اس میں فوزیہ بھی شریک ہوئی۔ نوی نے اپنے بھائی کو بھی کالیا کے ساتھ وہی بھیج دیا اور خود بحرین چلا گیا۔ بحرین میں نوی کی ملاقات ایک ٹیکسی ڈرائیور سے ہوئی وہ ڈرائیور اسے ایک سرائے میں لے گیا۔ وہاں پہنچ کر پتا چلا کہ بہرام خان جس سے وہ ملنے آیا تھا اسے کسی نے گولی مار دی ہے۔ نوی کاؤنٹر پر پہنچا تو ایک آدمی کسی سے فون پر بات کر رہا تھا کہ بہرام خان کی بیوی خوب شور مچا کر گئی ہے۔ تبھی کسی نے عقب سے اسے لاکارا۔ وہ آواز سے پہچان گیا کہ وہ آواز را کا کی ہے۔

(اب آگے پڑھیں)

را کا نے شاید استقبالیہ پرفون سے مصروف اپنے ساتھی سے بھی کچھ کہا تھا۔ اس نے بات ختم کر کے ہماری طرف ہی رخ کیا تھا۔

شیشے کا دروازہ خود کار انداز میں کھلا اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ یہ ایک چکنے فرش والی راہداری تھی۔ دائیں طرف کمرے نظر آ رہے تھے جو بھی خالی تھے۔ گرائڈیل شخص میرے آگے تھا، وہ اُلٹے ہاتھ والے آخری سرے پر بنے کمرے کے دروازے کے سامنے پہنچا اور اسے کھول کر محتاط انداز میں ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ اب اس کے ہاتھ میں بھی پستول نظر آ رہا تھا۔

مجھے راستہ ملا اور اس کمرے میں داخل ہونے کا اشارہ بھی.....

ہم سب کے اندر داخل ہوتے ہی گرائڈیل شخص نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔

اب کمرے میں ہم تینوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ میں اپنے ایک سفاک اور سنگین ترین دشمن کے رحم و کرم

جولائی 2018ء

میں نے دانستہ چونکنے کی اداکاری کی پھر نصف حد تک گردن گھمائی اور لہجے میں خوف سموتے ہوئے ہکلا کر بولا۔ ”کک..... کون؟“

میں نے یہ کوشش چاہی تھی کہ وہ میری آواز نہ پہچان سکے، اسی لیے میں نے حلق پر زور دیتے ہوئے گھٹے گھٹے لہجے میں کہا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ وہ مجھے پہچانتا ہے یا نہیں، جس کے امکانات فحش فحش تھے۔

”ہوں..... بولتے انگریزی ہو اور بہرپ عربیوں والا بھر رکھا ہے۔“ را کا کی زہر خند طنزیہ آواز ابھری۔

ادھر استقبالیہ میں فون پر مصروف گفتگو وہ گرائڈیل شخص بھی چونک کر ہماری طرف متوجہ ہوا تھا۔

”اس طرف چلو۔“ را کا نے حکمانہ درشتی سے کہا۔ ساتھ ہی میری پشت پر لگی وہ سخت سی شے جو یقیناً پستول کی ٹال ہی ہو سکتی تھی، کو زور دیا۔ اشارہ وہ کر چکا تھا۔ جو سیدھے ہاتھ والے ایک شیشے کے دروازے کی جانب تھا۔ میں نے خاموشی سے مذکورہ سمت کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

ماہنامہ سرگزشت

148



قابو پاتے ہوئے اس سے کہا۔ اپنی نئی بات کی اثر پذیری کو بھانپنے کی غرض سے میری مشاق نظروں نے تاز لیا کہ دونوں کچھ ٹاپے کے لیے چونکے تھے، لیکن پھر دوسرے ہی لمحے جب را کا مجھ سے مخاطب ہوا تو اب اس کے لہجے کی درشتی میں قدرے کمی محسوس کی گئی تھی۔

”معزز نمائندے اس طرح چھپ کر کسی کی ٹیلی فونک گفتگو نہیں سنا کرتے۔“

”چھپ کر؟“ میں نے حیران ہونے کی شاندار ایکٹنگ کی تھی۔ ”کیا میں کسی دیوار کے کونے میں یا کسی میز کے نیچے اور پوشیدہ گوشے میں چھپا ہوا تھا، مسٹر بد معاش؟ میں تو دروازے سے اندر داخل ہوا تھا کہ استقبالیہ پر اپنے ساتھی مسٹر اوبرائے گرانٹ کا پوچھ سکوں کہ وہ یہاں مجھے کہاں مل سکتا ہے؟ ان صاحب کے فارغ ہونے کا منتظر ہی تھا کہ تم پیچھے سے آن دمکے۔“ کہتے ہوئے میں نے اس گرائڈیل شخص کی طرف اشارہ کیا تھا۔

ایسے نازک اور سنگین لمحات میں بس! میرے ذہن میں

پر تھا۔ اگر وہ مجھے یہ سب ”لوازمات“ اتارنے کا حکم دے ڈالتا، جو میں نے فوری طور پر اپنی شناخت پوشیدہ رکھنے کے لیے اڑھ رکھے تھے تو اس خبیث کا مجھے پہچان لینا ایک یقینی امر تھا۔ میں اچانک ہی اس طرح اور بالکل غیر متوقع طور پر اپنے ایک خونخوار دشمن کے نرغے میں آ جاؤں گا، یہ میرے سان و گمان میں بھی نہ تھا۔

اب را کا کی صورت میں ایک بھیا تک موت مجھ سے محض چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ اس کا ساتھی بھی خطرہ بھانپتے ہی اپنا پستول نکال کر چوکس کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے گھبرانے کی بس ایک حد تک ہی اداکاری کی تھی (اگرچہ اندر سے تو میں واقعی تشویش زدہ سا ہورہا تھا)

”میں واقعی کچھ نہیں سمجھ پارہا ہوں۔“ بالآخر میں نے اپنے بھیا تک دشمن کو لف کرنے کی سعی کی۔ ”ایک بڑے آئل فیلڈ میں ایک معزز نمائندے کے ساتھ ایسی غنڈہ گردی میری سمجھ سے باہر ہے۔“

میں نے حتی المقدور کوشش کے ساتھ اپنے حواسوں پر

ماہنامہ سرگزشت

149

جولائی 2018ء

اپنی گلو خلاصی کے لیے یہی ایک نام ابھرا تھا اور لایلا کی زبانی میں جانتا تھا کہ اور برائے گرانٹ ان کے لیے کتنی اہمیت رکھتا تھا۔ میرا ہوائی تیر جو اندھیرے میں چلا تھا، ”ٹھک“ کر کے نشانے پر لگا۔ سب سے پہلے ٹیلی فون والے گرانٹیل شخص پر بوکھلاہٹ کے آثار ابھرے تھے اور راکا تو جیسے یوں نظر آنے لگا، کہ اس کا پیشاب ہی خطا ہو گیا ہو۔ مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ اور برائے گرانٹ ان کے لیے کتنی اہمیت رکھتا تھا۔

”کک..... کیا.....؟“ تہ..... تم مسٹر اور برائے گرانٹ کے ساتھی ہو؟“ راکا غیر یقینی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”آف کورس! میں اور اور برائے گرانٹ کل ہی کی فلائٹ سے تو یہاں پہنچے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اس کی گرل فرینڈ مس لایلا بھی اس کے ساتھ تھی، وہ مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کا کہہ رہے تھے لیکن میں نے ان کے بیچ خلل ہونا مناسب نہیں سمجھا اور آج ملنے کا وعدہ کر کے مناما اپنے دوست کے پاس چلا گیا تھا۔ ہم تینوں نے آج کمپ تھری میں رپورٹ پیش کر کے صرافہ کی طرف نکل جانا تھا۔“

”او..... سوسری..... مسٹر؟“ راکا نے معذرت خواہانہ انداز..... میں یہ کہتے ہوئے دانستہ استفسار یہ، اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے وہ مکمل کرتے ہوئے پورے اعتماد سے کہا۔

”شیخ واحد الکریمی..... آئل کولیون (collision) ایکسپلوزر..... ایکسپلرٹ.....“

میری کامن سینس یعنی عقل سلیم تیزی سے کام کر رہی تھی اور میں اپنی زیرک دماغی سے ان مضبوط عوامل کو اندھیرے کے تیر میں پرو کر چلانے کی کامیاب کوشش کر رہا تھا جو میرے لیے بظاہر غیر متعلقہ تھے۔

”دیری ساری..... مسٹر واحد الکریمی! ایکسپلرٹیلی ساری۔“ راکا میری چال میں آکر جیسے ڈھے گیا۔ اس نے اپنا پستول، جس کی نال وہ پہلے ہی جھک چکا تھا، معذرت خواہانہ انداز میں کہتے ہوئے دوبارہ اپنی شرٹ کے نیچے پشت پر پیلٹ میں اڑس لیا۔ اس کے گرانٹیل ساتھی نے بھی دیکھا دیکھی یہی کیا۔

”تشریف رکھیے جناب! اور حقیقت آپ کو یہاں آکر حالات کا اندازہ تو ہو ہی گیا ہوگا کہ کچھ شرپسند ہمارے اس عظیم منصوبے کو سیوتا کرنا چاہتے ہیں، بہر حال..... میں ایک بار پھر آپ سے معافی کا طلب گار ہوں۔“

راکا ایک دم سے ہی عجز و انکسار کی تصویر نظر آنے لگا

تھا۔ میرا تجربہ تھا کہ جو جتنا پکا اور بڑا مجرم ہوتا ہے، وہ ابتداء میں نہایت اخلاق اور محرب زبانی کا ہی اظہار کرتا ہے۔ پھوں پھاں کرنا اور شور مچانا کچے مجرموں کا کام ہوتا ہے۔

”کوئی بات نہیں، ایسے حالات میں اس طرح کی غلط فہمیاں ہو جاتی ہیں۔“ میں نے بھی جلدی سے کہا اور دل ہی دل میں شکر کیا کہ اتنے میں ہی جان چھوٹ گئی۔

”تو آپ مسٹر اور برائے گرانٹ کے ساتھی ہیں۔ میری ان سے اٹلی میں فون پر بات ہوئی تھی، تو کیا وہ آگئے ہیں؟“ راکا نے کہا اور ساتھ ہی مجھے ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کیا جبکہ میں اب یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا۔ کیا خبر کس وقت یہ اور برائے گرانٹ سے رابطہ کر کے میرا بھانڈا پھوڑ دے۔

”ہاں! میں نے مختصر کہا۔ صوفے پر میں نہیں بیٹھا تھا۔“ میرا خیال ہے وہ وہ ہیں ہوگا، مجھے اب اسی جگہ بیٹھ کر اس سے خودی مل لینا چاہیے۔ کیا مجھے اجازت ہے جانے کی؟“

میں نے راکا سے یہ کہتے ہوئے متفطرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر کچھ تذبذب کے آثار نمایاں ہو گئے تھے، وہ خبیث شاید مجھے یہاں باتوں میں لگا کر کسی قسم کی ”کنفریشن“ کے چکروں میں نظر آ رہا تھا۔

”آ..... ہاں ضرور..... لیکن ہمیں ذرا خدمت کا موقع دیں۔“

”مجھے پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔ بہت شکریہ۔“ میں نے کہا اور ان دونوں کو سوچتا چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

باہر آتے ہی میں نے بے اختیار سکون کی سانس لی تھی۔ عملے کے لوگوں کے علاوہ اب وہاں کچھ مقامی باشندوں کا بھی جھگھکا دیکھنے میں آ رہا تھا۔ یہ لوگ اس عورت کے داویلا کرنے کی وجہ سے جمع ہوئے تھے، جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ مقتول بہرام خان کی بیوی تھی۔

میں نے نکاسی والے راستے کی طرف قدم بڑھا دیے تھے، جدھر ایک شاندار ڈبل ٹائر والی بس مناما کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ میں لپک کر اس میں سوار ہو گیا اور ذرا بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔

کارواں سرائے (سرائے نما ہوٹل) اسی سڑک کے سپر بام واقع تھا۔ ذرا دیر بعد بس روانہ ہو گئی۔ یہ انٹرکنڈیشن بس تھی اور مناسب رفتار سے دوڑنے لگی۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ ریت کے زرد بگولے گرم ہواؤں کے زور پر اڑتے پھر رہے تھے۔ دھوپ چمک رہی تھی۔ تاخیر نگاہ ریت کا سمندر

پھیلا ہوا تھا اور ہوائیں اس میں لہریں سی پیدا کرتی محسوس ہوتی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد میں کارواں سرائے کے سامنے اتر گیا۔ بس ریت اور کنکر اڑاتی آگے بڑھ گئی۔ میں نے اپنے کمرے میں آکر ہی دم لیا۔

میں ایک بھیا نک موت کے منہ سے بال بال بچ کر نکل آیا تھا۔ حالاں کہ میں بے حد احتیاط پسند تھا، شاید ایسا اس نئی جگہ اور نئے حالات کی وجہ سے ہوا تھا، تاہم یہ بھی تو میں ہی تھا جو اپنی زیرک دماغی سے بچ کر نکل آیا تھا۔

بہرام خان کی بے وقت موت نے مجھے واقعی اندھیری کھائی میں پھینک دیا تھا لیکن یہ اللہ ہی تو ہے جو راہ حق کے راستوں پر چلنے والوں کی ہر طرح سے مدد کرتا ہے۔ بہرام خان کی جگہ اور برائے گرانٹ سے میں نے فائدہ اٹھا لیا تھا جو بے شک ”عائنہ“ سہی۔ اس بے چارے کو تو پتا بھی نہیں ہوگا کہ میں نے اس کی اس قدر اہمیت کی حامل ”شناخت“ سے کتنا بڑا فائدہ اٹھا لیا تھا۔ دوسرا ساتھی میرا وہ ہندوستانی ٹیکسی ڈرائیور فاران احمد تھا۔ وہ تو جیسے میرا بہترین ساتھی اور دست راست ثابت ہوا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں اللہ کا ایک بار پھر شکر ادا کیا کہ اس کا جتنا بڑا نام اُٹاتا ہی بڑا آسرا تھا۔

یہاں تک آتے ہوئے میں نے احتیاط رکھی تھی کہ راکا یا اس کا کوئی ساتھی میرے تعاقب میں نہ آتا ہو، مجھے پورا یقین تھا کہ میرا یہ بھانڈا اب تک یا تھوڑی دیر بعد تک یقیناً پھوٹ چکا ہوگا، جب راکا، اور برائے گرانٹ سے رابطہ کر کے میرے فرضی نام سے اسے پوچھے گا۔

اس وقت بے شک اس کے پاس گرانٹ سے رابطہ کرنے کے فوری ذرائع نہ تھے، یہ میری خوش قسمتی ہی تھی۔ اس میں انسان کی خوش قسمتی کے علاوہ وقت اور حالات کے علاوہ ان لمحات کا بھی دخل ہوتا ہے جن کا دھار عارضی طور پر ہی سہی، موافقت کی جانب بہہ رہا ہوتا ہے۔ تاہم مجھے ابھی تک رانا بشیر سے فون پر بات کرنے اور اسے بہرام خان کے قتل سے متعلق بتانے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ ممکن تھا اسے یہاں کی نئی صورت حال کا بتانے کے بعد وہ بھی مجھے کوئی مشورہ دیتا کہ اب بہرام خان کے ”مرحوم“ ہو جانے کے بعد مجھے کس سے ملنا چاہیے تھا؟ وغیرہ۔

میں نے کھانا منگو کر کھایا اور فاران احمد کے آنے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا لیکن میرا نہیں خیال تھا کہ وہ

اتنی جلدی لوٹا۔ وہ بے چارہ روڈ پر روزی کمانے لگا ہوا تھا اور بہ قول اس کے وہ شام سے پہلے نہیں لوٹتا تھا، کبھی کبھار اسے لوٹتے ہوئے رات بھی ہو جاتی تھی۔ میں اس کا انتظار نہیں کر سکتا تھا، مجھے یہاں بہت سے کام نمٹانا تھے، جنہیں میں نے مرحلہ وار نمٹانے کی ایک ترتیب اپنے ذہن کے کمپیوٹر میں بنارہی تھی۔

سب سے پہلا کام میرا فرحانہ کا کھوج لگانا تھا۔ اس دوران میں مجھے راکا کو واصل جہنم بنانے کی کوشش بھی کرنا تھی اور شاہ میر کو بھی پاکستان کی عدالت کے کٹہرے میں لانا تھا۔ آخر الذکر کام بے شک ذرا لمبے چوڑے ”پروڈسز“ کا سہی، تاہم میں نے یہ بھی دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ اگر وہ اس طرح میرے قابو میں نہ بھی آیا تو زندہ میں بھی اسے نہیں رہنے دوں گا۔ اس مردود کو فنا کے گھاٹ اُتار کے کم از کم اپنے باپ کی بے گناہ موت کا تو انتقام ضرور لوں گا۔ رہا بن رانڈ تو سروسٹ اس سے میری براہ راست کوئی خاص دشمنی نہیں تھی لیکن اگر اس نے بھی میرے راستے میں آنے کی کوشش چاہی تو میں زندہ اسے بھی نہیں چھوڑوں گا۔

راکا کا جن غیر متوقع حالات میں میرا سامنا ہوا تھا اس نے میرا آئندہ کاروبار گرام چو پٹ کر ڈالا تھا۔ بہ صورت دیگر میں نے بہرام خان کی بیوہ سے فی الفور رابطہ کرنا تھا۔ فاران احمد کے مشورے اور اس کے بتائے آدمی محمود الحسن سے بھی ملنا تھا، وہ کام بھی رہ گیا تھا۔

تب ہی اچانک مجھے یاد آیا کہ راکا کا وہ گرانٹیل ساتھی جس کی فون بر میں نے بہرام خان کی بیوہ کو راستے سے ہٹانے سے متعلق گفتگو کی تھی، ساتھ ہی میں نے اس کے منہ سے ”گنارا“ کا نام بھی سنا تھا، جو یقیناً بہرام خان کی اسی بیوہ کا نام ہی ہو سکتا تھا۔ مجھے اس کے بارے میں بھی اُسے آگاہ کرنا تھا اور اس سے یقیناً مجھے یہاں آباد میرے دشمنوں سے متوقع جنگ کے سلسلے میں اہم راہنمائی بھی مل سکتی تھی۔ اس کی جان خطرے میں تھی اور یقیناً وہ بھی اس سے غافل نہ ہوگی۔

یہ اب مجھے فاران ہی بتا سکتا تھا۔ راکا کا معاملہ نہ ہوتا تو میں اسی وقت کمپ تھری میں کسی سے اس کا اتا پتا حاصل کرنے کی کوشش کرتا اور بہرام کی بیوہ (گنارا) کے پیچھے جا نکلتا۔

میں نے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن سے ایک اور ارادہ باندھا۔ میرے پاس ابھی ٹیلی فونک رابطے کا پرستی کوئی ذریعہ، یعنی موبائل وغیرہ نہیں تھا۔ اس کا سارا بندوبست اپنے

طور پر میرے لیے بہرام خان نے کرنا تھا، جبکہ اب وہ خود قبر میں لیٹا منکر و نکیر سے اپنا بندوبست کروانے میں مصروف ہو چکا تھا۔

میرے دل میں بے چینی گھر کرنے لگی تھی۔ مجھے بہرام خان کی بیوہ کو خطرے سے آگاہ کرنا تھا۔ وہ غم و غصے کے جوش میں کیمپ تھری کے اندر جو داویلا اور قانونی دھمکیاں دے کر گئی تھی، نہیں جانتی تھی کہ وہ اس کے اور اس کے دونوں معصوم بچوں کے لیے کس قدر خطرناک اور جان لیوا بھی ثابت ہو سکتی تھیں۔ نہ ہی اسے ابھی راکا جیسے جلاوطن انسان کا پتا تھا۔

میں پھر وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکا اور سوچا کہ ایک نئے بہروپ کے ساتھ دوبارہ مجھے کیمپ تھری کا چکر لگانا چاہیے۔ مگر میں کون سا نیا بھیس بھرتا؟ میرے پاس اتنا سامان نہ تھا۔ یہ عربی لباس بھی مجھے فاران احمد نے ہی مہیا کر کے دیا تھا۔

اس وقت مجھے فاران احمد کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی اور وہ میری پہنچ میں نہیں تھا۔ بالآخر میں نے ایک اور رسک لینے کا فیصلہ کیا اور دوبارہ کیمپ تھری جانے کے ارادے سے اٹھا۔ سرائے سے نکلا ہی تھا کہ سامنے نظر پڑتے ہی میں چونک پڑا۔

وہ فاران احمد کی نیکی تھی اور خوش قسمتی سے وہ یہاں کی سواری لایا تھا۔ میرا دل مسرت تلے یکبارگی زور سے دھڑکا۔ اس وقت مجھے اس کی موجودگی نعمت غیر مترقبہ ہی لگی اس نے مجھے ایک بڑے رسک سے بچالیا تھا۔

میں تیر کی طرح اس کی جانب لگا۔ وہ ڈگی سے سواری کا سامان اتار رہا تھا، مجھے دیکھ کر مسکرایا اور سلام کا اشارہ کر دیا۔

جب وہ فارغ ہو گیا اور وہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ رہا تو میں نے اسے کچھ زیادہ بتائے بغیر جلدی سے کہا۔

”کیا تم مجھے اسی وقت بہرام خان کے گھر لے جاسکتے ہو؟“

وہ میری بات سن کر چونک پڑا۔ بولا۔ ”خیریت تو ہے نوی بھائی؟ یہ اچانک.....“

”میرے پاس وقت بہت کم ہے، باقی باتیں راستے میں بتا دوں گا۔“ میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”بس..... یوں سمجھ لو اس کی جان خطرے میں ہے اور مجھے اسے ایک خطرے سے فوری طور پر آگاہ کرنا ہے۔“

فاران سمجھ رہا تھا، اس نے پھر کوئی دوسری بات مجھ سے نہیں کی اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور تھوڑی دیر بعد ہی نیکی

”اولیٰ“ روڈ پر فرارے بھر رہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ممکن ہے شہر والی رہائش گاہ کی بجائے ادھر ہی کیمپ تھری کی کالونی میں مقیم ہو، کیونکہ وہ آج ادھر ہی نظر آئی تھی اسی لیے ہم نے پہلے یہاں کالونی میں اسے دیکھنا ضروری سمجھا تھا، ورنہ شہر کا طویل چکر ہمیں خالی پڑتا۔ وقت الگ ضائع ہوتا۔

دن چڑھ رہا تھا اور سورج نصف النہار پر آگ برسا رہا تھا۔ کارائیر کنڈیشن تھی۔ میں نے دوران سفر فاران احمد کو صرف اسی قدر ہی بتایا کہ مقتول کی بیوہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ کیمپ تھری آئی تھی اور داویلا بچا کراچی جیپ میں لوٹ گئی تھی۔ یہ بھی کہ میں نے ایک مشکوک شخص کو کسی سے ٹیلی فون پر بات کرتے بھی اتفاق سے سن لیا تھا جو اپنے کسی باس سے مخاطب تھا۔

اس کے بعد راکا وغیرہ کے بارے میں بات گول کر گیا۔

”صاف ظاہر ہے کہ یہ وہی لوگ جو بہرام خان کے قاتل ہیں۔“ یہ سب سننے کے بعد فاران احمد نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا اور آگے بولا۔ ”مگر گلزار نے یہ بڑی خطرناک بے وقوفی کی ہے۔ قانون اور ثبوتوں کی دھمکیاں دے کر اس نے اپنے شوہر کے قاتلوں کو چونکا دیا ہے۔“

”گلزار!..... سے تمہاری مراد مقتول بہرام خان کی بیوہ ہے؟“ میں نے سچ چاہی تھی۔

”ہاں.....“

”کاش! وہ ادھر ہی مل جائے۔ ویسے ادھر کہاں رہتی ہوگی؟“

”آج کل اولیٰ میں ہی رہتی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کیمپ تھری کی کالونی اسی علاقے کے جنوب میں ہے۔“

”اوہ.....“ میرے ہونٹ بے اختیار تشویش زدہ انداز میں سکڑ گئے۔

”پھر تو وہ اور زیادہ خطرے میں گھر چکی ہے۔ پتا نہیں اب تک.....“

”نہیں.....“ فاران نے میری بات کاٹی۔ ”اگر وہ اپنے بھائی کے ہاں نہیں گئی تو اسے کیمپ تھری میں کوئی خطرہ نہ ہوگا کیونکہ وہاں پولیس کا سخت پہرا ہوتا ہے اور ہر آنے جانے والا ریکارڈ رجسٹرڈ کیا جاتا ہے، خواہ وہ ایسپلائی (ملازم) ہی کیوں نہ ہو۔ جبکہ قاتل اتنے بے وقوف نہیں ہو سکتے کہ اسے کیمپ تھری والی رہائش میں قتل کریں۔“

”اچھا.....“ مجھے کچھ تسلی ہوئی۔ تاہم ایک خدشے تلے بولا۔ ”لیکن کیا خبر اس نے اپنے بھائی کے گھر کا رخ کیا ہو تو۔“

”خدا کرے اس نے ایسا نہ ہی کیا ہو ورنہ خطرے کی زد میں آ سکتی ہے۔“ فاران نے کہا اور ایک موڑ کاٹا، گردوغبار کا ایک مرغولہ عقب میں بلند ہوا اور ہماری کار پر غلبہ پانے کے لیے لپکا، مگر موڑ کاٹتے ہی فاران نے کار کی رفتار پھر تیز کر دی۔ ہم اب کیمپ تھری کے قریب سے گزرنے لگے۔ یہاں سے مزید پانچ کلومیٹر بعد کار دائیں جانب نشیب میں اتر گئی۔ اب ہم تپتے ہوئے ریگ زار کے پتھوں بچ سفر کر رہے تھے پھر لگ بھگ کوئی تین چار کلومیٹر مزید سفر کے بعد کار کی رفتار دھیمی پڑ گئی۔

میں نے ونڈاسکرین کے پار دیکھا، سامنے سیدھی صحرائی ویرانوں کی طرف جاتی سڑک کے دائیں بائیں سے دوسرے ٹریکس اور نکل رہی تھیں۔ فاران نے بائیں جانب والی سڑک پر نیکی موڑ دی اور پھر اس کے بعد ایک بڑی سی کوئی پانچ، چھ فٹ اونچی دیوار ہمارے دائیں جانب ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ فاران نے بتایا کہ اس کے دوسری طرف کوارڈز اور بجٹلے بنے ہوئے تھے۔ کوئی ایک کلومیٹر مزید چلنے کے بعد کار بائیں جانب گھوم گئی اور ایک بڑے سے گیٹ کے سامنے رک گئی۔

میں نے سامنے دیکھا۔ ایک بڑی سی ہرڈل راڈ نکائی ہوئی تھی جس کے دونوں جانب گنکریٹ کی مضبوط چیک پوسٹ کیمپن بنے ہوئے تھے۔ ان میں دورخی کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں۔ اندر باہر باوردی سکیورٹی کے افراد نظر آئے۔ چند افراد کے کاندھوں سے گنیں جموٹی نظر آرہی تھیں۔ یہ لوگ مقامی نظر آ رہے تھے۔

دونوں کیمپنوں کے وسط میں موٹی سی ہرڈل راڈ ہمارا راستہ روکے ہوئے تھی۔ فاران نے اس کے قریب جا کر کار روک دی۔ شیشے نیچے کیے اور اسی وقت ایک سکیورٹی اہلکار ہماری جانب بڑھا اور بہ غور ہم دونوں کی طرف گھورتے ہوئے عربی میں کچھ بولا۔ جو میرے پلے نہیں پڑا۔ البتہ فاران نے اس سے انگلش میں کہا۔

”پلیز! انگلش۔“ وہ آدمی ایک دو سیکنڈ کچھ سوچنے کے بعد سیدھا ہوا اور کسی کو آواز دے کر بلانے لگا۔

”مجھے عربی آتی ہے، مگر میں چاہتا ہوں، تم بھی بات کر سکو اور سمجھ سکو۔“ اسے دوسری جانب متوجہ پا کر فاران

احمد نے مجھ سے نیچی آواز میں کہا اور اس کی عقل مندی کا معترف ہونے لگا۔

”کون ہیں آپ لوگ؟“ ایک دوسرے اہلکار نے ہم دونوں کو بہ غور گھورتے ہوئے پوچھا۔

”انہوں نے.....“ فاران نے اسٹیمپرنگ پر دونوں ہاتھ جمائے ہوئے میری طرف گردن کے اشارے سے کہا۔ ”محترمہ گلزار صاحبہ سے ملنا ہے۔“

”آپ کم از کم تین چار گھنٹوں تک ان سے نہیں مل سکتے۔“ اس نے جواب دیا۔ اس کی عربک لب و لہجہ والی انگریزی بس گزارے لائق ہی تھی۔

”کوئی خاص وجہ؟“

”ان کے شوہر کا مرڈر ہو گیا ہے اور پولیس ٹیم اس وقت اندران کے پاس موجود ہے۔ وہ خاتون سے ضروری تفتیش میں مصروف ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”مگر ان کا گلزار سے ملنا بے حد ضروری ہے، ہم بھی اسی سلسلے میں ان سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ ہم انتظار کر لیں گے۔“

اس نے جواب میں کہا۔ ”آپ کو وینٹنگ ہال میں جانا ہوگا۔ گلزار سے ہم ٹیلی فون پر آپ کی بات کرا دیں گے لیکن اسی صورت میں جب وہ تین چار گھنٹے بعد فارغ ہوں گی اگر انہوں نے ملاقات کی ہامی بھری تو ٹھیک ہے ورنہ آپ کو اس طویل انتظار کے باوجود ایسے ہی لوٹ جانا پڑے گا۔“

”جی شکریہ! ہمیں منظور ہے۔ وینٹنگ ہال کہاں ہے؟“ اس بار میں نے پوچھا۔

اس نے فاران کو بتایا اور پھر فاران نے بھی اس کا شکریہ ادا کر کے کار کو ریورس گیمر میں ڈالا۔ شکر تھا کہ گلزار!.....

ادھر ہی تھی ورنہ مجھے شہر کے طویل سفر کرنا پڑتا۔ ایک نصف دائرے کا چکر کاٹ کر ہم عمارت سے متصل شیشوں کے دروازے والے وینٹنگ ہال کے بڑے سے گیٹ کے سامنے رکے اور کار سے نیچے اتر آئے۔

وہاں گیٹ پر بھی دو سکیورٹی اہلکار موجود تھے۔ انہوں نے ہماری تلاشی لی اور ہمیں اندر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔

بحرین کے اس تپتے سگتے ریگزار میں ایسا جدید اسٹائل کا آرام دہ انٹرکشن ہال کا موجود ہونا میرے لیے حیرانی کا سبب نہ تھا۔

میں اور فاران احمد خاموشی سے ایک آرام دہ صوفے پر

براجمان ہو گئے۔

میں طائرانہ نظروں سے ہال کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں مجھے ایک مرد اور ایک عورت بھی بیٹھے نظر آئے۔ سامنے استقبالیہ طرف کا ایک کاؤنٹر تھا، مگر وہاں کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ البتہ مختلف قسم کے ٹیلی فون سیٹس پڑے نظر آ رہے تھے، جو نیلے پیلے اور سرخ رنگت کے تھے۔

ایک ملازم ٹائپ کاؤنٹر کا وہاں پانی وغیرہ پلانے میں مصروف تھا۔ ہمارے لیے بھی ٹھنڈے پانی کی مشینزہ ٹائپ بوتل اور گلاس لے کر آیا تھا۔

فرش پر قالین بچھا ہوا تھا اور دیواروں پر آئینہ فیلڈ متعلق پینٹنگز اور نقشے وغیرہ چسپاں تھے۔

تھوڑی دیر بعد ہی ایک واش روم سے ہم نے خاتون کو برآمد ہوتے دیکھا۔ یہ بھی مقامی تھی اور اس نے سیاہ عبا پہن رکھی تھی۔ اس نے ہماری طرف ایک نظر ڈالی اور پھر اپنے کاؤنٹر کی جانب بڑھ گئی۔

ٹھیک اسی وقت ایک فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی اور اس جوڑے کی طرف دیکھا جو ہمارے سیدھے ہاتھ کے صوفے پر براجمان تھا۔ وہ ان کی جانب بڑھے، عربی استقبالیہ خاتون نے ان سے عربی میں ہی کچھ کہا اور وہ دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

وہ بھی شاید کسی سے ملنے کے انتظار میں بیٹھے تھے اور گویا ”پروانہ راہداری“ پاتے ہی نکل لیے تھے۔

ہمیں اپنی باری کا انتظار تھا۔ جوتین چار گھنٹوں سے پہلے آنے کی نہیں تھی۔ اس میں بھی گلنار کی مرضی کا دخل تھا کہ وہ ہمیں ”شرف باریابی“ بخشتی ہے یا اتنے طویل انتظار کے بعد ہمیں انتظار کی کوفت میں مبتلا کیے جانے کا احساس کیے بغیر ہمیں ایسے ہی چلتا کر دے گی، یعنی ملے بغیر۔

اس عربی خاتون نے ہماری جانب بھی دیکھا تھا اور عربی میں کچھ پوچھا تھا جس کا جواب فاران نے عربی میں ہی دیا تھا۔

”کیا کہہ رہی تھی؟“ میں نے دھیرے سے کہا۔

”یہی کہ ہم کس سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”ہم.....“

انتہائی بوریکسانیت بھرا، ابھی صرف ایک گھنٹا ہی بیتا تھا کہ اچانک میری نظر شیشے کے دروازے کے پار پڑی۔ وہاں ایک بڑی سی چمکتی دمکتی نئی کار رکی۔ اس کے اندر سے دو افراد اترتے دکھائی دیئے۔ میں نے وہیں سے انہیں پہچان

لیا اور لیکھت مجھے اپنا سینہ سکڑتا ہوا اور دم گھٹتا محسوس ہونے لگا۔

ان دو میں سے ایک تو وہی گرانڈیل بد معاش نما آدمی تھا، جبکہ دوسرا کا تھا۔ دونوں وہی تھے جن سے میری مڈ بھڑ ہو چکی تھی۔ مجھے اتنی جلدی ان سے دوبارہ سامنا ہونے کی امید ہرگز نہ تھی۔

”خطرہ.....“ بے اختیار میرے ہونٹوں سے بدبانے والے انداز میں برآمد ہوا اور فاران نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”کک..... کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں، بس! ذرا خاموش رہنا تم۔“ میں نے بدستور شیشے کے پار اپنی نظریں جمائے اس سے کہا تو اس نے بھی میری نگاہوں کے تعاقب میں اس طرف دیکھا۔

”کیا یہ دونوں آدمی.....“ فاران پوچھے بنانہ رہ سکا۔

”پلیز، فاران!“ میں نے ہولے سے تادیبی انداز میں اس کی بات کاٹ کر کہا اور وہ چپ ہو گیا۔

را کا اور وہ گرانڈیل، دونوں دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے اور میرا دل تیز تیز دھڑکے جا رہا تھا۔ مجھے تسلی تو تھی کہ راکا کم از کم یہاں میرے ساتھ کوئی ایسی ویسی جرأت دکھانے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں! البتہ وہ مجھے پہچانتے ہی میری طرف متوجہ ضرور ہو جائے گا، یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا مگر میری کوشش تھی کہ میں انہی اپنے دشمنوں کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ اسی سبب میں ایک عرب باشندے شیخ واجد الکریمی کے ہمیں میں راکا سے پہلے بھی جان چھڑا چکا تھا، ایک خدشہ ذہن میں ابھرا تھا کہ کہیں یہ راکا میری اصلیت تو نہیں بھانپ چکا تھا؟ اور یوں کمپ تھری سے ہی یہاں تک میرے تعاقب میں آ رہا ہو؟

میرا ذہن اس وقت تیزی سے سوچوں کے تانے بانے بن رہا تھا کہ یہ لوگ کیوں آئے تھے؟ گلنار سے ملنے؟ اگر ایسا تھا تو کالونی کے گیٹ پر سکیورٹی کے اہلکاروں نے انہیں بھی طویل انتظار کے لیے یہاں بھیج دیا تھا؟ اگر ایسا تھا بھی تو یہ واپس بھی لوٹ سکتے تھے اور تین چار گھنٹے آرام سے اپنی آرام دہ کمین گاہ میں گزار کے دوبارہ بھی آ سکتے تھے؟ یا پھر انہوں نے کسی اور سے ملاقات کرنی ہو، جو ایک آدھ گھنٹے کے انتظار کے بعد ممکن ہو سکتی ہو؟

ادھر ہال کا دروازہ کھلا اور میرا دل زور سے دھڑکا۔ سب سے پہلے راکا اندر داخل ہوا۔ اس سے چھپنے یا اپنا چہرہ

چھپانے کا کوئی فائدہ نہ تھا اب۔ میں اس کی ایک ایک حرکت کو نوٹ کر رہا تھا اور اس کا ہال کے اندر داخل ہوتے ہی متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہی مجھے کھٹک گیا کہ دال میں کالا تھا۔

پھر اگلے لمحے میں ہی مجھ پر اس کی نظر پڑی اور..... اسے پل بھر کے لیے میں نے سکتے کی سی کیفیت سے دوچار ہوتے دیکھا، مگر دوسرے ہی لمحے ایک حیران کن امر ظہور پذیر ہوا، وہ میری طرف ایک دم ہی یوں بے پرواہ سا نظر آنے لگا جیسے مجھے اس نے پہچانا ہی نہ ہو، میں اس کی مکاری بھانپ چکا تھا۔

اس نے استقبالیہ پر موجود عبا پوش خاتون سے مسکرا کر کچھ ہائے، ہیلو قسم کے جملے کہے، جس کا جواب بھی اسے مسکراتی آنکھوں اور نقاب کے اندر ہلکتے لبوں سے ملا تھا۔ دونوں میں شناسائی کا ہونا میرے لیے مطلق اچھنبے کی بات نہ تھی۔

وہ عربی میں ہی مخاطب ہوئے تھے۔ اس کے بعد ہمارے سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گئے، اس کا گرانڈیل ساتھی مجھے نہیں پہچانتا تھا۔ تاہم اس کے بھی انداز

سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے۔ وہ بھی راکا کی طرح کسی ”تلاش“ میں ہی یہاں آئے تھے۔

اچانک راکا میری جانب بڑی زبردست مسکراہٹ سے گھورنے لگا اور پھر میں نے اسے اپنے گرانڈیل ساتھی سے کچھ کہتے ہوئے دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی چونکنے کے آثار ابھرے تھے۔

فاران یہ ساری حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا۔ استقبالیہ پر موجود خاتون بھی ہمارے ان ”اطوار“ کو کچھ شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگی تھی۔

تب ہی اچانک راکا اپنی جگہ سے اٹھا، میرے چہرے پر ایک آخری گھورتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر میری نبضیں لیکھت دوڑنے لگیں۔ اس موذی مردو نے میری جانب ہی قدم بڑھائے تھے۔ مجھے امید تو نہ تھی کہ وہ یہاں مجھ سے کسی قسم کی ہتکے بازی کی کوشش کرے گا، تاہم اس لعین خونی درندے سے کچھ بعد بھی نہ تھا، میں سنبھل سا گیا اور بغیر کسی مرعوبیت کے اس کی مسلسل اپنی جانب گھورتی آنکھوں میں آنکھیں گاڑھے ہوئے ہی رہا۔

”ہیلو، مسٹر نعمان! بحرین کے صحراؤں میں راکا تمہیں

سنگین خاتمہ

ایک بے بنیاد بات پر زندگی کی عمارت کو متزلزل کرنے والے ضمیر فروش لوگوں کی عبرت اور داستان..... آخری صفحات پر **نشور ہادی** کا دلربا انداز

نا اتفاقی

مختلف سمتوں میں جو سفر، بادشاہ اور مصاحبین کے مخالف اذہان اور حصول اقتدار کے خطرناک اور حیران کن عزائم کا قصہ..... **ڈاکٹر ساجد امجد** کے خیالات کی پرواز

رنگ آسمان

رنگ برنگے لمحات اور خونیں واقعات کے سائے سائے بڑھتے کرداروں کے انوکھے روپ..... **ایے آر راجپوت** کے قلم کا جادو

وقت

اپنے دامن میں کبھی بے بے قدموں کی آہٹ اور کبھی کسی طوفان کی دھمک چھپائے اچانک بھی وقت کی بساط اور زبردست چالیں **حسام بٹ** کے قلم کی روانی

جولائی 2018ء کا دلربا شمارہ

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سرسبز ٹیگٹ

ماہنامہ

مزید

عقلمند شعروں کی

خطوط کی محفل اور

مرزا امجد بیک کا دلنشین انداز

ایسی کہ عیالوہ

تنویر ریاض، منظر امام، جامر مظہر، سلیم، انجم فادوق ساحلی، محمد الیاس اور ذویا اعجاز کی خوب صورت تحریریں آپ کی منتظر

خوش آمدید کہتا ہے۔“ اس نے میرے قریب پہنچتے ہی عجیب سے گھمنڈی لہجے میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”تم سے دوبارہ ملاقات کی خوش ہوئی۔“ کہتے ہوئے اس نے میری طرف کھڑے کھڑے ہی مصافحے کے لیے اپنا ایک ہاتھ بڑھا دیا۔ مجبوراً مجھے بھی اخلاق کا مظاہرہ کرنا ہی پڑا اور کھڑے ہو کر میں نے بھی اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو گویا چارونا چار تھام لیا۔ ”بیٹھو.....“ کہتے ہوئے وہ میرے سیدھے ہاتھ کے سنگل صوفے پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔

راکا کے انداز و اطوار سے روایتی غرور مترشح تھا۔ ہم دونوں کئی بار ایک دوسرے کو ذک پہنچا چکے تھے۔ کبھی وہ غالب آتا کبھی میں لیکن میں نے اکثر اسے میدان چھوڑ کر بھاگنے پر ہی مجبور کیا تھا اور یہی میری اس پرفورمیت تھی۔

اس کا مکروہ چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اب بھی مجھے یہاں دیکھ کر اندر سے بری طرح خار کھائے ہوئے تھا اور دکھاوے کی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیے ہوئے تھا۔

”یہاں تم یقیناً پرل ٹریڈرز کی طرف ہیوی ڈیوٹی مشینری اپورٹ کرنے کے معاہدے کے سلسلے میں آئے ہو گے۔“ اس نے کہا اور میں چونک گیا۔ وہ میری یہاں (بحرین میں) آمد سے اچھی طرح آگاہ تھا۔

”تمہارا اندازہ غلط نہیں ہے۔“

”تو پھر تمہیں اس وقت مسٹر جیکسن کے پاس موجود ہونا چاہیے تھا، یہاں تم کیا کر رہے ہو؟“ اس کے لہجے میں طنز کی زہریلی کاٹ تھی۔ جیکسن کا نام میرے لیے اجنبی تھا، ممکن ہو بہرام خان کے بعد اس معاہدے کے سلسلے میں مجھے اسی آدمی سے ملنا پڑتا۔ تاہم محمود آسن کا نام بھی میرے ذہن میں محفوظ تھا۔

”رہنمائی کا شکریہ!“ میں نے ہولے سے مگر تاؤ دلانے والے انداز میں اس سے کہا۔ لیکن اس کے سوال کا جواب دینا گوارا نہیں کیا۔

”ہم..... ویسے تم واقعی بہت بہادر ہو جو یہاں تک چلے آئے۔“ وہ پھر بولا۔ میں نے اب خاموشی اختیار کر لی تھی۔ یہی نہیں اس کی طرف سے بے نیازی بھی برتنے لگا، وہ چند ثانیے سے میرے بولنے کا منتظر رہا اس کے بعد خاموشی سے اٹھ کر آگے بڑھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ جائے گا، مگر ایسا نہیں ہوا وہ سیدھا دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا، اس نے شاید اپنے گرائڈیل ساتھی کو بھی آنے

کا اشارہ کر دیا تھا کیونکہ وہ بھی میری طرف ایک گھورتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پیچھے چل دیا تھا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئے۔

شیشے کے پار سے میں نے ان دونوں کو کار میں سوار ہوتے اور روانہ ہوتے دیکھا۔

”کون تھے یہ دونوں؟“ فاران نے ان کے روانہ ہوتے ہی پوچھا۔

”ذمّن.....“ میں نے مختصر کہا۔

”اوہ.....“ اس کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔ ”محسوس کر رہا تھا میں، وہ کھر دے چہرے والا تو تمہیں یوں گھور رہا تھا جیسے کھائی جائے گا۔“ اس کا اشارہ راکا کی طرف تھا۔

”ان کے نام کیا ہیں؟“ اس نے آخر میں دریافت کرنا چاہا۔

”نام ہی نہیں ان سے متعلق ساری تفصیل بھی سنا دوں گا بہت جلد، لیکن ابھی نہیں۔“

فاران سمجھ رہا تھا، اس نے پھر اصرار نہیں کیا۔

راکا..... کی نظروں میں آنے کا مطلب تھا میں شاہ میر اور بن رائد کی نظروں میں بھی آ گیا تھا۔ دشمنوں نے مجھے یہاں دیکھ لیا تھا۔ راکا کا ادھر آنے کے مشکوک انداز سے ہی میں جان گیا تھا کہ دینگ ہال میں اس کی یوں متلاشی انداز میں آمد خالی از علت نہ تھی۔ وہ بھی یقیناً گلزار سے ملنے کے لیے آیا ہوگا، مگر گیت پر تعینات سکیورٹی اہلکاروں نے اسے بھی وہی جواب دیا ہوگا جو ہمیں دیا تھا، کیا خبر کسی گہری شناسائی کے سبب کسی نے اسے بتا دیا ہو کہ کچھ اور لوگ بھی اسی انتظار میں دینگ ہال میں موجود ہیں، راکا چونکہ مجرم تھا اور یہی جاننے کے لیے اس نے بھی دینگ ہال کا رخ کیا کہ دیکھا جائے اور کون سی ”پارٹی“ گلزار سے ملنے کی منتظر بیٹھی ہے، یوں وہ ادھر آ کر دھمکا تھا۔

انہی سوچوں اور الجھنوں میں دو تین گھنٹے بیت گئے، اس دوران میں یہی دعائیں لگا رہا کہ گلزار کسی خوف یا پریشانی کی وجہ سے کہیں ہم سے ملاقات کا ارادہ نہ ترک کر دے ورنہ اس قدر طویل انتظار کی ساری محنت اکارت چلی جاتی۔ راکا بھی تو ملنے آیا تھا۔ ممکن تھا وہ مجھے پہچان کر لوٹ گیا ہو اور پھر کسی وقت آنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

اسی وقت ٹیلی فون کی بیل گنگنائی۔ میں نے چونک کر استقبالیہ خاتون کی طرف دیکھا۔ وہ ریسیور کان سے لگائے میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ کچھ بولی اس کے بعد مجھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی طرف چلا، فاران نے بھی میری تقلید کی۔

”گلزار! آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔“ خاتون نے سیاہ نقاب کی اوٹ سے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکراتی آنکھوں سے کہا۔ میں نے یوں اس کے نازک ہاتھ سے ریسیور چھپا تھا جیسے وہ انکار ہی نہ کر دے۔

”ہہ..... ہیلو..... مس گلزار؟“ میں نے انگریزی میں استفسار یہ کیا۔

”لیس..... آپ کون..... ہیں اور مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟“ دوسری جانب سے ایک تیزی نسوانی آواز ابھری۔ اس کی تیزی میں خوف کا عنصر بھی مجھے واضح طور پر محسوس ہوا تھا۔ اس کی انگلیش رواں اور شائستہ تھی۔

”جی میں، آپ مجھے نہیں جانتیں اور جانتا تو میں بھی آپ کو نہیں ہوں۔ لیکن مجھے آپ سے ضروری ملنا تھا، کچھ اہم باتیں کہنا تھیں آپ سے۔“

”کس قسم کی باتیں؟“ سوال پوچھا گیا۔

”وہ میں مل کر ہی آپ کو بتا سکتا ہوں۔“

”میں آپ سے نہیں مل سکتی، آپ فون انہی خاتون کو دیں۔“ گلزار نے بدستور اسی طرح خشک لہجے میں مخاطب ہوتے ہوئے ملنے سے صاف انکار کر دیا۔ میں پریشان ہو گیا۔ میں نے اس سچی سے لہجے میں کہا۔

”دیکھیے خاتون! میرا ہی نہیں آپ کا بھی مجھ سے ملنا ضروری ہے، میں کئی گھنٹوں سے یہاں دینگ ہال میں آپ سے ملاقات کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔“

میرے قریب کھڑے فاران احمد نے صورت حال فوراً بھانپ لی اور مجھ سے ریسیور لے کر خود اپنے کان سے لگاتے ہوئے شناسا لہجے میں گلزار سے مخاطب ہو کر بولا۔

”مس گلزار! یہ میں ہوں، فاران احمد، ٹیکسی ڈرائیور، مجھے تو آپ اچھی طرح جانتی ہیں ناں..... کئی بار آپ اور آپ کی فیملی کو میں یہاں لاتا لے جاتا رہا ہوں؟“

میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے بھی گلزار سے ملنے کی میری سفارش کر دی۔ تھوڑی دیر بعد بالآخر گلزار نے فاران احمد کے توسط سے ملاقات کی حامی بھر لی اور اس کے

کہتے ہیں حوصلے بلند ہوں تو انسان کیا کچھ نہیں کر سکتا، چین کے شی پنک کی مثال لے لیں جنہوں نے 1995ء میں ایک حادثے میں اپنے دونوں بازو گنوانے کے بعد بھی حوصلہ نہیں ہارا اور اپنے پیروں سے پینٹنگ کرنا شروع کر دی۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ معذور افراد کے فلاح و بہبود کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

☆☆☆

موریطانیہ مغربی افریقا کا ایک ملک ہے اور یہاں کی اکثریت مسلمان ہے۔ یہاں پر اگر کوئی خاتون اپنی شادی سے خوش نہ ہو تو وہ طلاق لے کر اپنے والد کے گھر واپس آ جاتی ہے، جہاں اس کی آمد کی خوشی میں ایک جشن منایا جاتا ہے جسے طلاق کا جشن کہتے ہیں۔ موریطانیہ شاید وہ واحد ملک ہے جہاں کے معاشرے میں طلاق یافتہ عورت کو زیادہ عزت دی جاتی ہے اور گھر کے اہم معاملات میں اس کے مشوروں کو مقدم رکھا جاتا ہے۔

☆☆☆

تائیوان میں مائی کافی کے نام سے مشہور ایک کیفے ایسا بھی ہے جہاں کافی پر اتنے دلکش اور دلچسپ نقش و نگار بنائے جاتے ہیں کہ دیکھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔ اس کیفے میں کام کرنے والی فنکارہ جس کا نام چینگ کوئی فینگ ہے، صرف دس منٹ میں کافی تیار کرنے کے بعد اس کے اوپر ایسے منفرد اور دلچسپ نقش و نگار بناتی ہیں کہ کافی کا مزہ دو بالا ہو جاتا ہے، جن میں انسانی اشکال، پالتو جانور یا گاہک کی من پسند تصاویر شامل ہوتی ہیں۔ چینگ کافی پر تصویر کے نقش و نگار صرف کریم اور دودھ کی مدد سے بناتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کام میں سب سے زیادہ مشکل جھاگ کوڈیزائن کے حساب سے ترتیب دینا ہوتا ہے جو ان کے لیے ایک چیلنج ثابت ہوتا ہے۔

مرسلہ: منشی محمد عزیز مئے۔ لندن

تھوڑی دیر بعد ہم کالونی میں انٹر ہو چکے تھے۔ اندر دور یہ ایک ترتیب کے ساتھ بنگلے اور مکانات بنے ہوئے تھے۔ کوارٹرز بھی نظر آرہے تھے۔

ہم ایک بنگلے کے دروازے پر پہنچ کر کر کے اور فاران

نے کال بیل پر اُننگی رکھ دی۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ ایک ادھیڑ عمر عورت نے کھولا۔ یہ ایک کرخت صورت ایک مقامی عورت ہی نظر آرہی تھی۔ رنگت سیاہ تھی اور آنکھیں نیچی نیچی تھیں۔ قد بھی مردانہ انداز کا دروازہ چوڑا تھا۔ اسے دیکھ کر کہا جاسکتا تھا کہ مرد مار عورت تھی۔

فاران نے اسے میرے اور اپنے بارے میں بتایا۔ وہ ہم دونوں کو ایک خراٹ سی نگاہ سے دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولی۔

”اندرا آ جاؤ۔“

اندرا سے مکان کی آرائش و تزئین دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ اس قدر سجا سورا ہوا آرام دہ گھر جو زندگی کی ساری سہولیات سے مزین بھی نظر آتا تھا، دیکھ کر میں خواہ مخواہ ہی مرعوب سا ہونے لگا۔ نشست گاہ بھی بہترین سجاوٹ کا نمونہ تھی، جو دور جدید کے ساز و سامان سے مرصع تھی۔

میں اور فاران آرام دہ صوفے پر براجمان ہو گئے، میں ابھی اطراف کا جائزہ لے رہا تھا کہ میں نے گلنارا کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ اُس نے حسب سابق نفیس قسم کی بنگالی طرز کی ساڑی باندھ رکھی تھی۔ اس کے نقوش جیسے تھکے اور گہرے تھے، جیسا کہ مذکور ہو چکا وہ ایک سانولی مگر پُرکشش رنگت کی خاتون تھی، اس کی آنکھیں گہری اور کشش انگیز تھیں۔ سر قد تھی۔ اس کے بیضوی چہرے پر اُداسی غم کے علاوہ خوف کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔ تاہم اسے خاص بارعب انداز و اطوار سے وہ ایک دنگ خاتون بھی لگی تھی۔ مجھے یاد تھا کہ بہرام خان کا ذکر کرتے ہوئے رانا بشیر نے مجھے یہی بتایا تھا کہ وہ ایک انڈین نژاد مسلمان ہے، لیکن گلنارا مجھے بنگال خاتون محسوس ہو رہی تھی۔ بہت نفیس خاتون نظر آتی تھی۔

قریب سے اس کا جائزہ لینے پر مجھے اس کی عمر کا اندازہ چوبیس پچیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ وہ کسی طور بھی دو عدد میں ایجرز بچوں کی ماں بھی نہیں دکھتی تھی، جنہیں میں آج صبح اس کے ہمراہ دیکھ بھی چکا تھا۔

میں نے اس کے احترام میں کھڑے ہو کر اسے سلام کیا۔ فاران نے بھی فوراً میری تقلید کی تھی۔ گلنارا نے فاران پر محض ایک سرسری سی نگاہ ڈالی تھی مگر مجھے وہ کافی غور سے مکتی رہی میرے سلام کا جواب دینے کے بعد مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی سامنے والے صوفے پر بڑی سچ سے براجمان ہوئی۔

اس کی قدرتی کجکاری آنکھیں ہنوز میرے چہرے پر جیسے ثبت ہو کر رہ گئی تھیں۔ تاہم ان میں تشکیک کے گہرے سائے ہلکورے لیتے نظر آتے تھے۔

”آپ کی تعریف؟“ اس نے پوچھا۔

”میرا نام نعمان ہے اور میں پاکستان سے آیا ہوں۔“ میں نے ترنت کہنا شروع کیا کہ کہیں یہ مجھے جلد ہی جانے کا نہ کہہ دے۔ کیوں کہ اس کے طرزِ مخاطب سے بیزاری اور تھکن بھی ظاہر ہو رہی تھی، وجہ ابھی تھوڑی دیر پہلے پولیس پارٹی کی طویل پیزار کن گفتیش ہی ہو سکتی تھی، جسے وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی بھٹکا چکی تھی۔

میں کہتا رہا۔

”میں پاکستان میں پرل ٹریڈرز کا بزنس منیجر ہوں۔ میرے پاس کا نام مسٹر رانا بشیر ہے۔ تلفو آئل کمپنی کے سلسلے میں میری ایک اہم ملاقات آپ کے مرحوم شوہر مسٹر بہرام خان سے طے تھی اور انہوں نے ہی مجھے ان پورٹ پر ریسو کرنے کے لیے آنا تھا۔ لیکن انہوں نے.....“

میں نے کہتے ہوئے دانستہ اپنا جملہ اُدھورا چھوڑ دیا۔ میں نے دیکھا، میری اتنی صراحت پر گلنارا کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ ٹھوکر کے سائے بھی مانند پڑنے لگے تھے اب اس کی دلشیں کجکاری آنکھوں سے۔

اس نے ایک گہری سانس لی تھی۔ پھر بولی۔ ”بہرام کی زبانی میں نے غائبانہ طور پر رانا صاحب کا نام سن رکھا ہے۔ بہرام پاکستان جاتے تو ہوٹل کے بجائے انہی کے ہاں قیام کرتے تھے لیکن اب تو وہ دنیا میں نہیں رہے، آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟“ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں اُجھکن سی تیر گئی۔

”یقیناً مجھے اب آپ سے کوئی کام نہیں ہونا چاہیے۔“ میں نے ہولے سے کھٹکھارتے ہوئے محتاط لہجے میں جواب دیا۔ ”لیکن پھر بھی میں آپ سے ایک ضروری بات کہنا چاہوں گا، جو میرا فرض بھی بنتا ہے۔ پہلی تو یہ کہ جن لوگوں نے آپ کے شوہر کا قتل کیا ہے میں ان سے واقف ہوں، دوسری بات یہ کہ وہ میرے بھی دشمن ہیں۔“

یہ بتانے کے بعد میں نے اس کا ردِ عمل دیکھنے کے لیے اس کے دلش چہرے پر نظریں جمادیں۔ میرا خیال تھا وہ میری بات سنتے ہی چونک پڑے گی لیکن یہ میری محض خام خیالی ہی رہی، جس کا دور کہیں خدشہ مجھے بھی تھا۔

اس کے چہرے پر طنز یہی مسکراہٹ ابھری اور وہ اسی

لہجے میں مجھ سے بولی۔

”تم شاید تیسرے یا چوتھے فرد ہو جو کم و بیش اسی قسم کی بات کا اظہار پہلے بھی مجھ سے کر چکے ہیں۔ خیر.....“ وہ اپنی ساری کا پلو درست کرتے ہوئے ایک نگاہ میرے برابر میں بیٹھے ہوئے فاران پر ڈالتی ہوئی مزید بولی۔

”یہ تو فاران کی وجہ سے اور کچھ رانا بشیر کے حوالے سے میں نے آپ کو اتنا وقت دے دیا، بہر حال آپ کا شکریہ، میرا خیال ہے کہ میں خود بھی بہت اچھی طرح سے یہ حقیقت جانتی ہوں کہ میرے شوہر کے قاتل کون ہیں اور پولیس کو بھی میں نے ان کے نام بتادیئے ہیں، باقی ٹھوس ثبوت میں عدالت میں پیش کرنے کا فیصلہ کر چکی ہوں۔ ایک بار پھر آپ کا شکریہ۔“

اس کا آخر میں کہنے کا انداز مجھے ایسا ہی لگا۔ ”لہذا اب آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔“

مجھے اپنے حلق میں کڑواہٹ سی اُترتی محسوس ہوئی۔ تاہم گلنارا خود ایسے حالات سے دوچار تھی کہ اس کا بھی تصور نہ تھا۔ میں رخصت چاہنے والے انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا اور آخر میں بولا۔

”محترمہ گلنارا صاحبہ! خدا کرے کہ مجرم کوئی اور قتل کھلانے سے پہلے قانون کی گرفت میں آ جائیں لیکن ایک بات یاد رکھیے گا کہ میں اور آپ بہر حال مقامی نہیں ہیں مگر دشمن نہ صرف مقامی بلکہ بے حد اثر و رسوخ والے بھی ہیں۔ چلتا ہوں۔“

میں گلنارا کو سوچتا چھوڑ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

میں اور فاران اسی ملازمہ کے ساتھ دروازے تک آئے اور..... باہر نکلے۔ ملازمہ نے ہمارے عقب میں دھڑ سے دروازہ بند کیا۔ اس سے مجھے ناگواری کا انداز محسوس ہوا۔

میں نے سر جھٹکتے ہوئے انداز میں ایک قدم آگے بڑھایا اور چونک کر رک گیا۔

”کیا ہوا؟“ میرے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے فاران نے یک دم پوچھا۔

میں نے کوئی سن گن لینے کے انداز میں اس سے کہا۔ ”تم نے کوئی آواز سنی؟“

”نہیں تو! کیسی آواز؟“ تبھی ایسی ہی آواز دوبارہ میری ٹھٹکی ہوئی ساعتوں سے ٹکرائی۔

”خطرہ.....! اندر کوئی خطرہ ہے فاران!“ میں نے سننا تے لہجے میں ہولے سے کہا۔ وہ ایسی ہی آواز تھی جو ملازمہ کے دھڑ سے دروازہ بند کرنے کے بعد اندر سے آتی ہوئی مجھے سنائی دی تھی جیسے کسی کو اچانک دیوبچ لیا ہو اور اس کے حلق سے کھٹی کھٹی آواز نکلی ہو، چوں کہ ابھی میں دروازے کی چوٹ بھی پار نہیں کر پایا تھا، یہ ہلکی سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی تھی، جبکہ دوسری آواز میں ایسی کھڑ بڑاہٹ تھی، جس سے کسی گڑ بڑ کا احساس اُبھرتا تھا۔

”اندرا تو ہم ہی تھے بھلا اندر کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔“ ”گلنارا کی جان خطرے میں ہے اندر فاران!“ کہتے ہوئے میرے رگ دے میں سنسنی دوڑ گئی اور میں نے فوراً پلٹ کر دروازے کو اندر کی طرف تھوڑا دھکیلا۔ وہ بند تھا۔ میں نے فوراً کال بیل بجانے کا ارادہ کیا مگر کچھ سوچ کر بدل دیا اور فاران سے بولا۔

”اندرا داخل ہونے کا کوئی چور راستہ مل سکتا ہے ہمیں؟“

”ہرگز نہیں یہاں ایسی حرکت کرنا بھی مت۔“ فاران تشویش زدہ لہجے میں بولا۔ ”یہ مت سمجھو کہ سیکورٹی ایگنٹ تک محدود ہیں وہ خفیہ کیمروں سے ایک ایک مکان پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ یہاں کے قوانین بہت سخت ہیں، پکڑے گئے تو مشکل میں پڑ جائیں گے۔“

”فاران! تم جاؤ میں سب سنبھال لوں گا۔ تم خواہ مخواہ میرے ساتھ.....“

”ہرگز نہیں جناب!“ اس نے فوراً میری بات کاٹ کر جرات مندی سے کہا۔ ”آپ نے جو کرنا ہے کریں، میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

پل کے پل مجھے یوں لگا جیسے اس وقت ایک ایک لمحہ نازک اور قیمتی ہے۔ مجھے اور تو کچھ بھائی نہ دیا، میں نے کم از کم اندر کی گڑ بڑ کو ”بدحواس“ اور ”خبردار“ کرنے کے لیے فوراً کال بیل پر اُننگی رکھ دی۔

میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ فاران بھی کچھ پریشان سا نظر آنے لگا۔

”کون ہے؟“ اندر سے اسی مرد مار ادھیڑ عمر ملازمہ کی کھروری آواز ابھری، لیکن اس میں مجھے وہ پہلے جیسی سختی محسوس نہیں ہوئی۔

”دروازہ کھولے ذرا..... میں ایک بات کہنا بھول گیا تھا۔“

اندرونی بھری خاموشی رہی پھر اس کی جوابی آواز ابھری۔
 ”آ..... آپ اب پھر کسی وقت آجائیے گا۔ میم صاحبہ اب آرام کرنے اپنے کمرے میں چلی گئی ہیں۔“ ملازمہ نے کہا، میں اب اس کے لب و لہجے پر ہی نہیں بلکہ اس کی آواز پر بھی غور کر رہا تھا۔ اس کا انداز گھبراہٹ آمیز محسوس ہوا تھا مجھے۔

”پلیز! یہ بات بے حد اہم ہے اور مس گلنار کے علم میں لانا ضروری بھی۔ میں یہ انہیں بتائے بغیر یہاں سے ہوں گا بھی نہیں۔“

اندرونی خاموشی چھا گئی، مگر لمحہ بھر بعد دوبارہ اس کی آواز ابھری۔ ”آپ ضد مت کریں اور برائے مہربانی واپس لوٹ جائیں، ورنہ میں سیکورٹی کو کال کر دوں گی۔“
 ”بے شک آپ سیکورٹی بلا لیں یہاں میں ہرگز شس سے مس نہیں ہوں گا۔“ میں نے بھی پُر قطعیت سے کہا اور اندر کی خاموشی اس بار طویل ہو گئی، میرا دل یہ سوچ کر تیزی سے دھڑکنے لگا کہیں وہ واقعی سیکورٹی کو فون کر کے نہ ادھر بلوالے، دونوں صورتوں میں بہر حال میرا مقصد ایک ہی رہتا۔

”اچھا کھول رہی ہوں میں دروازہ۔“ اچانک آواز آئی اور میرے شکوک و شبہات یقین کی حد تک جا پہنچے۔

دروازہ کھلا، اسی ملازمہ کا چہرہ نمودار ہوا۔ میرا پہلا عمل یہی تھا کہ میں نے اس کے چہرے پر اپنی بھانپتی نظریں جمادیں۔ جہاں پہلے جیسی بیزاری اور ناگواری جیسے تاثرات تو گجاس کی پیشانی پر شکن کا ایک بل تک مجھے دکھائی نہیں دیا تھا بلکہ اس کے برعکس وہاں مجھے ہراس اور آنکھوں میں ایک خاموش اور مجبور قسم کی التجا محسوس ہوئی، وہ بہت ذہین تھی، اس نے اپنے چہرے کے تاثرات سے مجھے بہت کچھ ”سمجھا“ دیا۔ میرے حوصلوں کے بادبان بلند ہو گئے۔ میں ڈر کے پیچھے ہٹنے والوں میں سے کب تھا؟ حالانکہ جانتا تھا کہ اندر میرے لیے کس قدر خطرہ مجھے نکلنے کے لیے کسی عفریت کی طرح تیار کھڑا تھا۔

میں نے فاران کو باہر دروازے ہی میں رکنے کی تاکید کی، میں اسے کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا مگر وہ نہ مانا۔ ملازمہ نے مجھے فوراً اندر آنے کا راستہ دیا تھا اور اندر قدم رکھتے ہی میری تیز جیسی نظروں نے اس کے اطراف اور عقب میں دیکھنا شروع کر دیا۔

دروازے کے اندرونی حصے کے اس مختصر گوشے میں اب مدھم سی تاریکی کر دی گئی تھی۔ جو دانستہ عمل ہی محسوس ہوا تھا مجھے۔ میں نے اپنے تئیں بظاہر غفلت اور بے پرواہی انداز میں اندر قدم بڑھادیے اور اسی وقت مجھے اپنے دائیں جانب قدرے عقب میں کسی سائے کی آہٹ ابھری محسوس ہوئی، میں اسی پھرتی کے ساتھ ٹپ کر پلٹا، اس سائے کے ہاتھ میں خنجر تھا، جو بلند کئے ہوئے میرے جسم میں اتارنے کو تیار بھی تھا۔ میں نے اس کے پیٹ پر ناف کے نیچے زوردار لات رسید کر دی، یہ ضرب اس کے لیے یقیناً غیر متوقع نہ تھی مگر اچانک ضرور تھی، وہ حملہ آور اپنے حلق سے اوغ کی گھٹی گھٹی آواز نکالتا ہوا دہرا ہوا گیا، میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھے جگھے ہوئے چہرے پر گھٹنے کی بھی ایک زوردار ضرب شدید رسید کر ڈالی۔ وہ ڈھے گیا اور میں نے لپک کر اس کا خنجر ہاتھ میں لے لیا۔

میں نے اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے اس کا جائزہ لیا، وہ کچھ دیر کے لیے اثنا غفلت ہو چکا تھا۔

”وہ..... وہ..... اندر بھی موجود ہیں۔“ ہک بک سی کھڑی اور مجھے یہ ساری ”کارروائی“ بل کے پل نمٹاتے دیکھتی ملازمہ کو جیسے زبان مل گئی۔ فاران بھی تب تک اندر چلا آیا تھا اور حیران پریشان مجھے دیکھتا رہ گیا۔

”کتنے لوگ ہیں وہ؟“ میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

”دو..... ان کے پاس پستولیں ہیں۔ دونوں بچے بھی ان کے قبضے میں ہیں۔ وہ لوگ میم صاحبہ کے منہ سے کچھ اُگلوانا چاہتے ہیں۔“ اس نے بتایا اور میں خنجر ہاتھ میں لیے اس کے بتائے ہوئے کمرے کی جانب بڑھا۔

”جناب! آپ وہاں نہ جائیں۔“ فاران نے ایک دم ہلکی آواز میں مجھ سے کہا۔ ”آپ کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے، سیکورٹی والوں کو مطلع.....“

”نہیں فاران! کچھ پُر اسرار معاملات کو اسی تاریکی کے پردوں میں ہی نمٹانا زیادہ سودمند ہوتا ہے۔“ میں نے عجیب سے جوش تیلے لہجے میں کہا ”تم دونوں فقط ایک کام جلدی سے کر ڈالو، اس عورت کی مدد سے رسی لے کر اس بے سدھ آدمی کی مشقیں کس دو، تاکہ ہوش میں آنے کے بعد یہ کام نہ خراب کر ڈالے میں آگے دیکھتا ہوں۔“ فاران اور اس خاتون کو یہ ہدایت دینے کے بعد میں اسی کمرے کی طرف بڑھا۔ جہاں کا اشارہ ملازمہ نے کیا تھا۔

یہ وہی کمرہ تھا جہاں تھوڑی دیر پہلے میری گلنار سے

ملاقات ہو چکی تھی۔ میں دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا اور قریب پہنچا، دروازہ بند نہیں بھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کی چوڑی درز سے اپنی آنکھ چکادی۔ اندر کا ماحول ہی نہیں ان کے باتیں کرنے کی آوازیں بھی صاف سنائی دینے لگیں۔ اندر دو نقاب پوش افراد نے گلنار اور اس کے دونوں بچوں کو محبوس کر رکھا تھا۔ دونوں بچے رن بستہ حالت میں تھے اور ان پر ایک نومند سا بد معاش پستول لیے مسلط کھڑا تھا۔ اس کے پستول کی غیر معمولی لمبی نال کو دیکھتے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ساکینر ڈ تھا۔

دونوں بچے خوف زدہ نظر آ رہے تھے۔ یہی حالت ان کی ماں یعنی گلنار کی بھی تھی، جو ایک اور ایسے ہی بد معاش کی گن پوائنٹ پر دوسری طرف سراسیمہ سی کھڑی تھی۔ دوسرے بد معاش کا پستول بھی ساکینر ڈ تھا۔

گلنار کی حالت خوف اور تشویش سے بری ہو رہی تھی۔ اس کے دونوں بچوں کی زندگیاں داؤ پر لگی ہوئی تھیں۔ پہلا والا اس سے کچھ اُگلوانے کی کوشش کر رہا تھا اور نہ بتانے کی صورت میں اسے اور اس کے بچوں کو موت کی دھمکیاں دے رہا تھا۔

میں ابھی ان دونوں نقاب پوش بد معاشوں کو قابو کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے کہا۔

”اس نامراد ٹمبلر کو دیکھو جا کر کہاں رہ گیا، دروازے تک گیا تھا۔“

وہ شخص پستول ہاتھ میں تولے دروازے کی طرف آنے لگا جس کی دوسری جانب میں کھڑا تھا۔ اسے دروازے کی طرف بڑھتا دیکھ کر میں جلدی سے بے آواز ایک طرف کوچپ کر کھڑا ہو گیا۔

دروازہ کھلا، وہ آدمی پستول ہاتھ میں لیے باہر نکلا اور میں نے موقع پاتے ہی اچانک اسے پیچھے سے چھاپ لیا۔ میں نے کھڑی ہتھیلی..... کاوار اس کی گدی پر کیا تھا، وہ تورا کر گرا، مگر گرتے ہی فوراً سنبھلا، ادھر ہی میں دھوکا کھا گیا، پستول اگرچہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا اور اسے ڈھتا دیکھ کر میں نے کچھ زیادہ ہی غفلت کا مظاہرہ کر ڈالا۔ یکے بعد دیگرے اس پروار کرنے کی دھن میں اس نے گرتے ہی حیرت ناک انداز میں سنبھلا لیا تھا اور اپنی داہنی ٹانگ سوئپ کی جو میری دونوں ٹانگوں سے ٹکرائی، نتیجے میں فرش سے چند انچ اُچھل کر میں گرا، وہ اپنے گھرے ہوئے

پستول کی طرف لپکا۔ بلاشبہ اس نے کمال پھرتی ہی نہیں ناقابل یقین برداشت سے بھی کام لیا تھا ورنہ جاننے والے فائر جانتے ہیں کہ کھڑی ہتھیلی کا وار اور وہ گدی پر پڑے تو مد مقابل کی کیا حالت ہو جاتی ہے۔

میرے اچھل کر گرنے کی آواز خاصی ”دھم“ کی صورت میں ابھری تھی۔ جو اندر موجود اس کے ساتھی کو چونکانے کا سبب بن سکتی تھی۔

اس بد معاش کی حیران کن کارکردگی نے میرے وجود میں بھی جوش غیظ کا طوفان بھردیا اور میں بھی بجلی کی طرح ٹپ کر اس کی جانب کہنوں اور ٹھنوں کے بل پر جس قدر تیزی سے لپک سکتا تھا لپکا..... ادھر اس کا ایک ہاتھ اپنے پستول پر پڑا، ادھر میں اس قدر قریب تھا اور میرا گھونسا اس کے بائیں پہلو پر پڑا، اس کے حلق سے کریہہ ناک چیخ خارج ہو گئی، میں نے پھرتی سے اس کے پستول والے ہاتھ پر وار کیا، جسے وہ میری جانب سیدھا کرنے والا تھا، وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میرے ہاتھ میں آ گیا مگر..... اس طرح اس کی لمبی نال ہی میرے ہاتھ میں آ سکی، میں نے وہی گھما کر اس کی کٹپٹی پردے ماری..... بچپاک کی آواز نے اس کی کٹپٹی پھاڑ ڈالی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

میں وحشت خوں رنگ انداز میں کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا اور ایک درندہ دار جوش تیلے اسے ٹھوکر مارتا ہوا اندر جا پڑا لیکن یہ حرکت میری بے ظاہر اندھا دھند سی مگر اس میں احتیاط کا عنصر یہ تھا کہ میں اندر موجود بد معاش کے پستول کی زد میں نہ آؤں اور دہی ہوا بھی وہ بری طرح ٹھٹھکا تھا اور گلنار سے دھیان ہٹا کر وہ میری طرف متوجہ ہوا مگر اسے مجھ پر اپنا پستول سیدھا کرنے کا موقع نہ ملا اور میں نے اس کے ساتھی سے چھینے ہوئے پستول کی ”خاموش گولی“ اس کے جسم میں اُتار دی، وہ ایک کریہہ انگیز چیخ کے ساتھ گرا اور ٹھنڈا پڑ گیا۔

لڑائی اور ”مارا ماری“ کا یہ ٹیکٹیکل (Tactical) انداز میں نے کالیا کی سنگت میں کچھ اور اس کے ساتھیوں سے اس کے اڈے پر ہی سیکھا تھا جو آج صبح معنوں میں میرے کام آیا تھا۔

گلنار اجرت سے آنکھیں پھاڑے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کے دونوں بچے گھٹے گھٹے انداز میں رونے لگے تھے۔ اتنے میں فاران اور وہ ملازمہ عورت اندر داخل ہوئے۔ ”باہر ایک اور شکار ٹھنڈا پڑا ہے، اس کی بھی مشقیں کس

کر یہاں لے آؤ۔“

میں نے ہانپتی سی آواز میں ان سے کہا اور پھر گلنارا کی طرف متوجہ ہوا جو مجھے ہنوز یوں نکلے جا رہی تھی جیسے میں کسی اور دنیا کا باسی ہوں۔

”دیکھ لیا آپ نے..... خطرہ میرے خیردار کرنے سے پہلے ہی یہاں موجود تھا۔“ میں نے شکوہ کنناں انداز میں گلنارا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی اس کے دونوں بچوں کے جکڑ بندھو لئے لگا۔

”اوہ..... میرے خدا.....! مم..... میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں؟ آ..... آپ تو میرے اور میرے بچوں کے لیے رحمت کا فرشتہ بن کر آئے تھے اور میں کیسی بد نصیب عورت ہوں کہ اپنے نصیب کو ہی ٹھوکر مار کے گھر سے چلتا کر دیا۔“

اس کی آخر الذکر بات کا مطلب میں سمجھ رہا تھا، بولا۔
”اللہ آپ اور آپ کے بچوں کی سلامتی رکھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ کی نیلی پر جو کل رات غم کا پہاڑ ٹوٹا ہے اس میں اضافہ ہو کیونکہ اتفاق سے میں نے فون پر ان لوگوں کی گفتگوں لی تھی اور اسی دن سے ہی آپ کو خبردار کرنے کے لیے بے چین ہو گیا تھا، میں ایک صاف گو آدمی ہوں، یہ کہ میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا اور آئندہ بھی جو کروں گا، اگر آپ چاہیں تو وہ بھی احسان نہ ہوگا بلکہ اس میں میرا بھی مفاد شامل ہے، ایک بار پھر یہی کہوں گا میں کہ آپ کے شوہر یا اب آپ کے دشمن درحقیقت میرے بھی دشمن ہیں۔“
”مجھے اب آپ کی باتوں سے پورا اتفاق ہے..... آں..... سو رہی آپ نے اپنا کیا نام بتایا تھا؟“ وہ متاثر انداز میں بولی اور میرا نام پوچھا۔
”نعمان احمد۔“ میں نے بتایا۔

اس عرصے میں فاران اور وہ ادھیڑ عمر ”مرد“ ملازمہ دوسرے بد معاش کو بھی رسن بستہ کر چکے تھے۔
گلنارا اور بھی کچھ کہہ رہی تھی مگر میں تیسرے بد معاش کی طرف متوجہ ہوا جو خون میں لت پت قالین پر پڑا تھا۔ اس کے دائیں پہلو سے خون بہہ جا رہا تھا۔ میں نے اس کی گردن ہبہ رگ برائتا ہاتھ رکھا۔ وہ پھڑک نہیں رہی تھی۔ وہ میری چلائی ہوئی گولی سے ختم ہو چکا تھا۔

میں نے ملازمہ کو اشارہ کیا کہ دونوں بچوں کو ان کے کمرے میں پہنچا دے اور وہ خود بھی انہی کے پاس رہے جب تک میں نہ بلاؤں۔

گلنارا اور بھی کچھ کہنا چاہ رہی تھی لیکن میں نے فون کہا۔

”آپ اسی کمرے میں موجود ہیں اور فاران! تم مجھ سے مت ہلنا، میں ذرا گھر کے دیگر اندرونی گوشوں کی تلاشی لے لوں، کہیں اور کوئی نہ چھپا بیٹھا ہو۔“

نصف گھنٹے تک میں بنگلے کے اندرونی گوشوں میں تاسو جھانکتا رہا، چھت پر بھی گیا اور وہاں بنے ایک دو اسٹو نما کمروں میں بھی دیکھا۔ پوری تسلی کرنے کے بعد میں دو باہر نیچے آ گیا اور سوچتے ہوئے انداز میں بڑبڑایا۔

”آخر یہ بد معاش اندر کیسے داخل ہوئے؟ جبکہ یہاں تو ابھی تھوڑی دیر پہلے پولیس ٹیم موجود تھی؟“

”یہ ضرور پولیس ٹیم کے اہلکاروں میں سے ہی کوئی ہوں گے۔“ گلنارا بولی تو فاران نے فوراً انکار میں سر ہلادیا اور بولا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا، یہ لوگ پہلے سے ہی یہاں گھاسے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ ممکن ہے یہ دیکھنا چاہتے ہوں کہ آپ پولیس کو کیا بیان دیتی ہیں۔“

فاران کی بات پر میں حیران رہ گیا۔ اس نے بالکل درست تجزیہ کیا تھا۔

”میں پوری طرح متفق ہوں تمہاری بات سے مسئلہ فاران!“ میں نے ایک جوش تلے کہا۔ گلنارا بے چاری کی حالت پتلی ہوئی جا رہی تھی۔ میری طرف دیکھ کر اسی انداز میں بولی۔

”مم..... مجھے واقعی آپ کی مدد کی ضرورت ہے نعمان صاحب! پلیز، میری مدد کیجئے..... میں اور میرے بچے واقعی بہت خطرناک لوگوں میں گھر چکے ہیں۔“ گلنارا کو صورت حال اور میرے ”پانی“ کا اندازہ ہوتے ہی فوراً احساس ہو گیا کہ وہ شوہر کے قتل ہونے کے بعد خود بھی کیسی خطرناک صورت حال کا شکار ہو چکی ہے۔ یوں میری اہمیت کا احساس ہوا تھا۔ میری کارکردگی نے ہی نہیں بلکہ میری صاف گوئی نے بھی اس کے دل میں میرا اثر قائم کیا تھا۔

لہذا میں نے نہایت بردبارانہ اور مدبرانہ لہجے میں اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”دیکھیے خاتون! مجھے یقیناً اس بات کی خوشی ہوگی کہ میں آپ کے کام آؤں، آج صبح جب میں نے آپ کو کیمپ قمری میں غم و غصے سے شور مچاتے دیکھا تھا تو اسی وقت میں جان گیا تھا کہ آپ جوش میں ایک خطرناک غلطی کر رہی ہیں۔ مجھے موقع نہ مل سکا تھا ورنہ تو میں وہیں آپ کو

ایک طرف لے جا کر سمجھانے کی کوشش کرتا۔ خیر..... اب خدا را سوچ سمجھ کر قدم اٹھائیں۔“

”یہ سب باتیں ہوتی رہیں گی جناب نعمان صاحب!“ فاران نے کہا۔

”اب ان کا کیا کرنا ہے؟“

اس کا اشارہ ان تینوں بد معاشوں کی طرف تھا، جن میں ایک میرے ہاتھوں لاش میں تبدیل ہو چکا تھا۔ میں نے فاران کی طرف دیکھ کر ہولے سے اپنے سر کو تھپی جنبش دی تھی پھر گلنارا کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ ”آپ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے پولیس کو کیا بیان دیا تھا۔“

”یہی کہ مجھے انہی لوگوں پر شبہ ہے جن سے میرے شوہر کا جھگڑا چلا آ رہا تھا۔“

”آپ نے کن لوگوں کے نام بتائے تھے؟“ میں نے دھڑکتے دل سے اگلا سوال کیا۔

”ایک توحسان بن رائد ہے، دوسرا شاہ میر اور تیسرا شخص..... ایک گورا ہے، جس کا نام..... لاڈلہ ور تھا ہے۔“

”آپ کے شوہر کی موت سے انہیں کس نوعیت کا فائدہ ہو سکتا تھا؟ آپ نے ٹھوس ثبوت اور شواہد وغیرہ کا بھی کوئی ذکر کیا تھا۔“ میں نے پولیس کے سے انداز میں اس سے سوال کیا۔

گلنارا نے جواب دینے کی بجائے اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ لیا اور اسے مسلنے لگی۔ میں نے دیکھا وہ اس وقت سخت قسم کی اعصابی اور ذہنی کشیدگی کا شکار نظر آ رہی تھی۔ وہ صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی اور اکتلتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”مم..... مجھے پلیز! پہلے ایک گلاس پانی پلا دو..... میں نے ادھر ادھر دیکھا اور مجھ سے پہلے فاران حرکت میں آیا، وہ قریب رکھے فریج کی جانب بڑھا اور اسے کھول کر ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال لی۔ کالج کے گلاس شیشے کی ٹاپ والی میز پر رکھے تھے۔ فاران نے پہلے گلاس بھر کر گلنارا کو دیا پھر مجھے بھی تمھارا جسے میں نے شکر یہ کہہ کر لیا اور غماغت چڑھا گیا۔ فاران نے بھی پانی پیا۔“

”یہ تینوں گلفو آئل کے شرارت دار ہیں لیکن مجرمانہ ذہنیت رکھتے ہیں۔“ پانی کا ایک گلاس ختم کرنے کے بعد گلنارا نے بتانا شروع کیا۔ ”بلیک گولڈ یعنی کالا سونا، اس کا نام تم نے شاید سن رکھا ہو۔“

یہ نام میرے لیے غیر شناسنا تھا اسی لیے میں نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی تھی۔ وہ آگے بٹارہی تھی۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری

(1287ھ/1868ء-1368ھ/15 مارچ 1648ء)

مفسر۔ مناظر اور عالم دین۔ ابوالوفا کینیت والد کا نام خضر تھا۔ امرتسر میں پیدا ہوئے۔ آبائی وطن کشمیر تھا۔ آپ کا سلسلہ نسب کشمیر کے نو مسلم خاندان منٹو سے ملتا تھا۔ آپ نے مولانا غلام رسول قاسمی، مولانا احمد اللہ امرتسری، مولانا احمد حسن کانپوری، حافظ عبدالمنان وزیر آبادی اور میاں نذیر حسین محدث دہلوی سے علوم دینیہ کی تحصیل کی۔ مسلک کے لحاظ سے اہل حدیث تھے چنانچہ اپنے مسلک کی ترویج کے لیے زندگی بھر کوشاں رہے۔ اخبار اہل حدیث جاری کیا۔ فن مناظرہ میں مشاق تھے۔ زندگی بھر آریہ سماج اور قادیانیوں سے معرکتہ الآراء مباحثے کیے اور دین اسلام اور ختم نبوت کی حقانیت ثابت کرتے رہے۔ تقسیم پاک و ہند کے بعد سرگودھا میں مقیم ہوئے۔ آخر عمر میں فالج ہو گیا۔ اور اسی عارضے سے وفات پائی۔ آپ نے کئی تصانیف چھوڑی ہیں۔ عربی زبان میں قرآن کی تفسیر کا نام ”تفسیر القرآن بکلام الرحمن“ ہے۔ اردو تفسیر کا نام، ”تفسیر ثنائی“ ہے۔

مرسلہ: احمد ندیم، لاہور

”یہ ایک گروپ ہے، جو بہ ظاہر کالے سونے (تیل) کی تلاش میں رہتا ہے اور سروے ٹیم کے ساتھ ہیلنگ ہینڈ میں ہوتا ہے۔ اسے مشترکہ طور پر تشکیل دیا گیا ہے۔ اس میں دو ڈور تھ کمپنی، جس کے تعاون سے گلفو آئل کمپنی جو یو اے ای کی ایک مشہور زمانہ اور معتبر کمپنی جانی اور پہچانی جاتی ہے، جبکہ دو ڈور تھ کو تو عالمی سطح کی اہمیت حاصل ہے، اس میں پانچ ایکسپریٹس کو شامل کیا گیا ہے۔ جن میں دو افراد دو ڈور تھ کمپنی کے اور تین گلفو آئل کے شامل ہیں۔ سارا معاملہ اسی ”بلیک گولڈ“ کی وجہ سے خراب ہوا ہے۔ اس کی مخالفت سب سے پہلے بہرام نے ہی کی تھی، اس ضمن میں ان کا کہنا تھا کہ یہ گروپ بلاوجہ تشکیل دیا گیا ہے جو درون خانہ مجرمانہ نوعیت کی سرگرمی میں ملوث رہتا ہے۔“

”مجرمانہ سرگرمی سے آپ کی کیا مراد ہے؟“ میں نے درمیان میں کہا۔

”بہرام کو پہلے اس پر شبہ تھا کہ یہ گروپ غیر قانونی طور پر تیل کی تلاش اور کھدائی وغیرہ کے راستے اپناتا ہے اور تیل کے ان سوداگروں کی راہ ہموار کرتا ہے جو عالمی سطح پر تیل کا مصنوعی بحران پیدا کر کے یا قیمتوں کے حوالے سے انتشار پھیلا کر اپنی مرضی کے سامنے بڑے بڑے ممالک کو گھسنے کیلئے پر مجبور کرتے ہیں، یوں وہ اپنی جائز و ناجائز (جو زیادہ تر ناجائز ہی ہوتی ہیں) بات منوا کر اپنا الوسیدھا کرتے ہیں، ان کی اس حرکت سے تیسری دنیا کے ممالک، جن میں پاکستان اور بنگلہ دیش سمیت کئی ایسے ملکوں کی معیشت ڈھے جاتی ہے، جن میں مسلم ممالک اور ان کے حلیف ملک شامل ہیں اور بد قسمتی سے وہی زیرِ عتاب آتے ہیں۔ معاملہ تب خراب ہوا جب بہرام خان نے اس ”بلیک گولڈ“ کے اصل خطرناک اور بین الاقوامی سطح پر معیشت کا ہراس پھیلانے کے ایک مکروہ منصوبے کا بھی کھوج لگایا، جو کسی سپر پاور کے کہنے پر عنقریب شروع کیا جانے والا تھا۔“

”وہ منصوبہ کیا تھا؟“ میں نے ایک عجیب جوش تلو سے لہجے میں پوچھا۔ میرے اندر ایک ایسی تنہائی اترنے لگی تھی۔

”وہ خطرناک مشن، جسے بلیک گولڈ یعنی کالا سونا گروپ نے ”او، پی، پی“ کا نام دے رکھا ہے۔“

”او، پی، پی؟“ میں نے استفسار طلب لہجے میں دہرایا اور سوالیہ نظروں سے گلنارا کا چہرہ تکتے لگا۔

”ہاں..... او۔ پی۔ پی..... یعنی..... آئل پروڈکشن پلیٹ فارم کی خفیہ طور پر ایک مجرمانہ..... تعمیر۔“ گلنار نے بتایا۔

”یہ کیا بلا ہے؟“ میں تیل اور تیل کی سیاست کی ابجد سے بھی واقف نہ تھا۔

”تیل کی صنعت کی سیاست میں یہ ایک بڑی اور بد بلا ہے، بشرطیکہ اس کے مقاصد نیک ہوں، یہ آئل پروڈکشن پلیٹ فارم درحقیقت ایک عظیم الشان ”آئل رگ“ (Oil Rig) ہے، جو ایک بڑے بحری بیڑے پر بنا ہوا ہے۔ جسے ”سی کوئین“ یعنی ”سمندری ملکہ“ کہا جاتا ہے۔

یوں سمجھو یہ ایک کنواں ہے۔ ایک دکھتا ہوا جہنم زار کنواں، جس کے اندر تیسری دنیا کے غریب ممالک کوئی نہیں بلکہ ان ممالک کو بھی جھوک دیا جائے گا جو ابھی ترقی

پذیری کی راہ پر گامزن ہوئے ہیں۔ اس کنویں کا ایندھن سب سے پہلے اسلامی ممالک کو بنایا جائے گا۔ اس کا منہ ایک شیطان ہے، جسے ”کالا شیطان“ کہا جاتا ہے۔ اسے تیل کی صنعت کا بادشاہ کہا جاتا ہے اور کئی بڑے ممالک کے سیکریٹری آف انٹینسٹی کی اسے زبردست حمایت بھی حاصل ہے کیونکہ وہ ان ممالک کو کروڑوں ڈالر زکے ٹیکس ادا کرتا ہے۔ یہ خود اس وقت کہاں اور کس ملک میں چھپا بیٹھا ہے، کوئی نہیں جانتا۔

وہ کالا شیطان اس وقت خود کو سات پردوں میں چھپائے ہوئے ہے اور اس نے اپنی کٹھ پتلیوں کو آگے کر رکھا ہے۔ بہرام خان اپنے سینے میں ایک سچے مسلمان کا دل رکھتے تھے۔ انہیں اس ”کالا شیطان“ کے اس مکروہ منصوبے کی بھنگ مل چکی تھی۔ یہاں تک انہوں نے پتا لگایا تھا کہ سات پردوں میں چھپا ہوا وہ کالا شیطان ووڈور تھ کے مالک مسٹر ڈی کارلو کو ہی نہیں بلکہ اس کے ذریعے وہ گلفو آئل کے بھی چند مقتدرہ لوگوں کو بھی اپنا ہمواء بنا چکا ہے۔“

وہ اتنا بتا کر ذرا خاموش ہوئی۔ مجھے اس کی باتیں سن کر اپنے دل و دماغ میں ایک عجیب قسم کی سنسنی کا احساس ہونے لگا۔

”بہرام، مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتے تھے جو کچھ وہ یہاں محسوس کرتے مجھ سے نہ صرف شیئر کرتے تھے بلکہ مشورہ بھی کرتے۔ وہ اس گھناؤنی سازش پر اندر ہی اندر کڑھتے بھی تھے۔“ اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

”میں نے ان سے کہا بھی کہ اگر ایسی بات ہے تو اس نوکری پر ہی لعنت بھیج کر اپنے دیش (بنگلہ دیش) چلے جاتے ہیں کیونکہ انڈیا ہم جھوڑ چکے تھے۔ بنگلہ دیش ہمارا آبائی وطن تھا لیکن وہ نہیں مانے۔ بڑے عجیب سے لہجے میں انہوں نے مجھ سے کہا۔ گلنارا! میں اپنی ذات کے بارے میں کوئی بڑا دعویٰ تو نہیں کرتا کہ میں کوئی محبت وطن ہوں یا اسلام کا کوئی بڑا سپاہی، ہرگز نہیں، میں ایسا خوش قسمت کہاں۔ ایک عام سا آدمی ہوں میں، لیکن کیا ہمارا کام صرف یہی ہونا چاہیے کہ ملازمت کی تنخواہ لی اور پیٹ بھر لیا؟ اور بس؟ اس سے آگے ہمارا کوئی فرض نہیں بنتا؟ اگر میں کسی ایسی گڑبڑ کا کھوج لگا بیٹھا ہوں جس سے ملک و قوم سمیت دنیائے اسلام کی سر بلندی کو خطرہ درپیش ہو رہا ہو تو کیا میں اس سے چشم پوشی اختیار کر لوں؟ نہیں گلنارا! میں اپنے وطن کا سپاہی تو نہ بن سکا، اگرچہ ہر محبت وطن ایک سپاہی ہی کی حیثیت رکھتا ہے لیکن ایک سچے مسلمان ہونے کے ناطے میں ایسی گھناؤنی سازش

کو ہوتے دیکھ کر اس سے نظریں چرا کر نہیں رہ سکتا، میں نے اس کا لے شیطان (بلیک ڈیول) کے خلاف علم جہاد بلند کر دیا ہے۔ آگے اللہ میری مدد کرنے والا ہے۔“

وہ اپنے شوہر کے بارے میں اتنا بتا کر بے اختیار رو پڑی۔

میرے سینے میں ایک ہلچل سی مچنے لگی۔ ایمان کی تازگی شاید اسے ہی کہتے ہیں جب کسی دوسرے مسلمان کی قابلِ فخر کارگزاری، اس کی سوچ اور عملی اقدام، پھر اس کی اس نیک کا زمیں شہادت، از خود ہی دوسرے مسلمان کے سینے میں احساس کا چراغ روشن کرنے لگتی ہے۔ ہاں! میرے نزدیک بہرام خان کی موت، موت نہیں تھی بلکہ ایک شہادت تھی۔ وہ اگر چاہتا تو واپس اپنے وطن بنگلہ دیش چلا جاتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ ایک اسلام دشمن، ایک شیطان کے خلاف ڈٹ گیا۔

میرے ضمیر نے مجھے بھی اندر سے جھنجھوڑ دیا۔ چراغ سے چراغ جلنا شاید اسی کو کہتے ہیں۔ میں بھی اپنے اندر ایک ایسی ہی لوگوں نمٹاتے ہوئے، اس کی تپش کو محسوس کرنے لگا تھا۔ اگرچہ میں تو پہلے ہی ان کی سرکوبی کے لیے آگے قدم بڑھا چکا تھا۔

”آپ تو ایک خوش قسمت خاتون ہیں، محترمہ گلنارا صاحبہ!“ اجانک میرے منہ سے بے اختیار ایک جوشیلے انداز میں یہ تو صنی کلمات نکلے تھے۔ اس نے اپنا اشکبار چہرہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔

”ہاں! گلنارا صاحبہ، آپ ایک بہادر انسان ہی نہیں بلکہ ایک سچے اور مجاہد مسلمان کی بیوی تھیں اور اب ایک شہید کی بیوہ ہونے پر آپ کو فخر ہونا چاہیے۔ افسوس کہ میں بہرام خان سے تو کبھی نہیں مل سکا لیکن اس کے بارے میں اپنے پاس رانا بشیر سے یہی سنا تھا کہ وہ ایک بڑی تیل کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ میں بھی انہیں کاروباری آدمی ہی سمجھتا تھا لیکن مجھے تو آج آپ کی باتیں سن کر یہ احساس ہوا کہ وہ تو ایک عظیم انسان تھے۔“ میں اتنا کہہ کر ذرا رکا اور عجیب ہمکاری لینے کے انداز میں کسی غیر مرئی نقطے پر اپنی سوچتی نظریں گاڑتے ہوئے جیسے ایک عزم صمیم تلے لہجے میں دوبارہ اس سے بولا۔

”بھائی بہرام کی شہادت نے میرے اندر بھی ایک نئے جوش و جذبے کو ابھارا ہے۔ مجھے اب یہ بتائیں..... میں نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔“ آپ کے

پاس اپنے شوہر کے قاتلوں کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت ہیں؟ اگر ہیں تو وہ کس صورت میں ہیں؟ محض قیافہ اس کی بنیاد ہے یا.....“

”رتی بھر بھی قیافے پر منحصر نہیں ہیں وہ ثبوت۔“ وہ فوراً ایک جوش تلے لہجے میں بولی۔ ”بہت ٹھوس شواہد ہیں، وہ سب میرے پاس محفوظ ہیں اور میں نے وہ پولیس کو دے دیئے ہیں۔“

”اپنے پاس بھی کچھ رکھا ہے یا سب ان کے حوالے کر ڈالے آپ نے؟“ میں نے کسی خیال کے تحت کہا تو وہ شاید میری اس بات کا مطلب سمجھ کر کچھ پریشان سی ہو گئی اور ایک جواب دینے کی بجائے اسی لہجے میں مجھ سے بولی:

”کیا مطلب آپ کا؟ کیا پولیس بھی؟“

”ممکن ہے۔“ میں نے کاندھے اچکا کر کہا۔ ”کیونکہ دشمن خاصے بار سوخ ہیں اور ان کی پشت پر مجھے بعض بڑی عالمی طاقتوں کا ہاتھ محسوس ہوتا ہے۔ آپ کو یہ ثبوت پولیس کو دینے کی بجائے عدالت میں پیش کرنے چاہیے تھے۔“

”او میرے خدا! مجھ سے تو واقعی یہ ایک بڑی غلطی ہو گئی اب کیا ہوگا؟“ اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔

میں نے ازراہ تشفی اس سے کہا۔ ”پریشان نہ ہوں آپ کچھ سوچ لیتے ہیں، کاش! میری آپ سے پہلے ملاقات ہو جاتی تو میں آپ کو مشورہ دے سکتا۔“

”آپ نے وہ ثبوت پولیس کو دیتے وقت ان سے کوئی ریسرونگ لیٹر لیا تھا؟“ کافی دیر کی خاموشی کے بعد فاران نے بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے صوفے پر پریشان بیٹھی گلنارا سے پوچھا۔

”نہیں، فاران بھائی! ایسا تو میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں تو خود پریشان اور غم زدہ تھی، میری عقل ہی کام نہیں کر رہی تھی، جوش میں آکر میں نے ایک بڑی غلطی کر ڈالی۔“

وہ بے چاری مسلسل پریشان ہوئے جارہی تھی۔ میں نے پھر اسے تسلی دی اور اس کے آئندہ کے پروگرام کے بارے میں پوچھتے ہوئے کہا۔ ”اب آپ نے آئندہ کے بارے میں کیا سوچا ہے؟ کیونکہ آپ کے شوہر کے مقتول ہونے کے بعد تو اب ان کی نوکری اور تمام معاہدے ختم ہو گئے، آپ کو عنقریب یہ رہائش گاہ ہی نہیں بلکہ اس علاقے کو بھی خیر باد کہنا پڑے گا؟“

”میں اپنے شوہر کے قاتلوں کو کفر کردار تک پہنچا کر رہوں گی۔“ وہ تند سے لہجے میں بولی۔ ”منام میں

میرا بھائی منصور رہتا ہے۔ وہ ایک آئی ٹی کمپنی میں کمپیوٹر انجینئر ہے۔ میں اسی کے پاس رہوں گی، وہ آج شام تک یہاں پہنچنے والے ہیں۔“

”ان تینوں کا کیا کرنا ہے، نعمان صاحب؟“ فاران نے پوچھا۔ اس کا اشارہ بد معاشوں کی طرف تھا۔ گلنارا بھی ان کی وجہ سے پریشان نظر آرہی تھی۔ کیونکہ یہ سارا ہنگامہ اسی کے گھر پر ہوا تھا۔

”پولیس کو انعام کرنے کی صورت میں آپ لمبی چوڑی تفتیش کا شکار ہو جائیں گے، کوئی بعید نہیں کہ ایک بڑی مصیبت بھی گلے پڑ جائے۔“

”یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔“ میں نے گہری تفکیر سے کہا۔ ”بہ صورت دیگر ہم اس سے زیادہ بڑی مصیبت میں گرفتار ہو سکتے ہیں۔“

”میرے ذہن میں ایک راہ بھاتی ہے۔“ اچانک گلنارا نے کہا اور فاران اور میں سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ بولی۔

”آج شام تک میرا بھائی منصور مجھے ساتھ لے جانے کے لیے پہنچ رہا ہے۔ ہم خاموشی سے نکل جاتے ہیں، کسی کو بتانے کی ضرورت ہی نہیں۔ بعد میں یہاں کیا ہوا، پولیس خود جانے اور ان کا کام..... وہ انہیں چور ہی سمجھیں گے۔“

”اور..... لاش کا کیا بتائیں گی آپ؟“ فاران نے کہا۔

”تم نے دیکھا کہ یہ لوگ نقاب اوڑھے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں بھی دستانے نظر آرہے ہیں۔“ گلنارا جیسے ہمیں اس گھمبیر صورت حال سے نجات دلانے کے لیے ہمیں تدبیر بھار رہی تھی۔ آگے بولی۔ ”نعمان ان کے پستول سے اپنے فنگر پرنٹس صاف کر لیں، بعد میں سیکورٹی اہلکار یا انتظامیہ کے افراد یہاں آ بھی گئے تو ان تینوں کو چور ہی سمجھا جائے گا۔“

اس کی تجویز قابل غور تھی کیونکہ وہ تینوں غیر قانونی طور پر اندر داخل ہوئے تھے۔ جن میں سے اب ان کا ایک ساتھی میرے ہاتھوں واصل جہنم بھی ہو گیا تھا لیکن گلنارا کی بات پر غور کرنے کے دوران میرے ذہن میں بھی ایک خیال کلک ہوا تھا۔ میں نے ابھی تک ان کی جیبوں کی تلاشی نہیں لی تھی اور دوسرے یہ کہ ان سے پوچھ گچھ ضروری تھی۔

میں نے اول الذکر کام نمٹایا۔ دونوں ہوش میں آ چکے تھے۔ باقی ان کے پاس سے کوئی قابل ذکر شے برآمد نہیں ہوئی تھی۔

”کس کے آدمی ہو تم؟“ میں نے ایک سے پوچھا۔ ”تم زندہ نہیں بچو گے۔“ اس نے میری طرف مٹھوڑے ہوئے کہا۔ مجھے اس کی ڈھٹائی پر غصہ آ گیا۔ میں نے نفر سے ہونٹ بھینچ لیے، میں اسے ہاتھ لگانے سے قاصر تھا، نہیں چاہتا تھا میں کہ اپنے فنگر پرنٹس کو صاف کرنے میں دو بار محنت کروں، جو ایک گھنٹا پہلے کر چکا تھا۔ بنگلے کے ان گوشوں سے بھی میں اپنے فنگر پرنٹس صاف کر چکا تھا، جہاں جہاں ان کے پائے جانے کا خدشہ تھا۔

”کوئی فائدہ نہیں ہے ان سے کچھ اگلوانے کا نعمان صاحب!“ فاران نے کہا۔ ”یہ کچھ بتائیں یا نہیں، ایک ہی بات ہوگی۔“

مجھے فاران کی اس بات پر صاف تھا۔ گلنارا کا بھی کم و بیش یہی خیال تھا، مگر میں نے سفاکی سے کہا۔ ”ٹھیک ہے پھر وہی کارروائی کرنا پڑے گی جو ہم سوچ چکے ہیں۔ انہیں اسی حالت میں بندھا ہوا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، کوئی یہاں آیا تو ان کی قسمت ورنہ ادھر ہی دونوں اپنے ساتھی کی لاش کے پاس بھوکے پڑے گل مرز کمر جائیں گے۔“

میں نے یہ کہتے ہوئے اپنی بات کارڈ عمل دیکھنے کے لیے دزدیدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا بھی تھا۔ دونوں کچھ پریشان سے ہو گئے تھے۔

”انہیں اندر کمرے میں لے جا کر بند کر دو دوبارہ جہاں ان کے ساتھی کی لاش رکھی ہوئی ہے۔“ میں نے فاران سے کہا۔

”دیکھو تم سب بری طرح پچھتاؤ گے۔ بہتر یہی ہے کہ ہمیں جانے دو۔“ ایک نے غصے سے میری جانب گھوم کر تہدید کی۔ اس کے دھمکانے پر میں نے دانت پیس کر کہا۔

”خاطر جمع رکھو مسٹر! پہلے اپنی فکر کرو۔“ ”اگر ہمیں یہاں سے برآمد کر بھی لیا تو ہم تم سب کو پھنسا دیں گے کہ تم لوگ ہمارے ایک ساتھی کو قتل کرنے کے بعد فرار ہو گئے پھر پولیس تمہیں پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالے گی۔“

اس کی بات غلط نہیں تھی۔ وہ ایسی حرکت کر سکتے تھے۔

مگر میں ان کی چال کا توڑ بھی کرنا جانتا تھا۔ پورے اعتماد مگر زہریلی اور کاٹ دار مسکراہٹ سے بولا۔ ”پھر تو میرا خیال ہے کہ ہمیں پہلی دالی ترکیب پر ہی عمل کر لینا چاہیے۔ یعنی تم دونوں کا خاتمہ۔“

”میں تو پہلے ہی آپ سے کہہ رہی تھی کہ ان کا قصہ ہی پاک کر دینا چاہیے، یہ میرے شوہر کے قاتلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ میرے سینے میں جلتی انتقام کی آگ کچھ تو ٹھنڈی پڑے گی۔“ گلنارا نے بھی ان پر نفسیاتی حربہ استعمال کرنا ضروری سمجھا تھا۔

”ہم..... ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”انہیں کمرے میں لے چلو، ایک کا گلا تم دبانا اور دوسرے کو میں تختہ مشق بناؤں گا۔“ میں نے فاران کی طرف دیکھ کر کہا۔

”نہیں..... تہ..... تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ ان کا دوسرا ساتھی ایک دم خوف زدہ ہو کر بولا۔

”کیوں؟ نکل گئے سارے کس بل؟ ابھی تو اکڑ رہے تھے بہت۔“ میں نے اس کی طرف طنزیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“ پہلے سے کہا۔ ”کس کے آدمی ہو؟ مگر یاد رکھنا میں صرف بیچ سنوں گا کیونکہ حقیقت کا مجھے بھی کافی اندازہ ہے۔“

”سچی بات یہ ہے کہ ہم صرف حکم کے غلام ہیں۔ ہمیں حکم دینے والے خود پردے کے پیچھے ہوتے ہیں۔ ایسے کاموں کے لیے وہ اپنے آدمی پیچھے رکھتے ہیں۔ ہمیں صرف کرائے پر ہار کرتے ہیں۔ مرنے کی صورت میں وہ ہمارے لواحقین کو ایک مقررہ رقم تمنا دیتے ہیں، الغرض ہم تو پولیس کو بھی ان کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتے، بھلا پردے کے پیچھے موجود لوگوں کے بارے میں ہم بتا بھی کیا سکتے ہیں؟ یا پھر فون پر گفتگو کرنے والوں کو کیسے پہچان سکتے ہیں۔“

مجھے اس کی باتوں سے سچائی کی بو آ رہی تھی کیونکہ یہ حقیقت بھی تھی کہ جفاور قسم کے بڑے کنٹیکٹر گندی کھسی کی طرح اپنا ایک پر بچا کر رکھتے تھے۔ شاید بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہوں کہ گندی کھسی جب کسی گندیا مٹھاس پر بیٹھتی ہے تو وہ اپنا ایک پر آغشتہ (آلودہ) ہونے سے بچاتی ہے، خدا جانے اس میں کیا منطق ہے، ممکن ہے ایسا اس لیے کرتی ہوں کہ دوبارہ اڑنے کے قابل رہیں۔ بہر کیف..... میں نے اگلا سوال داغا۔

”تمہیں کیا حکم ملا تھا؟“

”گلنارا سے اُن بیوتوں کے بارے میں پتا کرنا جو اس نے پولیس کو دینے کی دھمکیاں دی تھیں۔“ وہ جواباً بولا۔ ”وہ حاصل کرنے اور انہیں زائل کرنے کے بعد گلنارا کو بھی قتل کرنے کا حکم دیا گیا تھا ہمیں۔“

”ہم.....“ میرے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔ ”یہ بتاؤ، تم لوگ اتنی سخت سیکورٹی کے باوجود کیسے اندر داخل ہوئے تھے؟“

”ہم پولیس مین بن کر اندر داخل ہوئے تھے، ہر قسم کے جعلی آئی ڈی کارڈ ہر وقت ہمارے پاس ہی ہوتے ہیں، اندر آنے کے بعد ہم نے اصل بھیجیں بھرا اور اس طرح اندر داخل ہوئے تھے۔“

”اب اگر ہم تمہیں چھوڑ دیں تو تم کس طرح باہر نکلو گے؟“ کسی خیال کے تحت میں نے کہا، میں انہیں آزمانا چاہتا تھا۔

”بہت آسانی سے، یہ ہمارا کام ہے۔“ ”اپنے مرے ہوئے ساتھی کا کیا کرو گے؟“ ”اس کی لاش ہم ساتھ لے جائیں گے باہر ایک الگ گوشے میں ہماری کار کھڑی ہے۔“

میں نے تھوڑا غور کیا، یہ ہمارے لیے بے کار تھے۔ یہاں چھوڑنے کی صورت میں دونوں طرف سے مسائل پیدا ہوں گے اور نتیجہ سوائے پریشانی کے کچھ بھی برآمد نہ ہوگا۔ میں نے ان سے ایک ”معاہدہ“ کر لیا۔ وہ بھی جان چھوٹنے کے چکروں میں راضی ہو گئے۔

انہیں روانہ کرنے کے بعد میں نے گلنارا سے اس کا کوئی ٹیکٹ نمبر لے لیا۔ اس بے چاری نے میری ایک مدد اور کردی کہ ایک فالتو موبائل سیٹ کنکشن سم کے ساتھ مجھے دے دیا۔ اس میں کافی بیلنس بھی تھا۔ یہ بہت اچھا ہوا تھا۔ میں نے وہ شکریے کے ساتھ سنبھال لیا۔

ہمارا زیادہ دیر کرنا مناسب نہیں تھا۔ لہذا میں اور فاران بھی ٹیکسی میں بیٹھ کر کالونی سے بہ خیر وعافیت باہر نکل آئے۔

”واہ..... جناب نعمان صاحب! مان گئے آپ کو۔“ اولی روڈ پر آتے ہی فاران نے تو صلی لیچ میں مجھ سے کہا۔ ”کس خوبی سے ایک گھمبیر پڑنی صورت حال کو آپ نے نمٹایا لیکن.....“ وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔

”لیکن کیا؟“

”نعمان صاحب! کیا یہ ہم نے اچھا کیا کہ ان لوگوں کو ایسے ہی جانے دے دیا؟“

”یہ ہمارے کسی کام کے نہیں رہے تھے، بلکہ اُلٹا مصیبت بننے لگے تھے۔“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ یہ اصل آدمی تھے ہی کب..... محض حکم کے غلام تھے اور وہ بھی ایسے کہ اپنے سائے سے بھی لاعلم، ایسے میں وہ ہمیں یا پولیس

کو کیا بتاتے؟“

”ہاں! یہ بات تو ٹھیک تھی، خیر..... اب کہاں چلنا ہے؟“

”کیمپ تھری.....“ میں نے کہا اور تھکے تھکے انداز میں اپنا سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔

میرے بحرین پہنچتے ہی نت نئے ہنگاموں نے سر ابھارنا شروع کر دیا تھا۔ ریت کی دلدل تھی جس میں خود کو میں دھنستا ہوا محسوس کرنے لگا تھا۔

میں یونہی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ صحرائیں شام اُترنے لگی تھیں۔ ریت کے زرد مرغولے ہم رکاب محسوس ہوئے۔ دور در دور تیلے ٹیلوں کے پیچھے سورج کا دکھتا گولہ پیچھے کی طرف لڑھکتا محسوس ہوا۔ ایک عجیب بے رونق سی خاموشی اور اداسی کا احساس ہوتا تھا۔

کیمپ تھری پہنچ کر میں نیچے اُترا، جبکہ فاران کو میں نے انتظار کرنے کا کہا۔

کچھ تھکے تھکے سے متعلقہ عملے کے لوگ ادھر ادھر منڈلاتے نظر آئے۔ رات والے واقع کے بعد آج صبح جو یہاں غدر مچا ہوا تھا اس کے اب آثار بھی نظر نہیں آرہے تھے۔

میں نے سیدھا سی عمارت کا رخ کیا جہاں استقبالیہ تھا، حالانکہ مجھ سے یہاں پہلے بھی کہا گیا تھا کہ میں محمود الحسن سے کل صبح ہی ملاقات کر سکتا ہوں لیکن بس! ایک جنون تھا مشن کو نٹانے کا، سو میں اندر داخل ہو گیا۔

استقبالیہ پر مجھے ایک مغربی دو شیزہ ملی۔ اس کے سیدھے ہاتھ پر ایک کمپیوٹر لگا ہوا تھا اور وہ اسی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھی۔ اطراف میں ایک طائرانہ سی نظر ڈال کے میں اس کی طرف بڑھا۔

ہال میں چند ایک افراد ہی موجود تھے۔ جو کہ باتوں میں مشغول تھے۔ ان کے سامنے دو تین کپ رکھے ہوئے تھے۔

”ایکسکوز می.....“ میں نے ہولے سے کھٹکھار کر لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا۔

وہ ایک بیس بائیس سالہ خوبصورت سی دو شیزہ تھی، قد ٹھکانا تھا اور جسم صحت مند جس پر اس نے مغربی طرز کا چست لباس چکا رکھا تھا۔

”جی فرمائیے؟“ وہ کمپیوٹر اسکرین سے میری جانب متوجہ ہوئی۔ اس کے عنابی سے نرم لبوں پہ مسکراہٹ کا شائبہ تک نہ تھا۔

”مجھے محمود الحسن صاحب سے ملنا ہے۔“ میں نے بھی کھنڈی ہوئی سنجیدگی سے کہا۔ جواب میں وہ لٹی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”اس وقت تو آپ کسی سے نہیں مل سکتے۔ آپ کل صبح تشریف لے آئیں۔“ وہ یہ کہہ کر پھر کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ گویا جان چھڑانا چاہ رہی ہو۔ گفتگو انگشت میں ہی ہو رہی تھی۔

مجھے اس کا یہ بے رخ انداز کھل گیا اور اس بار ذرا گھمبیر سے سخت لہجے میں بولا۔ ”خاتون! آپ کا نام کیا ہے؟“

میرے اس طرح اچانک استفسار پر وہ قدرے ہنسیوں اچکا کر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”جی!“

”جی! میں نے آپ کا نام پوچھا ہے۔“

”میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔“ وہ بھی ذرا اکھڑے لہجے میں بولی۔ محسوس ہوتا تھا کہ یہاں کے ادنیٰ ملازمین بھی سرچڑھے تھے۔ اس میں یقیناً

یہاں کے ”باس“ کا دخل تھا یا پھر انتظامیہ کو ہی ایسا رکھا گیا تھا۔ ”ضرور ہونی چاہیے، تاکہ میں آپ کی اس غیر اخلاقی

حرکت کا جواب اخلاق سے دینے کے لیے آپ کو نام سے پکار کر یہ کہہ سکوں کہ ابھی میں یہاں سے گیا نہیں ہوں کہ آپ فوراً کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہو جائیں۔“

”اچھی بات ہے۔ میں ایک ضروری لیٹر ٹائپ کر کے ای میل کرنے والی تھی۔“ لڑکی نے خشک لہجے میں کہا۔

”بولیے اور کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“ انداز اس کا دیسا ہی رہا سو میں نے بھی وہی انداز اپناتے رکھا۔ بولا۔

”میں پاکستان سے آیا ہوں اور میری ایک ضروری بزنس میٹنگ طے تھی ان کے ساتھ۔“ میں نے تھوڑے سے جھوٹ کا تڑکا لگانا ضروری سمجھا۔

تب ہی وہ میری بات پر چونکی اور تھوڑا گھبرائی بھی پھر..... میرا نام وغیرہ پوچھنے کے بعد دوبارہ کمپیوٹر اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے کی بورڈ پر جلدی جلدی کچھ ٹائپ کیا پھر ایک نظر اسکرین پر اُبھرنے والے ان گنت الفاظ کے جال کو غور سے پڑھنے کے بعد بولی۔

”جی ہاں! آپ کی میٹنگ مسٹر بہرام خان سے طے تھی، لیکن افسوس کہ.....“

”مجھے معلوم ہے، کل رات ان کا مژر ہو گیا ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹی۔ ”لیکن..... آج صبح ہی یہاں مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں اب محمود الحسن سے مل لوں۔“

”میرا جواب اب بھی وہی ہوگا۔“ وہ اس بار تھوڑا مسکرائی، یوں جیسے وہ بھی بارہا اس پر تاہم اس کا لہجہ کچھ بہتر ہو گیا تھا۔

”مسٹر محمود آج سہ پہر میں ابو ظہبی چلے گئے ہیں، اب وہ کل صبح ہی آئیں گے۔“

”کل صبح ان سے ادھر ہی ملاقات ہو جائے گی؟“

”آف کورس۔“

”تھینک یو۔“ میں نے کہا اور دروازے کی جانب پلٹا، یونہی میری نظریں ان چند افراد پر بھی پڑیں۔ ایک کالے سے شخص کو میں نے اپنی جانب گھورتے پایا۔ باقی آپس میں مشغول تھے۔ وہ ان میں ایک طرف تنہا بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی میگزین تھا اور نشست کی ہتھیلی پر بنے کپ اسٹاک پر کافی کامگ دھرا پڑا تھا۔ اس نے شیشی رنگ کا چغہ سا پین رکھا تھا۔

میں نے بے ظاہر اس پر کوئی توجہ نہ دی اور دروازے سے باہر آ گیا۔

”کارواں سرائے نکل چلو.....“

میں نے فاران کے برابر میں سیٹ پر بیٹھے ہی کہا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی ٹیکسی اشارت کر لی تھی۔ گیسٹر ڈال کر آگے بڑھا دی۔

کیمپ تھری کے احاطے سے مین گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے ایک مخصوص زاویے سے گردن گھما کر دفتری عمارت کی طرف دیکھا تو میرے ہونٹوں پہ ہلکی سی استہزائیہ مسکراہٹ اُبھری۔

وہ چغہ پوش عرب آدمی شیشے کے دروازے سے باہر آ رہا تھا اور پھر جب تک فاران نے ٹیکسی احاطے کے مین گیٹ سے باہر سڑک پر نکالی تو میں نے اس کا لے عربی کو ایک شاندار سی کار میں سوار ہوتے دیکھا، اس نے جلجت کے سے انداز میں لمحہ بھر کو ہماری جانب دیکھا تھا اور پھر اپنی کار کا دروازہ کھول کر اس میں سوار ہونے لگا۔

فاران تب تک ٹیکسی کی رفتار بڑھا چکا تھا۔ میں نے اس سے کچھ نہیں کہا اور ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

سرائے ہوٹل قریب آنے لگا۔ میں بیک یومر میں دیکھتا آ رہا تھا کہ اس کا لے عربی کی کار بدستور کیمپ تھری سے ہمارے تعاقب میں تھی۔

”آج تو آپ کو سرائے میں اکیلا رہنا پڑے گا لیکن ذرا احتیاط رہیے گا جناب!“ سرائے ہوٹل کے گیٹ سے

اندر داخل ہو کر فاران نے کار روکتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟ تم آج یہاں رات نہیں گزارو گے؟“

”نہیں، ادھر لاسی قصبے میں ایک فیملی نے سیل فون پر میری ٹیکسی بک کر رکھی ہے۔ انہیں شہر (مناما) پہنچانا ہے۔ دیکھوں گا، واپس لوٹ سکا تو ٹھیک ورنہ رات وہیں کہیں گزار کے صبح دوسری سواری اٹھا کر ادھر آ جاؤں گا لیکن.....“

وہ کہتے کہتے رکا۔

”لیکن کیا؟“

”نعمان صاحب! میرا دل بھی نہیں کر رہا ہے آپ کو ان خطرناک حالات میں یہاں اکیلا.....“

”تمہارا شکریہ بھائی!“ میں نے اس کی بات کاٹ کر فوراً مسکراتے ہوئے کہا۔

”اب کیا تم میری وجہ سے روزگار بھی نہیں کرو گے، تم بے فکر ہو جاؤ، میں نے چوڑیاں نہیں پہن رکھیں۔ یہ لو اپنا آج تک کا کرایہ۔“ کار میں بیٹھے بیٹھے ہی میں نے اسے، میٹر میں دیکھ کر جو کرایہ بنا تھا وہ میں نے اسے بحرین دینار کی صورت میں ادا کر دیا۔ اس نے انکار کیا تھا مگر میں نہ مانا۔

میں کار سے اُتر آیا اور اس نے ٹیکسی واپس گھمائی۔ میں نے یونہی گیٹ کی جانب دیکھا۔ تعاقب میں آنے والی وہ کار مجھے کہیں نظر نہ آئی۔

میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ لائٹ آن کی اور بیٹھنے کی بجائے سیدھا کھڑکی کی جانب بڑھا اور اسے تھوڑا کھول کر نیچے جھانکا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہی کار گیٹ سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ میں اس کا لے عربی کی چالاک کی سمجھ چکا تھا۔

وہ کار سے اُترا اور تیزی سے سرائے کے اندر داخل ہو گیا۔ وہ اب میری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

ایک اور نامعلوم خطرے کے پیش نظر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟ کیا وہ میرے کمرے میں آنا چاہتا تھا؟ مگر وہ تنہا بھی تھا، بھلا میرا کیا بگاڑ لیتا یا پھر ممکن ہے، نیچے سے میرا کمرہ وغیرہ معلوم کر کے وہ واپس لوٹ جاتا اور بعد میں اپنے مسیح ساتھیوں کے ساتھ بھی آ سکتا تھا۔

یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ آیا واپس جاتا ہے یا نہیں، میں وہیں کھڑکی کے پاس ہی کھڑا رہا۔ اگر اس نے جانا ہوتا تو زیادہ سے زیادہ سے چند منٹوں بعد اپنی کار میں لوٹ جاتا۔

ابھی چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ اچانک دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

(باقی آئندہ)

تیری یادیں تیری باتیں بہت مصروف رہتی ہیں

رخسانہ انعام..... لاہور

نالے ہیں نہ آہیں ہیں نہ رونا نہ ترپنا
بے خود ہوں تری یاد میں فرصت کے دن آئے
امداد علی چاندیو..... حیدرآباد

نہ بزم اپنی نہ اپنا ساقی نہ شیشہ اپنا نہ جام اپنا
اگر یہی ہے نظام ہستی تو زندگی کو سلام اپنا
(امیر حمزہ اشرف ملتان کا جواب)

توحید احمد..... سرگودھا

ایسا جانباز محبت نہ ملے گا ان کو
اس لیے خود کو مٹاتے ہوئے ڈر لگتا ہے
ارباب شیخ..... چنیوٹ

اب عشق کے جاوے سے قدم ہٹ نہیں سکتے
اے شمع اگر آگ برستی ہے تو برے
آفتاب حسین..... لاہور

اس کے نین سمندر جیسے گہرے نیلے پراسرار
آئی ہو گی اس کے سر کتنے لوگوں کی غرقابی
(منشی عزیز مئے واہڑی کا جواب)

تہذیب الحسن..... لاہور

نہ خدا کی ملا نہ وصال نہ منہ نہ اہر کے ہوئے نہ اہر کے ہوئے
رہے دل میں ہاں نہ ہاں نہ اہر کے ہوئے نہ اہر کے ہوئے
نادیہ سیام..... کراچی

نہ منزلوں کو نہ ہم رہ گزر کو دیکھتے ہیں
عجیب سفر ہے کہ بس ہم سفر کو دیکھتے ہیں
عابد عطاری..... میرپور خاص

اچھا خاصا بیٹھے بیٹھے گم ہو جاتا ہوں
اب میں اکثر میں نہیں رہتا تم ہو جاتا ہوں

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ
سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس
اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے
جاتے ہیں۔ اس اصول کو مد نظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

(عبدالحکیم شمر کراچی کا جواب)

گہمت حسن..... شیخوپورہ

یہاں اہل محبت عمر بھر برباد رہتے ہیں
یہ دریا ہے اسے کچا گھڑا اچھا نہیں لگتا
علی بیگ..... لاہور

یہ طرفہ کرشمہ ہے اندازِ نظر ہی کا
ویرانہ بھی گلشن گلشن بھی ویرانہ
عبدالستار..... ساہیوال

یوں اس نگاہ مست میں حل ہو گیا ہوں میں
شفاف پانیوں کا کنول ہو گیا ہوں میں
اسد علی..... شیخوپورہ

یہ کس مقام پہ لایا ہے مجھ کو سوز دروں
وہ خود بھی مجھ سے جو پوچھیں تو کچھ بتا نہ سکوں
عباس حسن..... سکھر

یہ علم کا سودا یہ رسالے یہ کتابیں
اک شخص کی یادوں کو بھلانے کے لیے ہیں
ارشاد خان..... شیخوپورہ

یہاں مانا کہ کچھ نہ جانا ہے
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم
(شبیر شاہ گلدوبیراج کا جواب)

نازش سلمان..... سکھر

اب آگے خدا عشق کی لاج رکھے
ابھی تک تو ہم دل کو بہلا رہے ہیں
اسد علی..... شیخوپورہ

ایک فریب مستقل ہے زندگی
زندگی سے غیر ممکن ہے نجات
انیس الحق..... سکھر

آپ اپنی ضیا سے ڈرتے ہیں
غم کدوں کے چراغ ہیں ہم لوگ
(انعام الحسن لاہور کا جواب)

ابرار الحسن..... لاہور

نہیں فرصت یقین مانو ہمیں کچھ اور کرنے کی

ماہنامہ سرگزشت

علمی آزمائش ذہنی آزمائش ہے کہ بتائی گئی شخصیت کو پہچانیں۔ قارئین کی ایک بڑی تعداد اس مقابلے میں حصہ لیتی
رہی ہے لیکن کچھ قارئین کا کہنا ہے کہ یہ دو صفحہ بھی کہانیوں کو دے دیا جائے۔ بحالت مجبوری اس سلسلے کو بند کیا جا رہا ہے۔
امید ہے وہ قارئین جو مسلسل حصہ رہے ہیں وہ تعاون کریں گے۔

علمی آزمائش 149 کا جواب

سردار عبدالرب نشتر 13 جون کو پشاور میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ سیاست میں آئے تو برصغیر کے
مقبول لیڈر میں شمار ہوئے۔ حکومت میں بھی شامل رہے اور اپوزیشن لیڈر کے طور پر بھی شہرت حاصل کی۔ کراچی میں مدفون ہیں۔

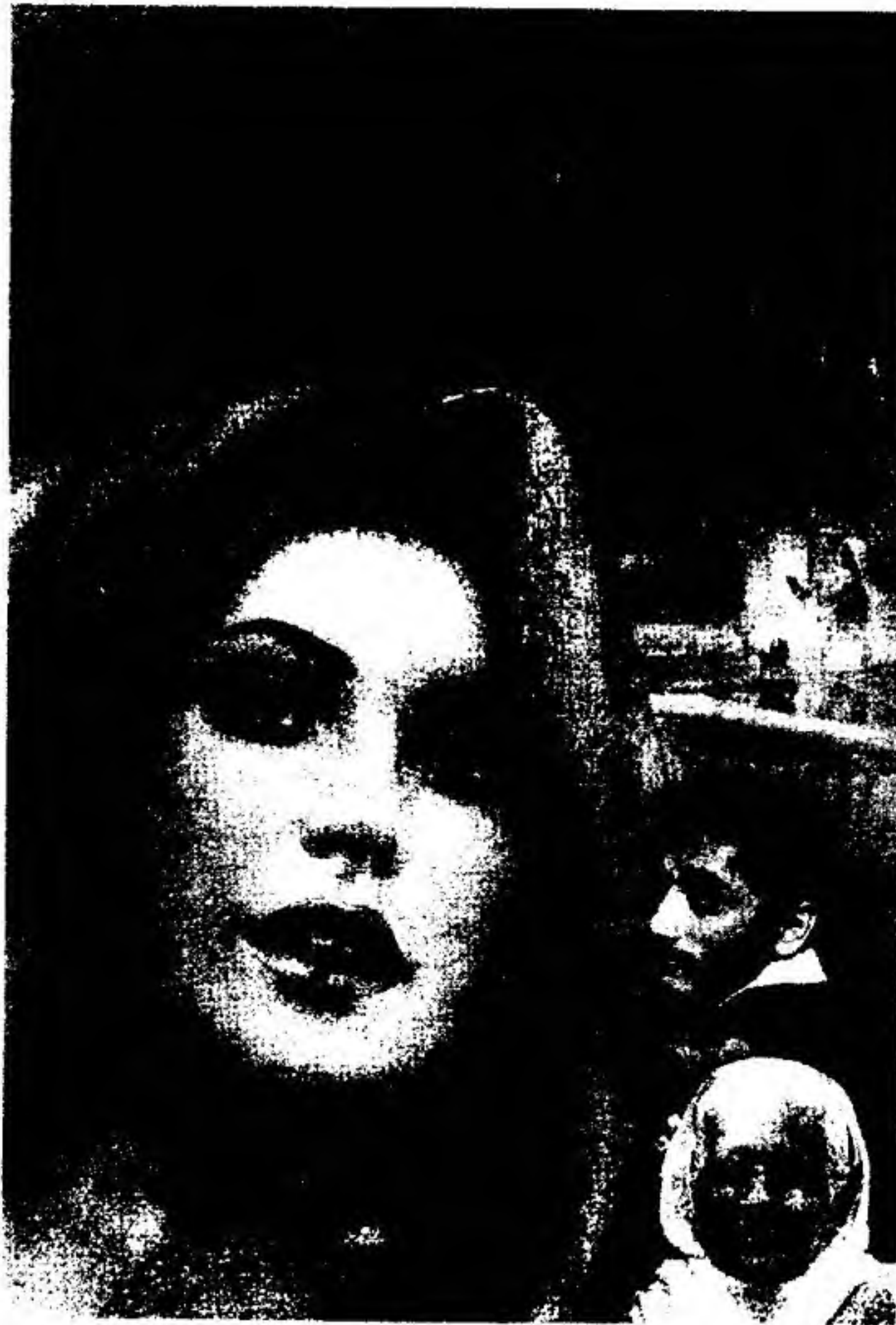
انعام یافتگان

1۔ احمد علی گھشکوری، لاہور 2۔ زاہدہ عارف، ملتان 3۔ خلیل اللہ عطاری، ملتان

4۔ غلام عباس کاظمی، کوئٹہ 5۔ اشرف سلطانی، کراچی

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

میانوالی سے افتخار حسین شاہ۔ کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ ساہیوال سے زین الایمان احمد قریشی، عبدالستار، ممتاز علی خان۔
ٹوبہ ٹیک سنگھ سے اولیس طارق۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے افتخار علی عبداللہ۔ انک سے نزابت افشار (فتح جنگ)۔ کشمور سے شبیر
شاہ۔ پشاور سے شاہ جہاں (حیات آباد)، وحیدہ جان، گل مست خان، (ارمڑ پاپان)، زرولی خان، علی شاہ، شبیر جان، بشیر
اشرف، گل باز خان۔ نوشہرہ سے خاور شیخ۔ ڈیرا غازی خان سے محمد ظفر، ظہیر الدین، سلطان اشرف۔ ڈیرا مراد جمالی سے شا کر
عطر خان، احمد فیض۔ نظیر آباد سے نواز حسن خان، قسیم اللہ۔ کراچی سے وجاہت وکیل عثمان خان، عبدالحکیم شمر، صفیہ افسر، جلیل احمد
جعفری، نسرین عزیز، محمد احمد، سید معصوم حسن، نسیم الدین، اعجاز حسین درانی، محمد ظفر، ظہیر الدین، اشرف علی سلطان، سید امتیاز
حسن زیدی۔ بہاولنگر سے خالد بٹ، شمیمہ شیخ۔ بہاولپور سے سلیم اختر، کلیم اصغر، رحیم شاہ۔ اسلام آباد سے نیلو فر شاہین، انور
یوسف زئی، وحید خان، غضنفر عباس مرزا، طاہر پردیسی، نعمان نذیر، نسیم الدین، شاہین عثمانی، کمال حسن کمال، شا کر عباس، محمد
اسلم، سلطان علی، فتح محمد جوکیو، اقبال حسن۔ راولپنڈی سے نادیہ خان، انور شاہ، امجد حسن، شوکت کمال، اختر کوکب، بلقیس بتول،
شاہینہ بتول، شادور علی، شازیہ اکرام، بہادر خان اچکزئی، کلیم الحسن، افروز جہاں۔ حیدرآباد سے اختر عباس، زبیر احمد، امروڑ
اقبال، احسان علی، زاہد شاہ بخاری، چوہدری اشفاق، مرزا ہادی بیگ، محمد فیضان، تانیہ حسن، ظہیر حسین۔ جنگ سے بانو برہیس،
احمد رشید مصطفائی۔ لاہور سے احسان خان، ثناء اللہ، اشفاق حسن، نادیہ خان، علی نواز شاہ، شوکت ملک، افروز جہاں، نوشین اختر،
حمکین جعفری، صنوبر علی شاہ، محمد عاقل شاہ، محمد عماد، طہ حسین، زرین پروین، فرید اسلم ڈوگر، حکیم فیروز، افراتیم، چوہدری ممتاز علی،
فرید اسلم، تانیہ حسن ثانی، زبیر ملک۔ فیصل آباد سے عتیق اسلم، منور سلیم، عرفان مروت، دلاور حسن۔ منڈی بہاؤ الدین سے عباس
علی۔ رحیم یار خان سے فاطمہ فرحت، نصرت اسماعیل، گل باز خان۔ سرگودھا سے نصرت جہاں، عباس علی اصفہانی۔ فیصل آباد سے
عتیق احمد، منور سلیم، کلیم اصغر، اعجاز حسین زیدی۔ میرپور خاص سے ندیم بیسی، گل باز خان، اقبال فریدی۔ میرپور آزاد کشمیر سے
عمیر بٹ، فخر الدین رازی، نعمان احمد بھٹ، صدر الدین ملک۔ ایبٹ آباد سے محمد فیض، اقبال حسن، فرحت اللہ، مجاہد عباس۔
شجاع آباد سے نصرت زیدی۔ ٹنڈو جان محمد سے عباس۔ کمالیہ سے اصغر حسین۔ خوشاب سے ظہیر شاہ۔ نوشہرہ فیروز سے احمد علی۔
بیرون ممالک سے ابرار شاہ (دہلی)، صدر الدین (لعین)، عباس علی سید (ٹورنٹو)، ظہیر علی شیخ (ماچسٹر یو کے)۔



باتوں کو مسئلہ بنا کر ماں سے الجھ جاتا تھا۔ یہی سوچ کر وہ مطمئن انداز میں چائے بنانے کے لیے چل دیں اور محسن نے بھی لباس تبدیل کرنے کے لیے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ پانچ منٹ بعد ہی وہ دوبارہ محسن میں آچکا تھا۔ وہ صادق بیگم کے تخت کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر کپڑوں کے ڈھیر اور سلائی مشین کی طرف دیکھنے لگا جن کی بدولت وہ اس مقام تک پہنچا تھا۔ چائے کا انتظار کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے ذہن میں وہ جملے ترتیب دینا شروع کر دیے جو کچھ دیر بعد اسے ماں سے بولنا تھے۔ وہ پتا کر چکا تھا کہ ہر قیمت پر اپنی بات منوا کر رہے گا کیونکہ اب اس میں یہ نظارہ دیکھنے کی مزید تاب نہ تھی۔

صادق بیگم نے چائے کی پیالی محسن کو تھائی اور بے تابی سے بولیں۔ ”ہاں، اب جلدی سے بتاؤ وہ کیا بات ہے جسے بنیاد بنا کر تم مجھ سے لڑنا چاہ رہے ہو۔“

”میں آپ سے کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ یہ سلائی کا کام چھوڑ دیں۔ اچھی معمولی تنخواہ ہے میری۔ اس میں ہم دونوں کا گزارہ آسانی سے ہو سکتا ہے۔ پھر یہ مشقت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”ای آپ کو تو پتا ہی ہے کہ میرے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ موبائل چوری ہو جاتے ہیں پامیں خود کہیں رکھ کر بھول جاتا ہوں اسی لیے میں نے موبائل رکھنا چھوڑ دیا ہے۔ بہر حال آپ کہہ رہی ہیں تو اس مہینے یہ خواہش بھی پوری کر دوں گا۔ بس اب آپ جلدی سے مجھے چائے پلوادیں، پھر مجھے آپ سے لڑنا بھی ہے۔“

”ہیں، کیا کہا؟“ صادق بیگم چونکتے ہوئے بولیں۔ ”اب تم اتنے بڑے ہو گئے کہ مجھ سے لڑنے کی باتیں کرنے لگے۔“ ”مجبوری ہے کیونکہ ویسے تو آپ میری کوئی بات مانتی نہیں ہیں۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو؟“ صادق بیگم حیران ہوتے ہوئے بولیں۔ ”بھی ایسا ہوا ہے کہ میں نے تمہاری کوئی بات نہ مانی ہو۔“

”یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے آپ چائے پلوادیں تاکہ تازہ دم ہو کر لڑ سکیں۔“

محسن کے لہجے سے صادق بیگم کو یہ اندازہ تو ہو گیا کہ کوئی ایسی سنجیدہ بات نہیں ہے۔ وہ ایسے ہی چھوٹی چھوٹی

محرمیوں کے سائے لرزنے لگتے لیکن وہ جانتا تھا کہ موٹر سائیکل خریدنے کے لیے ایک معقول رقم درکار تھی۔ یہی غنیمت تھا کہ ماں جیسے تیسے کر کے اسے پڑھا رہی تھی پھر ایک وقت ایسا آیا کہ سلائی کی آمدنی اور مکان کے کرائے سے ملنے والی رقم بھی گھریلو اخراجات کے لیے کم پڑنے لگی تو محسن نے خود بھی ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا۔ اس طرح اس کے تعلیمی اخراجات پورے ہونے لگے لیکن موٹر سائیکل اب بھی اس کی پہنچ سے بہت دور تھی۔ اس نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ جاب ملتے ہی وہ سب سے پہلے بایک خریدے گا تاکہ کام پر آنے جانے کے لیے اسے بسوں میں دھکے نہ کھانے پڑیں۔

صادق بیگم دروازہ سے کان لگائے بیٹھی تھیں لیکن جس مخصوص آواز کا انہیں انتظار تھا وہ ان کی سماعت سے دور تھی۔ مغرب کی نماز کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ انہوں نے وضو کیا اور نماز پڑھنے کھڑی ہو گئیں۔ پریشانی کے باعث دماغ میں الٹے سیدھے خیالات آرہے تھے اس لیے نماز بھی بڑی مشکل سے ادا کی۔ سلام پھیر کر انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ گیٹ کھلنے کی آواز آئی تو انہیں یوں لگا جیسے وہ تپتی دھوپ میں کڑی مسافت طے کر کے کسی شجر کے سایہ میں آکھڑی ہوئی ہیں۔ ان کے پورے وجود میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ محسن نے دیوار کے ساتھ موٹر سائیکل کھڑی کی اور گنگنا تا ہوا ماں کی طرف بڑھا۔ اتنی دیر میں صادق بیگم دعا سے فارغ ہو چکی تھیں۔ محسن نے سلام کیا تو وہ مصنوعی خشکی سے بولیں۔ ”کہاں رہ گئے تھے بیٹا اگر دیر سے ہی گھر آتا تھا تو کم از کم ایک فون ہی کر دیتے۔“

محسن نے چونک کر ہاتھ پر بندی گھڑی پر نظر ڈالی تو اس کے چہرہ پر خفت کے آثار نمودار ہو گئے۔ وہ قدرے شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”واقعی آج تو مجھے بہت دیر ہو گئی۔ سوری امی میری وجہ سے آپ کو انتظار کی کوفت اٹھانا پڑی۔ دراصل گلی کے کٹ پر ایک دوست مل گیا تھا۔ اس نے باتوں میں ایسا لگا یا کہ وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا، بہر حال اب ایسا نہیں ہوگا۔ آئندہ میں احتیاط رکھوں گا۔“

”تم جانتے ہو محسن، میرا اس دنیا میں تمہارے سوا کوئی نہیں ہے تم جتنی دیر گھر سے باہر رہتے ہو، میں سولی پر لٹکتی رہتی ہوں۔ اوپر سے تم نے یہ موٹر سائیکل لے کر میری ٹینشن اور بڑھادی ہے، کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ ایک موبائل ہی لے لو۔ کم از کم بوقت ضرورت میں تم سے رابطہ تو کر سکیں

ماں صدقہ

محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم

مرسلہ روداد میرے دوست محسن کی ہے۔ اس کی زندگی جہنم بننے والی تھی کہ اس نے ایک ایسا فیصلہ کیا جس نے سب کو حیران کر دیا۔ اس کے اس فیصلے نے کس طرح بساط الٹ دی، یہ آپ اس سچے بیانی میں پڑھ لیں گے۔ اس سچے بیانی میں ایک بہت بڑا سبق ہے، یہ سبق ہر ایک کو ازیر کر لینا چاہیے تاکہ زندگی آسان سے آسان ہو جائے، ماں اور بیوی میں کیا فرق ہے آپ بھی ملاحظہ کر لیں۔ ایس ایم نوشاد (کراچی)

شام کا ملکی اندھیرا تیزی سے فضا کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ مغرب کی اذان ہوئی تو صادق بیگم کی نظریں بے اختیار گھڑی کی طرف اٹھ گئیں۔ پونے سات بج رہے تھے اور محسن ابھی تک نہیں آیا تھا۔ اس کی چھٹی پانچ بجے ہوتی تھی اور وہ عموماً ساڑھے پانچ یا پونے چھ بجے تک گھر پہنچ جایا کرتا تھا۔ جب سے اس کی بینک میں جاب لگی تھی، اس کا یہی معمول تھا اور اگر اسے چھٹی کے بعد کام ہوتا تو صبح ماں کو بتا کر جاتا تھا۔ اتنی دیر تو اسے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ویسے تو وہ ہمیشہ سے ہی اس سواری کے خلاف تھیں۔ شہر کے بڑھتے ہوئے بے ہنگم ٹریفک کی وجہ سے سب سے زیادہ حادثے بھی موٹر سائیکل سواروں کو ہی پیش آتے ہیں۔ انہوں نے محسن کو اس ارادے سے باز رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کی ضد کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔ وہ جانتی تھیں کہ محسن کو بچپن سے ہی موٹر سائیکل چلانے کا شوق تھا اور وہ بڑی حسرت سے اپنے دوستوں، رشتے داروں اور محلے والوں کو موٹر سائیکل پر آتے جاتے دیکھتا تو اس کی آنکھوں میں

”عادی ہو گئی ہوں۔“ صادق بیگم نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”پھر میں نے اسے بھی مشقت نہیں سمجھا۔ یہ میرا کام ہے۔ کیا تم کسی درزی سے یہ کہہ سکتے ہو کہ اس کے بیٹے برسر روزگار ہو گئے ہیں۔ لہذا وہ اپنی دکان بند کر دے جس طرح تم صبح سے شام تک بینک میں کام کرتے ہو، اسی طرح میں بھی اپنی جاب کر رہی ہوں بلکہ مجھے تو کہیں جانا بھی نہیں پڑتا، گھر بیٹھ کر ہی ٹھیک ٹھاک کماتی ہوں۔“

”جانتا ہوں کہ دلیل میں آپ سے نہیں جیت سکتا۔“

محسن نے زچہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے جو کچھ کہا وہ حرف بحرف سچ ہے۔ میں اس سے انکار نہیں کر سکتا لیکن میرے پاس بھی دو پوائنٹس ہیں اگر ان پر غور کر لیں تو بڑی عنایت ہوگی۔“

”کہو میں سن رہی ہوں۔“

”پہلی بات تو یہ کہ کام کرنے کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ سرکار بھی اپنے ملازمین کو ساٹھ سال پر ریٹائر کر دیتی ہے اس لیے میرے حساب سے اب آپ کو بھی آرام کرنا چاہیے اور اس سے بھی زیادہ اہم پوائنٹ یہ ہے کہ کام ہمیشہ ضرورت کے تحت کیا جاتا ہے۔ پہلے مجبوری تھی لیکن اب ایسا نہیں ہے اس لیے میرے خیال میں آپ کو سلائی کا کام چھوڑ دینا چاہیے اور اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو لوگوں کو باتیں بنانے کا موقع مل جائے گا۔ سب یہی کہیں گے کہ بیٹا بینک میں افسر ہے اور ماں لوگوں کے کپڑے سی کر گزارہ کر رہی ہے۔“

صادق بیگم نے خالی کپ میز پر رکھا اور تخت پر رکھے گاؤٹیکے سے ٹیکے لگاتے ہوئے بولیں۔ ”تمہاری تینوں ہی دلیلیں بالکل پوری ہیں۔ اول تو میری عمر ابھی صرف پچاس سال ہے اور میری ریٹائرمنٹ میں ابھی دس سال باقی ہیں۔ تمہارا دوسرا پوائنٹ اس حد تک سمجھ میں آتا ہے کہ مجھے شخص پیسوں کی خاطر سلائی کا کام نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ ضرورت تمہاری تنخواہ سے باآسانی پوری ہو رہی ہے لیکن تم نہیں جانتے کہ میری اس سروس سے کتنے لوگوں کا بھلا ہو رہا ہے۔ بازار میں سلائی بہت مہنگی ہو گئی ہے اور غریب یا متوسط طبقے کے لوگ اسے انورڈ نہیں کر سکتے۔ میں ان سے آدمی قیمت لیتی ہوں۔ اس محلے کے لوگوں نے پچیس برس میرا ساتھ دیا ہے تو میں انہیں کیسے چھوڑ دوں اور مجھے کسی کے کہنے سننے کی پرواہ نہیں پچیس سال تک ہمیں کسی نے نہیں پوچھا۔ سگے بھائی کو میرا حال جاننے کی توفیق نہیں کہ بہن زندہ ہے یا

مرکب گئی۔ شوہر چھوڑ کر چلا گیا۔ اس نے کبھی پلٹ کر خبر نہیں لی۔ اس کے باوجود زندہ، خوش اور مطمئن ہوں۔ تمہیں بھی کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، جس کا جوجی چاہے کہتا رہے، ہم وہی کریں گے جو مناسب ہوگا۔“

یہ کہہ کر صادق بیگم نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ یہ گویا مہنگی درخواست ہونے کا اشارہ تھا۔

محسن خاموشی سے اٹھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ صادق بیگم دو تین گھنٹوں تک یادوں کے صحرا میں بھٹکنے کے بعد ہی واپس آئیں گی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے بلاوجہ ہی غلط موضوع چھیڑ دیا۔ وہ تو انہیں نوٹیشن کے بارے میں بتانا چاہ رہا تھا جس سے ان دونوں اس کا زوردار فیئر چل رہا تھا۔ وہ اسی محلے میں رہتی تھی۔ خاصے امیر لوگ تھے۔ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہونے کے باعث وہ کافی شوخ اور ضدی واقع ہوئی تھی جس چیز کے لیے چل جاتی اسے حاصل کر کے ہی چھوڑتی۔ جو دل میں ٹھان لیتی۔ اس پر عمل کر کے ہی اسے چین آتا۔ وہ ڈگری کالج میں آخری سال کی طالبہ تھی ایک روز اتفاقاً کالج سے آتے ہوئے گلی کے کٹ پر اس کی محسن سے ٹکرائی۔ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے لیکن کبھی بات کرنے یا ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

اس روز محسن ایک فائل گھر میں بھول گیا تھا۔ لہذا لچ ٹائم میں وہ فائل لینے گھر آ گیا۔ ابھی وہ اپنی گلی کے موڑ تک ہی پہنچا تھا کہ اس نے دیکھا ایک لڑکا نوٹیشن کا پیچھا کر رہا ہے۔ دوپہر کا وقت تھا اور گلی بالکل سنسان تھی۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ سیدھا نکل جائے۔ خواہ وہ کسی کے معاملے میں ٹانگ اڑانے سے فائدہ، کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں لیکن اس کی غیرت نے یہ گوارہ نہیں کیا۔ نوٹیشن اسی کے محلے میں رہتی تھی اور اس کی حفاظت کرنا اس کا فرض تھا۔ اس نے ان دونوں سے کافی فاصلے پر بایک روکی اور ایک کیمین کی آڑ میں کھڑے ہو کر دیکھنے لگا۔ ابھی وہ پوری طرح مان دونوں کو فوکس بھی نہیں کر پایا تھا کہ وہی لڑکا اچانک نوٹیشن کے سامنے آ گیا اور اس کا راستہ روک کر کچھ کہنے لگا۔ محسن کے لیے یہ نظارہ ناقابل برداشت تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا، ان دونوں کے قریب پہنچا اور نوٹیشن کو مخاطب کرتے ہوئے سختی سے بولا۔ ”کون ہے یہ؟ اور اس نے تمہارا راستہ کبوں روک رکھا ہے؟“

”میں نہیں جانتی۔“ نوٹیشن کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”یہ شخص بس اسٹاپ سے ہی میرے پیچھے لگا ہوا ہے اور

نہ جانے کیا الٹی سیدھی بکواس کیے جا رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے تم جاؤ میں اس سے نمٹتا ہوں۔“ محسن نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور بولا۔ ”میں ہوں نا تمہاری بات سننے کے لیے، مجھے بتاؤ تمہیں کیا تکلیف ہے، تم جیسے لوگوں کا علاج کرنا مجھے بہت اچھی طرح آتا ہے۔“

اس غنڈے نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن محسن کی گرفت بہت سخت تھی۔ اس نے نوٹیشن کو جانے کا اشارہ کیا اور اس لڑکے کو کھینچتا ہوا مین روڈ تک لے آیا پھر اس کا گریبان پکڑ کر زور کا جھکا دیا اور غضب ناک لہجہ میں بولا۔ ”اگر دوبارہ اس علاقے میں نظر آئے تو ہڈیوں کا سرمہ بنادوں گا۔“

وہ لڑکا محسن کی طاقت اور غصے سے اتنا خوفزدہ ہوا کہ اس کی گھٹی بندھ گئی جیسے ہی محسن نے اس کا گریبان چھوڑا، اس نے دوڑ لگا دی۔ محسن واپس اپنی موٹر سائیکل کی طرف آیا۔ نوٹیشن ابھی تک اپنے دروازے میں کھڑی ہوئی تھی۔ وہ محسن کو دیکھ کر ایک قدم آگے بڑھی اور بولی۔ ”آپ کا بہت بہت شکریہ۔ میں اس مدد کے لیے ہمیشہ آپ کی احسان مند رہوں گی۔“

محسن نے بایک پر بیٹھے بیٹھے ہی جواب دیا۔ ”یہ رکی باتیں نہ کریں۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو وہ یہی کرتا۔“

”بہر حال شکریہ ادا کرنا تو میرا فرض ہے۔“ نوٹیشن نے ایک اداسے کہا تو محسن کو اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ واقعی وہ ایسی تھی کہ اسے دیکھ کر کسی کا دل بھی قابو میں نہ رہتا۔ وہ ہر اعتبار سے حسین کہلائے جانے کی مستحق تھی۔ خاص طور پر اس کی آنکھیں تراشیدہ لب اور دل فریب ہنس کی بھی شخص کو دیوانہ کر دینے کے لیے کافی تھا گو کہ یہ ان کی پہلی ملاقات تھی لیکن محسن نے کہہ ہی دیا:

”اس طرح کے واقعات سے بچنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ نقاب کا استعمال شروع کر دیں۔“

نوٹیشن کو بے اختیار ہنسی آ گئی اور ساتھ ہی اس کے گالوں پر ڈھیل نمودار ہو گئے۔ اسے پتا بھی نہ چلا کہ اس ادا نے محسن کے دل پر کیا قیامت ڈھادی۔ اس کے لیے وہاں رکنا مشکل ہو گیا اس نے موٹر سائیکل اشارٹ کی اور جھینپتے ہوئے بولا۔ ”بعض اوقات میں سوچے سمجھے بغیر بول دیتا ہوں آپ مائنڈ مت کیجیے۔“

نوٹیشن مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میں نے بالکل مائنڈ نہیں کیا۔ البتہ اس بارے میں ضرور سوچوں گی۔“

گھر آنے کے بعد محسن کا کسی کام میں دل نہیں لگا۔ اس کی نگاہوں میں نوٹیشن کی صورت جم کر رہ گئی تھی۔ وہ کوئی دل پھینک قسم کا نوجوان نہیں تھا۔ بچپن سے لے کر نوجوانی تک اس کا ایک ہی مقصد رہا کہ جلد از جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے۔ اسی لیے اس نے فضول باتوں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے تعلیم پر پوری توجہ دی۔ بی کام کرنے کے بعد اس نے بینک میں جاب تو کر لی تھی لیکن وہ آگے بڑھنا نہیں چاہتا تھا، اسی لیے اس نے ایم بی اے میں داخلہ لے لیا اور ایک پرائیویٹ کالج میں ہفتہ میں دو دن کلاسیں لیتا تھا۔ اسے قوی امید تھی کہ اس کے بعد اسے ایک بہتر ملازمت مل جائے گی۔ اسی لیے وہ بینک سے آنے کے بعد سارا وقت پڑھنے میں گزار دیتا لیکن نوٹیشن سے ملنے کے بعد اس کے دل میں عجیب سی اٹھل پٹھل ہونے لگی اور وہ سمجھ نہیں سکا کہ اس کیفیت کو کیا نام دے۔

نوٹیشن کے بارے میں وہ بس اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ شیخ عبدالعزیز کی بیٹی ہے جن کا کپڑے کا..... کاروبار تھا۔ ان کے چاروں بیٹے شادی شدہ تھے اور اپنا اپنا کاروبار کرتے تھے۔ البتہ چھوٹا بیٹا ارشد جس سے محسن کی تھوڑی بہت سلام دعا تھی، باپ کے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ نوٹیشن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بہت شوخ اور تھچل ہے۔ اسے اچھا کھانے، اچھا پہننے اور شادی بیاہ کی تقریبات میں شریک ہونے کا بہت شوق ہے۔ محلے میں مہندی، مایوں یا منگنی وغیرہ کی کوئی بھی تقریب ہو، وہ بن بلائے ہی پہنچ جاتی اور خوب ہلاکلا کرتی۔ اسی طرح وہ مذہبی تقریبات مثلاً میلاد شریف، مجلس اور ختم شریف وغیرہ میں بھی بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ شریک ہوتی۔

دوسری صبح محسن بینک جانے کے لیے گھر سے نکلا تو عین اسی وقت نوٹیشن بھی اپنے گھر سے برآمد ہوئی، اس نے سیاہ رنگ کا عبا پہن رکھا تھا اور چہرے پر بھی نقاب تھا۔ محسن تو اسے پہچان بھی نہ پاتا اگر وہ آداب کرنے کے انداز میں دایاں ہاتھ ماتھے تک لے جا کر اسے سلام نہ کرتی۔ محسن نے چونک کر اسے دیکھا تو اس نے نقاب ہٹا کر بڑے دلنشین انداز میں کہا۔ ”دیکھ لیجیے، آپ کے مشورے پر عمل کرنے میں بالکل دیر نہیں لگائی۔“

محسن کے لیے اس کا یہ روپ بالکل انوکھا تھا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ نوٹیشن اتنی جلدی اس کی بات مان سکتی ہے۔ اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ”یہ آپ نے بہت اچھا

کیا۔ اس طرح بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے۔ یہ کہہ کر اس نے موٹر سائیکل آگے بڑھا دی۔ اگر باتوں میں لگ جاتا تو دفتر پہنچنے میں دیر ہو جاتی۔ نوشین کچھ دیر کھڑی اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی پھر کالج کے لیے روانہ ہو گئی۔

اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا۔ محسن جو نبی اپنے کام پر جانے کے لیے نکلتا، عین اسی وقت نوشین بھی کالج جانے کے لیے دروازے پر آ جاتی۔ دونوں کے درمیان مسکراہٹوں اور چند جملوں کا تبادلہ ہوتا پھر محسن اپنی راہ لیتا۔ نوشین اسے کچھ دیر جاتا ہوا دیکھتی، اس کے بعد وہ بھی کالج کے لیے روانہ ہو جاتی محسن عموماً کالج کے لیے قریبی ریسٹورنٹ میں جایا کرتا تھا لیکن بعض اوقات اچھا کھانے کی خواہش ہوتی تو برنس روڈ کا رخ کر لیتا۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ برنس روڈ سے لے کر کالج کے بعد واپس بینک جا رہا تھا کہ کالج کے اسٹاپ پر اسے نوشین نظر آ گئی۔ محسن نے گھڑی دیکھی اور سوچ میں پڑ گیا اس وقت نوشین یہاں کیا کر رہی ہے جب کہ کالج کی چھٹی ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ نوشین نے بھی محسن کو دیکھ لیا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے رکنے کا اشارہ کیا اور بولی۔ ”مجھے بہت دیر ہو گئی ہے۔ کب سے کھڑی ہوں لیکن سب بیس بھری ہوئی آرہی ہیں۔ پلیز مجھے گھر تک چھوڑ دیں۔“

محسن شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی کسی لڑکی کو بایک پر نہیں بٹھایا تھا۔ وے بھی لے کر ختم ہو رہا تھا اور اسے واپس بینک بھی پہنچنا تھا لیکن نوشین کو منع بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بادل خواستہ اس نے ہامی بھری۔ نوشین اس کے ساتھ بالکل چپک کر بیٹھی تھی۔ اس کے قرب کی مہک نے محسن کو دیوانا بنا دیا تھا۔ یہ نشہ، یہ سرور، اس نے زندگی میں پہلی بار محسوس کیا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ یہ سفر بھی ختم نہ ہو۔ یہ موٹر سائیکل یونہی چلتی رہے۔ نوشین اسی طرح اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہے اور اس کی زلفوں کی آوارہ لٹیں اس کے چہرے کو چھوئی رہیں لیکن وائے حسرت۔ یہ سفر بھی دس منٹ میں ختم ہو گیا۔ محسن نے اسے مین روڈ پر اتار بھی دیا تو وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔ ”موٹر سائیکل پر سواری کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ کل صبح مجھے یہیں سے پک کر لیجئے۔“

”دماغ تو صحیح ہے تمہارا۔“ محسن جھلاتے ہوئے بول۔ ”صبح کے وقت محلے کا کوئی نہ کوئی فرد اس اسٹاپ پر ضرور موجود ہوتا ہے۔ کسی نے دیکھ لیا تو شامت آ جائے

گی۔“ ”مجھے تو نقاب کی وجہ سے کوئی نہیں پہچان سکتا۔ البتہ آپ کے لیے پراہلم ہو سکتی ہے۔ ٹھیک ہے ایسا کریں وہ جو اگلا موڑ ہے وہاں سے پک کر لیں۔ اس طرف کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”ضرور رت کیا ہے موٹر سائیکل پر جانے کی، ہمیشہ بس میں سفر کیا ہے، اب کیا ہو گیا؟“

”انتارش ہوتا ہے کہ کھڑے ہونے کی جگہ بھی نہیں ملتی۔ دروازے پر ٹکنا پڑتا ہے۔ کسی دن گر گئی تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معذور ہو جاؤں گی۔“

”اچھا بابا ٹھیک ہے۔“ محسن نے ہتھیار ڈالنے ہوئے کہا۔ ”لیکن کبھی بھی روز یہ سلسلہ نہیں چلے گا۔“

پھر تو یہ معمولی بن گیا۔ نوشین روزانہ صبح کو محسن کے ساتھ جانے لگی۔ واپسی میں بھی اکثر وہ اسے گھر پر ڈراپ کر دیتا۔ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آتے جا رہے تھے لیکن محسن کو ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا کہ اگر کسی نے نوشین کو اس کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھے دیکھ لیا تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ اس نے جب بھی نوشین کے سامنے اس خدشے کا اظہار کیا تو وہ ہنس کر کہتی۔ ”تم بھی نہ جانے کس دنیا میں رہتے ہو۔ ارے آج کل تو ہر لڑکا بیک وقت چار چار لڑکیوں سے فلرٹ کرتا ہے اور تم سے ایک نہیں سنہیل رہی۔ اول تو کسی کے پاس اتنی فرصت نہیں ہے کہ تمہیں وایج کرے اور بالفرض کوئی دیکھ بھی لے تو یہی سمجھے گا کہ محسن میاں بالغ ہو گئے ہیں۔ اسے کیا پڑی ہے کہ وہ اپنے دس کام چھوڑ کر تمہاری اماں کو یہ بتانے جائے گا کہ اس نے ایک لڑکی کو تمہارے ساتھ موٹر سائیکل پر سفر کرتے دیکھا ہے۔ چلو مان لیا کہ تمہاری رپورٹ ہو گئی۔ اماں پوچھیں تو بتا دینا کہ وہ لڑکی تمہارے ساتھ بینک میں کام کرتی ہے۔ اس نے لفٹ مانگی اور تم نے بٹھا لیا۔“

محسن کو اس کی ذہانت اور حاضر جوابی پر پیار آنے لگا۔ ویسے تو وہ اس کی بہت سی خوبیوں کا معترف تھا اور جیسے جیسے ان کے درمیان قربت بڑھتی جا رہی تھی، اس کی شخصیت کے بہت سے پہلو سامنے آرہے تھے۔ اس کا حسن بے مثال تھا۔ وہ ذہین، حاضر جواب اور بذلہ سخا تھی۔ اسے گفتگو کرنے کا فن آتا تھا۔ بلا کی جامہ زیب، ہمیشہ موسم، وقت اور ماحول کی مناسبت سے لباس کی انتخاب کرتی۔ محفلوں کی جان، خوش مزاج اور ہنسنے ہنسانے والی، محسن نے اس کے

بارے میں کئی انداز سے سوچا لیکن اسے نوشین میں کوئی خامی نظر نہیں آئی۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ شاید وہ نوشین میں کوئی خامی دیکھنا ہی نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہ اسے اچھی لگنے لگی تھی۔ محسن محسوس کر رہا تھا کہ نوشین کے ساتھ اس کی بڑھتی ہوئی قربت رفتہ رفتہ محبت کا روپ دھار رہی ہے اور محبت میں تو یہی ہوتا ہے کہ محبوب کے عیب بھی خوبیوں کی شکل میں ڈھل جاتے ہیں۔

وہ بھی موسم بہار کی ایک خوشگوار سہ پہر تھی۔ صبح سے ہی آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ دونوں ایک ریسٹوران میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ اچانک ہی محسن پر جذباتی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے نوشین کا ہاتھ تھاما اور انتہائی رومانٹک موڈ میں بولا۔ ”نوشین ہم کب تک اس طرح چھپ چھپ کر ملتے رہیں گے، اگر تم کہو تو امی کو تمہارے گھر بھیجوں؟“

وہ تو نجائے کب سے یہ جملہ سننے کی منتظر تھی۔ محسن کو اس نے پہلی ہی ملاقات میں اپنا سب کچھ مان لیا تھا۔ لہذا اس کے پاس انکار کرنے یا ٹالنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”جب تم مناسب سمجھو۔“

اس کا جواب سن کر محسن کی ہمت بڑھ گئی۔ اس نے ذرا واضح انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”اس سے پہلے میں تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دینا چاہتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ بات تمہارے علم میں ہے کہ نہیں لیکن اس کا جاننا تمہارے لیے بہت ضروری ہے اور وہ یہ کہ میری پیدائش کے کچھ عرصہ بعد ہی میرے ماں باپ میں علیحدگی ہو گئی تھی۔ میں نے آج تک اپنے باپ کی شکل نہیں دیکھی۔ ماں نے ہی محلے والوں کے کپڑے ہی مجھے پالا اور میٹرک کے بعد میں نے ٹیوشن کر کے اپنی تعلیم مکمل کی۔ ہم ماں بیٹے عرصہ دراز سے اس محلے میں رہ رہے ہیں۔ ہمارا ماضی اور حال سب کے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہے۔ میں نے یہ سب کچھ تمہیں اس لیے بتایا ہے کہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لینا کہ حیثیت کا فرق ہمارے راستے کی دیوار نہ بن جائے۔“

”تمہیں اس بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ گھر والے میری مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کریں گے پھر بھی میں اپنی بھابیوں کے ذریعے تمہارا پر پوزل والدین اور بھائیوں تک پہنچا دیتی ہوں۔ اس طرح ان کا ریاکشن بھی معلوم ہو جائے گا۔“

”اگر ان لوگوں نے مجھے رنجیکٹ کر دیا تو.....“ ”یہ معرکہ سر کرنا میرا کام ہے۔“ نوشین نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ”تم کچھ دن انتظار کرو اور جب میں گرین سگنل دوں تو اپنی والدہ کو رشتہ مانگنے بھیج دینا۔“

کچھ دن بعد نوشین کی جانب سے گرین سگنل مل گیا اور اب وہ ماں کو اسی کے بارے میں بتانا چاہ رہا تھا۔ نوشین کے لیے یہ مرحلہ آسان نہیں تھا۔ بھابیوں اور ماں کے علاوہ گھر میں کسی نے بھی اس پر پوزل کو پسند نہیں کیا۔ باپ اور بھائی تو یہ سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گئے۔ انہیں محسن کی شخصیت، تعلیم، قابلیت اور ملازمت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ محسن اور اس کی ماں کو برسوں سے جانتے تھے۔ اس کا پورا ماضی ان کے سامنے تھا پھر وہ آنکھوں دیکھی کبھی کیسے نکل سکتے تھے۔ بے شک وہ کوئی آوارہ، نکمہ، جاہل یا بد معاش قسم کا بندہ نہیں تھا۔ اس کی ماں نے بھی ساری عمر بڑی عزت، شان اور خودداری سے زندگی بسر کی لیکن محسن کا یہی جرم کیا کم تھا کہ وہ ایک ایسی عورت کا بیٹا تھا جس کا شوہر شادی کے چند سال بعد ہی اسے چھوڑ کر چلا گیا اور اس نے اپنے بیٹے کی پرورش محلے کے لوگوں کے کپڑے ہی کر کی۔ بے شک محسن ایک سیلف میڈ شخص تھا اور مستقبل میں اس کے پاس ترقی کرنے کے بے شمار مواقع تھے لیکن فی الوقت مالی اور خاندانی اعتبار سے اس کا معاشرہ کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں بنتا تھا۔ شیخ عبدالعزیز بیٹی کو اپنے سے بڑے.... لوگوں میں بیابنا چاہ رہے تھے تاکہ بڑے خاندان سے ناتا جوڑ کر ان کی شان میں بھی اضافہ ہو لیکن محسن کا نام سنتے ہی انہیں یوں لگا جیسے کھیر کھاتے ہوئے کوئی کرڑا بادام بیج میں آ گیا ہو۔

انہوں نے تو فوراً ہی یہ رشتہ مسترد کر دیا تھا۔ نوشین کے بھائیوں کی رائے بھی ان سے مختلف نہ تھی۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ محسن اپنے ماضی پر پردہ ڈالنے کے لیے اس گھر سے رشتہ جوڑنا چاہ رہا ہے۔ سب سے بڑے بھائی اس بات پر طیش کھا رہے تھے کہ محسن کی اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ وہ شیخ عبدالعزیز کی بیٹی کے بارے میں سوچ سکے لیکن نوشین کی ماں اور بھابیاں اس رشتے کے حق میں تھیں کیونکہ نوشین نے انہیں اپنی پسند سے آگاہ کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ اگر اس کی شادی محسن سے نہ ہوئی تو پھر کسی سے بھی نہیں ہوگی۔ یہ دمکلی کارگر ثابت ہوئی۔ نوشین کی ماں اور بھابیاں سر جوڑ کر بیٹھیں کہ کس طرح گھر کے مردوں کو اس رشتے پر راضی کیا جائے کیونکہ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتی

تھیں کہ نوشین اپنے باپ اور بھائیوں کی لاڈلی ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ ضدی اور خود سر ہو گئی ہے۔ ایک بار اس کے دماغ میں کوئی بات آجائے تو وہ اسے پورا کر کے ہی دم لیتی ہے۔ نوشین نے دھمکی دی تھی کہ اگر اس کی شادی محسن سے نہ ہوتی وہ خودکشی کر لے گی اور اس سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ اپنی بات منوانے کے لیے کسی حد تک بھی جاسکتی تھی۔

نوشین کی ماں اور بھائیوں کے لیے یہ کھن مرحلہ طے کرنا ہمالیہ کی چوٹی سر کرنے کے مترادف تھا۔ اس کے لیے انہوں نے ہی حکمت عملی اختیار کی کہ وہ سب انفرادی طور پر اپنے شوہروں کو راضی کرنے کی کوشش کریں گی۔ بھائیوں کو تو زیادہ مشکل پیش نہیں آئی کیونکہ وہ چاروں جوان اور خوب صورت تھیں اور شوہروں کو انگلیوں پر نچانے کا فن اچھی طرح جانتی تھیں۔ البتہ نوشین کی ماں کو لوہے کے چنے چبانے پڑ گئے۔ شیخ عبدالعزیز تو محسن کا نام بھی سننے کے لیے تیار نہیں تھے پھر نوشین کی ماں نے ان کی دھمکی رگ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولیں۔ ”دیکھو جی، آج کل اچھے مینیجر کہاں ملتے ہیں۔ محسن نے بی کام کر لیا ہے اور اب ایم بی اے کی تیاری کر رہا ہے۔ اسے داماد بنانے میں تمہارا فائدہ ہی فائدہ ہے۔ بیٹے تو اپنی دنیا میں مگن ہیں۔ تمہارے کاروبار کو سنبھالنے والا کوئی نہیں۔ محسن یہ کی پوری کر سکتا ہے۔ اس پر احسان بھی ہو جائے گا اور وہ ہمیشہ ہم سے دب کر رہے گا۔ میں تو کہتی ہوں کہ ہاں کر دو۔ ایسے رشتے قسمت والوں کو ملتے ہیں۔“

شیخ عبدالعزیز نے غور سے بیوی کی طرف دیکھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے کوئی عقل کی بات کی تھی۔ اس لیے ان کا چونکا ایک فطری سی بات تھی۔ انہوں نے عینک اتار کر اس کے شیشے صاف کیے اور بولے۔ ”کہتی تو تم ٹھیک ہو، ویسے وہ لڑکا ذاتی طور پر مجھے پسند ہے۔ میں نے آج تک اس کے بارے میں کوئی غلط بات نہیں سنی لیکن پھر بھی اس سے رشتہ جوڑنا کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ خاندان، برادری والے کیا کہیں گے کہ کس ٹپو نیچے سے لڑکی بیاہ دی۔ میں تو نوشین کے لیے بہت اچھا گھر تلاش کر رہا تھا جہاں میری بیٹی راج کرے۔“

”وہ یہاں بھی راج ہی کرے گی۔ محسن اور اس کی ماں دونوں ہی بہت اچھے ہیں۔ وہ دل سے ہماری بیٹی کی قدر کریں گے اور خاندان برادری کا کیا ہے جو چاہے کہتے رہیں۔ ہم تو وہی کریں گے جس میں ہمارا فائدہ ہوگا۔“

شیخ صاحب کے کاروباری تھے اور جہاں فائدہ کی بات آجائے تو ان کی دلچسپی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس معاملے میں بھی انہوں نے فائدہ کا پہلو دیکھا اور بیوی سے بولے۔ ”ٹھیک ہے، تم کسی چھٹی والے روز محسن اور اس کی ماں کو بلوالو۔ ذرا دو چار باتیں ان سے بھی ہو جائیں۔“ نوشین کی طرف سے گرین سگنل ملنے کے بعد محسن کی بے تابی مزید بڑھ گئی۔ وہ جلد از جلد ماں کو نوشین کے گھر بھیجنا چاہ رہا تھا۔ اب مزید تاخیر کی گنجائش نہیں تھی۔ نوشین جیسی حسین اور دولت مند لڑکی کے لیے رشتوں کی کیا کی، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سوچتا ہی رہ جائے اور کوئی دوسرا درمیان میں کود پڑے۔ اسی لیے اس روز اس نے دفتر سے آنے کے بعد ماں سے بات کرنے کا پروگرام بنایا تھا لیکن وہاں تو معاملہ ہی دوسرا ہو گیا اور تمہید کے طور پر کی جانے والی گفتگو کوئی دوسرا رخ اختیار کر گئی۔ اب محسن کے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا کہ وہ رات کے کھانے پر ماں کے ساتھ دل کی بات شیئر کرے۔

کھانے کے بعد جب صادق بیگم برتن وغیرہ سمیٹ کر فارغ ہوئیں تو محسن نے ماں کی گود میں سر رکھ دیا اور بولا۔ ”امی! آپ سارا دن گھر میں اکیلی رہتی ہیں۔ بوریٹ تو بہت ہوتی ہوگی۔“

صادق بیگم نے چونک کر بیٹے کی طرف دیکھا، جہاں دیدہ تھیں اس لیے بات کی تہہ تک پہنچنے میں دیر نہ لگی۔ مسکراتے ہوئے بولیں۔ ”خیریت تو ہے۔ آج تمہیں میری تنہائی کا خیال کیسے آگیا۔ میں تو گزشتہ کئی برسوں سے یہ عذاب جھیل رہی ہوں۔“

”اسی لیے سوچ رہا ہوں کہ اب یہ تنہائی ختم ہو جانی چاہیے۔“ حسن نے جھکتے ہوئے کہا۔

”اوہ، اب مجھی، میں بھی تو کہوں کہ آج اماں کے اتنے لاڈ کیوں اٹھائے جارہے ہیں۔“ انہوں نے محسن کے گال پر پیار سے چپٹ لگائی اور بولیں۔ ”سچ کہنا محسن! کیا تم بھی وہی کچھ سوچ رہے ہو... جو میرے دل میں ہے۔“

”شاید ایسا ہی ہو۔ ویسے بائی داوے آپ کے دل میں کیا ہے؟“

”وہ میں بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے تم کہو، کیا سوچ رہے ہو؟“

”میں یہ گستاخی نہیں کر سکتا۔ آپ بڑی ہیں اس لیے پہلے آپ۔“

صادق بیگم کی ہنسی چھوٹ گئی اور وہ محسن کا کان پکڑتے ہوئے بولیں۔ ”اس پہلے آپ پہلے آپ کے چکر میں گاڑی نکل جائے گی اور ہم دونوں ہی ہاتھ ملتے رہ جائیں گے۔ اس لیے تکلف برطرف۔ اگر تمہارے ذہن میں کوئی لڑکی ہے یا تم کسی کو پسند کرتے ہو تو بلا جھجک بتا دو۔“

محسن سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور اٹکتے ہوئے بولا۔ ”وہ..... وہ..... آپ شیخ صاحب کے یہاں چلی جائیں۔“

صادق بیگم چونکتے ہوئے بولیں۔ ”کون شیخ صاحب! کہیں تم اپنے شیخ عبدالعزیز کی بات تو نہیں کر رہے؟“

”جی ہاں، وہی شیخ صاحب ان کی بیٹی ہے نا نوشین۔“

صادق بیگم تیز لہجے میں بولیں۔ ”محسن! تم ہوش میں تو ہو، ہماری اور ان کی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں اگر اس نیت سے وہاں گئی تو وہ اپنے نوکروں کے ذریعے دھکے دے کر نکال دیں گے۔ کیا تم اپنی ماں کی بے عزتی برداشت کر لو گے؟“

”کسی کی مجال نہیں کہ کوئی آپ کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھے، میں اس کی آنکھیں ہی نکال دوں گا۔ آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ انشاء اللہ کامیاب ہو کر ہی لوٹیں گی۔“

”تو یوں کہو نا کہ سب معاملات بالا ہی بالا طے کر لیے اور مجھے خبر بھی نہ ہوگی۔“

”دیکھ لیجئے۔ میں نے آپ کا کام کتنا آسان کر دیا۔ اب تو صرف رسمی کارروائی پوری کرنی ہے۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔ اب صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اتوار شام پانچ بجے کا وقت طے کر لو۔ تمہیں بھی میرے ساتھ چلنا ہو گا نا کہ بردھوے کا مرحلہ بھی ساتھ ساتھ منٹ جائے۔“

محسن کے دل میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ اسے یقین نہیں تھا کہ ماں اتنی آسانی سے اس رشتے کے لیے تیار ہو جائے گی بلکہ اسے تو شیخ صاحب کی طرف سے بھی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ وہ اپنی حیثیت سے کم درجہ کے لوگوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے پر تیار ہوں گے یا نہیں لیکن شکر ہے کہ دونوں طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی۔ جس کا ایک ہی مطلب لیا جاسکتا تھا کہ نوشین کے ساتھ اس کا رشتہ آسمانوں پر طے ہو چکا تھا چنانچہ اس نے دوسرے روز ہی نوشین کو اتوار کے پروگرام سے مطلع کر دیا اور وقت مقررہ پر دونوں ماں بیٹے شیخ

بابا فرید ایک شب تہجد پڑھ رہے تھے کہ افغانستان سے ایک تجارتی قافلے کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس میں تقریباً 20، 15 اونٹ تھے جن پر ڈرائی فروٹ از قسم اخروٹ، بادام، خوبانی، پستہ اور چلغوزے وغیرہ لدے ہوئے تھے۔ جیسا کہ اس دور میں رواج تھا اس قافلے کے اونٹوں کے گلے میں گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ قافلے کے چند محافظ اور تاجر آگے آگے چل رہے تھے اور چند پیچھے پیچھے تھے تاکہ نگرانی کر سکیں۔ بابا فرید عبادت میں اس قدر مستغرق تھے کہ ان کو پہلے تو معلوم ہی نہ ہوا کہ کوئی قافلہ گزر رہا ہے لیکن جب اونٹوں کی گھنٹیوں کی آوازیں تیز ہو گئیں تو آپ کے استغراق میں خلل آیا اور آپ نے مریدوں سے پوچھا کہ یہ شور کیسا ہے؟ مرید حجرے سے باہر نکل کر دیکھنے لگے تو آخری اونٹ تین پر سے گزر رہا تھا اور اس کے ساتھ دو تین افغان محافظ بھی تھے۔ مرید ان کو لے کر بابا فرید کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بابا فرید نے پوچھا:

”یہ شور کیسا ہے، کہاں جا رہے ہو؟“

”قافلے والے یہ محافظ نو عمر لڑکے تھے ان کے بزرگ آگے آگے تھے اور ان لڑکوں کو پیچھے آنے کا حکم دیا ہوا تھا۔ انہوں نے بابا فرید کی بات سنی اور کہا ”زبان ہندی نمی دانم“ یعنی ہم ہند کی زبان نہیں جانتے۔“

بابا فرید چونکہ فارسی جانتے تھے پوچھا ”ایں شور و غوغا چیست؟ کدام میری؟“ ”تو شہر شام چیست؟“

بابا فرید کی کی فصیح فارسی سن کر وہ دونوں لڑکے حیران ہوئے اور ان کو شرارت سوچی۔ ایک نے جواب دیا۔ ”بابا می رویم بہ دہلی و تو شہر ماسنگ است۔“

یعنی ہم دہلی جا رہے ہیں اور وہاں پتھر لے جا رہے ہیں۔ بابا فرید نے سن کر تبسم فرمایا اور ان کی زبان سے نکلا۔ ”سنگ باشد“ یعنی ”پتھر ہی ہوگا۔“ ولی اللہ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ اونٹوں پر رکھے تمام کجاوؤں کے خشک پھل پتھر بن گئے۔

مرسلہ: انور حسن۔ لاہور

صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ رسی باتوں کے بعد صادق بیگم نے اپنا مدعا بیان کیا تو شیخ صاحب سنبھلتے ہوئے بولے۔ ”یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ آپ نے محسن جیسے سعادت مند اور ہونہار بیٹے کے لیے ہماری لڑکی کا انتخاب کیا ہمیں یہ رشتہ قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں کیونکہ محسن ہمارے سامنے ہی پل بڑھ کر جوان ہوا ہے اور آپ کی پوری زندگی بھی کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے البتہ اگر اجازت ہو تو آپ کی موجودگی میں ہی محسن سے دو چار باتیں کر لوں۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں، بڑے شوق سے آپ جو چاہیں پوچھ سکتے ہیں۔“ صادق بیگم نے خوش دلی سے کہا۔

”دیکھو محسن میاں، آپ کے مستقبل کے حوالے سے تو میں بالکل مطمئن ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آگے چل کر آپ بہت ترقی کریں گے لیکن فی الوقت آپ کو سپورٹ کی ضرورت ہے اور میں بھی یہی چاہوں گا کہ میری بیٹی جس عیش و آرام کی عادی ہو چکی ہے اس میں کوئی کمی نہ آنے پائے۔ اس لیے کیا ہی اچھا ہو کہ آپ اپنی ڈیمانڈ بتا دیں تاکہ اسی کی مناسبت سے فائل بات کی جائے۔“

محسن نے بڑے تحمل سے ان کی بات سنی اور شائستہ لہجے میں بولا۔ ”میری کوئی ڈیمانڈ نہیں ہے البتہ یہ خواہش ضرور ہے کہ اگر آپ کو یہ رشتہ منظور ہو تو مجھے میرے حالات سمیت قبول کرنا ہوگا کیونکہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو سسرال کے پیسوں پر نظر رکھتے ہیں۔“

”دیری گڈ۔“ شیخ صاحب خوش ہوتے ہوئے بولے۔ ”مجھے آپ سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی لیکن ہمیں یہ اختیار تو ہوگا کہ اپنی بیٹی کو جہیز کے نام پر کچھ دے سکیں۔“

”بالکل مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں لیکن آپ کو جو کچھ دینا ہو اپنی بیٹی کو دیں۔ میرے لیے کوئی اہتمام نہ کریں۔“

”دوسری بات یہ کہ شادی کے بعد اگر آپ کو ہماری بیٹی سے کوئی شکایت ہو تو اسے خود ہی طے کر لیں۔ مجھ تک کوئی بات نہیں آنی چاہیے۔ کیونکہ میں میاں بیوی کے معاملات میں دخل دینے کا قائل نہیں ہوں۔ اس لیے آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا گا۔“

”اللہ نے چاہا تو اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔“ محسن نے آہستہ سے کہا۔

اس طرح کی دو چار باتوں کے بعد یہ ملاقات ختم ہو

گئی۔ شیخ صاحب نے ان لوگوں کی تواضع کا خاصا اہتمام کیا تھا۔ چائے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد جب صادق بیگم نے رخصت ہونے کی اجازت چاہی تو شیخ صاحب نے کہا۔ ”بہن! آپ مطمئن رہیں ہم گھر میں مشورہ کر کے آپ کو جلد ہی جواب دیں گے۔“

محسن کی ماں کو یقین تھا کہ جواب ہاں میں ہی ہوگا اگر ناں کرنا ہوتی تو انہیں گھر آنے کی دعوت ہی کیوں دیتے، یہ تو لڑکی والوں کا طریقہ ہے کہ وہ پہلی دفعہ میں بھی ہاں نہیں کہتے بلکہ لڑکے والوں کو دو چار چکر لگوانے کے بعد ہی کوئی جواب دیتے ہیں۔ جہاں عیدہ عورت تھیں اور انہوں نے دنیا دیکھ رکھی تھی۔ اتنا تو جان ہی گئی تھیں کہ محسن اور نوشین ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور نوشین کے گھر والے بھی اس حقیقت سے باخبر ہیں۔ ورنہ وہ اپنے گھر میں ان لوگوں کا داخلہ بھی برداشت نہ کرتے۔ انہوں نے اپنے طور پر سوچ لیا تھا کہ جیسے ہی شیخ صاحب کی طرف سے رضا مندی کا اظہار ہوا، وہ فوراً ممکن کی رسم ادا کر کے چھ ماہ کے اندر اندر شادی بھی کر دیں گی۔ ان کے خیال میں بات چلی ہو جانے کے بعد شادی میں تاخیر کرنا مناسب نہ تھا۔

ایک ہفتہ خیریت سے گزر گیا۔ اس دوران کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ البتہ نوشین اور محسن کی ملاقاتیں جاری رہیں۔ نوشین کی زبانی ہی محسن کو معلوم ہوا کہ دیے تو گھر کے سبھی افراد ہی اس رشتے کو منظور کرنے کے حق میں ہیں لیکن شیخ صاحب جانتے ہیں کہ وہ اس سلسلے میں اپنے بڑے بھائی سے بھی مشورہ کر لیں لیکن نوشین کی ماں اس کی مخالفت کر رہی تھیں۔ ان کے خدشات بھی اپنی جگہ درست تھے۔ انہیں جینٹھ سے زیادہ جٹھانی سے ڈر لگ رہا تھا۔ وہ بے حد خطرناک، چالاک اور عیار عورت تھی اور اس کا ارادہ نوشین کو اپنی بہو بنانے کا تھا۔ جب کہ نوشین کی ماں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ مرتے مرجائیں گی لیکن بیٹی کی شادی اپنی سسرال میں نہیں کریں گی کیونکہ ان کی نظر میں جینٹھ اور سندوں کی اولاد میں کوئی اس قابل نہیں تھا کہ وہ اسے اپنا داماد بنا سکیں وہ سب لڑکے انتہائی ٹکے اور نالائق تھے۔ انہوں نے اچھی تعلیم حاصل کی تھی اور نہ ہی ڈھنگ کا کوئی کام کر رہے تھے۔ وہ سب اپنے باپ کے پیسوں پر عیش کر رہے تھے اور کسی کو بھی اپنے مستقبل کی فکر نہ تھی۔ اسی لیے وہ شیخ صاحب کو قائل کرنے کی کوشش میں تھی کہ اس معاملہ میں کسی سے کوئی مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم اپنی بیٹی کے لیے بہتر

سوچ سکتے ہیں۔

بڑی مشکل سے یہ بات شیخ صاحب کی سمجھ میں آئی اور انہوں نے محسن کا رشتہ منظور کر لیا لیکن انہیں یہ بھی ڈر تھا کہ ان کے بھائی بہنوں کا رد عمل بڑا شدید ہوگا اور ممکن ہے کہ وہ لوگ اس بات پر ناراض بھی ہو جائیں کہ اس رشتہ کے سلسلے میں ان سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا لیکن نوشین کی ماں کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی وہ صرف اور صرف اپنی بیٹی کو خوش دیکھنا چاہتی تھیں اور اس کے لیے وہ ساری دنیا کی ناراضی مول لے سکتی تھیں۔

اس روز بھی نوشین اور محسن ایک ریسٹوران میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ اچانک ہی نوشین نے شرماتے ہوئے کہا۔ ”اتنے دن ہو گئے۔ آپ کی امی نے پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔ اب تک تو انہیں جواب لینے کے لیے آ جانا چاہیے تھی۔“

محسن نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ ”دراصل ان کے مزاج میں جلد بازی نہیں ہے۔ وہ ہر کام سکون و اطمینان سے کرنا چاہتی ہیں۔ ویسے بھی شادی کوئی گڈے گڑیا کا کھیل نہیں۔ زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ اس لیے وہ چاہتی ہیں کہ تمہارے گھر والے خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔“

”یہ بھی خوب رہی۔“ نوشین جل کر بولی۔ ”ایسا نہ ہو کہ وہ سکون اور اطمینان سے بیٹھی رہیں اور یہاں کوئی دوسری کہانی شروع ہو جائے۔“

”کیا اب بھی کوئی خطرہ ہے؟“ محسن نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

”خطرہ نہیں بلکہ خطرات، اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ آپ جلد از جلد اپنی امی کو ہمارے گھر بھیج دیں۔ اب اس بات کو کافی دن ہو چکے ہیں۔ اس لیے ان کا آنا جلد بازی میں شمار نہیں ہوگا۔“

اس کے بعد نوشین نے اسے مختصر الفاظ میں گھر میں پکنے والی کچڑی سے آگاہ کیا لیکن ساتھ ہی یہ اطمینان بھی دلا دیا کہ فی الوقت فیصلہ اس کے حق میں ہوا ہے تاہم اگر بات گھر سے نکل گئی تو کوئی بھی رکاوٹ کھڑی ہو سکتی ہے۔

محسن کی سمجھ میں ساری بات آگئی اور اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تم فکر نہ کرو۔ میں کل ہی امی کو تمہارے گھر جواب لینے کے لیے بھیجتا ہوں۔“

اس روز محسن نے گھر پہنچتے ہی ماں کو سب سے پہلے ہی

بات بتائی اور کہا۔ ”امی! اب آپ کو ایک چکر شیخ صاحب کے یہاں بھی لگایا چاہیے۔ اب تو اس بات کو کافی دن ہو چکے ہیں۔ انہوں نے یقیناً کوئی فیصلہ کر لیا ہوگا۔“

”تمہاری بے تابی میری سمجھ میں آرہی ہے۔“ صادق بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں سوچ رہی ہوں کہ کیا اتنی جلدی میرا جانا مناسب ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ انہیں مزید کچھ وقت ملنا چاہیے۔“

”ایک دفعہ جانے میں کیا حرج ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تاخیر ہی ہمارے لیے نقصان کا باعث ہو جائے۔“

”اللہ نہ کرے کہ ایسا ہو۔“ اب صادق بیگم کو بھی گھبراہٹ ہونے لگی۔ ”میں کل ہی شیخ صاحب کے یہاں جاؤں گی۔ دیکھتی ہوں وہ کیا جواب دیتے ہیں۔“

دوسرے دن صادق بیگم نے دو کلو مٹھائی منگوائی اور محسن کے گھر آنے سے پہلے ہی شیخ صاحب کی طرف چل دیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ محسن کے گھر میں داخل ہوتے ہی وہ یہ خوش خبری اسے سنا دیں۔ انہیں پورا یقین تھا کہ فیصلہ ان کے بیٹے کے حق میں ہی ہوا ہوگا اور وہ اسی یقین کے سہارے نوشین کے گھر پہنچیں۔ وہاں ان کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ اتفاق سے اس روز شیخ صاحب بھی جلد ہی گھر آ گئے تھے۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد صادق بیگم نے اپنا مدعا بیان کیا تو شیخ صاحب بولے۔ ”ہمیں یہ رشتہ منظور ہے۔ آپ جب چاہیں اپنی سہولت کے مطابق تاریخ طے کر سکتی ہیں۔“

”اللہ آپ کو خوش رکھے۔“ صادق بیگم دعا کے انداز میں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولیں۔ ”آپ نے مجھے بیوہ کا مان رکھ لیا۔ میں مرتے دم تک یہ احسان نہیں بھولوں گی۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔“ شیخ صاحب بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ”محسن جیسے بیٹے تو قسمت والوں کو ملتے ہیں۔ احسان مند تو ہمیں ہونا چاہیے کہ آپ نے اپنا ہیرے جیسا بیٹا ہمیں دے دیا۔ اب محسن ہمارا ہوا، اس کے بدلے میں ہم نے نوشین آپ کو دی۔“

نوشین کا ذکر آتے ہی صادق بیگم چوہکتے ہوئے بولیں۔ ”ارے بیٹی کو تو بلائیں۔ میں سب سے پہلے اسی کا منہ میٹھا کراؤں گی تاکہ ساری زندگی اس کی زبان سے میٹھے بول ہی سنتی رہوں۔“

نوشین کی ماں نے بڑی بہو کو اشارہ کیا تو وہ اسے بلانے کے لیے چلی گئی۔ صادق بیگم نے مٹھائی کا ڈبہ اپنی

ہونے والی سمدھن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال تو شگن کے لیے تھوڑی سی مٹھائی لائی ہوں آپ تاریخ دے دیں تو میں رسم کے لیے آ جاؤں۔“

”اگر آپ براہ منائیں تو ایک بات کہوں۔“ نوشین کی ماں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

”ضرور۔“ صادقہ بیگم بولیں۔ ”آپ کی بات کا میں کیوں برا مناؤں گی۔“

”بس یوں سمجھ لیں کہ ہماری طرف سے بات پکی ہے۔ یہ رسم وغیرہ رہنے دیں کیونکہ ہمارے یہاں مٹھائی راس نہیں آتی۔“

”ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی لیکن مجھے اتنی اجازت تو دیں کہ اپنی بیٹی کو شگن کے نام کی انگوٹھی پہنا دوں۔“

”چلیں۔ یہ خوشی بھی پوری کر لیں لیکن مٹھائی کا اعلان نہیں کیا جائے گا کیونکہ فی الحال ہم اپنے خاندان میں اس کی تشہیر نہیں چاہتے۔“

”کوئی بات نہیں۔ میں بھی اپنی طرف سے پوری احتیاط کروں گی کہ بات پھیلنے نہ پائے۔“ صادقہ بیگم نے انہیں اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ ”البتہ میں اس اتوار کو شگن کے ساتھ آرہی ہوں۔ اپنی بیٹی کو انگوٹھی پہنانے۔“

ان کی بات ختم ہی ہوئی تھی کہ نوشین بھی اپنی بڑی بھالوج کے ساتھ آگئی۔ صادقہ بیگم نے اسے اپنے پاس بٹھا کر پیار کیا اور مٹھائی کا ٹکڑا اس کے منہ میں رکھتے ہوئے بولیں۔ ”خوش رہو، بس یونہی ہمیشہ مسکراتی رہنا تاکہ میرے گھر میں خوشیوں کی برسات ہوتی رہے۔“

اگلے اتوار کو صادقہ بیگم، محسن کے ہمراہ شیخ صاحب کے گھر گئیں اور نوشین کو انگوٹھی پہنا دی۔ نوشین کی امی نے بھی محسن کو انگوٹھی پہنائی۔ اس موقع پر گھر کے افراد کے علاوہ کوئی اور موجود نہیں تھا حالانکہ شیخ صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ وہ اپنے بھائی بہنوں کو مدعو کریں لیکن ان کی بیگم نے منع کر دیا بلکہ سختی سے تاکید کر دی کہ ابھی کسی سے اس رشتے کا ذکر نہ کیا جائے لیکن تمام تر احتیاط کے باوجود یہ بات پھیل گئی۔

شیخ صاحب کے بڑے بھائی کو جب معلوم ہوا کہ نوشین کا رشتہ کسی غیر لڑکے سے طے کر دیا گیا ہے تو انہیں بہت غصہ آیا۔ اس کے ساتھ ہی انہیں یہ افسوس بھی تھا کہ چھوٹے بھائی نے اتنے اہم معاملے میں ان سے مشورہ کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ دونوں میاں بیوی شیخ صاحب کے

گھر آئے اور خوب گرجے برے۔ نوشین کی تائی کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ انہوں نے شیخ صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میری ہمیشہ سے خواہش تھی کہ نوشین کو اپنی بہو بناؤں لیکن آپ نے فیصلہ کرنے میں بہت جلدی کی۔ کم از کم ہمیں کچھ کہنے کا موقع تو دیا ہوتا۔“

”آپ نے تو کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔“ شیخ صاحب بولے۔

”میں نوشین کی پڑھائی ختم ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ فارغ ہو جائے پھر آپ کے آگے جھولی پھیلاؤں گی۔“

”اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔“ شیخ صاحب نے کہا۔ ”اگر آپ پہلے ذکر کر دیتیں تو میں ضرور اس بارے میں سوچتا۔“

”خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔“ وہ اپنا لہجہ نرم کرتے ہوئے بولیں۔ ”رشتہ ہی طے ہوا ہے، کوئی نکاح تو نہیں ہوا، آپ ان لوگوں کو انکار کر دیں۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ وہ سختی سے بولے۔ ”میں زبان دے چکا ہوں اور ویسے بھی وہ لڑکا ہر لحاظ سے بہتر ہے۔ میں کس بنیاد پر انکار کر دوں۔“

”دیکھئے بھائی صاحب! آپ میرے بیٹے کی حق تلفی کر رہے ہیں۔ نوشین پر پہلا حق ہمارا ہے۔“

”حق تلفی اس وقت ہوتی جب آپ نے رشتہ مانگا ہوتا اور میں انکار کر دیتا۔ اب ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔“ شیخ صاحب قطعاً انداز میں بولے۔

ان کے جانے کے بعد نوشین کی امی بولیں۔ ”مجھے ان کے تیور اچھے نہیں لگ رہے۔ کہیں یہ کوئی اور گل نہ کھلا دیں۔“

”کیا کر لیں گے۔ ہماری بیٹی کی تقدیر تو نہیں بدل سکتے۔“ شیخ صاحب بولے۔ ”تم اپنے دل میں اندیشوں کو جگہ نہ دو۔ اللہ بہتر کرے گا۔“

شادی کی تاریخ چھ ماہ بعد مقرر ہوئی تھی۔ دونوں طرف سے تیاریاں شروع ہو گئیں۔ صادقہ بیگم نے نوشین کے گھر والوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ جہیز میں دہن کے کپڑوں کے علاوہ کوئی بھاری چیز مثلاً فرنیچر وغیرہ نہ دیں کیونکہ ان کے گھر میں اتنی جگہ نہیں ہے۔ یہ سن کر شیخ صاحب دل مسوس کر رہ گئے کیونکہ وہ اپنی بیٹی کو بھاری بھر کم جہیز دینا چاہ رہے تھے لیکن ان کی بیگم نے تجویز پیش کی کہ وہ ان چیزوں کے

بدلے نوشین کو نقد رقم دے دیں۔ وہ شادی کے بعد اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق خریداری کر لے گی۔

صادقہ بیگم کا مکان ایک سو بیس گز پر بنا ہوا تھا۔ وہ جب اس میں شفٹ ہوئیں تو صرف ایک کمر، باورچی خانہ اور باتھ روم بنا ہوا تھا۔ انہوں نے دن رات محنت کر کے کمیٹی ڈالی اور ایک ایک اینٹ جوڑ کر اس مکان کو مکمل کیا۔

انہوں نے محسن کی شادی سے پہلے پورے مکان پر رنگ روغن کروایا، باتھ روم میں ٹائل لگوائے اور کچن بنوایا تھا کہ نوشین کو کسی چیز کی کمی کا احساس نہ ہو۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کی بہو ایک بڑے گھر سے آرہی ہے جہاں اسے زندگی کی ہر آسائش میسر ہے گو کہ ان کا مکان شیخ صاحب کے گھر کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا لیکن وہ اسے ہر لحاظ سے نوشین کے لیے آرام دہ اور پُر آسائش بنانا چاہ رہی تھی۔

بالآخر شادی کا دن بھی آ گیا۔ صادقہ بیگم نے بری اپنی حیثیت کے مطابق بنائی، جس میں زیور کا ایک سیٹ اور دہن کے گیارہ جوڑے تھے۔ وہ مقدار سے زیادہ معیار کی قائل تھیں اور ان کے ذہن میں یہی ایک بات تھی کہ جوڑے بے شک تعداد میں کم ہوں لیکن دیدہ زیب اور معیاری ہونے چاہئیں۔ نوشین کے گھر والوں نے تو کچھ نہیں کہا لیکن تائی اور ان کی بیٹیوں نے بری کا خوب مذاق اڑایا اور مسلسل طنز کے تیر پر سانی رہیں، اسی طرح ولیمہ کی تقریب میں بھی ان کی زبان فحش کی طرح چلتی رہی گو کہ محسن نے اپنی طرف سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی لیکن وہ ہر بات میں کڑے نکال رہی تھیں۔ ان کی باتیں سن کر نوشین کی امی کا خون کھول رہا تھا اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ انہیں دھکے دے کر گھر سے نکال دیتیں۔

شادی سے پہلے نوشین نے محسن کا گھر نہیں دیکھا تھا لیکن شادی کے بعد اسے یوں لگا کہ وہ محل سے نکل کر کسی جھونپڑی میں آگئی ہے۔ اسے محسن کا مکان دیکھ کر خاصی مایوسی ہوئی گو کہ وہ اس کے بیک گراؤنڈ سے اچھی طرح واقف تھی اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ محسن کی ماں نے کس طرح تنکا تنکا جوڑ کر یہ مکان بنایا ہے لیکن وہ جس پر آسائش زندگی کی عادی تھی اس کے مقابلے میں یہ گھر کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ عملاً ایک کمر میں محصور ہو کر رہ گئی تھی۔ باقی پورے گھر میں کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں کسی مہمان کو بٹھایا جاتا۔

شادی کو ایک مہینہ ہو گیا تھا لیکن نوشین نے گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اسے عادت ہی نہیں تھی۔ اپنے گھر میں

بھی اس کی ماں اور بھادھیں سارا کام کرتیں۔ اوپر کے کاموں کے لیے ماسی تھی۔ نوشین نے کبھی کھانا نہیں بنایا تھا البتہ جب اس کا موڈ ہوتا تو وہ اپنے لیے چائے بنا لیتی۔ شادی کے بعد بھی اس کا یہی معمول رہا۔ وہ صبح دیر سے سو کر اٹھتی۔ محسن خود ہی ناشتا کر کے بینک چلا جاتا۔ صادقہ بیگم اس کے انتظار میں بیٹھی رہتیں کہ وہ کمرے سے باہر آئے تو اسے ناشتا بنا کر دیں لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ اس کی صبح بارہ بجے سے پہلے نہیں ہوتی تو انہوں نے بھی اس کا انتظار کرنا چھوڑ دیا۔ اب وہ خود ہی چائے بناتی اور ناشتا کرنے کے بعد بیوی دیکھنے بیٹھ جاتی۔ شام کو محسن گھر آتا تو اسے بھی صادقہ بیگم ہی چائے بنا کر دیتیں پھر دونوں میاں بیوی گھومنے چلے جاتے اور صادقہ بیگم رات دیر تک ان کا انتظار کرتی رہتیں۔

بہت جلد نوشین کو احساس ہونے لگا کہ یہ وہ گھر نہیں جس کا شادی سے پہلے اس نے خواب دیکھا تھا۔ اسے صادقہ بیگم یا محسن سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اس کی ساس بہت ہی شفیق اور محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ انہوں نے ایک مرتبہ بھی اس سے کسی کام کے لیے نہیں کہا اور نہ ہی سخت لہجہ میں بات کی۔ نوشین کو اس بات کا احساس تھا کہ انہیں اس عمر میں بھی گھر کا سارا کام کرنا پڑ رہا ہے۔ اس نے انہیں مشورہ دیا کہ اوپر کے کاموں کے لیے ماسی لگالی جائے لیکن صادقہ بیگم اس تجویز سے متفق نہیں تھیں۔ اس سلسلے میں انہیں بہت سے تحفظات تھے تاہم نوشین کے بہت زیادہ کہنے پر انہوں نے ایک ماسی کا بندوبست کر لیا۔

آہستہ آہستہ صادقہ بیگم اور نوشین کے درمیان دوری بڑھنے لگی۔ صادقہ بیگم چاہتی تھیں کہ نوشین گھر کے کاموں میں دلچسپی لے لیکن وہ اپنی روش بدلنے پر تیار نہیں تھی۔ گو کہ صادقہ نے زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن نوشین جانتی تھی کہ ہر ساس کی طرح وہ بھی یہی چاہتی ہیں کہ ان کی بہو کلوہو کے تیل کی طرح صبح سے شام تک گھر کے کاموں میں جتی رہے اور وہ تخت پر بیٹھ کر حکم چلائی رہیں۔

نوشین کو اس دو کمرے کے مکان میں گھٹن کا احساس ہونے لگا۔ وہ چاہتی تھی کہ محسن اسے بچ کر کسی بڑے مکان میں شفٹ ہو جائے۔ اس گھر کو وہ اپنی مرضی کے مطابق سجا سکتی تھی اور نہ ہی اس میں کوئی تبدیلی کر سکتی تھی۔ اسے جہیز میں پانچ لاکھ کا چیک ملا تھا۔ اس نے سوچا کہ ڈرائنگ روم میں نیا فرنیچر ڈلوادے اور ایک ڈرائنگ ٹیبل لے آئے لیکن

مسئلہ یہ تھا کہ یہ چیزیں کہاں رکھی جائیں گی۔ ڈرائنگ روم اتنا چھوٹا تھا کہ اس میں بمشکل ایک صوفہ سیٹ ہی آسکتا تھا۔ ڈرائنگ ٹیبل کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی اگر لاونج میں رکھی جاتی تو وہاں چلنے کا راستہ بھی نہ بچتا۔ محسن سے مشورہ کیا تو اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دراصل اسے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ صادق بیگم نے بھی نیا صوفہ سیٹ خریدنے کی مخالفت کی اور بولیں۔ ”کیا ضرورت ہے پیسے خراب کرنے کی۔ ان صوفوں میں کیا خرابی ہے؟“

نوشین نے دل میں سوچا کہ کوئی خوبی بھی نہیں ہے۔ کباڑی کو دو گی تو وہ شاید مفت میں بھی نہ لے۔ تاہم اس نے ان کے مشورے کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس نے وہی کیا جو سوچا تھا۔ ایک دن وہ محسن کو لے کر بازار گئی اور اپنی پسند سے نئے صوفے لے کر آگئی۔ پھر پردے والے کو بلا کر نئے پردوں کا آرڈر دیا۔ اس طرح ڈرائنگ روم کی کچھ شکل نکل آئی۔ پھر بھی اس کی تسلی نہیں ہوئی۔ اس کے ذہن میں جس گھر کا تصور تھا۔ یہ مکان اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ اس مکان کی وجہ سے وہ شدید قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہو گئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے میکے یا سہیلیوں میں سے کوئی اس سے ملنے آئے اور اس مکان کی وجہ سے اس کی سبکی ہو کر کوئی اس کے گھر آنے کے لیے کہتا تو وہ کوئی بہانہ بنا کر اسے ٹال دیتی۔ سہیلیوں سے بھی وہ فون پر ہی بات کر لیا کرتی تھی یا خود ہی ان سے ملنے چلی جاتی لیکن اس نے بھی کسی کو اپنے گھر آنے کی دعوت نہیں دی لیکن ایک دن یوں ہوا کہ اس کے کالج کے زمانے کی ایک سہیلی بغیر اطلاع کے اس سے ملنے چلی آئی۔ اس کی بھی شادی ہو گئی تھی اور وہ ڈیفنس میں رہ رہی تھی۔ نوشین کا شادی کے بعد اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا لیکن اس روز نہ جانے اس کی سہیلی رومانہ کو کیا سوچھی کہ اس نے نوشین کی امی کو فون کر کے ان سے نوشین کا پتہ لیا اور اپنی نئی قیمتی چمچاتی ہوئی کار میں اس سے ملنے آگئی۔

اسے دیکھ کر نوشین کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ رومانہ کو کہاں بٹھائے۔ ظاہر ہے کہ دروازے سے تو واپس نہیں بھیج سکتی تھی۔ مجبوراً اسے ڈرائنگ روم میں بٹھانا پڑا کیونکہ پورے گھر میں وہی ایک ڈھنگ کی جگہ تھی۔ دونوں سہیلیاں بڑی گرم جوشی سے ملیں۔ کچھ دیر پرانے قہرے دہرائے گئے۔ نوشین نے اس کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی کہ رومانہ پر اچھا تاثر

قائم ہو۔ اس کے باوجود رومانہ سے رہانہ گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور گیٹ کے پاس آکر بولی۔ ”یار مجھے حیرت ہے۔ تم اتنے چھوٹے سے گھر میں کس طرح رہ رہی ہو۔ میرا تو ذرا سی دیر میں ہی دم گھٹنے لگا ہے۔“

نوشین شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”کیا کریں بھی مجبوری ہے۔ فی الحال اسی میں گزارہ کرنا ہے۔ محسن کی پروموشن ہونے والی ہے پھر کوئی بڑا گھر دیکھیں گے۔“

یہ بات اس نے اپنی جھینپ منانے کے لیے کہی تھی۔ محسن کی پروموشن کا دور دور تک پتا نہیں تھا اور نہ کبھی گھر بدلنے کی بات ہوئی تھی تاہم اب اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ جلد از جلد بڑے گھر میں شفٹ ہونے کی کوشش کرے گی۔ اگر نیا گھر خریدنے کی گنجائش نہیں تو بے شک کرایہ پر ہی کوئی اچھا مکان یا لکڑی فلیٹ دیکھ لیا جائے۔ کم از کم آنے جانے والوں کے سامنے شرمندگی تو نہیں ہوگی اور وہ اسے اپنی مرضی کے مطابق ڈیکوریت کر سکے گی۔

شام کو اس نے یہی بات محسن سے کہی تو وہ چونک اٹھا اور حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”کیوں اس گھر میں کیا برائی ہے جو ہم کسی اور جگہ شفٹ ہونے کے بارے میں سوچیں۔“

”برائی تو کوئی نہیں لیکن بہت چھوٹا اور پرانے زمانے کا بنا ہوا ہے۔ آج کل تو ہر گھر میں ایچڈ ہاتھ، امریکن کچن اور ٹائل لگے ہوتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ہم کسی سرکاری کوارٹر میں رہ رہے ہیں۔“

”شکر کرو کہ ہمارے پاس سر چھپانے کے لیے اپنی چھت ہے۔ ورنہ ہمیں بھی کرایہ کے مکان میں رہنا پڑتا۔“

”کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم اسے بیچ کر کوئی نیا اور جدید طرز کا مکان خرید لیں۔“

”اس میں دو مسئلے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ مکان امی کا ہے۔ انہوں نے کئی برسوں کی محنت کے بعد ایک ایک اینٹ جوڑ کر اسے مکمل کیا۔ اس مکان سے ان کی جذباتی وابستگی ہے۔ وہ کبھی اسے فروخت کرنے پر راضی نہ ہوں گی اور اگر وہ مان بھی گئیں تو اتنے پیسوں میں دوسرا مکان نہیں آسکتا۔ اس کے لیے مزید تیس چالیس لاکھ روپوں کی ضرورت ہوگی، وہ کہاں سے آئیں گے۔“

”اس کی تم فکر مت کرو۔ میں ابو سے لے لوں گی۔“

مجھے امید ہے کہ وہ انکار نہیں کریں گے۔“

”لیکن میں ایسا نہیں چاہتا۔“ محسن نے سختی سے کہا۔ ”تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے رشتہ طے ہوتے وقت ہی ان

سے کہہ دیا تھا کہ میری نظر ان کی دولت پر نہیں ہے۔ اب میں کیسے اپنی بات سے پھر سکتا ہوں۔“

محسن کا سخت لہجہ دیکھ کر نوشین ڈر گئی اور اس نے وقتی طور پر خاموشی اختیار کر لی لیکن وہ دل میں تہیہ کر چکی تھی کہ وہ ہر قیمت پر مکان بدل کر رہے گی۔ ٹھیک ہے اگر محسن اس کے باپ سے مدد لینا نہیں چاہتا تو وہ اپنا زیور بیچ دے گی اور صادق بیگم کو بھی اپنا مکان بیچنے پر راضی کر لے گی۔

محسن نے ایم بی اے کر لیا تو اس کی ترقی ہو گئی اور اسے بینک سے گاڑی بھی مل گئی۔ اب مسئلہ یہ ہوا کہ گاڑی کہاں کھڑی کی جائے۔ گھر میں تو جگہ بھی نہیں اور گلی میں نئی گاڑی کھڑی کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن مجبوری تھی۔ اس فکر میں اس کی نیند بھی خراب ہونے لگی۔ وہ رات کو کئی مرتبہ اٹھ کر گاڑی دیکھنے باہر جاتا پھر اس نے گلی کے چوکیدار کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ مزید کچھ پیسے لے کر گاڑی کی دیکھ بھال کرتا رہے۔

نوشین کو تو جیسے بہانہ ہاتھ آ گیا اور وہ بڑی شدت سے مکان بدلنے کا مطالبہ کرنے لگی۔ محسن بھی کسی حد تک اس سے متفق ہو چکا تھا۔ اس نے نوشین سے کہہ دیا کہ اگر امی مکان بیچنے پر راضی ہو جائیں تو وہ بقیہ رقم بینک سے قرض لے کر پوری کر لے گا لیکن جب اس نے صادق بیگم سے بات کی تو انہوں نے مکان بیچنے سے صاف انکار کر دیا اور کہا۔ ”تم لوگ جہاں جانا چاہو چلے جاؤ۔ میں اپنا گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔“

محسن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ ماں اور بیوی دونوں ہی اپنی جگہ سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ نوشین کو صادق بیگم کے انکار سے بہت دکھ ہوا، وہ تو سمجھ رہی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کی خوشی کی خاطر مکان کی قربانی دینے پر تیار ہو جائیں گی لیکن جب اس کی توقع پوری نہیں ہوئی تو اس نے بیویوں والا روایتی ہتھکنڈا استعمال کیا اور یہ کہہ کر میکے چلی گئی کہ اب وہ اسی وقت واپس آئے گی جب محسن نئے مکان کا بندوبست کر لے گا۔

صادق بیگم سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ نوشین اتنی معمولی سی بات پر گھر چھوڑ کر چلی جائے گی۔ وہ خود اسے منانے کے لیے کوششیں کر رہی تھیں کہ وہ اس سے راضی ہو جائے۔ ادھر محسن سے بھی نوشین کی جدائی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ ایک ہی ہفتے میں اس کی حالت دیوانوں جیسی ہو گئی۔ صادق بیگم کے لیے یہ صورت حال انتہائی تشویش ناک تھی۔ محسن کی حالت دیکھ

کر ان کا دل بری طرح کڑھ رہا تھا۔ وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ انہوں نے بڑی محنت و مشقت سے اسے پال پوس کر بڑا کیا تھا اگر خدا نخواستہ اسے کچھ ہو گیا تو.....

اس سے آگے سوچنے کی ان میں تاب نہیں تھی۔ انہوں نے الماری کھول کر مکان کی فائل نکالی اور محسن کو دیتے ہوئے بولی۔ ”میرے لیے تم سے بڑھ کر اس دنیا میں کچھ نہیں تم پر میں ایسے دس مکان قربان کر سکتی ہوں۔ تم کل ہی کسی ایجنٹ سے بات کر کے اسے بیچنے کا بندوبست کرو۔ ویسے بھی میرے بعد یہ مکان تمہارا ہی ہے۔ اس لیے جو فیصلہ کل ہونا ہے وہ آج ہی ہو جائے تو اچھا ہے۔“

محسن پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتا رہا۔ اسے ماں اور بیوی کا فرق سمجھ میں آ گیا تھا۔ اسی وقت فیصلہ کر لیا پھر وہ نوشین کے گھر پہنچا اور سب کے سامنے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”یہ رہے اس گھر کے کاغذات، اگر بیچنا چاہو تو بیچ لو مگر میں تمہارے ساتھ نئے گھر میں نہیں رہوں گا، اس لیے کہ اتنے پیسوں میں بڑا گھر نہیں ملے گا۔ اس لیے یہی تھا تم باقی کی رقم پوری کرنے کے لیے اپنے ابو سے مانگو گی اور میں اس بات کو پسند نہیں کروں گا۔ اس لیے اس گھر میں نہیں رہوں گا۔“

نوشین کے ابا نے یہ سنتے ہی اٹھ کر اسے گلے لگا لیا پھر بولے۔ ”اسے کہتے ہیں خودداری، مجھے تم پر فخر ہے اس لیے میرا بھی ایک فیصلہ ہے۔ بیٹی پرانی ہوتی ہے اس کی شادی کر دی۔ میرا فرض پورا ہو گیا۔ اب اس کا اس گھر سے کوئی رشتہ نہیں رہا۔ نوشین کے یہاں آتے ہی میں نے اپنی جائیداد تقسیم کر دی۔ نوشین کا حصہ اسے تب ملے گا جب وہ اپنے گھر جائے گی۔“ اپنی بات ختم کر کے انہوں نے بیٹی پر نظر ڈالی۔

نوشین نے ڈبڈبائی آنکھوں سے انہیں دیکھا پھر شوہر کے سامنے جا کھڑی ہوئی پھر بولی۔ ”چلیں، مجھے سمجھ آ گئی ہے کہ اپنا گھر صرف شوہر کا ہوتا ہے۔ اب نہ میں اس مکان کو بیچوں اور نہ مڑ کر یہاں آؤں گی۔“

باپ نے مسکرا کر کہا۔ ”یہ ہوئی ناقص مندی، تمہیں اسی گھر کو جنت بنانا ہے اس گھر میں تب آؤ گی جب کوئی تقریب ہوگی۔ اب جا سکتی ہو۔“

نوشین نے محسن کو اشارہ کیا اور دونوں اٹھ کر باہر آ گئے۔

محبت فاتح عالم۔ یہ معقولہ بچپن سے سنتا آیا ہوں لیکن اس کی تفسیر اب دیکھی ہے۔ افرایم اور بانی کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے۔ افرایم کو اس سے نفرت تھی لیکن یہ نفرت محبت میں کیسے بدلی اسے سمجھنے کے لیے اس سچ بیانی کو پڑھنا ضروری ہے۔

ناصر حسین بلوچ
(تونسہ شریف)

اسے وہ دن یاد آرہے تھے جب وہ دادی کے ساتھ ان کی مرحومہ سہیلی کے گھر پہنچا تھا، دادی کی سہیلی شہر سے اتنی دور، اس چھوٹے سے گاؤں میں رہتی ہے۔ اس نے بھی سوچا بھی نہیں تھا۔

ماں باپ کے ایکسڈنٹل موت کے بعد اسے دادی نے اپنی نگرانی میں رکھا تھا۔ گاؤں کی زمینوں سے اتنا آجاتا تھا کہ اس گھر میں کسی چیز کی کمی کا احساس نہ ہوا، صرف ایک دادی تھیں جن کی زبان پر ایک ہی بات رہتی تھی کہ اس گھر میں ایک

بہوکی بہت کمی ہے۔ وہ ہنس کر ان کی بات ہوا میں اڑا دیتا۔ دراصل ابھی تک اسے آئیڈیل ملی نہیں تھی لیکن جب وہ دادی کے ساتھ گاؤں آیا تو زندگی نے ایک نیا موڑ لے لیا۔ ان کی سہیلی کی پوتی انہیں پسند آگئی اور اسے زبردستی قربانی کا بکرا بنا دیا گیا۔ شہر واپس آتے ہوئے سرخ جوڑے میں ملبوس سنبل بھی آگئی تھی۔ اقبال نے بیوی کے لیے جو آئیڈیل بنا رکھا تھا وہ پھر پھر ہو چکا تھا۔

اقبال نے گاؤں میں ہی عہد کر لیا تھا کہ وہ اسے کبھی بھی بیوی کا درجہ نہیں دے گا۔

وہ چھٹی کا دن تھا اس لیے اسے بیدار ہونے کی کوئی جلدی نہیں تھی وہ دس بجے تک سوتا رہا اور دس بجے کے بعد جب اس کی نیند مکمل ہو چکی تھی تو وہ فریش ہونے واں روم چلا گیا جب باہر نکلا تو اس کی بلیک کلر کی شرٹ بیڈ پہ پڑی ہوئی تھی۔

مطلب آج اسے بلیک شرٹ پہنے کو کہا جا رہا ہے، اب وہ اسی کے استری شدہ کپڑے پہنے لگا تھا۔ جب اس کے ہاتھ کی بنی چائے پی سکتا ہے کھانا کھا سکتا ہے تو کپڑے پہننے میں بھی کوئی حرج نہیں تھا۔

لیکن ایک بات اسے اب تک سمجھ نہیں آئی کہ اس لڑکی کو کیسے پتا چل جاتا ہے کہ وہ کس ٹائم بیدار ہوا ہے اور اسی وقت وہ شرٹ بستر پہ لا کر رکھ دیتی ہے یا پھر جب اس کے سر میں درد ہوتا ہے یا پھر چائے پینے کا موڈ ہوتا ہے تو بنا کہے وہ اس کے لیے چائے بنا کر لے آتی ہے حالانکہ اس نے روایتی شوہروں والا ایسا کوئی حکم بھی نہیں سنایا لیکن وہ خود بنا کہے اس کے سارے کام کرتی۔ وہ روایتی بیویوں والے سارے فرائض نبھا رہی تھی لیکن اس سب کے باوجود بھی وہ اسے قبول نہیں کر سکتا۔

اس میں وہ اعتماد اور وہ شعور ہی نہیں ہے جو اسے ایک بیوی میں چاہیے تھا۔ وہ خوبصورت ہے لیکن خوبصورتی ہی تو سب کچھ نہیں ہوا کرتی اور نہ ہی صرف خوبصورتی کے ساتھ پوری زندگی گزاری جاتی ہے۔

ہر انسان کی طرح اسے بھی حسن متاثر کرتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ایک انسان کو خوبصورت بنانے کے لیے صرف حسن ہی کافی ہو حسن کے علاوہ بھی کئی اور چیزیں انسان کو خوبصورت بناتی ہیں۔

کبھی کر کے وہ نیچے چلا گیا تب تک وہ ناشتا لگا چکی تھی ناشتا کر کے یونہی لان میں اخبار لے کر بیٹھ گیا چھٹی کا دن تھا اس لیے ذہن بالکل فریش تھا۔ ویسے اسے اخبار پڑھنے کی

عادت تو نہیں تھی لیکن یونہی ٹائم پاس کرنے کے انداز میں وہ اخبار کی ہیڈ لائنز پر نظریں دوڑانے لگا۔ چھٹی کے دن اس کی کوئی خاص مصروفیت نہیں ہوا کرتی وہ ہمیشہ چھٹی کا دن گھر پہ ہی گزارتا عام نوجوانوں کی طرح کوئی خاص دوستی بھی نہیں پالی تھی، اس نے اپنا سارا وقت سارے خواب اپنی ہونے والی جیون ساہی کے لیے سمیٹ رکھے تھے لیکن اس کے خواب ریزہ ریزہ ہو چکے تھے۔ دادی کے آنے میں بھی ایک ہفتہ باقی تھا۔

اچانک اخبار پڑھتے پڑھتے اسے احساس ہوا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے نگاہ اٹھا کر دائیں بائیں۔۔۔ دیکھا لیکن اسے کوئی نظر نہیں آیا وہ ایک بار پھر اخبار پڑھنے لگا لیکن کچھ لمحے بعد اسے پھر احساس ہوا جیسے کوئی اسے مسلسل دیکھ رہا ہے۔ اب کی بار اس نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر سامنے دیکھا تو اسے پتا چلا کہ وہ لڑکی کچن کی کھڑکی جو باہر لان کی طرف کھلتی ہے اس سے چپکے چپکے اسے دیکھ رہی ہے۔ وہ اس کی چوری پکڑ چکا تھا شاید اسی لیے وہ کھڑکی سے غائب ہو گئی تھی اسے کچھ عجیب سا لگا۔ دو دن پہلے جب صبح کے وقت وہ گہری نیند میں سو رہا تھا تو اچانک ایک آواز سے اس کی آنکھ کھلی تب اس نے اوڑھ رکھی چادر سے دیکھا وہ لڑکی ہاتھ باندھ کر اسے بڑے غور سے دیکھ رہی ہے۔ اسے حیرت کا جھٹکا لگا پھر وہ چادر کے اندر سے آنکھیں کھول کر اس لڑکی کو دیکھنے لگا جو مسلسل اسے دیکھے جا رہی تھی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ وہ بھی اسے دیکھ رہا ہے۔ اگر اسے پتا ہوتا تو وہ شاید گڑبڑا کر باہر نکل جاتی۔

اس صبح وہ کافی دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا اور آج ایک بار پھر وہ اسے مسلسل گھور رہی تھی۔ کیا وہ ہمیشہ اسے ایسے گھور کر دیکھتی ہے جب وہ چائے پی رہا ہوتا ہے یا وہ کھانا کھا رہا ہوتا ہے لیکن کیوں؟

وہ اپنے دماغ کی حالت سمجھنے سے قاصر تھا مگر اس نے خود میں نئی تبدیلی یہ محسوس کی کہ وہ اخبار بالکل بھی نہیں پڑھ پا رہا تھا پتا نہیں کیوں وہ پھر سے اپنی توجہ اخبار پہ نہیں مرکوز کر سکا۔

وہ انہی سوچوں میں الجھا بیٹھا تھا کہ وہ اس کے بالکل قریب آئی اس کے کپڑوں سے اٹھنے والی خوشبو وہ اپنے بالکل پاس محسوس کر سکتا تھا اور خوشبو بھی اتنی لگا کر آئی تھی جیسے نہا کر آئی ہو، خوشبو کے ساتھ ساتھ کپڑے بھی اس نے ہمیشہ سے بہتر پہن رکھے تھے۔ وہ چائے لائی تھی جو اس نے ٹیبل پہ رکھ



دی۔ اس نے بغور سنبل کی طرف دیکھا اسے لگا جیسے وہ اس سے کچھ کہنا چاہتی ہو۔

”کچھ چاہیے؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں وہ.....“ کہتے کہتے وہ اچانک خاموش ہو گئی تو اقبال نے چائے اٹھا کر پینا شروع کر دی لیکن سنبل ایک جن کی طرح اس کے سر پہ کھڑی تھی۔

”وہ جی ہم باہر چلیں۔“ وہ دل کی بات زبان تک لے ہی آئی۔

اقبال نے چائے واپس ٹیبل پر رکھ دی اور حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

”کہاں؟“

”جی وہ موسم اچھا ہے ہم نے سوچا باہر چلیں گے جیسے فلموں میں ہیرو ہیروین جاتے ہیں۔“ سنبل نے شرما کر اپنی لمبی چوٹی سے کھیلنے ہوئے کہا۔

”اوہو، کیسی کیسی خوش فہمیاں ہیں محترمہ کو، میں تو ہیرو لگتا ہی ہوں پتا نہیں خود کو کس فلم کی ہیروین سمجھ رہی ہے۔“ اس نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے سوچا۔

”نہیں میں ذرا مصروف ہوں۔“ اقبال نے رکھائی سے جواب دیا اور پھر لڑکی کا چہرہ بھجھتے ہوئے دیکھا۔ جہاں تھوڑی دیر پہلے خوشی کے رنگ نظر آرہے تھے وہاں اب اداسی تھی اس نے جان بوجھ کر نظریں چرائیں اور وہ بھاگتے ہوئے اندر چلی گئی۔ وہ جانتا تھا اب کچن میں کوئی کونا پکڑ کر رونے کا شوق پورا کریں گی محترمہ۔

اقبال کافی دیر تک وہیں لان میں بیٹھا رہا پھر اندر آ کر ٹی وی کھول کر بیٹھ گیا اور ساتھ ہی ساتھ ادھر ادھر بھی لگا ہوں دوڑانے لگا۔ اقبال جسے دیکھنا چاہتا تھا وہ کہیں نظر نہ آئی۔ کہاں گئی ہوگی؟ اس نے دل ہی دل میں سوچا پھر پانی پینے کا بہانہ کر کے وہ کچن میں چلا گیا، وہاں بھی وہ اسے نظر نہیں آئی۔ کچھ سوچ کر وہ اپنے کمرے میں گیا وہاں بھی نہیں تھی یونہی ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ ایک کمرے کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اندر سسکیوں کی آواز سن کر اس کے قدم رک گئے بے ساختہ وہ دروازے سے کان لگا کر سننے لگا۔ وہ خود کھامی کے انداز میں بول رہی تھی۔

”آپ ہمیشہ میرے ساتھ ایسا کیوں کرتے ہیں، آپ اتنی بڑی دنیا اتنی بڑی کائنات کے مالک ہیں، کیا آپ کی اتنی بڑی دنیا میں سے مجھے ایک چھوٹی خوشی بھی نہیں مل سکتی۔ آپ تو مالک ہیں ناں؟ آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ آپ تو سب پہ

اختیار رکھتے ہیں پھر میرے ساتھ ہی ایسا کیوں کر رہے ہیں وہ خدا سے شکوہ کر رہی تھی۔“ میں نے ساری زندگی آپ کی عبادت کی ہے۔ ہمیشہ نماز پڑھی ہے۔ روزے رکھے ہیں، تو ان کا آپ مجھے یہ اجر دے رہے ہیں۔ آپ مجھے میری نیکیوں کا صلہ دے دیں مجھے آپ سے جو چاہیے آپ مجھے وہ دیں بھلے ہی آخرت میں میرے لیے کوئی حصہ نہ رہیں لیکن اس وقت مجھے اپنے دروازے سے خالی ہاتھ مت لوٹائیں۔

وہ خدا سے اپنی نیکیوں کا اجر مانگ رہی تھی خدا کو اپنی عبادات جتا رہی تھی ایک چھوٹے بچے کی طرح اپنی دی ہوئی شے وہ واپس مانگ رہی تھی۔ یہ بھی بھول گئی۔ وہ خود ایک معمولی سی بندی ہے۔

انسان بھی کیا چیز ہے بڑے شوق سے عبادت کرتا ہے، نماز پڑھتا ہے، روزے رکھتا ہے اور ضرورت پڑنے پہ اپنی ہی عبادات کا حساب مانگنے پٹھ جاتا ہے، پتا نہیں وہ کیا مانگ رہی تھی۔ آخر ایسی کون سی چیز تھی جو وہ خدا سے اتنا گڑگڑا کر مانگ رہی تھی۔

اقبال دروازے سے ہٹ کر واپس صوفے پہ آ کر بیٹھ گیا تھا پتا نہیں کیوں اسے اس لڑکی کا رونا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اب اسے اپنے لہجے پہ پچھتاوا سا ہونے لگا۔

آخر کیوں نہیں اس نے اس کی بات مانی۔ کیا ہو جاتا اگر وہ اس کے ساتھ باہر چلا جاتا، ویسے بھی وہ کون سا اس کے جیون بھر کی ساتھی ہے۔ کچھ دنوں کے لیے ہی تو ہے اس گھر میں ایک بات تو وہ شروع سے اپنے ذہن میں بٹھا چکا تھا کہ وادی کے آتے ہی وہ ان کا لایا ہوا یہ تحفہ واپس کر دے گا، اس لیے ہمیشہ اسے دیکھ کر یہی سوچتا کہ وہ اس گھر میں مستقل طور پر نہیں ہے اور نہ ہی یہ وہ لڑکی ہے جس کے ساتھ وہ اپنی ساری زندگی گزار سکتا ہے لیکن اتنے عرصے میں پہلی بار یہ بات سوچتے ہوئے وہ کچھ عجیب احساسات سے دوچار ہوا۔ کچھ ایسے جذبات جنہیں وہ کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا۔ کبھی کبھی انسان کچھ اضطراب میں، ایک ٹینشن میں ہوتا ہے لیکن وہ اس ٹینشن کی وجہ نہیں سمجھ پاتا مگر آگے چل کر حالات اسے ہر بات سے آگاہ کر دیتے ہیں۔

سنبل اب بیٹھیاں اتر کر نیچے آ رہی تھی۔ اس نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا، جہاں کوئی آنسو کوئی پریشانی نظر نہیں آ رہی تھی مطلب وہ لڑکی اپنی کمزوری اس پہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”سنو!“ سنبل جب کچن کی طرف جانے لگی تو اس نے

آواز دے کر اسے روک دیا۔

”آج کھانا مت بنانا، ہم باہر جا کر کھانا کھائیں گے۔“

”جی ہم بھی؟“ اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

”ہاں ہم، مطلب ہم دونوں، اوکے؟“ وہ مسکرا دی۔

”اور ہاں کپڑے بھی اچھے پہن لینا۔ اگر اس طرح کے

کپڑوں میں جاؤ گی تو کبھی ہنس ہنس کر مذاق اڑائیں گے۔“

”جی!“ سنبل مسکراتے ہوئے کمرے میں چلی گئی۔

پتا نہیں کیوں لیکن اب اقبال بھی خود کو پرسکون محسوس کر رہا تھا وہ اپنی زندگی میں یہی تو چاہتا تھا لیکن اس طرح ہرگز نہیں۔

وہ اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر سڑک پہ پیدل چلنا چاہتا تھا، ہوٹلوں میں کھانا کھانا چاہتا تھا۔ اس نے تصور میں اپنے لیے ایک الگ ہی بیوی کی خواہش کی تھی لیکن اس قسم کی نہیں۔

وہ دونوں دو بچے ہی گھر سے روانہ ہو گئے تھے اور تین گھنٹے بعد لوٹے۔ وہ چونکہ تھک چکا تھا اس لیے تھوڑا آرام کرنے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆.....☆

اس دن سنبل اس کے کپڑے استری کرنے لگی تھی جب اچانک اسے یاد آیا کہ وہ دودھ کی دیکھی چولہے پہ رکھ آئی ہے۔ وہ اب اپنے ہی والا ہوگا۔ وہ بھاگتی ہوئی کچن میں گئی، چولہے کا بٹن بند کیا اور دودھ اتار کر سائینڈ پر رکھ دیا۔

اب وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کمرے تک آئی۔ کمرے میں اسے عجیب بدبو کا احساس ہوا۔ اس نے استری کی طرف دیکھا اور یہ دیکھ کر جیسے اس پہ آسمان گر گیا، وہ شرٹ جل چکی تھی۔

اس نے اپنے ماتھے پہ زور سے ہاتھ مارا۔

”یہ کیا کر دیا میں نے، یہ تو ان کی پسندیدہ شرٹ تھی۔ اب کیا ہوگا اللہ، اب تو وہ بہت غصہ کریں گے، کیا کہوں گی ان سے؟ کیسے بتاؤں گی، وہ تو پہلے بھی بہت ناراض رہتے ہیں۔

اب انہیں اس شرٹ کا پتا چلے گا تو وہ اور بھی ناراض ہوں گے۔“

وہ آفس سے واپس آ گیا لیکن وہ اسے شرٹ کے

بارے میں نہ بتا سکی، کھانے کے وقت بھی اس کی ہمت نہیں

ہوئی۔ رات سوتے وقت بھی وہ اسے بتانا چاہتا تھا لیکن ہمت

ہی نہیں پیدا کر پا رہی تھی۔

وہ اس کی عجیب، غیر معمولی تبدیلی کو نوٹ کر رہا تھا۔ پتا

نہیں کہاں گم تھی، کس ٹینشن میں تھی۔ جب سے وہ آفس سے

آیا ہے اسے کسی پریشانی میں مبتلا لگی۔ کھانے کے دوران بھی

خیبر پختونخوا کے ضلع ہری پور جیل میں سزائے موت کے ایک قیدی نے پشاور ہائی کورٹ میں درخواست دائر کی ہے کہ اسے قانون کی ڈگری حاصل کرنے کی اجازت دی جائے۔ قیدی سجاد 15 سال سے جیل میں قید ہیں اور دوران قید انہوں نے گریجویشن یعنی بی اے کے امتحان کے علاوہ ایم اے پولیٹیکل سائنس اور ایم اے انگلش بھی کیا ہے۔ جیل میں قیدیوں کی تعلیم حاصل کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن سزائے موت کے کسی قیدی کا جیل کے اندر گریجویشن اور ڈبل ایم اے کرنے کا یہ ایک منفرد واقعہ ہے۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے حکام کے مطابق جیل میں قید افراد میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق بڑھ رہا ہے اور ماضی کی نسبت اب زیادہ قیدی تعلیم حاصل کرنے کے لیے رابطے کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سجاد کے وکیل خورشید خان نے بتایا کہ ڈاکٹر سجاد قانون کی ڈگری یعنی ایل ایل بی کرنا چاہتے ہیں اس لیے عدالت سے درخواست کی گئی ہے کہ ان کے لیے خیبر پختونخواہ کے کسی لاء کالج میں داخلے کا بندوبست کیا جائے اور انہیں قانون کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دی جائے۔ درخواست کے مطابق پاکستان پرینز رولز کے رول نمبر 215 کے تحت قیدی قانون کی تعلیم یا ایل ایل بی کر سکتا ہے اس لیے ہائی کورٹ اسے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے۔

مرسلہ: اسما توحید۔ جڑانوالہ

اس نے جگ کے ساتھ گلاس نہیں رکھا اور چائے میں بھی چینی کی جگہ نمک ڈال کر آگئی اس نے تو اسے کچھ نہیں کہا لیکن وہ کچھ نیارین محسوس ضرور کر رہا تھا۔ لیکن وہ خود بتا نہیں رہی تھی اور وہ تو اس سے زندگی بھر نہیں پوچھتا۔

صبح جب وہ ناشتا کر کے آفس جانے لگا تو پیچھے سے آواز دے کر اس نے روک دیا۔

”پیچھے سے آواز دینا ضروری تھا محترمہ، اب بتاؤ کیا چاہیے؟“ اقبال نے کہا مگر وہ خاموش، نگاہیں جھکا کر کھڑی تھی۔ شاید کچھ بول ہی نہیں پا رہی تھی۔

”اب آپ کچھ بولیں گی یا میں بیٹھ کر آپ کے بولنے کا انتظار کروں، ویسے بھی مجھے آفس جانے میں تو بالکل بھی دیر

نہیں ہو رہی۔“ وہ طنز کے تیز چلا رہا تھا۔
 ”وہ جی میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔“
 اس نے ہونٹوں پہ زبان پھیر کر کہا۔
 ”جی، ہم وہی سننے کے لیے تو کھڑے ہیں محترمہ۔“
 ”وہ غلطی سے آپ کی شرٹ استری کرتے ہوئے جل گئی۔“ یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی
 اور اقبال پتا نہیں کیا کیا سوچ چکا تھا کل سے اور اب پتا
 نہیں وہ رو کیوں رہی تھی۔
 ”اوکے، اوکے، کوئی بات نہیں۔“
 ”لیکن وہ آپ کی پسندیدہ شرٹ تھی وہ نیلی والی۔“
 اقبال نے اس سے اپنی مسکراہٹ چھپائی۔ ”کہہ دیا
 ناں کوئی بات نہیں، اب یہ مگر مجھ کی طرح آنسو مت بہاؤ اسے
 اس کے آنسوؤں سے تکلیف ہونے لگی تھی وہ جانے کے لیے
 دروازے کی طرف مڑا پھر کچھ سوچ کر واپس اس کے پاس
 آیا۔
 ”تم تو آسانی سے یہ بات مجھ سے چھپا سکتی تھی، اتنی
 ساری شرٹس میں سے میں اپنی ہر شرٹ کا تو حساب نہیں رکھتا
 پھر تم نے اپنی غلطی کیوں بتائی۔“
 ”آپ سے جھوٹ بول سکتی ہوں خدا سے تو نہیں۔“
 ”وہ تو سب جانتا ہے، آپ سے جھوٹ بول کر میں بچ
 بھی جاؤں تو خدا سے کیسے جھوٹ بول سکتی ہوں؟ وہ تو سب
 جانتا ہے ناں۔“
 اسے حیرت کا جھٹکا لگا، پتا نہیں کیسی پاگل لڑکی تھی۔ ایسی
 لڑکیاں بھی دنیا میں ہوتی ہیں۔
 وہ سارا راستہ اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔

☆.....☆

اس رات وہ اپنے بستر پہ یونہی لیٹا تھا جب وہ اس کے
 کمرے میں آئی۔ اس کے ہاتھوں میں دودھ کا ایک گلاس تھا
 وہ ہمیشہ رات کو سونے سے پہلے اس کے لیے دودھ لانا نہیں
 بھولتی تھی وہ ایک مشرقی بیوی کے روپ میں بالکل پوری اترتی
 تھی۔ کبھی کبھی وہ اس لڑکی کو بالکل بھی سمجھ نہیں پاتا۔ وہ اس
 سے جتنی بدتمیزی سے بات کرتا یا کبھی کبھی غصے سے بات کرتا تو
 وہ جواباً خاموش ہو جاتی، دوسری بیویوں کی طرح لڑتی جھگڑتی
 بالکل بھی نہیں لڑتا تو دور وہ کبھی اپنی صفائی بھی پیش نہیں کرتی
 تھی۔

وہ اپنے دوستوں کی جب شکایتیں سنتا جو وہ اپنی اپنی
 بیویوں کے بارے میں کرتے تو حیران ہو جاتا کہ کون سی بیوی

صحیح قسم کی ہے وہ ایک ان پڑھ جاہل گاؤں کی لڑکی یا وہ پڑھی
 لکھی ماڈرن لڑکیاں، جو اپنے شوہروں پہ حکومت کرتی
 تھیں۔ نہ کھانا بنانا نہ بچوں کو سنبھالنا، ہر وقت میک اپ سے
 لدے رہنا، ہنس ہنس کے ہر مرد سے باتیں کرنا، اسے اس قسم
 کی عورتیں کچھ عجیب لگتیں لیکن وہ اپنی زندگی میں ایک بہت
 مختلف لڑکی دیکھ رہا تھا۔ ایک ایسی لڑکی جو اس نے آج تک کبھی
 نہیں دیکھی۔

ایک وہ بیویاں تھیں جو شوہروں کی ہر بات پہ اعتراض
 کرتی تھیں اور ایک یہ ہے اگر اس سے کہا جائے کہ رات سفید
 ہے تو یہ اپنے شوہر کی ہاں میں ہی ہاں ملائے گی۔ یہ لڑکی تو
 اپنے شوہر کو مجازی خدا سمجھتی تھی ہر بات ماننے والی ہر کام کرنے
 والی۔

ایک بار اس کے آفس کے ایک دوست نے اس سے
 پوچھا تھا، اسے کس قسم کی بیوی چاہیے۔ وہ کوئی جواب نہیں
 دے سکا۔ اسے اب تک نہیں معلوم تھا کہ بیویوں کی بھی اقسام
 ہوتی ہیں۔

اس نے دودھ کا گلاس اس کے ہاتھوں میں تھا دیا۔ وہ
 دودھ پیتے ہوئے اسے مسلسل اپنی نگاہوں کے حصار میں لیے
 ہوئے تھا اور وہ نگاہیں جھکائے کھڑی تھی۔ کتنی عجیب لڑکی تھی۔
 کسی اور تو کیا، شوہر سے نگاہیں ملاتے ہوئے بھی شرماتی تھی۔
 وہ پہلی بار اس کی اس اداسے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

اس لڑکی کے ساتھ رہتے ہوئے اسے تیس دن ہو چکے
 تھے اور ان تیس دنوں میں اس نے نوٹ کیا کہ وہ لڑکی جھوٹ
 کبھی نہیں بولتی، یا مقصد بنا مطلب کوئی بات نہیں کرتی، نماز
 پابندی سے ادا کرتی اور کئی بار اس نے صبح اسے قرآن پاک

کی تلاوت کرتے بھی سنا۔

وہ اب نیچے فرش پہ اپنا بستر ڈال کر سو رہی تھی۔ اس نے
 کبھی نہیں کہا کہ میرا حق ادا کرو۔ بیڈ پہ سونا میرا حق ہے۔ وہ
 ہمیشہ رات کو سونے سے پہلے کوئی نہ کوئی عجیب سا ٹاپک پکڑ کر
 اس پہ سوالات کرتی تھی اور وہ بس ہول ہاں میں یا کبھی کبھی تو
 اسے غصے سے بھی جھڑک دیتا تھا مگر وہ کبھی اس کے غصے پہ
 ناراض نہیں ہوتی تھی، کوئی شکوہ نہیں کرتی تھی۔

لیکن آج وہ خاموشی سے سونے کے لیے لیٹ گئی
 تھی۔ اسے ہمیشہ رات کو اس لڑکی کی باتیں بہت بری لگتیں
 لیکن عجیب بات تو یہ تھی کہ اگر وہ لڑکی بات نہ کرتی تو وہ ابھرنے کا
 شکار ہو جاتا۔

اور آج بھی جب وہ بنا کوئی بات کیے سو رہی تھی تو اسے
 ایک عجیب کرب کا احساس ہوا۔
 ”سو رہی ہو تم؟“ پہلی بار اس نے خود سے اسے مخاطب
 کیا

”جی، کچھ چاہیے تھا آپ کو؟“ وہ ایک دم جاق و چوبند
 ہو کر کھڑی ہو گئی وہ اس طرح جلد بازی میں اس کے کھڑے
 ہونے پہ ہنس دیا۔

”نہیں وہ..... یہ تم ہمیشہ یہی کہڑے ہی کیوں پہنتی
 ہو؟“ اس نے بات شروع کرنے کے لیے یہ عجیب و غریب
 سوال کیا۔ اس نے غور سے اپنے کپڑوں کو دیکھا جو سادہ لان
 کے کپڑے تھے۔

”جی وہ باقی میلے تھے اس لیے۔“ اس نے حیران ہو کر
 جواب دیا۔

”کتنے جوڑے ہیں تمہارے۔“
 ”جی پانچ۔“ اس نے سادگی سے جواب دیا جبکہ وہ
 حیران ہوا جس لڑکی کا شوہر لاکھوں کے حساب سے تنخواہ لیتا ہو
 اس کی بیوی کے پاس صرف پانچ سادہ لان کے کپڑے ہیں یہ
 بات اسے بہت عجیب لگی۔ اس کے خود ڈھیروں کپڑے تھے
 اور اس نے بھی کبھی کچھ نہیں مانگا۔

”کیوں نہیں مانگا، اسے مانگنا چاہیے تھا۔ یہ اس کا حق
 تھا۔ وہ اس کا شو.....“

”تم نے پہلے کیوں نہیں پتایا؟“ وہ دکھ سے پوچھ رہا تھا
 جبکہ سنبل نظریں جھکائے ہوئے تھی جیسے اس نے بہت بڑی
 غلطی کر دی ہو۔

”اچھا ٹھیک ہے، ہم کل چلیں گے شاپنگ پہ، پھر لے
 لینا اپنے لیے کپڑے اور بھی تمہیں جو کچھ چاہیے وہ بھی او
 کے۔“

”جی۔“

”اچھا اب سو جاؤ۔“
 وہ سونے کے لیے لیٹ گئی اس نے لیپ آف کر دیا۔
 اب اسے بھی اچھی نیند آئی، وہ سابقہ تجربات سے یہ نتیجہ اخذ کر
 چکا تھا کہ جب بھی وہ لڑکی اس سے بات نہیں کرتی اسے نیند
 بڑی دیر سے آتی ہے۔

رات تقریباً گزر چکی تھی دور سے کہیں مٹوؤں کی آواز آ
 رہی تھی۔ اس نے سوتے سوتے محسوس کیا کہ کوئی اس کے
 ماتھے پہ ہاتھ رکھے ہوئے ہے۔ اقبال چونک کر اٹھ گیا۔ وہ اس
 کے بالکل پاس کھڑی تھی۔ اسے اٹھتا دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔

اسے اتنی صبح اس کا چھوٹا بہت برا لگا۔ غصے کی شدید
 لہر اس کے جسم میں پیدا ہو گئی پورا جسم جیسے جلنے لگا ہو، وہ کبل کو
 پرے دھکیل کر بالکل اس کے برابر کھڑا ہو گیا۔ وہ سسکی ہوئی
 نگاہیں نیچے جھکا کر کھڑی تھی۔ اس کے دل میں اس وقت آگ
 لگی ہوئی تھی اسے نہیں پتا تھا کہ اسے اتنا غصہ کیوں آرہا ہے
 لیکن وہ مزید اپنے غصے پہ قابو نہیں رکھ سکا۔

”تمہاری اہمیت کیسے ہوئی مجھے ہاتھ لگانے کی کیا سمجھتی ہو
 تم خود کو اور کیا سوچ کر تم نے مجھے ہاتھ لگایا۔ میں نے تمہیں
 بتایا تھا ناں میں تمہیں بیوی کا درجہ کبھی نہیں دے سکتا تو زبردستی
 میری زندگی میں گھسنے کی کوشش مت کرو، اوکے۔ نہ تو میں
 تمہیں کبھی قبول کر سکتا ہوں اور نہ کبھی کروں گا۔ اس لیے یہ
 روایتی بیویوں والی حرکتیں کرنا بند کر دو۔“

”وہ چلا چلا کر بات کر رہا تھا، اندر کے لاوا کو باہر آنے
 کا راستہ مل چکا تھا۔ اس کا پارہ ایک دم چڑھ چکا تھا۔ وہ بدستور
 سر جھکائے کھڑی تھی، اس نے محسوس کیا اس کی آنکھوں سے
 آنسو گر رہے ہیں۔“

”گیٹ آؤٹ۔“ اس نے چلا کر کہا پھر اسے یاد آیا تھا
 وہ جاہل منور لڑکی انگلش نہیں سمجھ سکتی اس لیے اس نے اس کا
 ہاتھ پکڑ کر اسے زبردستی اپنے کمرے سے باہر نکالا اور کنڈی لگا
 کر بیڈ پہ بیٹھ گیا۔

اس کا خون کھولنے لگا تھا۔ کافی دیر بعد وہ جب خود کو
 نارمل کرنے میں تھوڑا کامیاب ہوا تو دوبارہ بستر پہ لیٹ گیا پھر
 جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

چھٹی کا دن تھا اس لیے اسے بیدار ہونے کی کوئی جلدی
 نہیں تھی لیکن دس بجے آلازم نے اپنے ہونے کا احساس دلایا۔
 وہ اٹھ کر واش روم میں گھس گیا۔ سر میں ہلکے درد کا بھی احساس
 ہوا، صبح چھ بجے والا واقعہ ابھی بھی ذہن میں تازہ تھا۔

وہ نہا کر جب باہر نکلا تو ٹھنک گیا۔ اس کی شرٹ بیڈ پہ
 آج نہیں تھی ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ وہ نہا کر نکلا ہو اور بیڈ پہ
 شرٹ نہ ہو، اسے کچھ عجیب لگا اس نے الماری سے ایک شرٹ
 نکال کر پہن لی اور ناشتے کے لیے نیچے چلا گیا۔ ناشتے کے
 دوران دوسری حیرت اسے تب ہوئی جب اسے ٹیبل پہ ناشتا
 نظر نہیں آیا یہ بھی پہلی مرتبہ ہوا تھا اور نہ وہ ہمیشہ اس کے جاگتے
 ہی میز پہ ناشتا بچا دیا کرتی تھی۔

تو اس کا مطلب وہ ناراض ہے، اس نے سوچا۔
 ”ناراض ہے تو ہوتی رہے ناراض..... میں نے کیا کیا
 ہے۔“

”تو نے اچھا بھی تو نہیں کیا، کتنی بری طرح سے پیش آئے اس سے..... دل سے آواز آئی۔“
وہ کچن میں چلا گیا اور خود اپنے لیے ناشتا بنانے لگا پھر اسے ایک دم محسوس ہوا کہ ناشتا بنانے میں اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے، اتنے دنوں سے وہ اس کے ہاتھوں کا بنا ناشتا کھا رہا تھا، خود کھانا بنانے کی تو اس کی عادت ہی چھوٹ گئی۔ وہ بنا ناشتا بنائے کچن سے باہر نکل آیا۔
وہ یونہی صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ ایک سوچ جو پہلی بار اس کے ذہن میں آئی۔

وہ کہاں ہے؟ یہ سوچ کر وہ کھڑا ہو گیا اور گھر کے کمروں میں اسے تلاش کرنے لگا لیکن وہ اسے کہیں نہیں ملی۔ اس کی ٹینشن میں مزید اضافہ ہوا، وہ ایسے تڑپنے لگا جیسے پھلی کو پانی سے باہر نکال دیا جائے۔
کہاں چلی گئی؟

وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے سوچ رہا تھا۔
جہاں چلی گئی چلی گئی اس سے اسے کیا، وہ بھی کہاں اسے اس گھر میں چاہتا تھا، اچھا ہوا خود چلی گئی ویسے بھی کسی نہ کسی دن تو اسے جانا ہی تھا ناں؟

وہ ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ سنبھل چلی جائے لیکن آج جب وہ چلی گئی تو اقبال اس طرح پریشان کیوں تھا، وہ خوش کیوں نہیں تھا جبکہ اصولاً تو اسے بہت زیادہ خوش ہو جانا چاہیے تھا۔
کیا وہ اس لیے پریشان ہے کہ جب دادی واپس آئیں گی تو وہ اسے کیا جواب دے گا۔

نہیں نہیں دل سے فوراً آواز آئی۔ وہ دادی کے لیے نہیں خود اپنے لیے پریشان تھا مگر کیوں اس نے دل سے پوچھا؟

کیونکہ تم اس سے پیار کرنے لگے ہو، دل نے ایک عجیب انکشاف کر دیا۔ وہ گم سم ہو گیا۔ یہ کیا کہہ رہا تھا دل، وہ اس سے پیار کیسے کر سکتا ہے وہ تو اس سے نفرت کرتا ہے شدید نفرت، نہیں دل جھوٹ بول رہا ہے۔
اس نے دل کو جھٹلانے کی کوشش کی مگر وہ ایسا نہیں کر سکا کیونکہ دل جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔

ہاں ہاں میں اس سے پیار کرتا ہوں، بہت پیار مجھے صرف اس کی عادت نہیں ہو گئی۔ میں اس سے پیار بھی کرنے لگا ہوں مگر وہ کہاں ہے؟ اس نے چلا چلا کر پورے گھر سے پوچھا اور پورا گھر خاموش تھا۔ اسے زندگی میں پہلی بار گھر میں اکیلے پن کا احساس ہوا۔ اسے پہلی بار گھر کی خاموشی ڈر رہی تھی۔

اس پہ پہلی بار انکشاف ہوا وہ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ وہ جسے اس کی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتا تھا وہ یہی لڑکی تھی۔ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی اس سے پیاری تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ اتنی معصوم اتنی سچی اسے جیون ساتھی کے روپ میں صرف یہی لڑکی چاہیے تھی اور تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی اس جیسی لڑکی دنیا میں کہیں نہیں ہے جو اس کے اتنے غصے کے باوجود خاموش رہے، جو اس کے جاگتے ہی ناشتا لگا دے۔ اس کے ماتحت سے پہلے اسے چائے پلا دے اتنی صبر اتنی قناعت والی لڑکی اور کہاں ہوگی واقعی اگر دادی اس پہ بھروسہ کرتیں تھیں تو بالکل سہی کرتیں تھیں۔ وہ واقعی اپنے پوتے کے لیے سب سے اچھی بیوی ڈھونڈ لائی تھیں اگر وہ خود ان کی مرضی کے خلاف کسی ماڈرن لڑکی سے شادی کرتا تو کیا ہو جاتا۔ وہ لڑکی کیا گھر کے کام کرتی۔ کیا اس میں اتنا صبر ہوتا؟ کیا وہ اس کے اس طرح چلانے پہ خاموش ہوتی نہیں نہیں نہیں۔ وہ پہلی بار اس کی کہی ہوئی ساری باتیں یاد کر رہا تھا۔
کیا جی بیوی پارلر؟ یہ کیا ہوتا ہے؟
یہی وی کرنت تو نہیں مارتا جی؟

ہمارے گاؤں میں پہلے مرد کھانا کھاتے ہیں پھر عورت اس کا بچا ہوا کھاتی ہے۔

آپ کو گاڑی چلانا آتا ہے جی؟
یا اللہ مجھے اپنے گھر سے خالی ہاتھ مت لوٹائیں۔ میں آپ سے جو مانگ رہی ہوں وہ مجھے دے دیں۔

جی آپ کی وہ نیلی شرٹ جل گئی۔
آپ سے جھوٹ بول سکتی ہوں خدا سے تو نہیں۔

وہ تو سب جانتا ہے آپ سے جھوٹ بول کر میں بچ بھی جاؤں تو خدا سے کیسے جھوٹ بول سکتی ہوں۔

ادو میرے اللہ یہ میں نے کیا کر دیا، کیوں کر دیا۔ میں نے اس سے کتنی بدتمیزی سے بات کی، صبح مجھے کیوں اتنا غصہ آ گیا تھا حالانکہ اس نے ایسا بھی کچھ غلط نہیں کیا تھا۔ صرف ہاتھ ہی تو لگایا تھا اور میں.....

اور وہ اتنی اچھی تھی کہ اس نے کوئی شکوہ کوئی شکایت تک نہیں کی لیکن وہ کہاں چلی گئی۔

پلیز واپس آ جاؤ میں تمہیں پھر کچھ نہیں کہوں گا، ہم دونوں مل کر پیار محبت سے رہیں گے۔ میں تمہارے بنا نہیں رہ سکتا لوٹ آؤ..... اسے اپنے گالوں پہ نمی کا احساس ہوا۔ وہ بھاگتے ہوئے پورچ میں گیا اور گاڑی میں بیٹھ کر ریلوے

اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔

گاڑی وہ فل اسپید سے چلا رہا تھا۔ اتنے رش میں اتنے اسپید سے گاڑی چلانا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن وہ ہر خطرے سے انجان بس جلدی جلدی ریلوے اسٹیشن پہنچ جانا چاہتا تھا۔ کئی بار اس کی گاڑی دوسری گاڑیوں سے ٹکراتے ٹکراتے پکی بھی وہ ریلوے اسٹیشن کے بالکل پاس پہنچ چکا تھا۔ گاڑی سے نکل کر وہ بھاگتے ہوئے اسٹیشن تک گیا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا یا تو ابھی تک ریل گاڑی آئی ہی نہیں ہوگی یا پھر آ کر.....

وہ بھاگ کر بیٹھنے لگا اسے بیٹھنے اس انسان تک گیا جو پتا نہیں کن خیالوں میں گم تھا۔
ایلسکوز می، جناب یہ ریل گاڑی کی ٹائمنگ کیا ہے۔

اس آدمی نے حواس باختہ مخاطب کو دیکھا۔
ابھی تھوڑی دیر پہلے ریل گاڑی تو نکل چکی ہے۔ اسے لگا جیسے وہ آدمی کہہ رہا ہو آپ کی تو جان نکل چکی ہے۔ اس کے جسم میں خون کی گردش اچانک رک گئی۔ وہ مایوس ساری دنیا سے بیزار گھر لوٹ آیا اور صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

ایسے کیسے جا سکتی ہے وہ؟
مجھے چھوڑ کر وہ نہیں جا سکتی۔

اتنی معمولی غلطی کی اتنی بڑی سزا کون دیتا ہے۔
کیا سب کچھ ختم ہو گیا اب کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا کیا۔

وہ مرتھامے صوفے پہ بیٹھا تھا جب اسے اپنے بالکل پاس ہی کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا تو اوپر کی سانس اور پر اور پینے کی سانس نیچے رہ گئی۔ وہ اس کے بالکل پاس کھڑی تھی، اس سے کچھ ہی فاصلے پر وہ چوک کر کھڑا ہو گیا۔

”تم کہاں چلی گئی تھیں کیوں گئی تھیں تم؟“
”جی وہ ہم تو..... ہم تو یہیں تھے۔“ اس نے اس کی بات نہیں سنی اور آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا وہ اس طرح اس کے گلے لگانے سے حیران بھی تھی اور خوش بھی۔

اب آئندہ تم کبھی مجھے چھوڑ کر مت جانا اوکے چاہے میں تمہیں جتنا ڈانٹوں، ہم سب کچھ پھر سے شروع کریں گے۔

تم ایک بار پھر سے دلہن بنو گی اور اس بار تمہیں کمرے سے باہر نکلنے کی بجائے باموں میں سمیٹ لوں گا۔

خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
وہ صبح اس کے منہ سے نکلنے والے شعلے سن کر تو ٹوٹ ہی

گئی تھی۔ اسے لگا اب اس کی زندگی کا تو کوئی مقصد ہی باقی نہیں رہا سب کچھ ختم ہو گیا۔

وہ کمرے سے نکل کر اس کے برابر والے کمرے میں جا کر روتی رہی اور روتے روتے وہ کب سو گئی اسے پتا ہی نہیں چلا اس کی آنکھ تب کھلی جب کوئی اسے پکار رہا ہے وہ بھاگ کر کھڑکی تک گئی تو اس کے شوہر محترم جوج آگ برسا رہے تھے اب بڑی بے تابی سے اپنی زوجہ محترمہ کو ڈھونڈ رہے تھے اسے حیرت بھی ہوئی اور اچھا بھی لگا۔ وہ بہت دیر تک کھڑکی سے اس کی اداس شکل دیکھتی رہی پھر اس نے چلا چلا کر اپنی محبت کا اظہار کیا۔ ان دیواروں کے سامنے اس گھر کے اندر لیکن وہ نہیں جانتا تھا جس کے لیے وہ اقرار کر رہا ہے وہ اس کے بہت قریب ہے۔

وہ جانتی تھی کہ وہ اس سے پیار کرنے لگا ہے۔ وہ کئی بار اس کے چہرے پہ اپنے لیے محبت کا پیغام پڑھ چکی تھی لیکن وہ اقرار نہیں کر رہا تھا کیونکہ ابھی تک خود اس کے دل نے ہی اقرار نہیں کیا تھا۔

رات کو دو بجے اٹھ کر بریانی کھائی جاتی ہے جناب چوری چوری قیمہ اپنی پلیٹ میں ڈال کر کھانے لگتے ہیں گاڑی میں بیٹھ کر چپکے چپکے اسے دیکھا جاتا ہے صرف اقرار کرنے میں ہی مشکل پیش آرہی تھی جناب کو..... اس کے منہ سے اپنے لیے محبت کا اقرار سن کر اسے بہت اچھا لگا۔

وہ اس وقت اس کے پاس جانا چاہتی تھی اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ اس کے قریب ہے لیکن وہ نہیں گئی وہ اسے تنگ کرنا چاہتی تھی جس شوہر محترم نے اسے اتنے دن تنگ کیا وہ بھی اپنا بدلہ وصول کرنا چاہتی تھی۔

صبح وہ اس سے ناراض تھی روئی تھی لیکن اگر آج کی صبح وہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا تو وہ کبھی اپنی محبت کا اقرار نہ کرتا یہ تقدیر کا تب کا فیصلہ تھا جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہی ہوتا ہے بے شک کوئی ہے جو ہماری ہر سوچ پہ اختیار رکھتا ہے اور ہمارے لیے بہتر فیصلے تجویز کرتا ہے وہی جو اس پوری کائنات کو چلا رہا ہے یہ ساری دنیا جس کے ماتحت ہے وہی تو خدا ہے۔

اس نے تشکر آمیز نگاہوں سے اوپر آسمان کی طرف دیکھا بے شک جوڑے وہی بناتا ہے آسمانوں پر وہ اپنے انسانوں میں کبھی فرق نہیں کرتا نہ دیہاتی اور شہری میں اور نہ ہی غریب اور امیر میں وہ سب کو دو آنکھیں دو کان دو ہاتھ اور دو پاؤں نواز کر بھیجتا ہے فرق تو صرف انسان کرتے ہیں۔

اور سہمی ہوئی عورت نے لے لی تھی، ہنستا اور قہقہے لگانا تو دور کی بات اس کے چہرے سے مسکراہٹ ہی غائب ہو چکی تھی۔

نیلیم کے ساتھ بھائی کا ناروا سلوک دیکھ کر امی نے بھی اپنا رنگ بدل لیا۔ حالانکہ وہ بڑے چاؤ سے اسے بیاہ کر لائی تھی لیکن کچھ ہی عرصہ بعد وہ بھی روایتی ساس بن گئیں۔

نظارہ ان کا رویہ مشفقانہ تھا لیکن اندر ہی اندر وہ بھی نیلیم کو کچھ کے دیا کرتیں۔ پہلے امی خود کھانا بناتی تھیں اور اوپر کے کاموں کے لیے ماسی رکھی ہوئی تھی۔ نیلیم کے آنے کے بعد انہوں نے کھانا پکانے کی ذمہ داری اسے سونپ دی اور خود فارغ ہو گئیں۔ اس کے بعد انہوں نے ماسی کے کام میں کثیرے نکالنا شروع کر دیے جس کے نتیجے میں وہ کام چھوڑ کر چلی گئی۔ دوسری ماسی آگئی لیکن وہ بھی زیادہ دیر نہ رک سکی پھر یہ سلسلہ چل نکلا جو بھی ماسی آئی۔ وہ امی کے ناقابل برداشت رویہ سے گھبرا کر چند ہفتوں یا مہینوں میں چلی جاتی اور اس کے حصے کا کام بھی نیلیم کو ہی کرنا پڑتا۔

نیلیم کی حالت نوکرائیوں سے بھی بدتر تھی۔ گھریلو ملازمہ کے مخصوص اوقات کار ہوتے ہیں اور وہ ہفتہ میں ایک چھٹی بھی کرتی ہے لیکن نیلیم کو ایسی کوئی سہولت میسر نہیں تھی۔ اس کی ڈیوٹی فجر کی نماز کے بعد شروع ہوتی اور وہ رات گئے گھر کے کاموں میں جتی رہتی۔ صبح کے دو گھنٹے شوہر کی ناز برداری میں گزر جاتے۔ بھائی کو اتنی توفیق بھی نہیں تھی کہ الماری سے اپنے پہننے کے لیے کپڑے ہی نکال لیں۔ بستر پر لیٹے لیٹے حکم چلاتے۔ ”فلاں کپڑے استری کر دو۔“ پھر وہ ان کے جوتے پالش کرتی اور جب وہ نہانے چلے جاتے تو کچن میں آکر ناشتا تیار کرتی۔ اس دوران بھی اسے بار بار آوازیں پڑتیں۔ ”میرا بٹوہ کہاں ہے؟ چشمہ نہیں مل رہا۔ کہاں چلی گئی؟ وغیرہ وغیرہ۔ نیلیم کا ایک پاؤں کچن تو دوسرا کمر میں ہوتا۔ ساتھ ساتھ اسے جھڑکیاں بھی پڑتی رہتیں۔ بھائی کی شکایتیں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔ کبھی استری ٹھیک نہ ہونے کی شکایت تو کبھی چائے ٹھنڈی ہونے کی۔ بھائی کو تو بس ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا بہانہ چاہیے تھا اور نیلیم بے چاری سر جھکائے یہ سب سہتی رہتی۔ اس کی آنکھوں میں می تیرتی رہتی اور ایک ہی سوال مچلتا جیسے کہہ رہی ہو۔ مجھے کس جرم کی سزا مل رہی ہے اگر نورین سے تمہاری شادی نہیں ہوئی تو اس میں میرا کیا قصور۔ میں یا میرے گھر والوں نے تو تمہیں اس شادی پر مجبور نہیں کیا تھا۔ لیکن وہ یہ سب باتیں زبان سے نہیں کہہ سکتی تھی ورنہ اس کی شامت آ جاتی، بس دل

ہی دل میں گھنٹی رہتی۔

نیلیم اس گھر میں عملاً ایک قیدی بن کر رہ گئی تھی۔ اسے کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ بھائی کو تو کبھی اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ وہ اسے اپنے ساتھ کہیں لے جاتے۔ یہاں تک کہ اس کا میکے جانا بھی امی کو ناگوار گزرتا۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ شادی کے بعد ایک مرتبہ بھی دو چار دن کے لیے اپنے ماں باپ کے گھر گئی ہو۔ وہ ہفتہ دو ہفتہ بعد اپنے سارے کام نمٹا کر دوپہر میں جاتی اور شام کو بھائی اسے اپنے ساتھ واپس لے آتے، اس پر بھی امی کا منہ بن جاتا۔

کبھی کبھی میں سوچتا کہ نیلیم کو اس حال تک پہنچانے کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ اگر میں ہمت کر کے امی سے کہہ دیتا کہ نیلیم کی شادی مجھ سے ہوگی کیونکہ میں اسے چاہتا ہوں تو اس کی زندگی بر باد ہونے سے بچ جاتی لیکن اس کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ امی بھی نہ مانتیں بلکہ الٹا مجھے ہی برا بھلا کہا جاتا اور بھائی کے دل میں بھی میری طرف سے شک پڑ جاتا۔ بہر حال جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ نیلیم کی قسمت میں یہی لکھا تھا اور وہ اپنے حصے کی سزا بھگت رہی تھی۔

میں اس کی حالت دیکھ کر دل ہی دل میں کراہتا لیکن اس کے لیے دعا کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا لیکن نیلیم کے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے اور سونے پر سہاگا یہ ہوا کہ بھائی نے دیر سے گھر آنا شروع کر دیا جس کا ایک ہی مطلب تھا اور وہ یہ کہ بھائی دفتر کا وقت ختم ہونے کے بعد کہیں اور جانے لگے ہیں۔ مجھے ان کے مالی حالات کا علم تھا۔ وہ کوئی تفریح افروز نہیں کر سکتے اور نہ ہی ان کا کوئی ایسا قریبی دوست تھا جس کے ساتھ وہ رات کو دیر تک گھومتے رہتے۔ بس ایک ہی بات سمجھ میں آرہی تھی کہ وہ کسی دوسری عورت کے چکر میں پھنس گئے ہیں اور شام کا بیشتر وقت اسی کے ساتھ گزارتے ہیں اور شاید نیلیم بھی یہی سمجھ رہی تھی۔

عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے لیکن اپنی زندگی میں کسی دوسری عورت کا وجود اسے گوارہ نہیں۔ شاید اسی لیے اس کے چہرے کی سنجیدگی میں اضافہ ہو گیا تھا اور وہ پہلے سے زیادہ اداس اور غمگین نظر آنے لگی تھی۔

نیلیم کے کمرے کی لائٹ ابھی تک جل رہی تھی۔ میں پانی پینے کے ارادہ سے باہر آیا تو مجھے اس کے کمرے سے کسی کے بولنے کی آواز آرہی تھی اور دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ میں فریج کی طرف بڑھنے لگا کہ نیلیم کی آواز نے میرے قدم روک لیے وہ کہہ رہی تھی۔

”کھانا لگاؤں؟“

”نہیں۔“ بھائی کی کرخت آواز گونجی۔

”اچھا۔“ اس نے باپوسی سے کہا۔ ”میں نے تو آپ کے انتظار میں ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔“

”بہت احسان کیا مجھ پر۔“ بھائی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”مجھے یہ چونچلے پسند نہیں تم کھانا کھالیا کرو۔“

”آج تو بہت دیر کر دی آپ نے؟“ نیلیم نے خالص بیویوں والے انداز میں کہا۔

”ذلیل عورت مجھ سے سوال جواب کرتی ہے۔“ بھائی نے اس کے بال پکڑتے ہوئے کہا۔ ”آئندہ اگر ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو زبان پھینچ لوں گا۔“

نیلیم روتے ہوئے بولی۔ ”آپ مجھ سے اس طرح کیوں پیش آتے ہیں۔ آخر میرا قصور کیا ہے؟“

”مجھے مجھ پر مسلط کیا گیا ہے اور یہی تیرا سب سے بڑا جرم ہے۔ جس کی سزا ساری عمر بھگتنا ہوگی۔ میں تجھے بھی اپنی بیوی تسلیم نہیں کر سکتا۔“

یہ سن کر میرا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔ ایک عورت کے لیے اس سے بڑی سزا کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا شوہر اسے بیوی ماننے سے انکار کر دے۔ جی میں آیا کہ اسی وقت بھائی سے جا کر کہوں کہ وہ نیلیم کو آزاد کر دیں۔ میں اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن یہ کوئی فلمی چجویشن نہیں بلکہ حقیقی زندگی کا منظر تھا۔ اگر میں ایسی بات منہ سے نکالتا تو قیامت برپا ہو جاتی۔ صرف بھائی ہی میرا دشمن نہ بنتا بلکہ نیلیم کی زندگی بھی عذاب ہو جاتی۔

میری نیند غائب ہو چکی تھی۔ وہ رات میں نے کروٹیں بدلتے اور نیلیم کے بارے میں سوچتے ہوئے گزار دی۔ میرے ذہن کی سوئی ایک ہی نکتے پر آن کرانک گئی تھی کہ بھائی کسی عورت کے چکر میں پھنس گئے ہیں اور ان کے دیر سے گھر آنے کی یہی وجہ ہے۔ میرے لیے یہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ صحافی کسی جاسوس سے کم نہیں ہوتے اور خاص طور پر کسی رپورٹر کے لیے معلومات حاصل کرنا تو بہت ہی آسان ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر واقعی یہ کسی عورت کا معاملہ ہے تو میں اس کا کھوج لگا کر ہی دم لوں گا۔

دوسرے دن میں نے ایڈیٹر سے درخواست کر کے دوبارہ رپورٹر کی ڈیوٹی سنبھال لی وہ خود بھی یہی چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ رپورٹر کے کام میں سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ میں دفتر جانے کی پابندی سے

آزاد ہو گیا۔ اس طرح میں باہر رہ کر بھائی کی نقل و حرکت پر نظر رکھ سکتا تھا۔

بھائی وقت مقررہ بر دفتر سے نکلے اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چل دیے۔ میں نے بھی کچھ فاصلہ رکھ کر ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ میں نے چونکہ ہیلمٹ پہن رکھا تھا اس لیے وہ بیک مرر میں میری شکل نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ان کی گاڑی کا رخ گھر کی طرف نہیں بلکہ وہ کہیں اور جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ان کی کار گشتن اقبال میں واقع ایک مکان کے گیٹ پر رکی۔ ہارن دینے پر ایک لڑکی باہر آئی اور ان کی گاڑی میں بیٹھ گئی میرا پہلا شبہ درست ثابت ہوا۔ وہ واقعی کسی عورت کے چکر میں تھے۔

اب ان کی کار کا رخ سی وی کی طرف تھا۔ وہاں پہنچ کر بھائی نے گاڑی ایک کنارے کھڑی کی اور وہ دونوں کار سے باہر آ گئے۔ میں بھی ان کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ میں نے ذرا قریب سے اس لڑکی کو دیکھا۔ وہ خاصی قبول صورت تھی لیکن نیلیم سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ نیلیم اس سے کہیں زیادہ پرکشش اور حسین تھی۔ اس لڑکی نے جدید فیشن کا لباس پہن رکھا تھا اور گہرے میک اپ سے اپنے آپ کو سنوارنے کی کوشش کی تھی، بھائی اس کی ایک ایک ادا پر فدا ہو رہے تھے اور وہ بھی کسی نئی نویلی دہن کی طرح خنجرے دکھا رہی تھی۔ انہوں نے ایک جگہ رک کر کولڈ ڈرنک اور اسٹیکس لیے اور ساحل پر چہل قدمی کرنے لگے۔ میں نے انتہائی محتاط طریقہ اختیار کرتے ہوئے اپنے موبائل سے ان کی کچھ تصویریں بنا لیں جن میں اس لڑکی کی سولو پکچرز بھی تھیں۔

تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے سی وی پر گزارنے کے بعد وہ دونوں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ میں نے بھی تعاقب جاری رکھا۔ میں دیکھتا جا رہا تھا کہ بھائی اس لڑکی کو گھر چھوڑنے جاتے ہیں یا اس کے ساتھ مزید کچھ وقت گزارنے کا ارادہ ہے۔ تھوڑی دیر بعد ان کی گاڑی ایک ریسٹوران کے سامنے رکی اور وہ دونوں اندر چلے گئے۔ مجھے یہ یقین تھا کہ جب تک وہ مجھے نزدیک سے نہیں دیکھیں گے پہچان نہیں سکیں گے۔ کیونکہ میں نے ایک دوست کا دیا تھا استعمال کر لیا تھا۔ صبح صبح وہ مجھے اجرک اور ٹوپی دے گیا تھا۔ بانیٹ سے اترتے ہی میں نے سر پر ٹوپی اور کندھے پر اجرک ڈال لیا تھا۔ سفید شلوار قمیص پر وہ کھل رہا تھا۔ دیکھنے والے مجھے اندرون سندھ کا سمجھ رہے ہوں گے۔ اس لیے بلا جھجک میں نے ان کی تقلید کی۔ وہاں کا ماحول بے حد رومانی تھا۔ ہال میں ہلکی ہلکی

موسیقی گونج رہی تھی اور جوڑے سرگوشیوں میں گفتگو کر رہے تھے۔ انہوں نے ہال کے آخری کونے میں ایک میز کا انتخاب کیا، خوش قسمتی سے مجھے بھی ان کے عقب میں جگہ مل گئی اور میں ایک ایسی کرسی پر بیٹھ گیا جس کی پشت ان کے پیچھے تھی۔ اس طرح وہ مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے، البتہ میں ان دونوں کی باتیں سن سکتا تھا۔

بھائی نے میرے کوبلا کر کھانے کا آرڈر دیا۔ اس کے جانے کے بعد وہ لڑکی بولی۔ ”نوید! آخر ہم کب تک اس طرح ملتے رہیں گے؟“

”نورین! مجھے کچھ وقت دو، تم جانتی ہو کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ دوسری شادی کے لیے مجھے پہلی بیوی سے اجازت لینا ہوگی۔“

نورین کا نام سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ اس کی تو شادی ہو چکی تھی پھر وہ یہاں کیسے آگئی۔ میں فی الوقت اس مسئلے پر سوچ بچار نہیں کر سکتا۔ اس سے زیادہ میرے لیے ان کی گفتگو سننا اہم تھا۔

”نوید! یہ تمہارا مسئلہ ہے اور تمہیں ہی اسے ہینڈل کرنا ہے اگر وہ اجازت نہیں دیتی تو اسے چھوڑ دو۔“

”ناممکن! وہ میرے چچا کی بیٹی ہے، اگر میں نے طلاق کا لفظ بھی منہ سے نکالا تو بابا مجھے گھر سے نکال دیں گے اور میں جائیداد میں اپنے حصہ سے محروم ہو جاؤں گا۔“

”پھر ایک کام کرو۔“ نورین نے کہا۔ ”تم اپنے باپ سے مطالبہ کرو کہ وہ تمہیں جائیداد میں سے حصہ دے دیں۔ ان سے کہو کہ ملازمت میں تمہارا گزارہ نہیں ہو رہا۔ اس لیے تم کوئی کاروبار کرنا چاہ رہے ہو جس کے لیے سرمایہ کی کمی آڑے آرہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ مان جائیں گے۔ آخر ان کے مرنے کے بعد بھی جائیداد کا بٹوارہ ہونا ہی ہے۔“

مجھ میں اس سے زیادہ سننے کی تاب نہیں تھی۔ دیے بھی میں جو کچھ جانتا چاہ رہا تھا وہ معلوم ہو گیا۔ بھائی نورین کی محبت میں اتنا آگے چلے گئے تھے کہ وہ نیلم جیسی نیک اور شریف عورت کو چھوڑنے کے لیے تیار تھے، میں نے تہیہ کر لیا کہ انہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گا لیکن پہلے مجھے نورین کا حدود واربعہ معلوم کرنا تھا کہ وہ کہاں سے ٹپک پڑی۔

دوسرے روز میں نے ایک ساتھی رپورٹر شیریں کو اعتماد میں لے کر اسے نورین کے بارے میں بتایا اور اس کے گھر کا پتا اور تصویر دے کر اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنے کے لیے کہا۔ شیریں میری بہت اچھی دوست

تھی اور میں نے بھی کئی معاملات میں اس کی مدد کی تھی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے اور بہانے بہانے مجھ سے قریب ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ اس لیے مجھے یقین تھا کہ وہ میری توقع سے بڑھ کر نتائج دے گی اور ایسا ہی ہوا۔ وہ ایک سیلز گرل کے روپ میں نورین کے گھر گئی اور پانی پینے کے بہانے اندر داخل ہو گئی۔ ڈرائنگ روم میں نورین کی بڑی سی پورٹریٹ دیکھ کر وہ چونک پڑی جس میں وہ ایک ماڈل کی طرح پوز بنائے کھڑی تھی۔ اس نے نورین سے پوچھ ہی لیا کہ کیا وہ ماڈلنگ کرتی ہے؟

”ہاں۔“ نورین نے فخریہ انداز میں کہا۔ ”صرف ماڈلنگ ہی نہیں بلکہ ایکٹنگ بھی کرتی ہوں۔ لیکن ابھی ابتداء ہے۔ میں انڈسٹری میں قدم جمانے کے لیے جدوجہد کر رہی ہوں۔“

شیریں نے کہا۔ ”میں ایک شو بزنس میگزین کے لیے فری لانس جرنلسٹ کے طور پر بھی کام کرتی ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو میں اس پرچے میں آپ کا انٹرویو اور فوٹوشوٹ لگوا سکتی ہوں۔“

”ضرور کیوں نہیں۔“ نورین خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ”آپ جب چاہیں میرا انٹرویو کر سکتی ہیں۔“

”ٹھیک ہے میں ایڈیٹر سے بات کر کے آپ کو بتا دوں گی۔ آپ مجھے اپنا فون نمبر دے دیں تاکہ آپ سے رابطہ کر سکوں۔“

اس طرح شیریں نے نورین سے اس کا موبائل نمبر لے لیا اور باتوں باتوں میں اس کا پس منظر بھی معلوم کر لیا۔ نورین نے بتایا کہ اس کی شادی برادری میں ہوئی تھی اور وہ بیاہ کر لاہور چلی گئی لیکن شوہر سے اس کی نہ بھسکی۔ دونوں کے لائف اسٹائل میں بہت فرق تھا۔ وہ شروع سے جدید طرز زندگی کی عادی تھی۔ اچھا لباس، فیشن، میک اپ، سیر و تفریح اور مردوں سے بے حجابانہ تعلقات جب کہ شوہر اس کے بالکل برعکس تھا۔ وہ سادہ لباس پہنتا سادہ غذا کھاتا اور دفتر سے آکر گھر میں بند ہو جاتا۔ اس کا کوئی دوست نہیں تھا اور نہ ہی اسے ہونٹوں میں جانے کا شوق تھا۔ چھ مہینے میں ہی نورین اس طرز زندگی سے اکتا گئی اور دونوں میں جھگڑے ہونے لگے جس کا نتیجہ طلاق کی صورت میں نکلا اور وہ شادی کے ایک سال بعد ہی میکے واپس آگئی۔

وہ شروع سے ہی آزاد خیال اور بے باک واقع ہوئی تھی۔ مردوں سے دوستی کرنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ یہی وجہ

تھی کہ وہ آئے دن دوست بدلتی رہتی تھی۔ شوہر سے طلاق کے بعد وہ بالکل ہی آزاد ہو گئی اور گھر والوں کی طرف سے بھی اس پر کوئی روک ٹوک نہ رہی۔ اسی دوران اس کی دوستی ایک کمرشل فوٹو گرافر سے ہو گئی جس نے اسے ماڈل کے طور پر ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں متعارف کروایا اور اسے اکا دکا اشتہار ملنے لگے۔ اس کے علاوہ وہ فی وی ڈراموں میں بھی کام حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن تاحال کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے جب شیریں نے اس کا انٹرویو لینے کی فرمائش کی تو وہ فوراً راضی ہو گئی کیونکہ اس انٹرویو کے شائع ہونے کے بعد وہ پروڈیوسرز کی نظروں میں آسکتی تھی۔

شیریں نے مجھے تمام صورت حال بتائی تو میں نے اس سے کہا کہ وہ نورین کا انٹرویو ضرور کرے بلکہ مجھے بھی اپنے ساتھ فوٹو گرافر کے طور پر لے جائے۔ اس کا فوٹوشوٹ میں کروں گا۔

شیریں نے نورین کو فون کر کے انٹرویو کا وقت طے کیا اور ہم دونوں اس کے گھر پہنچ گئے۔ شیریں نے شاید اسے فوٹو سیشن کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اسی لیے وہ بنی سنوری ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے شیریں سے کہا کہ پہلے وہ انٹرویو کرے کیونکہ مجھے تصویریں بنانے میں وقت لگے گا۔ چنانچہ شیریں نے اپنا کام شروع کر دیا اور میں خاموش بیٹھا ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ وہ نورین سے عام روایتی سوالات کر رہی تھی اور میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا کیونکہ یہ ایک فرضی انٹرویو تھا جو کہیں شائع نہ ہوتا اور ہم نے صرف نورین کا حدود واربعہ جاننے کے لیے یہ ڈراما رچایا تھا۔ آخر میں شیریں نے ایک غیر متوقع سوال کر کے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ پوچھ رہی تھی ”کیا تمہارا کوئی بوائے فرینڈ ہے۔“

”نہیں۔“ اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”میں سنگل ہوں۔“

اس کے سفید جھوٹ پر میں حیران رہ گیا۔ ایک طرف وہ میرے بھائی سے پیار کی چمکیں بڑھا رہی تھی اور دوسری جانب اپنے سنگل ہونے کا دعویٰ کر رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس نے جھوٹ کیوں بولا۔ کیا وہ بھائی کو بھی بے وقوف بنا رہی تھی۔

انٹرویو ختم ہونے کے بعد شیریں نے کہا کہ اسے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ لہذا وہ میرے انتظار میں نہیں رکھ سکتی۔ اس کے جانے کے بعد میں اور نورین تنہا رہ گئے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک دیکھی۔ وہ مجھے

یوں دیکھ رہی تھی جیسے کوئی شکاری اپنے شکار کو دیکھتا ہے۔ میں نے بھی کچھ گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ اس کی نظروں کا مفہوم بھانپتے ہوئے بولا۔ ”مس نورین! اگر آپ چاہتی ہیں کہ یہ فوٹوشوٹ دھوم مچا دے تو آپ کو میرے ساتھ پورا تعاون کرنا ہوگا۔“

وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔ ”میں ہر طرح سے تعاون کے لیے تیار ہوں۔“

”ویری گڈ۔“ میں نے کہا۔ ”سب سے پہلے آپ کو اپنا لباس تبدیل کرنا ہوگا، اپنی وارڈ روم میں سے ایسے ڈریسز کا انتخاب کریں جن میں آپ کے جسمانی خطوط پوری طرح نمایاں ہو جائیں۔“

”اوہ آئی سی۔“ وہ میرا مطلب سمجھتے ہوئے بولی۔ ”اس سلسلے میں آپ کو میری مدد کرنا ہوگی۔“

وہ مجھے اپنے بیڈ روم میں لے گئی۔ میں اس کی وارڈ روم دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ عام گھریلو عورت کی بجائے کسی اداکارہ یا ماڈل کی وارڈ روم لگ رہی تھی جس میں ہر رنگ، ڈیزائن اور فیشن کا لباس موجود تھا۔ اس نے ایک ایک کر کے وہ ملبوسات بستر پر پھیلانا شروع کیے تو میں بھی پریشان ہو گیا اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ان میں سے کس کا انتخاب کروں، مجبوراً مجھے کہنا پڑا۔ ”ان میں سے آپ کو جو بھی پسند ہو وہی پہن لیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ہر لباس میں پُرکشش نظر آئیں گی۔“

اس نے اپنے سراپا پر فخریہ انداز میں نظر ڈالی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ”میں کوشش کروں گی کہ آپ کے معیار پر پوری اتر سکوں۔ آپ ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھیں۔ میں تیار ہو کر آتی ہوں۔“

اس نے تیار ہونے میں آدھ گھنٹا لگا دیا۔ سرخ رنگ کی کرتی اور سفید ٹراؤزر میں اس کا انگ انگ بول رہا تھا۔ اس نے پہلا پوز ہی اتنے بے باک انداز میں دیا کہ میرے لیے اسے نظر بھر کر دیکھنا مشکل ہو گیا۔ اس نے میری ہدایات کے مطابق دو تین پوز دیے اور لباس تبدیل کرنے چلی گئی۔

اس بار اس نے ساڑی کا انتخاب کیا، جس کا مختصر سیلیویں بلاؤز نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ پوز دیتے وقت ساڑی کا پلو ڈھلکا دیتی جس سے اس کے جسم کا بالائی حصہ عریاں ہو جاتا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے سامنے نورین نہیں بلکہ کوئی آوارہ عورت ہے۔ مجھے اس سے کراہیت محسوس ہونے لگی۔ جی چاہ رہا تھا کہ یہ ڈراما ختم کر کے فوراً چلا جاؤں

لیکن مجھے اپنا مشن بھی پورا کرنا تھا۔ اس لیے طوعاً و کرہاً اس کی حرکتیں برداشت کرنا پڑیں۔

یہ سلسلہ تین چار گھنٹے چلتا رہا۔ اس دوران اس نے چھ سات لباس تبدیل کیے اور کئی تصویریں بنوائیں۔ کام ختم ہونے پر میں نے اجازت جا ہی تو وہ اٹھلاتے ہوئے بولی۔
”میں کھانا کھائے بغیر آپ کو نہیں جانے دوں گی۔“
”معذرت چاہوں گا۔ مجھے ایک اور جگہ جانا ہے۔ پہلے ہی کافی دیر ہو گئی ہے۔“

”اچھا چائے تو پی لیں۔“
میں خاموش ہو گیا۔ وہ پانچ منٹ میں آنے کا کہہ کر چلی گئی اور میں آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچنے لگا۔ میرا مقصد اس وقت حاصل ہوتا جب نورین، بھائی کا پیچھا چھوڑ دیتی اور اس کے لیے ضروری تھا کہ اسے کسی دوسرے راستے پر لگا دیا جائے لیکن ابھی تک میں اس راستے کا تعین نہیں کر سکا تھا لیکن یہ مشکل بھی نورین نے ہی آسان کر دی۔ وہ چائے کے ساتھ لوازمات سے بھری ہوئی ٹرالی بھی لے آئی تھی۔ وہ میرے برابر میں ہی صوفے پر بیٹھ گئی اور میری طرف پلیٹ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”شروع ہو جائیں۔“

میں نے پلیٹ واپس ٹرالی میں رکھ دی اور بولا۔ ”اس وقت میرا کچھ کھانے کا موڈ نہیں ہے۔ بس چائے ہی کافی ہے۔“

”یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔“ اس نے مصنوعی ہنسی سے کہا پھر میرے لیے کپ میں چائے اٹھیلے ہوئے بولی۔
”چینی کتنی؟“

”ایک چمچ۔“
اس نے چائے کا کپ مجھے تھمایا تو اس کی انگلیاں میرے ہاتھ سے مس ہو گئیں۔ اس نے ایک سکٹ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس انٹرویو اور تصویروں کی اشاعت سے مجھے کوئی فائدہ ہوگا؟“

”کیسا فائدہ؟“ میں نے انجان بنے ہوئے کہا۔
”اوہ، آپ بھی بڑے بھولے بادشاہ ہیں۔“ اس نے ایک ادا سے کہا۔ ”کیا آپ کو معلوم نہیں کہ میں ٹی وی ڈراموں میں اداکاری کرتا چاہتی ہوں لیکن ابھی تک کوئی چانس نہیں ملا۔“

”حیرت ہے۔ آپ جیسی پُرکشش اور حسین لڑکی پر ابھی تک کسی کی نظر نہیں پڑی۔“

”تعریف کا شکریہ۔“ وہ میری طرف کھکتے ہوئے بولی۔ ”کوئی ترکیب بتائیں کہ میں لوگوں کی نظروں میں آ جاؤں۔“

”دیکھیے محترمہ! آج کل تعلقات کے بل بوتے پر کام ہوتے ہیں۔ آپ بھی اپنے تعلقات بڑھائیں۔ پروڈکشن ہاؤس کے چکر لگائیں۔ تقریبات اور پارٹیوں میں بن بلائی مہمان بن کر پہنچ جائیں اور لوگوں کی توجہ کا مرکز بننے کی کوشش کریں۔ امید ہے کہ جلد ہی آپ کا کام بن جائے گا۔“

میں چاہ رہا تھا کہ وہ ان مصروفیات میں الجھ کر بھائی کا پیچھا چھوڑ دے لیکن پھر بھی میں نے حفظ ماقدم کے طور پر کہا۔ ”آپ نے شیریں کو انٹرویو دیتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ آپ کا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے، آپ کو آئندہ بھی یہ خیال رکھنا ہوگا کہ کسی کے ساتھ اسکیئنڈل نہ بننے پائے ورنہ آپ کو کوئی نہیں پوچھے گا۔“

وہ میرے اور قریب آ گئی۔ اب اس کا گداز جسم مجھ سے مس ہو رہا تھا۔ وہ میرے گلے میں بانٹیں ڈالتے ہوئے بولی۔ ”آپ کے بھی تو شو بزم کے لوگوں سے تعلقات ہوں گے کیا آپ کسی سے میری سفارش نہیں کر سکتے؟“

میں اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اب مجھے اجازت دیں، مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔“

اس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“
میں نے اسے ٹالنے کی غرض سے کہا۔ ”کسی سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔“

رات کو میں دیر تک نورین کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس سے ملنے کے بعد یہ اندازہ تو ہو گیا تھا کہ وہ انتہائی مطلبی اور خود غرض عورت ہے اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتی ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں وہ جس طرح مجھ سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس سے اس کے آوارہ پن کا اظہار ہو رہا تھا۔ اگر میں ذرا سی بھی حوصلہ افزائی کرتا تو وہ کہے ہوئے پھل کی طرح میری گود میں گر جاتی لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اگر وہ اداکارہ بننے کی خواہش مند تھی تو پھر بھائی پر ڈورے ڈالنے کا کیا مقصد تھا۔ یقیناً بھائی سے شادی کرنے کے بعد وہ اپنی خواہش کی تکمیل نہیں کر سکتی تھی اور اس کا اداکارہ بننے کا خواب ادھورا رہ جاتا۔ بہت سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی

نظریں بھائی کے پیسے پر تھیں اور اسی لیے اس نے انہیں جائیداد سے اپنا حصہ مانگنے کا مشورہ دیا تھا۔

میں نے تمام صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کیا کہ مجھے نورین کی مدد کرنی چاہیے۔ ایک دفعہ وہ اس چکر میں پھنس گئی تو وہ خود بخود بھائی سے دور ہوتی چلی جائے گی۔ ایک کام تو میں نے یہ کیا کہ اخبار کے دفتر میں جس تقریب کا دعوت نامہ آتا، میں اس کی اطلاع نورین کو دے دیتا اور وہ بن ٹھن کر وہاں پہنچ جاتی۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ بھائی سے اس کی ملاقاتوں میں وقفہ آنے لگا۔ وہ خوش تھی کہ اس طرح اسے شو بزم کے لوگوں سے راہ و رسم بڑھانے کا موقع مل رہا ہے۔ البتہ جس روز وہ فارغ ہوتی تو وہ شام بھائی کے ساتھ ہی گزارتی۔ میں سائے کی طرح ان دونوں کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ البتہ ان کا تعاقب کرتے وقت اپنے حلیے میں تھوڑی سی تبدیلی کر لیتا۔ میں نے ٹھنکریا لے بالوں والی ایک دگ اور نعلی موچھیں خرید لی تھیں۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی مجھے دیکھ لیتا تب بھی نہ پہچان پاتا اس کے ساتھ ہی میں نے دوران تعاقب آلہ سماعت بھی استعمال کرنا شروع کر دیا تھا تاکہ کچھ فاصلے سے بھی ان کی گفتگو سن سکوں۔

میرا دوست شعیب ایک پروڈکشن ہاؤس میں معاون پروڈیوسر کے طور پر کام کرتا تھا اس سے میری کوئی خاص دوستی نہیں بس تھوڑی بہت جان پہچان تھی۔ میں نے سوچا کہ اس سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔ شاید وہ نورین کی کچھ مدد کر سکے۔ میں چاہ رہا تھا کہ ایک مرتبہ نورین پروڈکشن ہاؤس والوں کے ہتھے چڑھ جائے۔ وہ اسے اتنا گھمائیں گے کہ بھائی کا نام لینا بھول جائے گی۔ میں نے اسے فون کر کے نورین کے بارے میں بتایا اور اس کی بُر زور سفارش کی اس نے کہا۔ ”لڑکی کی تصویریں بھیج دو۔ انہیں دیکھنے کے بعد ہی کچھ کہا جاسکتا ہے۔“

میں نے یہ بات نورین کو بتائی تو وہ اس پر تیار ہو گئی اور میں نے اس کی کچھ تصویریں شعیب کو بھیج دیں۔ دو دن بعد اس کا فون آ گیا کہ لڑکی کو بھیج دو۔ وہ اسے پروڈیوسر سے ملوانا چاہتا ہے۔ میرے بتائے ہوئے پتے پر نورین پروڈکشن ہاؤس چلی گئی جہاں اس کا اسکرین ٹیسٹ لیا گیا اور پروڈیوسر نے یہ خوش خبری سنائی کہ وہ عنقریب ایک نئی سیریل شروع کرنے والا ہے اور اگر اس میں نورین کے مطلب کا کوئی کردار ہو تو وہ ضرور اسے موقع دے گا۔

یہ سن کر نورین خوشی سے پھولی نہ سائی۔ اس کے

خوابوں کی تعبیر ملنے کا وقت قریب آ گیا تھا۔ اس نے فوراً یہ خوش خبری مجھے سنائی۔ وہ میری احسان مند تھی اور اس خوشی میں مجھے ٹریٹ دینا چاہ رہی تھی۔ مجھے اس کی سادگی پر ہنسی آ گئی۔ میں جانتا تھا کہ پروڈیوسر نے اس کا دل رکھنے کے لیے یہ بات کہہ دی ہے۔ ورنہ اس وقت بھی اس کی دوسریلر سیٹ پر ہیں۔ وہ اگر چاہتا تو کسی ایک میں نورین کو چانس دے سکتا تھا لیکن میں اس کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ لہذا یہ کہہ کر ٹال دیا کہ جب اس کا کنٹریکٹ سائن ہو جائے تو میں ضرور اس کی خوشی میں شریک ہو جاؤں گا۔

اس کے بعد نورین نے ہر دوسرے تیسرے روز شعیب کو فون کرنا شروع کر دیا۔ وہ جانتا چاہتی تھی کہ پروڈیوسر اپنی نئی سیریل کب شروع کر رہا ہے۔ شعیب سمجھ گیا کہ لڑکی پاگل پن کی حد تک ڈراموں میں کام کرنے کی خواہش مند ہے چنانچہ اس نے ایک نیا کھیل کھلایا اور نورین سے کہا کہ آج کل مقابلہ بہت سخت ہو گیا ہے اور پروڈیوسر صرف اپنی آرٹسٹوں کو کاسٹ کرتے ہیں جن کی مارکیٹ میں ڈیمانڈ ہو یا پھر ان لوگوں کو ترجیح دی جاتی ہے جو ان کی پروڈکشن میں سرمایہ کاری کر سکیں۔ شعیب نے نورین سے کہا کہ اگر وہ سرمایہ کا بندوبست کرے تو وہ اپنے ڈرامے میں مرکزی کردار ادا کر سکتی ہے۔ سیریل کی تیاری اور اسے فروخت کرنے کی ذمہ داری شعیب کی ہوگی اور وہ منافع میں برابر کا شریک ہوگا۔

نورین کو یہ تجویز پسند آئی۔ اس نے سوچا کہ پروڈیوسروں کے پیچھے بھاگنے سے بہتر ہے کہ اپنا پروڈکشن ہاؤس کھولا جائے۔ اس طرح اس کی ہیروئن بننے کی خواہش پوری ہو جائے اور آمدنی کا ایک ذریعہ بھی بن جائے گا۔ اس نے ایک لمحہ کے لیے نہیں سوچا کہ اس کام کے لیے سرمایہ کہاں سے آئے گا۔ اسے بس یہ اطمینان تھا کہ سب کچھ شعیب نے کرنا ہے اسے تو بیٹھے بٹھائے شہرت مل جائے گی اور ہر جگہ اس کے نام کا چرچا ہو رہا ہوگا۔ چنانچہ اس نے شعیب سے کہہ دیا کہ وہ پروڈکشن ہاؤس کھولنے کی تیاری کرے۔ وہ بہت جلد پیسوں کا انتظام کر دے گی۔

بھائی کو نورین کے تیور بدلے ہوئے محسوس ہوئے تو انہوں نے ایک دن نورین کے سامنے اپنی تشویش کا اظہار کر دیا۔ وہ اسی مخصوص ریسٹوران میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں عام طور پر ان کا ڈنر ہوتا تھا۔ میرے کوکھانے کا آرڈر دینے کے بعد بھائی نے کہا۔ ”کیا بات ہے نورین۔ آج کل بہت

مصرف ہو گئی ہو۔ مجھ سے ملنے کے لیے بھی تمہارے پاس وقت نہیں ہے۔“

”ہاں کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ نورین نے رکھائی سے کہا۔

”کیا مطلب، میں کچھ سمجھا نہیں۔“ بھائی نے سادگی سے کہا۔

”دیکھو ندیم۔“ وہ سمجھانے کے انداز میں بولی۔ ”تم جانتے ہو کہ اچھی زندگی گزارنے کے لیے پیساکتنی اہمیت رکھتا ہے لیکن پیسے درختوں پر نہیں اگتے۔ اس کے لیے جدوجہد کرنا پڑتی ہے اور میں یہی کر رہا ہوں۔“

”لیکن تمہیں یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میری اچھی خاصی تنخواہ ہے۔ اس میں ہمارا گزارہ با آسانی ہو سکتا ہے۔“

”ہونہ، ہمارا گزارہ۔“ وہ طنز یہ انداز میں بولی۔ ”تم ابھی تک اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ ہماری شادی ہو جائے گی۔ بھول گئے کہ تمہارے گھر والوں نے مجھے اس وجہ سے مسترد کر دیا تھا کہ تمہارے یہاں برادری سے باہر شادی نہیں ہوتی۔ وہ وجہ آج بھی موجود ہے بلکہ اب تو تمہارے پیروں میں ایک زنجیر بھی پڑی ہوئی ہے۔ تم اپنی بیوی کو اس لیے طلاق نہیں دے سکتے کہ تمہیں اپنے حصہ کی جائیداد سے محرومی کا ڈر ہے۔ پھر تم ہی بتاؤ کہ ہماری شادی کس طرح ہو سکتی ہے۔“

یہ سن کر بھائی سوچ میں پڑ گئے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ ”تمہاری دونوں باتیں درست ہیں۔ پہلے بھی بابا نے یہی دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے برادری سے باہر شادی کی تو وہ مجھے عاق کر دیں گے اور آج بھی میرے سر پر وہی تلوار لٹک رہی ہے۔ اگر میں نے نیلم کو طلاق دینے کی بات کی تو وہ ایک بار پھر وہی دھمکی دیں گے کیونکہ نیلم ان کے بھائی کی بیٹی ہے اور وہ کسی صورت میں بھی اس کا گھر برباد نہیں ہونے دیں گے۔“ اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں؟“

وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ”وہی جو میں پہلے کہہ چکی ہوں۔ تم ان سے جائیداد میں اپنے حصے کا مطالبہ کرو۔ اگر انہوں نے یہ بات مان لی تو تمہیں کوئی ڈر نہیں رہے گا۔ تم اپنی بیوی کو طلاق دے کر مجھ سے شادی کر سکتے ہو۔“

”تم کیا سمجھتی ہو۔ وہ مان جائیں گے۔“

”ہاں بشرطیکہ تم انہیں قائل کر سکو۔ تم انہیں بتاؤ کہ اس ملازمت میں تمہارا گزارہ نہیں ہو رہا اور نہ ہی اس میں آگے بڑھنے کا کوئی امکان ہے۔ اس لیے تم اپنا کاروبار شروع کرنا چاہتے ہو جس کے لیے سرمایہ چاہیے اور وہ صرف اسی صورت میں مل سکتا ہے جب تمہیں جائیداد میں سے حصہ دے دیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ یہ تمہارا حق ہے جو تمہیں ملنا چاہیے۔“

”لیکن میں کیا کاروبار کروں گا۔“ بھائی بولے۔

”مجھے تو اس کا کوئی تجربہ نہیں۔“

”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔“ نورین بولی۔ ”بلکہ میں نے اس کا بندوبست بھی کر لیا ہے اور آج کل اسی سلسلے میں بھاگ دوڑ کر رہی ہوں۔“

پھر اس نے بھائی کو پروڈکشن ہاؤس والے منصوبے کے بارے میں بتایا۔ بھائی حیرت زدہ اس کی باتیں سنتے رہے۔ ان کی سمجھ میں کچھ آیا۔ جب نورین نے اپنی بات ختم کی تو وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولے۔ ”تم کتنی اچھی ہو نورین۔ تمہیں میرا کتنا خیال ہے۔“

وہ اتراتے ہوئے بولی۔ ”ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ اگر میرے کہنے پر عمل کرتے رہے تو ساری زندگی عیش کرو گے۔“

بھائی نے اسے ممنونیت بھری نظروں سے دیکھا جسے اس نے انہیں تسخیر کائنات کا نسخہ بتا دیا ہو پھر ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولے۔ ”بس دعا کرو کہ بابا مان جائیں۔“

”مانیں گے کیسے نہیں۔“ وہ تنک کر بولی۔ ”تم اپنا حق مانگ رہے ہو۔ کوئی خیرات نہیں، اگر وہ ذرا بھی چون چرا کریں تو تم اپنی بات پر ڈٹ جانا۔ آدمی کو اپنے حق کے لیے لڑنا ہی پڑتا ہے۔“

غرض یہ کہ نورین نے بھائی کے کان اچھی طرح بھر دیئے اور وہ بابا سے ٹکر لینے پر آمادہ ہو گئے۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ بابا ایک چٹان کی مانند ہیں اور ان سے ٹکرانے والا خود پاش پاش ہو جاتا ہے لیکن نورین کی جھوٹی محبت نے ان کی عقل ماؤف کر دی تھی اور وہ یہ خطرہ مول لینے پر تیار ہو گئے۔

نورین کی باتیں سن کر میری کنپٹیاں سلگنے لگی تھیں۔ جی میں آیا کہ اسی وقت بھائی کی میز پر جا کر اس کا بھانڈا پھوڑ دوں لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ اس کی جھوٹی محبت کا جادو سرچڑھ کر بول رہا تھا اور بھائی میری کسی بات کا یقین نہ

کرتے بلکہ الٹا مجھے سب لوگوں کے سامنے بے عزت ہونا پڑتا۔ اس لیے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا اور وہاں سے چلا آیا۔

رات کو بستر پر لیٹنے کے بعد بھی میں بھائی اور نورین کے بارے میں سوچتا رہا، میرے ذہن میں بس ایک ہی بات گشت کر رہی تھی کہ کسی طرح بھائی کو نورین کی اصلیت اور اس کے عزائم سے آگاہ کیا جائے لیکن کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ پھر اچانک ہی مجھے ایک خیال سوچا۔ میں نے نورین کا جو فوٹو شوٹ کیا تھا، ان میں چند تصویریں جو انتہائی فحش تھیں جن میں نورین نے اپنے جسم کی بھرپور نمائش کی تھی۔ کوئی بھی غیر متوجہ نہیں اپنی محبوبہ کی ایسی تصویریں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ تصویریں بھائی کو دفتر کے تے پر بھیج دی جائیں تو انہیں دیکھ کر بھائی کی غیرت جاگ اٹھے گی اور وہ اس سے متفر ہو جائیں گے لیکن میں نے اس خیال کو بھی رد کر دیا اگر بھائی نے اس سے ان تصویروں کے بارے میں پوچھ لیا تھا تو وہ فوراً سمجھ جائے گی کہ یہ میری حرکت ہے اور مجھے اپنی صفائی دینا مشکل ہو جائے گا۔

بہت سوچ بچار کے بعد میں نے بھائی کو ایک گناہ خط بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس میں نورین کا سارا کچا چٹھایان کرنے کے علاوہ اس کے منصوبے کا بھی تفصیل سے ذکر کر دیا کہ وہ کس طرح بزنس کی آڑ میں بھائی کی دولت پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھ رہی ہے۔ میں نے یہ خط ہاتھ سے لکھنے کی بجائے اردو میں ٹائپ کیا اور بھائی کے دفتر کے تے پر بھیج دیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے موبائل کی سم بھی تبدیل کر لی تاکہ اگر نورین کو مجھ پر شک ہو تو وہ مجھ سے رابطہ نہ کر سکے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس خط کو پڑھنے کے بعد بھائی اس سے بدظن ہو جائیں گے اور اس سے قطع تعلق کر لیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بھائی نے اس خط میں لکھی ہوئی باتوں پر بالکل بھی یقین نہیں کیا اور نورین کو اس کے بارے میں بتا دیا۔

وہ اس خط کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں ہونے لگے لیکن اس نے بھائی کو ٹالنے کی غرض سے کہا۔ ”نوید تم نہیں جانتے۔ شو بزنس کے لوگوں میں بہت حسد ہوتا ہے۔ وہ کسی کو آگے بڑھتا نہیں دیکھ سکتے۔ لگتا ہے کہ کسی کو ہمارے منصوبے کا علم ہو گیا ہے اور اس نے تمہیں بدظن کرنے کے لیے یہ خط بھیجا ہے۔“

”لیکن یہ خط مجھے کیوں بھیجا گیا؟“ بھائی نے غصے

سے کہا۔ ”خط بھیجنے والے کو میرے اور تمہارے تعلقات کا علم کیسے ہوا؟“

”لگتا ہے کہ کوئی ہماری ٹوہ میں لگا ہوا ہے۔“ نورین منہ بناتے ہوئے بولی۔ ”کہیں تمہاری بیوی نے تو جاسوس نہیں چھوڑ دیئے؟“

”تو بہ کرو۔ وہ بے چاری تو گھر میں قید ہے۔ اس کے فرشتوں کو بھی علم نہیں کہ میری شامیں تمہارے ساتھ گزرتی ہیں۔“

”اس نے کبھی دیر سے آنے کی وجہ نہیں پوچھی؟“

”ایک دفعہ اس نے یہ حماقت کی تھی۔ میں نے ایسی طبیعت صاف کی کہ اس کی دوبارہ کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔“

”پھر یہ خط کس نے لکھا؟“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

”مجھے تو یہ کوئی تمہاری ہی فیلڈ کا بندہ لگتا ہے۔ اس نے اتفاقاً مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیا اور اس نے مجھے تم سے بدظن کرنے کے لیے یہ خط لکھ دیا۔“

”چھوڑو مٹی پاؤ اس قصے پر۔“ وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔ ”نیک کام میں در نہیں ہونی چاہیے۔ اس سے پہلے کہ کوئی اور سازش ہو۔ تم پہلی فرصت میں بابا کے سامنے اپنا مطالبہ رکھ دو۔“

”ٹھیک ہے۔ میں موقع دیکھ کر بات کرتا ہوں۔“

میرا یہ داؤ بھی خالی گیا۔ بھائی پر اس خط کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ الٹا نورین نے انہیں اور مضبوط کر دیا۔ وہ بابا کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ اب مجھے اس دن کا انتظار تھا کہ بھائی کب یہ بات منہ سے نکالتے اور بابا اس کا کیا جواب دیتے ہیں۔ ویسے مجھے بابا کے جواب کا پتا تھا۔ انہوں نے صاف انکار کر دینا تھا اور بھائی کو منہ کی کھانی پڑتی۔ اس کے بعد نورین کا کیا رد عمل ہوتا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اپنا مقصد پورا نہ ہونے کی صورت میں وہ بھائی سے کنارہ کشی کر کے کوئی نیا مرغا تلاش کرے گی اور میں یہی چاہتا تھا۔ بھائی نورین سے مایوس ہو کر گھر لوٹ آتے اور نیلم کی زندگی میں کچھ سکون آ جاتا۔

وہ اتوار کا دن تھا۔ بابا جانی ناشتا کرنے کے بعد لاؤنج میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ بھائی سہمی ہوئی بکری کی طرح کمرے سے برآمد ہوئے اور بڑے مؤدبانہ انداز میں بابا کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ بابا نے ایک نظر انہیں دیکھا

اور دوبارہ اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ بھائی نے کھٹکھار کر گلا صاف کیا اور آہستہ سے بولے۔ ”بابا جانی۔ مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“

”ہاں کہو۔“ بابا نے اخبار سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

”وہ میں یہ کہہ رہا تھا.....“

”ہاں کہو رک کیوں گئے؟“

”میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس نوکری میں میرا گزارہ نہیں ہو رہا، اس لیے میں نے سوچا ہے کہ کوئی کاروبار کر لوں۔“

”ہاں ضرور کرو، کس نے روکا ہے تمہیں۔“

”اس کے لیے کافی سرمایہ چاہیے اور میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے۔“

”دیکھو بھئی اگر لاکھ دو لاکھ چاہئیں تو وہ میں تمہیں دے سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ میری گنجائش نہیں ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں ریٹائرڈ آدمی ہوں۔ پراپرٹی سے جو کرایہ آتا ہے اسی سے گزارہ ہو رہا ہے۔“

”جی مجھے معلوم ہے لیکن مجھے تو بڑی رقم کی ضرورت ہے۔“

”دیکھو میاں پیسوں کے بغیر کوئی کاروبار نہیں ہوتا۔ بہتر یہی ہے کہ یہ خیال دل سے نکال دو اور خاموشی سے سر جھکا کر نوکری کرتے رہو۔“

”میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر جائیداد میں سے میرا حصہ مجھے مل جاتا تو.....“

”کون سی جائیداد اور کیسا حصہ؟“ بابا گرج کر بولے۔

بھائی میں نہ جانے اتنی ہمت کہاں سے آگئی۔ وہ بولے۔ ”وہی جائیداد جو آپ نے برسوں کی محنت کے بعد بنائی ہے اور جس کے ہم دونوں وارث ہیں۔“

”میرے مرنے کے بعد۔“ باہر کڑک کر بولے۔

”زندگی میں نہیں اب جاؤ اور مصلیٰ بچھا کر میرے مرنے کی دعا مانگو۔“

”بابا جانی! آپ بلا وجہ کی ضد کر رہے ہیں۔ آخر اس جائیداد پر ہمارا بھی کچھ حق ہے۔“

”بالکل ہے لیکن میرے مرنے کے بعد۔ میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ جائیداد تمہارے نام کر کے خود کوڑی کوڑی کا محتاج ہو جاؤں۔ آئندہ ایسی بات منہ سے نہ نکالنا ورنہ کھڑے کھڑے گھر سے نکال دوں گا۔“ بھائی مایوس ہو کر بڑ بڑاتے ہوئے چلے گئے۔

دوسرے دن بھائی حسب معمول نورین کے ساتھ ریستوران پہنچے۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا اور وہ کافی خاموش نظر آ رہے تھے۔ نورین ان کی حالت دیکھ کر سمجھ گئی کہ بات نہیں بنی پھر بھی اس نے پوچھ ہی لیا۔ ”کیا ہوا تم نے بابا سے بات کی؟“

”ہاں۔“ بھائی نے آہستہ سے کہا۔

”پھر انہوں نے کیا جواب دیا؟“

”وہ نہیں مان رہے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی زندگی میں جائیداد کا ہواڑہ نہیں ہونے دیں گے۔“

”اوہ۔ یہ تو بہت برا ہوا۔“ وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”پیسے کے بغیر تم کاروبار کیسے شروع کرو گے اور میرا کیا بنے گا۔ میں نے تو تمہاری آس میں کئی رشتے ٹھکرا دیئے۔“

”اس کی تم فکر نہ کرو۔“ بھائی جلدی سے بولے۔

”تم میری پہلی اور آخری محبت ہو۔ میں ہر قیمت پر تم سے شادی کروں گا۔“

”پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے تم مجھ سے کیسے شادی کر سکتے ہو؟“

”میں اسے طلاق کی دھمکی دے کر دوسری شادی کی اجازت لے لوں گا۔ وہ بہت ڈر پوک ہے۔ اپنا گھر بچانے کی خاطر وہ میری بات مان جائے گی۔“

”معاف کرنا، میں یہ حماقت نہیں کر سکتی۔ دوسری شادی کا سن کر تمہارے بابا آپ سے باہر ہو جائیں گے اور عین ممکن ہے کہ وہ تمہیں گھر سے نکال دیں۔ کیا تم اپنی تنخواہ میں دو بیویوں کو انورڈ کر سکتے ہو؟“

بھائی کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگے۔ اچانک ہی نورین اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ ”معاف کرنا ندیم، میں نے ہمیشہ ایک پُر آسائش زندگی کا خواب دیکھا ہے۔ تمہاری تنخواہ سے تو میرے میک اپ کا خرچ بھی پورا نہیں ہو گا۔ مجھے یہ سودا منظور نہیں۔ آج کے بعد میرے اور تمہارے راستے جدا ہیں۔“

اس سے پہلے کہ بھائی کچھ کہتے وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ریستوران سے باہر چلی گئی۔ بھائی کچھ دیر اپنا سر پکڑے بیٹھے رہے اور پھر اٹھ کر چل دیئے۔ میں نے نورین کے بارے میں جو اندازہ لگایا۔ وہ بالکل درست نکلا۔ وہ انتہائی مطلبی اور خود غرض عورت تھی اور اس کی نظریں بھائی کے پیسے

پر تھیں۔ جب اس کی دال نہیں گئی تو اس نے بھائی کو ٹھکرا دیا۔ مجھے بھائی پر ترس آ رہا تھا اور ساتھ ہی اس بات کی خوشی بھی تھی کہ نورین ان کی زندگی سے نکل گئی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی اصلیت جان لینے کے بعد وہ اس کا نام لینا بھی گوارا نہیں کریں گے اور نیلیم کی زندگی قدرے پرسکون ہو جائے گی۔

لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ نورین کی بے وفائی نے بھائی کو ذہنی طور پر منتشر کر دیا وہ شدید غصہ اور مایوسی کے عالم میں گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ وہ انتہائی تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہے تھے کہ اسٹیرنگ پر ان کا کنٹرول نہیں رہا اور گاڑی سڑک کے کنارے لگے ہوئے درخت سے ٹکرائی اور بھائی موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔

ہمارے گھر پر تو گویا قیامت گزر گئی۔ ہم سب صدمے سے نڈھال تھے لیکن نیلیم کی حالت دیکھی نہ جانی تھی۔ وہ بے چاری جوانی میں ہی بیوہ ہو گئی۔ اس نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا تھا اور وہ دن رات بھائی کی یاد میں آنسو بہاتی رہتی۔ عدت ختم ہوئی تو چچا اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ جانا نہیں چاہ رہی تھی لیکن اس کے یہاں رہنے کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔

میں اس کی خبر گیری کرنے دوسرے تیسرے روز چلا جاتا۔ آہستہ آہستہ اس کی حالت اعتدال پر آتی چلی گئی۔ میں ادھر ادھر کی باتیں کر کے اس کا غم بانٹنے کی کوشش کرتا۔ اس طرح سال گزر گیا۔ چچا اور چچی کو یہ فکر لاحق تھی کہ وہ پہاڑی زندگی کیسے گزارے گی۔ وہ اس کی شادی کرنا چاہ رہے تھے لیکن ابھی تک انہوں نے نیلیم سے یہ بات نہیں کی تھی۔

میں بھی نیلیم کی تنہائی اور اداسی دیکھ کر کڑھتا رہتا تھا پھر مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں اسے اپنا بنالوں۔ وہ میری بچپن کی محبت تھی۔ مجھ سے زیادہ اس کا کون خیال رکھ سکتا ہے۔ اس نے جو دکھ جھیلے اور سختیاں برداشت کیں۔ میں ان سب کی تلافی کر دوں گا۔ اسے اتنی خوشیاں دوں گا کہ وہ اپنے سارے غم بھول جائے گی۔

مجھے یقین تھا کہ نیلیم کو بھی اس پر دپوزل پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ ویسے بھی اس پر پہلا حق میرا تھا۔ اگر امی نے بھائی سے اس کا رشتہ طے نہ کیا ہوتا تو وہ بہت پہلے میری زندگی میں آچکی ہوتی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ شادی سے پہلے وہ مجھے پسند کرتی تھی اور اس کے دل میں اب بھی میرے لیے گنجائش موجود ہوگی۔

یہی سب کچھ سوچنے کے بعد میں نے ایک دن اس کے سامنے حرف مدعا بیان کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر سر جھکا کر اپنی رضامندی کا اظہار کر دے گی لیکن وہ میری بات سن کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر اچانک ہی دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رونے لگی۔ اسے روتا دیکھ کر میں پریشان ہو گیا اور میری سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیسے چپ کراؤں پھر اس نے دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو صاف کیے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں نے تمہیں ہمیشہ اپنا دوست اور بھائی سمجھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنی بڑی بات کہہ دو گے۔“

”اس میں حرج ہی کیا ہے۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”میں تمہارے دکھ سمیٹنا چاہتا ہوں۔ تمہیں زندگی کی طرف واپس لانا چاہتا ہوں۔ تمہارے سامنے پوری زندگی ہے۔ تمہیں کسی نہ کسی کا ہاتھ تو تھا مننا ہی ہو گا۔ چچا اور چچی بھی تمہاری طرف سے بہت فکر مند ہیں۔“

”انہیں میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں اگر وہ مجھے بوجھ سمجھتے ہیں تو میں کسی ہاسٹل میں چلی جاؤں گی۔ کوئی چھوٹی موٹی ملازمت کر کے اپنا گزارہ کر لوں گی اور تم بھی کان کھول کر سن لو اگر آئندہ ایسی بات زبان پر لائے تو ساری زندگی تمہاری شکل نہیں دیکھوں گی۔“

میں نے اسے سمجھانے کے لیے کہا۔ ”دیکھو نیلیم زندگی کے فیصلے جذباتی بن کر نہیں کیے جاتے تم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتیں۔“

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ”حقیقت تو یہ ہے کہ میری شادی تمہارے بھائی سے ہوئی تھی۔ ہم نے ساتھ جینے اور مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ بد قسمتی سے وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے لیکن میں اپنا عہد نہیں توڑ سکتی۔ زندگی بھر اس پر قائم رہوں گی۔ اب میری زندگی میں کوئی مرد نہیں آئے گا۔ میں تمہارے بھائی کی امانت ہوں اور اس میں خیانت کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“

وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور میں دم بخود کھڑا اس وفا کی پتلی کو دیکھتا رہا جس نے شوہر کے ہر ظلم اور زیادتی کو برداشت کیا اور مرنے کے بعد بھی اس کی یاد کو سینے سے لگائے بیٹھی تھی۔ واقعی مشرقی عورت کی کھٹی میں وفاداری پڑی ہے۔ مرد کتنا ہی بے وفا کیوں نہ ہو، عورت وفا کا دامن نہیں چھوڑتی۔

بھی رسالے تھے ہر ایک میں اس کی کوئی نہ کوئی تحریر لگی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ بہت اچھا ڈراما نگار بھی تھا۔ اس وقت بھی اس کے کئی ڈراما سیریل مختلف چینلوں پر ٹیلی کاسٹ ہو رہے تھے۔ اس کے ہم اثر ادیب اسے ”لکھنے کی مشین“ کہتے تھے۔ اس کی کہانیوں کے مرکزی خیال بڑے اچھوتے ہوا کرتے تھے۔

وہ اپنے آفس میں موجود تھا اور کافی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ صبح کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ اسٹاف میں اس کا اسٹنٹ اقبال اور ایک ملازم سلطان جو اوپری کاموں پر مامور تھا آچکے تھے۔ اقبال کمپیوٹر پر گرافک کا کام کرنے میں مصروف تھا اور سلطان فی الحال کرسی توڑ رہا تھا جب کہ ساحر اپنے ایک اسکرپٹ سے الجھا ہوا تھا۔ دراصل آج کا دن اس کے لیے بڑی خوش بختی کی علامت تھا۔ آج ملک کے ایک نامور ڈائریکٹر سید محمود نے اسے فلم لکھنے کی آفر کی تھی۔ کل شام اس سے ساحر کے آفس میں میٹنگ ہوئی تھی۔ دراصل سید محمود کو بھی ساحر کی شہرت اس تک پہنچ لائی تھی۔ فلم کا موضوع بھی بڑا دلچسپ تھا۔ اس نے قدیم دور کی محبت کو انتہائی جدید سائنسی ٹیکنالوجی کے آنے والے مستقبل کے دور میں پہنچا دیا تھا۔ وہ سوئی جو ایک گھرے کے ذریعے دریا پار کر کے اپنے مایہ نال سے ملنے آئی تھی۔ اب جدید ٹیکنالوجی کے دور میں کس طرح اپنے محبوب سے ملنے جاتی ہے۔ جدید سائنسی دور کے ظالم سماج کس طرح ان کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ سید محمود بھی مرکزی خیال سن کر تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ ساحر کا دعویٰ تھا کہ اگر یہ فلم اپنے تقاضوں کے مطابق بن گئی تو بین الاقوامی منڈی میں بہت شہرت اور بزنس کرے گی اور یہ بات سچ بھی تھی کیونکہ لوگ اب گھسے بے موضوعات دیکھ دیکھ کر تھک چکے تھے۔ فلم اور ٹی وی ڈرامے تو محض ایک وقت گزاری اور تفریح کا سبب ہوا کرتے ہیں اور جب تفریح دلچسپ نہ ہو تو دیکھنے والا بے رغبتی کا شکار ہو کر متبادل کی تلاش میں لگ جاتا ہے۔ ابھی وہ اسکرپٹ لکھ ہی رہا تھا کہ اقبال نے اطلاع دی کہ کوئی لڑکی اس سے ملنے آئی ہے۔ اس نے اشارے سے کہا کہ بھیج دو۔ یوں بھی لڑکیاں اکثر اس سے ملنے آتی ہیں۔ آجایا کرتی تھیں لیکن جب وہ حسینہ عالم اس کے آفس میں داخل ہوئی تو ساحر اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے آج تک ایسا منفرد، پرکشش، نمکین اور میٹھے کا امتزاج نہیں دیکھا تھا۔ وہ ماڈرن لباس میں تھی۔ اس نے اسکرٹ اور ٹی شرٹ زیب تن کر رکھی تھی۔ کھلے ہوئے بال سمیٹ کر ایک شانے پر ڈال رکھے

معاوضہ

جناب مدیر اعلیٰ
السلام علیکم

میں پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہوں۔ ہر روز ایسے ایسے مریضوں سے ملتا ہوں جن کی روداد بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ایک شوقیہ کہانی کار بھی ہوں۔ اس لیے جب بھی کوئی اچھی آپ بیتی سنتا ہوں تو اسے کہانی کے قالب میں ڈھال دیتا ہوں، یہ روداد بھی سبق بھری ہے۔ اس لیے سرگزشت کے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ تھوڑی سی ترمیم بھی کی ہے یعنی جن کرداروں کا نام دیا ہے وہ فرضی ہیں۔ امید ہے آپ کو بھی پسند آئے گی۔

ڈاکٹر ظفر احمد خان
(کراچی)

ساحر اس وقت لکھنے میں منہمک تھا۔ اس کی کہانی کے لیے کئی بار فون آچکے تھے۔ مدیر کا ایک ہی تقاضا تھا کہ جلد از جلد کہانی بھیجی جائے لیکن کہانی تھی کہ آگے بڑھ نہیں رہی تھی خاص نمبر کے لیے کہانی کا اے ون ہونا ضروری ہے لیکن اس کا ذہن اتنا الجھا ہوا تھا کہ الفاظ ساتھ نہیں دے رہے تھے کہ کہانی میں دلچسپی پیدا ہوتی وہ کوئی نیا قلم کار تو تھا نہیں۔ ادب کی دنیا کا چمکتا ستارہ تھا۔ اس کی تخلیقات کا بڑا حیر چا تھا۔ اس کی تحاریر قارئین کو اپنی گرفت میں لے لیا کرتی تھیں۔ اس کا انداز بیان ایسا مسکون تھا کہ پڑھنے والے لوگ لگتا تھا کہ جیسے وہ خود وہاں موجود ہے اور سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ اس کی منظر کشی لا جواب تھی۔ اس کا شمار شہر کے مہنگے لکھنے والوں میں ہوتا تھا۔ اس کی لکھنے کی رفتار بھی ناقابل یقین تھی۔ شہر کے جتنے

تھے۔

ساحر نے اسے سر تاپا دیکھا۔ سلام کے بعد بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر بولا۔

”جی میڈم! میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔“
”جی میرا نام شرمین علی ہے۔ مجھے ابن ادیب نے بھیجا ہے۔“ اس کی جلتنگ بجائی آواز گونجی۔
”جی اچھا..... تو پھر.....“ ساحر نے مستفسر لہجے میں کہا۔

”میں ایک پرائیویٹ چینل پر چھوٹے موٹے رول کرتی رہی ہوں لیکن اب میں فلمی دنیا کی طرف جانا چاہتی ہوں۔“

اور آپ تو ملک گیر شہرت کے مالک ہیں۔ سنا ہے آپ سید محمود کے لیے فلم بھی لکھ رہے ہیں۔ تو پلیز آپ میرے لیے سفارش کر دیں تاکہ میں فلم انڈسٹری میں متعارف ہو سکوں۔“ وہ بولی۔

”ویسے تو میں سفارش کا قائل نہیں ہوں۔ صرف آپ کا ٹیلنٹ ہی آپ کو آگے لے جاسکتا ہے۔ سفارش کرنے سے کوئی فلم اشار نہیں بن جاتا۔“ ساحر نے کہا۔

”جی آپ نے ٹھیک کہا۔ میں کوشش کروں گی کہ آپ کو مایوسی نہ ہو۔“ وہ کسی جادوگر کی طرح مسکون لہجے میں بولی۔ ساحر اس کے سحر میں گرفتار ہونے لگا تھا۔

”ٹھیک ہے سید محمود سے بات کر کے آپ کو بتاؤں گا لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ ابن ادیب نے آپ کو آگے کیوں نہیں بڑھایا۔ ان کے پاس بھی بہت سارے پروجیکٹ ہیں۔“

”دراصل ان کے کئی پروجیکٹ تکمیل کے لیے پروڈیوسرز نے آپ کو دے دیے۔ آپ کی وجہ سے انہیں قدم قدم پر زک پہنچ رہی ہے اس لیے وہ اپنے کیریئر سے مایوس ہیں۔“

”یہ ایک عجیب بات بتائی، ویسے میں نے کبھی اس کے پروجیکٹ پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ پروڈیوسرز اگر کوئی سیریل مجھے دے دیتے ہیں تو اس کے معنی ہیں کہ ابن ادیب کے پلاٹ میں خامی ہے۔“

ساحر نے شرمین کو معنی خیز نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ تمہیں فلم انڈسٹری میں بھیج کر اسے کیا فائدہ ہوگا۔ وہ بھی بڑی کایاں لگ رہی تھی جیسے اس کے مقصد کو سمجھ گئی ہو۔ وہ ادائے بے نیازی سے بولی۔



”بات کچھ بھی ہو مگر میں یہی مانتی ہوں کہ آپ ان سے بڑے راشر ہیں۔“

”میں اپنے پروڈیوسر سے بات کرتا ہوں۔“
”آپ کے یہاں کافی پلانے کا رواج نہیں۔“
”سوری..... کیوں نہیں۔“ ساحر جیسے اس کے سحر میں کھویا ہوا تھا گڑبڑا کر بولا پھر سلطان کو آواز دے کر کافی لانے کو کہا۔

”کیا آپ کا کارڈ مل سکتا ہے۔“ اس نے کہا تو ساحر نے فوراً دراز سے ایک وزینگ کارڈ نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔ اتنے میں سلطان کافی لے آیا۔ وہ اپنی محرومی انگلیوں کو طبلہ بجانے کے اسٹائل میں ٹیبل پر ہلارہی تھی۔ اس کی گوری انگلیوں کے ناخنوں پر لگی بلیک کلر کی ٹیل پالش کسی زہریلے سیاہ سانپ کے پھن کی طرح لگ رہی تھی۔ ساحر اس کے حسن سے خاصا متاثر تھا۔ کافی پینے کے دوران وہ اپنے کیرئیر کے بارے میں بتانے لگی۔ پھر فلم انڈسٹری اور ہدایت کار موضوع بحث آئے۔ کافی ختم کر کے وہ اٹھ گئی۔

”اچھا ساحر صاحب! اب اجازت دیں۔ میں آپ کے جواب کا انتظار کروں گی۔“ وہ مترنم آواز میں بولی۔
”جی میں آپ کو کال..... پر بتا دوں گا۔“ ساحر کال کہہ کر رکھا پھر بولا تو شرمین اس کا مقصد سمجھ گئی۔ وہ ہنسی پھر اپنے پرس میں سے اسمارٹ فون نکالا اور دوسرے ہاتھ میں موجود ساحر کے کارڈ پر درج نمبر ڈائل کرنے لگی۔ چند سیکنڈ بعد ہی ساحر کا فون بجنے لگا۔

”یہ میرا نمبر ہے۔ سیو کر لیجیے۔“ اس نے فون اور کارڈ پرس میں رکھا اور واپس جانے کے لیے مڑ گئی۔ ساحر اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسی وقت اقبال کمرے میں داخل ہوا اور اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

”کہاں کھو گئے سر! اب ہوش میں آجائیں۔“ اقبال شوخی سے بولا۔ دراصل اقبال، ساحر سے خاصا بے تکلف تھا اور وہ اکثر ہنسی مذاق کرتے رہتے تھے۔ یوں بھی ساحر کافی شوخ مزاج تھا اور وہ چاہتا تھا کہ آفس میں مخصوص دفتری ماحول نہ ہو جو عجیب سی شخص پیدا کر دیتا ہے۔ لہذا آفس میں بھی گھر کی طرح کا ماحول ہو۔

”ارے بھئی کیا غضب کی چیز تھی۔“ ساحر فضا میں ہاتھ ہلا کر بولا۔ جیسے کسی مشاعرے میں غزل کی داد دے رہا ہو۔
”مجھے تو وہ کوئی شرابی غزل لگ رہی تھی جس کے نشتے میں میرا دوست مدھ مست ہوا نظر آتا ہے۔“ اقبال ہنسا۔

”ہاں کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ ساحر کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھا۔

☆.....☆
ساحر نے سید محمود سے شرمین کے حوالے سے بات کی تو وہ بغیر کسی پس و پیش کے راضی ہو گئے۔ چونکہ فلم بھی جدید طرز کی تھی لہذا انہیں ویسے بھی نئے چہروں کی تلاش تھی۔ ویسے بھی ساحر ایک مایہ ناز ادیب تھا۔ وہ اس کی بات کیسے رد کر سکتے تھے۔ سید محمود سے بات کرنے کے بعد اس نے سوچا کہ یہ خوش خبری فوراً شرمین کو سنائی جائے۔ لہذا اس نے شرمین کا نمبر شیخ کیا۔ چند سیکنڈ بعد ہی موبائل فون سے شرمین کی مترنم آواز ابھری۔

”جی ساحر صاحب..... کوئی خوش خبری ہو تو سنائیے۔“
”جی ہاں آپ کے لیے خوش خبری ہی ہے۔ سید محمود صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔ آپ ان سے ایک میٹنگ کر لیں۔“ ساحر نے کہا۔
”اس کے لیے میں آپ کی احسان مند ہوں۔“ شرمین نے کہا۔

”احسان کی کوئی بات نہیں۔ آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔“ ساحر کی جملے بولنے لگا۔
”چھوڑیں یہ رکی باتیں۔ آج کی بات کریں کیا میں آج شام کو کچھ وقت آپ کے ساتھ گزار سکتی ہوں۔“ شرمین نے کہا تو ساحر کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے جیسے اس کی مراد بر آئی ہو۔

”کیوں نہیں میڈم۔“ ساحر نے خوش دلی سے کہا۔
”تو پھر آج شام کو ہم باہر کھانا کھائیں گے۔“ شرمین نے چمک کر کہا۔

”ٹھیک ہے، ڈن۔“ ساحر نے جھٹ کہا۔
”صرف میں اور آپ..... تیسرا کوئی نہیں۔“ شرمین نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ساحر نے سوچا اندھے کو کیا چاہیے دو آنکھیں، جب وہ خود ہی قریب آ رہی ہے تو پھر سوچنا کیسا۔
”اوکے..... ڈن۔“ کیا آپ مجھے گھر سے پک کر لیں گے یا میں آپ کے آفس آ جاؤں۔“ شرمین نے کہا۔

”میں آپ کو پک کر لوں گا، کل ٹھیک پانچ بجے میں آپ کے گھر کے قریب پہنچ کر آپ کو کال کروں گا اور اپنا ایڈریس مجھے میسج کر دیں۔“ ساحر نے کہا۔ اس کے بعد کال منقطع کر دی۔ وہ تو خود بخود ساحر کی طرف پیش قدمی کر رہی تھی۔ اس کا بیشتر لڑکیوں سے واسطہ پڑا لیکن شرمین جیسی اس

نے اب تک نہیں دیکھی تھی۔ اسے شرمین سے خاصا لگاؤ ہو گیا تھا۔ ساحر نے اقبال کو شرمین سے ملاقات کا ذکر کیا۔

”ارے بھئی آپ کی تو لائری لگ گئی۔ شرمین جیسی دو شیرزہ خود بخود آپ کی طرف لپک رہی ہے۔“ اقبال نے ہنس کر کہا۔

”یاد رہے آج کل کی لڑکیوں کو نہیں جانتے یہ اپنا کام نکالنے کے لیے گدھے کو بھی باپ بنا لیتی ہیں۔“ ساحر نے کہا۔

”چلو یونہی سہی..... کچھ آرہا ہے ناں..... جا تو نہیں رہا۔“ اقبال مسکرایا۔

”ہاں یہ تو ہے لیکن وہ اپنا کام نکلنے کے بعد پہچانے گی بھی نہیں اور اگر سید محمود نے اسے اپنی فلم میں کاسٹ کر لیا تو اس کے غرے اور بھی بڑھ جائیں گے۔“ ساحر نے خدشہ ظاہر کیا۔

”اس غم میں کیوں گھلتے ہو دوست۔ جب تک کھیر کھانے کو مل رہی ہے کھاتے رہو۔“ اقبال نے مشورہ دیا۔
”ہونہہ..... شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں بھی دیکھتا ہوں کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔“ ساحر نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

اگلے روز شام پانچ بجے ساحر اپنی کروڑا میں آفس سے نکلا۔ اس کا رخ شرمین کے گھر کی طرف تھا۔ وہ پندرہ منٹ میں گلشن اقبال کے اس بلاک میں پہنچ گیا جہاں شرمین کا گھر تھا۔ ”مائی ہائٹس“ اس نے اپارٹمنٹ کے ٹاپ پر لکھا دیکھا تو کار ایک طرف کر کے روک دی۔ اس نے فون پر شرمین کو اپنی آمد کی اطلاع دی۔ تقریباً تین منٹ بعد شرمین اپارٹمنٹ کے مین گیٹ سے باہر آ گئی۔ ایک لمحے کو ایسا لگا کہ شاہی محل سے کوئی شہزادی باہر آ رہی ہے۔ واقعی وہ لا جواب حسن کی مالک تھی۔ وہ کیٹ واک کے اسٹائل میں چلتی ہوئی آئی اور ساحر کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی کار آگے بڑھ گئی۔

تقریباً بیس منٹ بعد وہ ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ساحر نے کھانے کا آرڈر دیا۔ شرمین اب تک کافی بے تکلف ہو چکی تھی۔

”تم بہت خوب صورت ہو۔“ ساحر نے شرمین کو دیکھتے ہوئے بلا ضرورت کہا۔

”جی شکریہ..... آپ بھی بہت اچھے ہیں ساحر صاحب۔“ شرمین نے جوابا کہا۔

”کیا تم سید محمود سے ملی تھیں۔“ ساحر نے پوچھا۔
”جی میری ان سے فون پر بات ہوئی تھی۔ انہوں نے کل بلایا ہے۔ ویسے ان کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ مجھے فلم میں کاسٹ کرنے کے لیے ذہن بنا چکے ہیں۔“ شرمین نے کہا۔ اتنی دیر میں ویٹر کھانا لے آیا اور ان کی ٹیبل پر سروس کرنے لگا۔ وہ ویٹر کی موجودگی میں خاموش رہے۔ ویٹر کے جانے کے بعد وہ کھانا پلیٹوں میں نکالنے لگے۔
”فلم اشار بننے کے بعد مجھے بھول تو نہیں جاؤ گی۔“ ساحر نوالہ چباتے ہوئے بولا۔

”کیسی باتیں کرتے ہیں ساحر صاحب، آپ بھی کوئی بھولنے کی چیز ہیں۔“ شرمین مسکرائی۔ اس کا جملہ سن کر ساحر کا دل خوشی سے جھومنے لگا۔

”دراصل شہرت بہت بری شے ہے۔ اس کی بلندی پر جانے کے بعد نیچے دیکھنے پر اپنے بہت سے دیرینہ دوست چھوٹے نظر آتے ہیں۔“ ساحر نے کہا۔ شرمین نظر اٹھا کر ساحر کو دیکھنے لگی۔ ”میں آپ کو کبھی نہیں بھولوں گی کیونکہ آپ میرے محسن ہیں۔“ شرمین بولی۔
”بس محسن!“ ساحر معنی خیز لہجے میں بولا۔ اس کے جملے پر شرمین مسکرانے لگی۔

”اور آپ مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہیں۔“ وہ طنز پر انداز میں بولی۔ اس کی بات پر ساحر معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔

”خیر چھوڑو، یہ بتاؤ مستقبل میں تمہارا کیا پروگرام ہے اپنے کیریئر کے حوالے سے۔“ ساحر نے موضوع تبدیل کیا۔
”میں فلمی دنیا میں جانا اور شہرت کی بلندیوں کو چھونا چاہتی ہوں۔“ شرمین دھیرے سے بولی۔

”گڈ! اچھی بات ہے۔“ ساحر نے جوابا کہا۔ پھر وہ کھانا کھا کر جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ساحر نے شرمین کو واپس گھر ڈراپ کیا پھر وہاں سے اپنے گھر ہولیا۔ شرمین چند دنوں میں ہی اس کے دل میں اپنی جگہ بنا چکی تھی لیکن ساحر مجھے کا شکار تھا کہ شرمین اس کو بطور سیڑھی استعمال کر رہی ہے یا واقعی اس میں دلچسپی لے رہی ہے۔ فی الحال کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہوتا اس لیے اس نے خود کو جھوٹی تسلی دی کہ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

ویسے یہ کہانی ایک طرف نہیں تھی۔ شرمین بھی ساحر کے قریب آ رہی تھی۔ سید محمود سے تعارف کرانے کے بعد شرمین کا ساحر سے واسطہ ختم ہو جانا چاہیے لیکن وہ خود اس سے مل رہی

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

پین کی

تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

STERIODS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ایوارڈز ہولڈر اجمل زیدی کے دور پاکستان کا مستقل پروگرام



ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD



AWARD OF BEST ACHIEVEMENT



AWARD PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد

مکان نمبر 462 نزد سٹریٹ نمبر 20، بلاک G-8/1
ریجنل (ضلعی چوک) اسلام آباد
فون (051) 32331725
موبائل 0300-8566188

9- اپریل 30 تا مئی
9- اگست 30 تا ستمبر
9- دسمبر 30 تا جنوری

لاہور

گلف سینٹر

14- فروری تا 27 فروری
14- جون تا 27 جون
14- اکتوبر تا 27 اکتوبر
آفس نمبر 16
فیروز پور روڈ مرگ چوکی
نزد الائیڈ بینک لاہور
موبائل نمبر 0300-8566188

بشاور

ہسٹل لیسٹ

کیم فروری 11 تا فروری
کیم جون 11 تا جون
کیم اکتوبر 11 تا اکتوبر
نی نئی روڈ نزد سٹریٹ چوک پشاور
موبائل 0300-8566188

ملتان

ہسٹل سائبر سٹور

28 مارچ تا 6 اپریل
28 جولائی تا 6 اگست
28 نومبر تا 7 دسمبر
ریجنل سٹور نزد چوک نزد ہسٹل ملتان
فون (061) 4518061-62
4582803 (0300-8566188)

کراچی

نیشنل سٹور

13 مارچ تا 27 مارچ
13 جولائی تا 27 جولائی
13 نومبر تا 27 نومبر
آفس 7706 فلور شاہراہ فیصل
نرسری اسٹاپ بینک
الفلاح اور ایم کی بی
موبائل 0300-8566188

پسند کرنے لگا تھا اور نشے نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ آہستہ آہستہ نشہ اور بڑھ گیا۔ ساحر کی آواز لہرائے لگی اور وہ باتونی انداز میں اول فول بولنے لگا۔ ادھر شرمین اسے اپنی اداؤں سے بھانے لگی تو ساحر مزید اس کے قریب آنے لگا لیکن شرمین نے ساحر کو ایک مقررہ حد سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ سب سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کر رہی ہے۔ ساحر نشے میں دھت نیم بے ہوشی کی حالت میں صوفے پر پڑا ہوا تھا۔ اسے یہ بھی خبر نہیں ہوئی کہ شرمین کب کی جا چکی ہے۔ تقریباً رات کے دس بجے اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے کسمسا کراٹھائی لی۔ پھر اس نے اپنا فون اٹھا کر شرمین کا نمبر ملایا۔ ”ہیلو شرمین۔“

”جی ساحر صاحب۔“ دوسری طرف سے شرمین کی آواز آئی۔

”تم کہاں ہو؟“ ساحر نے تعجب سے پوچھا۔
”ارے ساحر صاحب لگتا ہے آپ کو زیادہ چڑھ گئی تھی۔ مجھے تو قہقہے نہیں تھی کہ آپ کی ایسی حالت ہو جائے گی۔ بہر حال مجھے دیر ہو رہی تھی اور آپ کی حالت ایسی نہیں تھی کہ آپ مجھے گھر ڈراپ کر سکتے۔ لہذا میں گھر آ گئی۔“ شرمین نے صفائی پیش کی۔

”چلو ٹھیک ہے ڈونٹ وری، پھر ملتے ہیں۔“ ساحر نے یہ کہہ کر لائن کاٹ دی۔ ساحر جیسے ہی کھڑا ہوا اسے لگا کہ جیسے اس کے سر پر نمون وزن رکھا ہوا ہے۔ بہر حال وہ جیسے تیسے آفس بند کر کے گاڑی تک گیا۔ جسمانی طور پر ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے اسے ڈنڈوں سے مارا ہو۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ اس نے کبھی شراب کو ہاتھ بھی نہ لگایا ہو۔ ایک دو بار اس نے فلم ایوارڈ فنکشن اور ایک فنکاروں کے پروگرام میں پی ٹی وی لیکن اس وقت بھی ایسی حالت تو نہیں ہوئی تھی۔ پھر رات گئے تک شرمین کا فون دوبارہ آیا۔ اس نے ساحر کی طبیعت پوچھی اور بہت معذرت کرنے لگی۔ ساحر نے اسے باور کرایا کہ اس کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ وہ شرمندہ نہ ہو۔

اگلے دن ساحر حسب دستور اپنے آفس پہنچ گیا۔ سید محمود کا فون بھی آیا تھا۔ وہ اس پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ فلم کا اسکرپٹ جلدی شروع کر دے تاکہ یہ کام اگلے مرحلے میں داخل ہو سکے کیونکہ اسکرپٹ ہی اس پروجیکٹ کی پہلی سیڑھی تھی۔ اس نے سوچا کہ فلم کے اسکرپٹ پر آج سے ہی کام شروع کر دیا جائے۔ اقبال اور سلطان بھی آچکے تھے۔ وہ فلم کے مرکزی خیال کے مطابق اسکرپٹ لکھنے کی کوشش کر رہا تھا

تھی۔ اگلے دن وہ شام پانچ بجے پھر ساحر کے آفس پہنچ گئی۔ ساحر اسے دیکھ کر حیران بھی تھا اور خوش بھی۔ پانچ بجے آفس ٹائم ختم ہو جاتا تھا۔ لہذا اقبال اور سلطان جا چکے تھے۔ صرف ساحر اور شرمین آفس میں موجود تھے۔

”خیریت تو ہے میڈم! آج پھر میرے نصیب جاگ گئے۔“ ساحر نے خوش دلی سے کہا۔

”ہاں تم سے مل کر مجھے اچھا لگتا ہے۔ جب سے تم سے ملی ہوں دل چاہتا ہے روزانہ تم سے ملوں۔“ شرمین نے کہا۔
”اچھا تو میں اس جذبے کو کیا نام دوں۔“ ساحر ہنس کر بولا۔

”پتا نہیں۔“ شرمین دوسری طرف منہ کر کے مسکرائی۔
”آج کہاں چلنا ہے۔“ ساحر نے پوچھا۔

”آج کہیں نہیں جائیں گے۔ یہیں تمہارے آفس میں ہی انجوائے کریں۔“ شرمین نے کہا۔
”اچھا لیکن آفس میں تو انجوائے کرنے کوئی سہولت نہیں ہے۔“ ساحر نے کہا۔

”انجوائے کرنے کی چیز میں ساتھ لائی ہوں۔“ شرمین نے کہا اور اپنے پرس میں سے ایک چھوٹی سی شراب کی بوتل نکالی۔

”ارے یہ کیا ہے۔“ ساحر نے مسکرا کر کہا۔
”انگلش ہے۔“ شرمین مسکور کن لہجے میں بولی اور اٹھ کر آفس سے ملحق چھوٹے سے چکن میں گئی اور وہاں سے شیشے کے دو گلاس لے آئی۔

”لیکن میں شراب نہیں پیتا۔“ ساحر نے کہا۔

”تو میں کون سی عادی ہوں۔ ہم تو صرف انجوائے کریں گے اور بس!“ شرمین نے کہا اور تھوڑی تھوڑی سی دونوں گلاس میں انڈیلی۔ پھر ایک گلاس ساحر کی طرف بڑھا دیا۔ ساحر نے جھجکتے ہوئے گلاس لے لیا۔

”چیر.....!“ شرمین نے ساحر کے گلاس سے گلاس نکرایا۔ پھر وہ دونوں ایک ساتھ ایک گھونٹ کے برابر محلول حلق میں انڈیل گئے۔ ساحر نے برا سامنہ بنایا۔

”بہت کڑوی ہے۔“

”مگر اس کا اثر بہت میٹھا اور مسکور کن ہے۔“ شرمین مستی بھرے لہجے میں بولی۔ ساحر نے سر کو جھکا۔ شاید اسے نشہ چڑھ رہا تھا۔ شرمین نارٹل تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ شراب کی عادی ہے۔ پھر شرمین بڑی خوب صورتی سے ادائیں دکھانے لگی جیسے ساحر کو بھانے کی کوشش کر رہی ہو۔ ساحر تو پہلے ہی اسے

جولائی 2018ء

210

ماہنامہ سرگزشت

لیکن یہ کیا۔ اسے اپنا دماغ بند محسوس ہو رہا تھا۔ ”لگتا ہے شراب کے اثرات ابھی تک دماغ پر ہیں۔“ اس نے سوچا پھر لکھنے کا ارادہ کچھ دیر کے لیے موقوف کر دیا۔ اقبال گراٹک کے کام میں مصروف تھا۔ سلطان صفائی ستھرائی کے کام میں مشغول تھا۔

تقریباً تین دن تک ساحر کچھ لکھ نہیں پایا۔ اس دوران میں شرمین سے بھی کسی قسم کا کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ ساحر وہی طور پر کچھ پریشان سا تھا۔ وہ ایک دن میں اچھا خاصا مواد لکھ لیا کرتا تھا لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ وہ گزشتہ تین روز سے لکھنے سے معذور رہا۔ اسے بار بار شراب کا خیال آ رہا تھا لیکن شرمین کا چہرہ بخیل میں آتے ہی وہ اپنی ساری کوتاہیاں اور شرمین کی حرکت بھول جاتا تھا۔

تین دن بعد شام کے تقریباً ساڑھے تین بجے شرمین آفس آگئی۔

”ہیلو ساحر! کیسے ہو۔“ وہ ہنس کر بولی۔
”ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ تین دن کہاں رہیں۔“ ساحر نے پوچھا۔

”اس دوران سید محمود صاحب سے میٹنگ ہوئی۔ انہوں نے مجھے اپنی نئی فلم کے لیے سائن کر لیا ہے۔ فی الحال تو سائیڈ ہیروئن کا کردار دیا ہے۔ وہ میری پرفارمنس دیکھ کر مجھے اپنی اگلی فلم میں ہیروئن کا کردار دیں گے۔“ شرمین نے بتایا۔
”اوہ..... گڈ..... مبارک ہو تمہیں۔“ ساحر نے خوش ہو کر کہا۔

”تم سناؤ تمہاری طبیعت اب کیسی ہے۔“ شرمین نے کہا۔

”ویسے تو ٹھیک ہے لیکن گزشتہ تین دن سے سر بھاری سا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں ٹھیک ہو جائے گا۔ تم یہ بتاؤ اس دن میں نے تمہارے ساتھ کوئی بدتمیزی تو نہیں کی۔ اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔“ ساحر نے کہا۔

”نہیں ساحر صاحب! ایسی کوئی بات نہیں، اتنا تو چلتا ہے۔ آپ مگنی ٹیل نہ کریں۔ ڈونٹ وری۔“ شرمین نے کہا۔

”تھینک گاڈ! میں تو سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔“ ساحر نے کہا۔

”خیر چھوڑیں۔ آج میں آپ کو اپنے ہاتھ کی کافی پلاؤں گی۔“ شرمین بے تکلفی سے بولی۔

”کیوں نہیں۔“ ساحر نے خوش ہو کر کہا تو شرمین اٹھ کر بڑی بے تکلفی سے کچن کی طرف چلی گئی۔ جہاں کافی بنانے کا

سامان اور چھوٹا سا چولہا رکھا ہوا تھا۔ وہ کافی بنانے لگی۔ کافی کے دو کپ تیار کر کے اس نے اپنے گریبان میں سے کوئی چیز نکالی۔ یہ ایک چھوٹی سی ڈراپر بوتل تھی۔ اس نے کافی کے ایک کپ میں چند قطرے پکائے اور بوتل واپس گریبان میں رکھ لی۔ ایک ٹرے میں کافی لے کر آفس میں آئی، اپنے ہاتھ سے اٹھا کر ایک کپ ساحر کو دیا اور دوسرا خود پینے لگی۔

”اوہ! تم تو بہت اچھی کافی بناتی ہو۔“ ساحر نے ایک چسکی لے کر کہا۔

”شکریہ ساحر صاحب! دراصل آپ ہیں ہی اتنے اچھے کہ میں چاہتی ہوں روزانہ آپ کو اپنے ہاتھ کی کافی پلاؤں لیکن قدر رکھ دیتا ہے روز کا آنا جانا۔“ شرمین نے کہا۔

”ارے بھئی! تمہیں کس کم بخت نے یہاں آنے سے منع کیا ہے۔ تمہارا اپنا آفس ہے جب چاہو آؤ اور تمہاری قدر تو میرے دل میں ہے۔“ ساحر خوش دلی سے بولا۔ شرمین ساحر کی بات سے قدرے مطمئن نظر آنے لگی۔ پھر ایسا ہوا کہ شرمین روزانہ شام کو آفس آنے لگی اور اپنے ہاتھ سے کافی بنا کر ساحر کو پلائی، اپنے حسن کے جلوے دکھا کر اسے سحر زدہ کر کے چلی جاتی تھی۔ یہ سلسلہ کافی دن تک چلتا رہا تھا۔ پھر اچانک شرمین غائب ہو گئی۔ اس نے آفس آنا چھوڑ دیا۔ ساحر نے دو تین بار اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن رابطہ نہ ہو سکا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شرمین اچانک کہاں غائب ہو گئی۔ وہ حسن کی پری اس پر جادو کر کے نہ جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔

آج تقریباً پندرہ دن ہو چکے تھے اور ساحر اسکرپٹ لکھنے کے نام پر ایک نقطہ بھی نہیں لگا سکا تھا۔ پہلے تو وہ اسے شراب کا اثر سمجھتا رہا تھا لیکن شراب کا اثر اتنے دن تک نہیں رہتا۔ وہ تشویش کا شکار تھا کہ آخر اسے کیا ہو گیا ہے۔ وہ لکھ کیوں نہیں پا رہا ہے۔ سید محمود کے علاوہ تقریباً چار پانچ چینل پر اس کے ڈراما سیریل چل رہے تھے۔ وہ بھی نہیں لکھ پا رہا تھا۔ اس دوران اس کی کئی پروڈیوسروں سے تلخ کلامی بھی ہو چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا دماغ بند کیوں ہو گیا ہے۔ اقبال نے اسے بتایا کہ وہ گزشتہ پندرہ دن میں خاصا کمزور ہو گیا ہے اور اس کی آنکھوں میں حلقے پڑ گئے ہیں لیکن وہ تو نیند بھی پوری لے رہا تھا اور جسمانی طور پر اسے کوئی تکلیف بھی لاحق نہیں تھی۔

تقریباً مزید ایک ہفتہ گزرنے کے بعد ساحر کو سر پکھرانے اور آنکھوں کے آگے اندھیرا آنے کی شکایت بھی

شروع ہو گئی وہ ڈرائیونگ کرنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ تب اس نے ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ ڈاکٹر نے اس کا بیان سننے کے بعد چند ضروری ٹیسٹ لکھ کر دیئے جن میں برین اسکین بھی شامل تھا۔ چند دنوں میں رپورٹیں بھی آ گئیں۔ تب ڈاکٹر نے اس کی رپورٹیں دیکھ کر بتایا کہ اس کے دماغ میں نیوروسٹم کئی جگہ سے متاثر ہے جس کی وجہ سے نیورٹراسمیشن رخساندازی کا شکار ہے اور اس کی وجوہات نامعلوم ہیں۔

”لیکن یہ پرالیم ہوا کیسے۔“ ساحر نے تشویشناک لہجے میں کہا۔

”اس کی وجوہات میں ایک خاص قسم کا زہر ہے جو مختلف ادویات میں شامل کیا جاتا ہے۔ اس کے سائیڈ افیکٹ کے طور پر یہ علامات پیدا ہوئی ہیں اور وہ زہر عموماً جان بچانے والی ادویات میں استعمال کیا جاتا ہے آپ نے ایسی کوئی دوا استعمال کی۔“ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

”لیکن ڈاکٹر صاحب میں نے تو ایسی کوئی دوا استعمال نہیں کی، کیا شراب سے ایسا ہو سکتا ہے کیوں کہ پچھلے دنوں میں نے اتفاقیہ طور پر پی لی تھی۔ ویسے میں شراب نہیں پیتا۔“ ساحر نے بتایا۔

”جی نہیں یہ شراب کے اثرات نہیں۔“ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

”تو کیا اس کا علاج ممکن ہے۔“ ساحر نے پوچھا۔
”اگر زہر کا نام پتا چل جائے تو اس کا تریاق کیا جاسکتا ہے۔“ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

”لیکن میں کیسے بتا سکتا ہوں۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ یہ زہر میرے جسم میں کیسے گیا جب کہ میں نے تو کافی عرصہ سے کوئی دوا استعمال نہیں کی۔“ ساحر الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میں کچھ ادویات لکھ کر دے رہا ہوں۔ آپ یہ استعمال کریں۔ خدا خیر کرے گا۔“ ڈاکٹر صاحب نے کچھ ادویات لکھ کر پرچا ساحر کو دے دیا۔ ساحر، ڈاکٹر صاحب کی لکھی ہوئی ادویات استعمال کرتا رہا لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ ساحر کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ سوکھ کر کاٹا ہو گیا۔ اس سے چلنا پھرنا بھی محال ہو گیا۔ آنکھوں میں گڑھے پڑ گئے۔ نقاہت اتنی تھی کہ اس سے بولنا بھی محال ہو رہا تھا۔ اسے اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ ساحر کی اچانک بیماری کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ بڑے بڑے پروڈیوسر، ٹی وی چینلز کے ڈائریکٹر، اداکار اور

ادیب اس کو دیکھنے اسپتال پہنچ رہے تھے۔ ساحر کے اس طرح صاحب فراش ہونے پر سبھی حیران و پریشان تھے۔ اس کے ان گنت پروجیکٹ ادھورے تھے۔ ہدایت کار اور ڈائریکٹر جن کے ادھورے اسکرپٹ ساحر کے پاس پھنسے ہوئے تھے وہ سخت ٹینشن میں تھے۔ لیکن ساحر کی حالت دیکھ کر وہ سب بے بس نظر آ رہے تھے۔ وہ سب یہی چاہتے تھے کہ ساحر جلد از جلد صحت یاب ہو جائے اور ان کے پروجیکٹ مکمل کر دے۔

اسپتال میں ساحر کے وارڈ میں ملاقاتیوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ساحر ادھ کھلی آنکھوں سے اس کی عیادت کے لیے آنے والوں سے مل رہا تھا اور بڑی نقاہت سے ان کے جواب دے رہا تھا۔ بھی دو افراد اس کے وارڈ میں داخل ہوئے۔ وہ اپنی دگرگوں حالت کے باوجود انہیں پہچان گیا۔ وہ ابن ادیب اور شرمین تھے۔ وہ دونوں اس کے بیڈ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔

”ارے ساحر صاحب! یہ سب کیا ہوا، کیسے ہو گیا۔“ شرمین کی مترنم آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”بھئی مجھے بڑا افسوس ہوا اللہ آپ کو صحت دے۔ آپ کے تو کافی پروجیکٹ ادھورے پڑے ہیں۔ ان سب کا کیا ہو گا۔“ ابن ادیب نے کہا۔ ساحر کچھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن الفاظ اس کے منہ سے نہیں نکل پارہے تھے۔ ابن ادیب نے پھولوں کا بو کے اس کے سر ہانے رکھ دیا۔ اس وقت وارڈ میں ان تینوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ ابن ادیب شرمین کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ دونوں کچھ دیر ساحر کے قریب خاموش کھڑے رہے۔ پھر ساحر سے اجازت لے کر جانے لگے۔ ابن ادیب اور شرمین وارڈ کے خارجی دروازے پر پہنچ کر رک گئے۔ ساحر نقاہت کے سبب بول نہیں پا رہا تھا لیکن وہ دیکھ اور سن سکتا تھا۔ اس نے وہیں سے لیٹے لیٹے دیکھا۔ ابن ادیب شرمین کو انگوٹھے سے لائیک کا نشان بنا کر دکھا رہا تھا۔ اس کے جواب میں شرمین نے بھی ایسا ہی کیا۔

”تم نے تو بہت اچھی فارمنس دکھائی۔ میرا خیال ہے کہ تم بہت ترقی کرو گی۔“ ابن ادیب نے کہا اور ایک لفافہ جیب سے نکال کر شرمین کی طرف بڑھایا۔

”یہ ہے تمہارا معاوضہ۔“ ابن ادیب نے کہا اور شرمین نے جھپٹ کر لفافہ اپنے پرس میں رکھ لیا۔ دور بیڈ پر لیٹا ساحر یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔

ایک دلچسپ اور سبق آموز سچ بیانی ارسال خدمت ہے جو ان سب کے لیے ہے جنہیں یقین ہے کہ میزانِ عدل کا فیصلہ ہی اہم فیصلہ ہے۔
اعزاز سلیم وصلی
(فیصل آباد)

”ہاں سر لگتا تو یہی ہے کیونکہ پٹواری اور تحصیل دار بھی ہمارے حق میں ہیں۔“ خالد مسکراتے ہوئے بولا۔
”ہاں لگتا ہے کافی مال کھلایا ہے تم نے انہیں۔“ وہ ہنسا۔

”کروڑوں کی زمین ہے، قریب سے ہی دو بڑے شہروں کو ملانے والی سڑک گزر رہی ہے، آج اگر ایک کروڑ قیمت ہے تو باقی پاس بنتے ہی یہ چار پانچ کروڑ کراس کر جائے گی، اتنے پیسوں کے لیے لاکھ دو لاکھ دے دینا کوئی بڑی بات نہیں۔“ خالد نے تفصیل بتائی۔

”اچھا کیا، میں درخواست کروں گا جج سے آج ہی فیصلہ سنا دیں۔“
”ہاں سر، مجھے بھی بہت جلدی ہے اس کیلئے عامر کے چہرے پر مایوسی دیکھنے کی۔“

خالد کا بیٹا احمد جو کافی دیر سے خاموش بیٹھا تھا وہ بول پڑا۔
”چند ماہ پہلے ہونے والی لڑائی میں عامر نے ہی اس کا سر پھاڑا تھا۔“

وہ رشتے میں خالد کے بھائی عابد کا سالہا تھا۔ کافی تیز مزاج اور غصیلہ شخص تھا۔ سماعت شروع تو ہوئی مگر فیصلہ نہ سنایا گیا کیونکہ عابد کا وکیل بیمار تھا اس لیے اگلی تاریخ چودہ دن بعد دی گئی۔ خالد اور احمد کے چہرے پر مایوسی تھی۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آج نہیں ہوا تو چودہ دن بعد ہو جائے گا۔“ شاہ زیب نے ان کا حوصلہ بڑھایا۔
دونوں ہاتھ ملا کر گھر کو چل دیے۔ راستے میں احمد نے عامر کو دیکھا۔ ”ابوہ جارہا ہے کتا۔“ وہ نفرت سے بولا۔

”چل ٹھنڈا رہ، کیس کا فیصلہ ہو لے پھر اس سے بھی نمٹ لیں گے۔“ خالد نے ہولے سے اس کا ہاتھ دبایا۔ عامر نے انہیں دیکھ کر منہ پھیر لیا تھا۔

☆.....☆

سیشن کورٹ کی عمارت کے قریب پارکنگ میں اس نے اپنی کار روکی اور چیمبر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ سیشن کورٹ کے چند بہترین وکلاء میں سے ایک تھا۔ نام سید شاہ زیب تھا تعلق ٹڈل کلاس فیملی سے تھا۔ گاؤں میں اس کی زمین تھی جس کی آمدنی سے گزارا اچھا ہو جاتا تھا۔ ایل ایل بی کرنے کے بعد اپنے ایک کلاس فیلو کے والد کے ساتھ جو کافی مشہور تھے مل کر اس نے پریکٹس شروع کی۔ چند سالوں میں بہت کچھ سیکھ کر جب اس نے اپنا الگ چیمبر بنایا تو اس کا شمار کامیاب وکلاء میں ہونے لگا۔ آج بھی وہ ایک کیس کے سلسلے میں جلدی آگیا تھا۔ آفس میں بیٹھ کر اس نے کورٹ اتارا اور قریب پڑے صوفے پر پھینک دیا۔ اس کا اسٹنٹ پاس آیا۔ ”سر آج خالد کے کیس کی سماعت ہے۔“
”ہاں یاد ہے مجھے، تم ایسا کرو اس کی فائل پکڑو اور ٹائم بتاؤ؟“

”دس بجے کے بعد عدالت پہنچنا ہے۔“
”اوکے۔“ وہ سر ہلا کے بولا۔ اسٹنٹ اصغر نے فائل پکڑائی اور وہ غور سے اس کے مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔
”اصغر، ایک کپ چائے کا منگواؤ۔“ سر اٹھائے بغیر اس نے کہا۔

”اوکے سر۔“ کہہ کر اصغر باہر چل دیا۔ اسی دوران خالد اور اس کا بیٹا احمد اجازت لے کر چیمبر میں داخل ہوئے۔ اس نے مسکراتے ہوئے ان سے ہاتھ ملایا۔ رسی کلمات کے بعد وہ کیس کے سلسلے میں بات کرنے لگے۔ یہ زمین کی تقسیم سے پیدا ہونے والا جھگڑا تھا اور مخالف پارٹی میں خالد کا بھائی اور اس کا سالہا شامل تھے۔ چند ماہ پہلے زمین کے اس جھگڑے پر لڑائی بھی ہو چکی تھی جس میں احمد خاصا زخمی ہوا تھا۔

”میرا خیال ہے آج کیس کا فیصلہ ہو جائے گا۔“ شاہ زیب نے خیال ظاہر کیا۔

خالد حسن اور عابد حسن، محمد حسن کے بیٹے تھے۔ عابد عمر میں تقریباً پانچ سال بڑا، دھیمے مزاج کا صلح جو شخص تھا۔ محمد حسن کی گاؤں میں زیادہ زمین نہیں تھی اس لیے اس کی وفات کے بعد دونوں نے آرام سے اپنا اپنا حصہ لیا اور محنت کرنے لگے۔ عابد کی شادی نازیہ سے ہوئی تھی جو قریب ہی گاؤں کے زمین دار احسان کی بیٹی تھی جبکہ خالد کی شادی سیکینہ سے ہوئی تھی۔ سیکینہ کی تیز مزاجی اور بدزبانی سے تنگ آ کر ہی عابد نے چھوٹے بھائی کو اس کا حصہ دے کر الگ کر دیا تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ خالد کے پاس ایک بیٹا احمد جبکہ عابد کے پاس تین بیٹیاں تھیں۔ بڑی دونوں بیٹیوں کی شادی کرتے وقت عابد نے زمین کا کافی حصہ بیچ دیا۔ مجبوری میں اسے یہ کام کرنا پڑا۔ اس لیے زمینوں سے ہونے والی آمدنی میں کافی کمی ہو گئی۔ کچھ سال پہلے جب زمینوں کا ریکارڈ کمپیوٹرائزڈ کیا گیا تو کوئی ایسی زمینیں جولا وارث پڑی تھیں یا جن پر غیر قانونی مالک قابض تھے، ان کا ریکارڈ سامنے آ گیا۔ گاؤں کے کئی زمین دار افراد کو ان کی زمینیں واپس مل گئیں۔ ایسے میں دو شہروں کو ملانے والے ڈبل روڈ پر خالد اور عابد کے نام زمین نکلی۔ یہ کروڑوں کی زمین تھی۔ عابد تقسیم کے لیے تحصیل دار اور پٹواری کے پاس گیا مگر خالد نے انکار کر دیا۔ اس کے مطابق محمد حسن نے یہ زمین اس کے نام کی تھی۔ پٹواری اور تحصیل دار کو پیسے کھلا کر اس نے زمین اپنے نام لکھوائی۔ پیسے کے لالچ میں اس کا خون سفید ہو چکا تھا۔ سیکینہ نے اس کے کان خوب بھرے۔ عابد نا انصافی پر چپ نہ رہا اور عامر کے مشورے پر عدالت سے رجوع کیا۔ دونوں جانب سے کافی بحث ہوئی مگر تحصیل دار اور پٹواری کی گواہی نے کیس خالد کے حق میں کر دیا تھا۔ بس فیصلہ ہونا باقی تھا۔ عابد اور عامر گھر میں داخل ہوئے تو ان کے چہروں سے مایوسی ظاہر ہو رہی تھی۔ خالد کی بیٹی اسما چائے بنا کر لے آئی۔

”میں نے پہلے کہا تھا تحصیل دار اور پٹواری کو تھوڑے سے پیسے دے دیتے تو وہ کم از کم ان کے حق میں تو نہ جاتے۔“ عامر نے چائے کی چمکی لی۔
”میں کہاں سے لاتا اتنے پیسے جو ان حرام خورافروں کا پیٹ بھر سکیں۔“ وہ مایوسی سے بولے۔

”کیا کریں اب، خالد کا وکیل اس سے بڑا کمینہ ہے پتا نہیں کہاں سے لے آتا ہے دلیلیں اور ثبوت۔“ عامر دکھ سے بولا۔ اس کی نظروں کے سامنے بار بار احمد اور خالد کے چمکتے

چہرے آرہے تھے۔

☆.....☆

”یہ کون ہے شاہ زیب جو بار بار کال کر رہی ہے۔“ شاہ زیب کی بیوی نمرہ نے ناگواری سے پوچھا۔

”یہ سعدیہ کی دوست ہے۔“ اس نے پُر اعتماد لہجے میں جھوٹ بولا۔ سعدیہ اس کی کزن تھی۔

”پھر آپ کو کیوں کال کر رہی ہے؟“ وہ چیختے ہوئے لہجے میں سوال کر رہی تھی۔

”کیا یا نمرہ، ہر بیوی کا شکی ہونا ضروری ہے؟ سعدیہ کا ہی پوچھ رہی تھی، یہ روایتی بیویوں والے سوال مت پوچھو پلیز۔“ اس نے اخبار اٹھا کر چہرے کے سامنے کر لیا۔

نمرہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی شاہ زیب نے موبائل اٹھایا اور کال ملا کر بولا۔ ”شاہینہ، تم جان چھوڑ دو میری، میں شادی کر چکا ہوں اور میں خوش ہوں۔“

”اور میں؟ میں جو پچھلے سات سال سے تمہارے لیے بیٹھی ہوں میں کیسے خوش ہو جاؤں شاہ زیب؟“ شاہینہ کے لہجے میں دکھ نہیں غصہ تھا۔

”مجھے نہیں پتا، وہ ماضی کا قصہ تھا، اب ختم ہو چکا ہے۔“ وہ رکھائی سے بولا۔ ”شاہ زیب میری بات سنو۔“ اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے شاہ زیب کال کاٹ چکا تھا۔ شاہینہ اور

اس نے ایل ایل بی ایک ہی یونیورسٹی سے کیا تھا۔ پہلے سال ہی وہ ایک دوسرے میں اس قدر انوالو ہوئے کہ ارد گرد کا ہوش بھلا بیٹھے۔ یونیورسٹی کے تین سال ان کے عشق کا چرچہ ہوتا رہا۔ دونوں ہر جگہ ساتھ ساتھ پائے جاتے تھے۔ ان کی جوڑی

بہت مشہور تھی کیونکہ دونوں ہی خوش شکل تھے۔ شاہینہ امیر گھر سے تھی اس نے شاہ زیب پر خوب پسپا لٹایا۔ یہاں تک کہ اپنی جوانی کی کئی راتیں بھی اس کے نام کیں۔ شاہ زیب

اس سے وعدہ کر چکا تھا کہ کچھ بنتے ہی وہ اس سے شادی کر لے گا مگر وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو جائے ریکش کے بعد جیسے ہی وہ کمانے کے قابل ہوا، اپنی بچپن کی مگلیتر نمرہ سے اس کی

شادی ہو گئی۔ شاہ زیب نے بالکل احتجاج یا اعتراض نہ کیا۔ شاہینہ اس کے لیے چکھا ہوا پھل تھا، اب وہ منہ کا ذائقہ بدلنا چاہتا تھا۔

شاہینہ کو اس کی نمرہ سے شادی کی خبر ایک ماہ بعد ہوئی۔ اب اس کی روز آنے والی کالز اور ایس ایم ایس کا شاہ زیب کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

☆.....☆

بچ کے فیصلہ سناتے ہی عدالت میں شور اٹھا۔ عدالت سے باہر آ کر شاہ زیب نے احمد اور خالد کو مبارک باد دی۔ ان کے چہرے فتح کی خوشی میں چمک رہے تھے۔ عامر اور عابد

ست قدموں سے عدالت سے باہر نکلے اور ان کی طرف دیکھے بغیر گیٹ کی جانب بڑھے۔ احمد نے انہیں جاتے دیکھا اور بلند آواز میں بولا۔ ”وکیل صاحب دل خوش کر دیا آپ

نے، کچھ لوگ تو مرجائیں گے اس غم میں۔“ اس کی بات سن کر شاہ زیب ہنس پڑا۔ عامر کے کانوں میں یہ آواز پڑی۔ اس نے مز کر دیکھا مگر عابد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آگے

چلنے کا اشارہ کیا۔ ابھی چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ احمد نے پھر زہر اگلا۔ ”بتایا جی لے جائیں اپنے سالہ صاحب کو ورنہ پرانا حساب چکا بیٹھے گا۔“

اب بات عامر کی برداشت سے باہر ہو چکی تھی۔ وہ مڑا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا ان کے قریب آیا۔ ”تیرے جیسے کمینوں سے بکواس ہی کی امید تھی اور حرام خور افسروں کو ملا کر یہ کیس

جیت کے تو نے کوئی تیر نہیں مار لیا۔“ اس کی بات سن کر احمد کے ساتھ کھڑے شاہ زیب نے درشت لہجے میں جواب دیا۔ ”زبان سنبھال کر بات کریں مسٹر

عامر ورنہ.....“ ”ورنہ کیا وکیل صاحب، آپ جیسا حرامی کر کیا لے گا۔“ عامر کے منہ سے دو تین گالیاں نکلیں۔ شاہ زیب کے

چہرے کا رنگ بدل گیا۔ عابد جانتا تھا، عامر نے بہت بڑی غلطی کر دی ہے۔ عدالت میں وکیلوں کی ایک بڑی تعداد

موجود تھی جو یقیناً شاہ زیب کا ساتھ دیتے اور یہی ہوا چانک ایک ساتھ کئی وکیل عامر پر پل پڑے۔ ان کے ساتھ ان

وکلا کے منشی بھی شامل تھے۔ عابد نے بھاگ کر اسے چھڑانے کی کوشش کی اور یہ اس کے لیے اچھا ثابت نہ ہوا۔ شاہ زیب

اور اس کے ساتھیوں نے چند لمحوں میں ہی مار مار کر ان کا برا حال کر دیا۔ خالد کی عمر کا لحاظ بھی کسی نے نہ کیا۔ اس کے منہ

سے خون جاری تھا۔ عامر کا سر پھٹ چکا تھا۔ عابد نے ہاتھ جوڑ کر شاہ زیب سے کہا۔ ”وکیل صاحب غلطی ہو گئی اس سے، معاف کر دیں خدا کے واسطے۔“ مگر یہ وہ سب کچھ سننے کے موڑ

میں نہ تھے۔ پولیس والے دور دور سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ وکلا کے نزدیک کوئی نہیں جانتا تھا۔

”منہ کالا کرو اس کتے کا، یہ جانتا نہیں تھا اس نے کس کو گالی دی ہے۔“ شاہ زیب چیخا۔ عابد اور عامر کا منہ کالا کر دیا گیا۔ وہ شرم سے سر نیچے جھکا رہے تھے مگر بے سود، کئی کے اور

تھڑا ایک ساتھ ان کے سر پر آ گئے۔ عابد کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ بے بس انسان اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ ایک گھنٹے

بعد کہیں سے وکلا کے صدر کی آمد ہوئی وہ بارعب لہجے میں بولا۔ ”شاہ زیب صاحب اتنی سزا کافی ہے اب جانے دو

انہیں۔“ شاہ زیب نے اشارہ کیا اور سب وکیل ان سے الگ ہو گئے۔ عامر اور عابد سر جھکائے باہر کی طرف چل دیے۔ ان کے دل سے نکلنے والی بد دعائیں خدا کے علاوہ کوئی نہیں سن رہا تھا۔

☆.....☆

”کچھ بتائیں بھی، کہاں جا رہے ہیں ہم۔“ نمرہ نے کوئی چوٹی بار یہ سوال پوچھا۔

”وہ سعدیہ کی دوست ہے ناں۔ شاہینہ، وہ ہماری شادی میں شرکت نہیں کر سکی تھی، آج اس کے ہاں دعوت ہے

ہماری۔“ شاہ زیب نے بتایا۔ شاہینہ نے کل اسے کال کر کے کہا تھا۔ ”شاہ زیب، میں تم سے ملنا چاہتی ہوں بس ایک بار

اپنی بیوی سمیت مل لو مجھ سے، میں سب بھول جاؤں گی بھی کال یا منیج نہیں کروں گی بس آخری بار مل لو شاہ زیب۔“ اور

شاہ زیب انکار نہ کر سکا اس لیے آج وہ دونوں میاں بیوی اس سے ملنے جا رہے تھے۔ شاہینہ کے گھر والے دوسرے

شہر میں تھے اور وہ یہاں ایک فلیٹ میں رہتی تھی۔ شاہ زیب کے تیل بجاتے ہی اس نے دروازہ کھولا۔ ”خوش آمدید!“ اس

نے مسکراتے ہوئے انہیں خوش آمدید کہا۔ دونوں اندر داخل ہوئے۔ وہ خوش دلی سے ان سے باتیں کر رہی تھی۔ کچھ دیر

بعد اس نے کھانا میز پر لگایا اور وہ تینوں کھانا کھانے لگے۔ شاہینہ کھا کم رہی تھی اور ان سے باتیں زیادہ کر رہی

تھی۔ ”ارے یہ کسٹرو تو آپ نے کھایا نہیں، اسٹیش بنایا ہے اپنے ہاتھوں سے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے پلیٹ دونوں کی

طرف بڑھائی۔ کھانا کھانے کے پانچ منٹ بعد ہی شاہ زیب اور نمرہ کو الٹیاں شروع ہو گئیں۔ ان کے منہ سے خون آرہا تھا۔ شاہینہ کی

آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ ”میرے نہیں ہو سکے تو کیا ہوا، اب تم کسی کے نہیں ہو گے۔“ اس کے لہجے میں دیوانگی تھی۔

نجانے کیوں شاہ زیب کی نظروں کے سامنے عامر اور عابد کا چہرہ آ گیا اور یہ آخری چہرے تھے جو اس نے دیکھے

میزان عدل نے سچ کو جھوٹ بنانے پر اپنا فیصلہ دے دیا تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں ہمیشہ کے لیے۔

برصغیر میں کچھ ایسے استاد تھے جو مذاہب کے اختلاف پر یقین نہ رکھتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ

کوئی ترکیب استعمال کرنی چاہیے۔ ہندو مت اور اسلام کو متحد کرنے کی سعی کے لیے یاد رکھا جانے والا

بہترین مصلح کبیر تھا۔ کبیر پیدا انٹی مسلمان تھا مگر اپنے ہندو ہمسائیوں کے ساتھ عبادت کرنے لگا۔ ہندو

دیوتاؤں کی پرستش کے دوران وہ یہ بھی تعلیم دیتا کہ حقیقی دیوتا صرف ایک ہے۔ یہ بات واضح نہیں ہوتی

کہ وہ کیسے اس تعلیم کو فروغ دینے کے قابل ہوا مگر اس نے سکھوں اور ان کے ادب پر گہرے اثرات مرتب

کیے۔ (کبیر سے پہلے بلکہ ریکارڈ کے مطابق سب سے پہلے 13 ویں صدی میں فرید الدین گنج شکر نے

مذہبی بنیاد پر ہندو اور مسلمانوں کے درمیان جھگڑا ختم کرنے کی بات کی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اچھے اور

نیک اعمال ہی اعلیٰ انسان کا معیار ہیں نہ کہ نمائشی اور ظاہری عقیدہ پرستی۔ سکھوں کے مذہبی صحیفہ گرنٹھ میں

فرید الدین کے 120 سے زائد دوہے شامل ہیں اور سکھ انہیں بابا نانک جیسی ہی عزت دیتے ہیں۔ مترجم)

سکھ مت کا حقیقی بانی نانک (1469-1538) نامی شخص تھا جو شیخ فرید الدین کا جانشین کبیر کا معاصر

تھا اور بلاشبہ ان سے متاثر تھا۔ نانک لاہور سے چالیس میل دور پنجاب کے علاقے میں ایک ہندو

گھرانے میں پیدا ہوئے۔ مرسلہ: حیدر علی سلطانی۔ کراچی

شتمت جاپان کا ایک مذہب ہے جو کہتا ہے: ”خدا کو خود سے دور نہ سمجھو بلکہ اسے اپنے دل میں تلاش کرو، کیونکہ دل خدا کا مسکن ہے۔ آسمان میں

تمام چیزوں کو پیدا کرنے والا اور انسان کو اپنے پڑوسی سے محبت کرنا سکھانے والا وہی ہے اس لیے اس بارے میں شک نہ کرو کہ آسمان دل کی اچھائی کو

پسند اور اس کے متضاد کو ناپسند کرتا ہے۔ آسمان اور اپنے اجداد کی نگریم و تحریم ”بزرگوں کی راہ“ کی اساس ہے۔

مرسلہ: آفتاب حسن۔ کراچی



جوت جل اٹھے۔ وہ مسکراتے ہوئے زریںہ کی طرف بڑھا لیکن زریںہ گھبرا کے پلٹی۔ وہ بیڑھیاں اترنے لگی تھی کہ اس نے بیڑھیوں کے نیچے کسی کی جھلک دیکھی۔ اسے لگا کہ وہ اس کی ماں ہے۔ وہ تیزی سے بیڑھیوں سے اتر کے سیدھا اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے دل کی دھڑکن بے قابو ہو رہی تھی۔ وہ اپنے بیڈ پر لیٹ کے گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ بیڈ پر لیٹے لیٹے وہ مستقبل کے سہانے سپنوں میں کھو گئی۔ اس بات سے بے خبر کہ اس کی ماں نے اس کی امتیاز سے کی جانے والی ساری باتیں سن لی ہیں۔ ☆.....☆

زینت نے جب سے امتیاز اور زریںہ کی گفتگو سنی تھی وہ اندر ہی اندر کھول رہی تھی۔ اسے امتیاز کے پورے گھرانے سے شدید نفرت تھی۔ وہ زریںہ کی شادی کی صورت امتیاز سے نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اس شادی کو روکنے کے منصوبے ترتیب دینے لگی۔ جب وہ رات کو سونے لیٹے تو وہ اپنے شوہر جبار سے بولی۔ ”میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتی ہوں۔“ جبار نے اس کی طرف کروٹ بدلی اور اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

کرنے کی ٹھان لی۔ وہ ماموں جبار کے گھر گیا۔ زریںہ گھر میں ہی تھی تاہم وہ مامی کی موجودگی میں اس سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے چائے پی کے زریںہ کو اشارہ کیا اور چھت پہ آ گیا۔ کچھ دیر بعد زریںہ بھی چھت پر آ گئی۔ وہ گھبراہٹ ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کی کیفیت دیکھتے ہوئے امتیاز نے اس سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

”دیکھو زریںہ، اب اماں اور بابا شادی کے لیے زور دے رہے ہیں اور تم جانتی ہو میری شادی خاندان سے باہر کرنا چاہتے ہیں۔“ وہ زریںہ کی طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے بولا۔

”تم کو تو پتا ہے بابا کتنے غصے والے ہیں اور میں ای سے بات کرتے ہوئے بہت ڈرتی ہوں۔“ زریںہ انگلیاں چٹاتے ہوئے اضطراب سے بولی۔

”تم بس ایک بار..... بس ایک بار ممانی سے بات کر لو اگلے دن ہی میں خود اماں کو تمہارے گھر بھیج دوں گا۔“ وہ التجائیہ انداز میں بولا۔

”ٹھیک ہے میں موقع پا کر امی سے بات کر لوں گی۔“ وہ دھیمے سے بولی۔ امتیاز کی آنکھوں میں امید کے

اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکال دی تھی۔

☆.....☆

وارث علی، میرخان اور پیر بخش تین بھائی تھے۔ ان کا کوئی چچا اور ماموں نہیں تھا کیونکہ ان کے والد اور والدہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ اب وارث علی اور میرخان بھی لاولد تھے اور عمر کے اس حصے میں پہنچ چکے تھے جہاں اولاد کی ساری امیدیں دم توڑ جاتی ہیں۔ پیر بخش کے البتہ دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ وہ پیر بخش کی اولاد کو ہی اپنی اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔ پیر بخش کے بڑے بیٹے کا نام امتیاز اور چھوٹے کا نام وزیر تھا۔ وزیر پیدائشی طور پر معذور تھا اس کے سارے جسم، یہاں تک کہ پیر کے ٹکڑوں پر بھی زخم تھے۔ رہی کمر شوگر نے پوری کر دی۔ اس کا بہت علاج کرایا گیا مگر ڈاکٹرز کی اکثریت نے اسے لاعلاج قرار دے دیا تھا۔

امتیاز صبح اسکول جاتا اور شام کو اپنے چچا اور والدین کے ساتھ گھر اور کھیت کے کاموں میں ہاتھ بٹاتا۔ سارے گھر والے امتیاز کے لاڈ اٹھاتے تھے کیونکہ ان کی نسل کو آگے بڑھانے والا وہی ایک تھا۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ امتیاز نے میٹرک کا امتحان دے دیا۔ اس کے والدین اسے مزید پڑھانا چاہتے تھے مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں اپنے والدین کی زمین کو اور زیادہ سرسبز و شاداب بنائوں گا۔ اس نے ایک سیزن کی فصل بیج کر ساتھ والی دو ایکڑ زمین بھی خرید لی۔ اپنے گھر والوں کو تیل کے ساتھ مل چلاتے دیکھ کر اسے بہت تکلیف ہوتی تھی۔ اس لیے کچھ قرض اور کچھ سود پر پیسے لے کر ٹریکٹر خریدا تھا۔ ٹریکٹر سے ان کو بہت بڑی آسانی ہو گئی اور پیداوار پر بھی اچھا خاصا فرق پڑا جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنی دونوں بہنوں کی شادی کرادی۔

والدین اور چچا اسے زور دے کر شادی کرنے پہ آمادہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے۔ ایک دن پیر بخش نے اسے قائل کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا امتیاز اب تم بھی شادی کر لو تا کہ ہم بھی اپنے آگن میں چھوٹے بچوں کی قلفکاریاں سنیں۔“ امتیاز نے جواب میں کہا۔ ”ابھی مناسب وقت نہیں آیا۔ جب میں شادی کرنا چاہوں گا آپ کو بتا دوں گا۔“ یہ الگ بات تھی کہ وہ ایک رشتے کے ماموں کی بیٹی کو دل ہی دل میں چاہتا تھا مگر اس نے کبھی کسی سے اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا۔ زریںہ بھی اسے چاہتی تھی۔

گھر والوں کی باتیں سن کر اس نے زریںہ سے بات

مٹھی بھر زمین

محترم ایڈیٹر
سلامتی

زمین کا ایک چھوٹا ٹکڑا کس طرح ایک پودے خاندان کی تباہی کا سامان بنا، یہ آپ کو اس سچ بیانی میں نظر آجائے گا، ایسے واقعات ہر علاقے میں رونما ہوتے ہیں مگر جس کے ساتھ ایسا کچھ ہوتا ہے اس سے پوچھیں کہ اس پر کیا گزرتی ہے۔

پرویز احمد لانگاہ
(دادو)

رات کا اندھیرا ہر طرف اپنے پر پھیلا چکا تھا۔ باہر شدت کی سردی تھی لیکن امتیاز کے اندر لاؤ دھک رہا تھا۔ وہ اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا، کھیتوں کے بیج بنی پگڈنڈی پر چلتا جا رہا تھا۔ گاہے بگاہے کتوں کے کھونکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ ان آوازوں کو بے دھیانی سے سنتا آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والی نا انصافی کا بدلہ لینا چاہتا تھا لیکن اسے ایسا کوئی راستہ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں مشغول چلتا جا رہا تھا کہ دفعتاً اس کے کانوں میں ایک آواز بڑی۔ وہ چونک کے رک گیا۔ آواز اس کے لیے جانی پہچانی تھی لیکن جو جملہ اس کے کانوں نے سنا تھا۔ اس نے گویا

”دیکھو جبار ہماری لڑکی اب شادی کے لائق ہو گئی ہے اس کی شادی کہیں طے کر دیتے ہیں۔“ وہ اپنے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے بولی۔

جبار کی آنکھوں میں اچنبھے کا تاثر ابھرا۔ وہ حیرت سے بولا۔ ”یہ آج تم کو بیٹھے بٹھائے کیا سوچھی جو زرینہ کے رشتے کے لیے اچانک خیال آ گیا۔“

”دیکھو جبار جوان بیٹی کا جتنا جلدی فرض پورا کیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ ویسے بھی جوان بیٹیوں کی عزت کا بچ کی طرح نازک ہوتی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس کا بچ کوٹھیں نہ لگ جائے۔“ اس نے اپنی دانست میں بہترین الفاظ کا چناؤ کیا تھا۔ وہ اصل بات کرنے سے پہلے ”زمین“ ہموار کر رہی تھی۔ اس کی توقع کے مطابق جبار بھڑک اٹھا۔

”کیا بکواس کر رہی ہو۔ ہماری بچی ایسی نہیں ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔ زرینہ بہت مصوم اور بھولی بھالی ہے، لیکن زمانہ بہت خراب ہے۔ میں زمانے کے بدلتے تیوروں سے ڈرتی ہوں۔“ وہ باقاعدہ منصوبے کے تحت بات کو اپنی مرضی کے رخ پر لے جا رہی تھی۔

”تو ہوا کرے زمانہ خراب۔ ہماری زرینہ کا زمانے سے کیا لینا دینا۔ وہ کون سا کوئی باہر جاتی ہے جو ہمیں زمانے کا ڈر ہو۔“ وہ اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

”میں زمانے کے ڈر سے ہی اسے باہر جانے... نہیں دیتی۔ میں نے سات پردوں میں چھپا کر رکھا ہوا ہے اپنی بیٹی کو مگر.....“ وہ بات ادھوری چھوڑ کے جبار کی طرف دیکھنے لگی۔

”مگر کیا؟“ وہ اسے شعلہ فشاں نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

”مجھے تمہارے بھانجے کا یوں سراٹھا کر گھر چلے آنا اچھا نہیں لگتا۔“

زرینہ نے آخر کار دھماکا کر ہی دیا لیکن جبار کا تاثر اس کی توقع کے خلاف تھا۔

”ارے تم کوئی غلط خیال دل میں نہ لاؤ۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بھائی بہن سمجھتے ہیں۔“ جبار بھانجے کی حمایت کرتے ہوئے بولا۔

”غلط فہمی میں تو آپ ہیں۔“ زرینہ، امتیاز کی حمایت کہاں برداشت کر سکتی تھی، بھڑکتے ہوئے بولی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ جبار بھی اس کا لہجہ دیکھتے ہوئے بھڑک اٹھا۔ زرینہ نے اسے آج کی روداد لفظ بہ لفظ سنا دی۔

جبار یہ سن کر آگ بگولہ ہو گیا۔ وہ چھلانگ مار کے بیڈ سے اتر۔ ”یہ بات ہے تو میں آج ان دونوں کا ہی کام تمام کر دیتا ہوں۔“

”پاگل مت بنو جبار ایسے میں ہماری عزت کا جنازہ نکل جائے گا۔ میں ایسا کرتی ہوں کل ہی بیٹے جاتی ہوں اور اپنے بھائی کے بیٹے سے رشتہ پکا کر کے آتی ہوں۔“ زرینہ نے اپنے دل کی خواہش ٹھیک وقت پہ اپنے شوہر کو بتائی۔

”ٹھیک ہے تم یہ کام کر کے آؤ، ایک کام میں بھی کرتا ہوں۔“ جبار پُرسوج انداز میں بولا۔

☆.....☆

دوسری طرف گاؤں کا وڈیرہ امتیاز کی محنت اور زمین کی پیداوار دیکھ کر اس زمین کو ہڑپنا چاہتا تھا مگر اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیسے اس زمین پر قبضہ کرے۔ مشورہ کرنے کے لیے اس نے اپنے منشی سے پوچھا۔ ”امتیاز کی زمین تو سونا اگل رہی ہے۔ کرم داد، تم کوئی ایسا طریقہ بتاؤ جس سے اس کی زمین حاصل کی جائے۔“

کرم داد اس کی بات سن کے سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ لمحات کے توقف کے بعد وہ بولا۔ ”سرکار ایک سال پہلے امتیاز نے سود پر پیسے لیے تھے اور اتار بھی دیئے تھے۔“

”تو اس میں زمین حاصل کرنے کا تو کوئی حل نہیں۔“ وڈیرے نے بگڑ کر کہا۔

”مائی باپ امتیاز نے سود آپ ہی کے کھاتے میں دینو سے لیا تھا، اب آپ دینو کے ساتھ کچھ لوگ بھیج دیں کہ سود واپس نہیں کیا اس کے پیسے اتنے بنتے ہیں وہ واپس کرو۔“ منشی نے مکارانہ لہجے میں کہا۔

وڈیرے کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

”واہ یہ کی ناں تم نے کام کی بات۔“ منشی کے چہرے پہ مکارانہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”تو سرکار پھر سود دینے والے کو بلا لوں۔“ وہ اسی مکارانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ آج ہی اسے پیغام بھیجو کہ وڈیرہ سائیں تمہیں یاد کر رہے ہیں۔“ وہ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔ منشی اس کی بات سننے ہی ایک ملازم کو آوازیں دینے لگا۔

☆.....☆

امتیاز کھیتوں میں مصروف تھا کہ اس نے تین چار لوگوں کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ وہ قریب پہنچے تو امتیاز نے انہیں

پہچان لیا۔ یہ وہی لوگ تھے جن سے امتیاز نے قرض سود پر حاصل کیا تھا۔ وہ اس کے قریب پہنچنے کے رک گئے۔ ایک شخص آگے بڑھ کے غصے سے بولا۔ ”تم نے پیسے واپس کیوں نہیں کیے؟ تمہارے پیسے واپس نہ کرنے کی وجہ سے سود دو گنا بڑھ چکا ہے۔“

امتیاز حیرت سے بولا۔ ”وہ تو میں کب کا لوٹا چکا ہوں۔“

سود دینے والوں کو تو جیسے کوئی بہانہ چاہیے تھا۔ وہ اسے مارنے پینے لگ گئے کہ کب دیا تھا، کس کے سامنے دیا تھا۔ جھوٹ بولتے ہو۔

امتیاز تین کے مقابلے میں اکیلا تھا۔ وہ ان سے مقابلہ نہ کر سکا۔ وہ بے دم ہو کے پیچھے گر گیا۔ سود دینے والے اس کے ٹریکٹر پر سوار ہو گئے۔ ایک شخص ٹریکٹر اشارت کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ ٹریکٹر ہم لے جا رہے ہیں۔ یہ تمہیں بھی واپس مل سکتا ہے جب تم سود کی رقم واپس کرو گے۔“ امتیاز بے بسی سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔ اس کا وجود غصے سے کھول رہا تھا۔

☆.....☆

اگلے دن امتیاز اپنے باپ کے ساتھ گاؤں کے وڈیرے کے پاس گیا۔ وڈیرہ اپنے مصاحبین کے ساتھ بیٹھا حقہ گڑا رہا تھا کہ ایک ملازم نے اسے امتیاز اور اس کے باپ کی آمد کی خبر دی۔

”انہیں اندر بھیجو۔“ وڈیرے نے ملازم کو حکم دیا۔ اس کے چہرے پر مکارانہ سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

امتیاز غصے میں تھا تاہم اس کا باپ عاجزی سے بولا۔

”صاحب، آپ کے لوگوں نے ہم سے زیادتی کی ہے سود کے پیسے کب کے واپس کر چکے ہیں مگر کل انہوں نے آکر مار پیٹ کی اور ٹریکٹر بھی لے گئے۔“

”دیکھو پیر بخش یہ لوگ بیشک میرے ہیں مگر میں ان کے کام میں مداخلت نہیں کرتا۔ ان کا اور تمہارا کیا معاملہ ہے مجھے نہیں پتا۔“ وڈیرہ مکاری سے بولا۔

”مگر سرکار ہمارے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ ہمارے تو مائی باپ آپ ہی ہو۔ ہم اس ظلم کی شکایت آپ کے پاس نہیں لے کے آئیں گے تو کہاں جائیں گے۔ ان سے کہیں، کھاتے والی کتاب آپ کو دکھائیں، جس میں اس نے میرے سامنے سب حساب ختم کیا تھا۔“ پیر بخش عاجزی سے بولا۔

مگر وڈیرے نے دو ٹوک اور روکھے لہجے میں کہا۔ ”بابا

مجھے اس مسئلے سے دور رکھو اپنا جھگڑا خود نمٹاؤ۔“

اس کا ٹکا سا جواب سن کے پیر بخش اور امتیاز لوٹ آئے۔ اب ان کے پاس اس مسئلے کا ایک ہی حل تھا، لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ حل ان کے مسئلے کا حل نہیں بلکہ ایک نئے مسئلے کا پیش خیمہ ہے۔

☆.....☆

اگلے دن امتیاز پولیس اسٹیشن این سی کٹوانے گیا مگر وہاں الٹا امتیاز کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔ تین دن اور راتیں مسلسل اس پر تھرڈ ڈگری آزمائی گئی اور یہ زور دیا گیا تم اقرار نامہ لکھ کر دو کہ وڈیرے کے گھر پر تم نے ڈاکا ڈالا تھا۔ تین دن کے بعد اس کی حالت کافی خراب ہو چکی تھی اس کے گھر والے کچھ رشوت دے کر اور کچھ منت سماجت کر کے اسے چھڑوا کے لے گئے مگر پولیس والوں نے کہا کہ ایک ہفتے بعد آئیں گے یا تو اقرار نامہ لکھ کر دینا یا پھر اپنی ساری زمین وڈیرے کے نام لکھ کر دینا ورنہ زندہ نہیں بچو گے۔

امتیاز کے باپ نے یہ سن کر ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

”سائیں ہم پر رحم کرو ہم غریب مزدور آدمی اسی زمین پر محنت کر کے گزارا کرتے ہیں وہ زمین ہی ہمارا اثاثہ ہے۔“

تھانے دار نے ایک غلیظ گالی بکی اور چنگھاڑتے ہوئے بولا۔ ”پیر، بکواس بند کر۔ ورنہ تجھے بھی بیٹے کے ساتھ اندر لٹا لٹکا دوں گا۔“

پیر بخش کو اندازہ ہو گیا کہ امتیاز کی جان زمین کے بدلے ہی چھوٹ سکتی ہے۔ اس نے مجبوری کے عالم میں یہ تیخ گھونٹ بھر لیا۔ اس نے زمین کے کاغذات پر دستخط کرنے کی رضامندی دے دی۔ امتیاز کا خون کھول رہا تھا مگر وہ بے بس تھا۔

پیر بخش اپنے بیٹے کو گھر لے کر آیا جہاں اس کی دیگرگوں حالت دیکھ کر سارے گھر والے پریشان ہو گئے۔ اس کی ماں رونے لگی۔

امتیاز تین دن کے اندر یہ سمجھ چکا تھا کہ دنیا میں شریف لوگوں کی کوئی جگہ نہیں خاص طور پر دیہاتوں میں جہاں پر جنگل کا قانون چلتا ہے۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ بھی اپنا جنگل خود بنائے گا جہاں اس کا قانون چلے گا۔ دو دن کے بعد گھر والوں سے یہ کہہ کر گیا کہ میں شہر جا رہا ہوں جہاں کچھ دن لگ جائیں گے۔

اس کے ذہن میں کیا چل رہا تھا۔ یہ اس کے گھر والے نہیں جانتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اسے اجازت دے

شہر جا کر امتیاز نے اپنے دوست کے توسط سے ایک پستول اور ایک ڈبل بیرل بندوق خرید لی کیونکہ توڑے کی دہائی میں ہتھیار آسانی سے نہیں ملتے تھے۔

واپس گھر آ کر بندوق اپنے باپ کو دی اور کہا۔ ”بابا ڈیرے نے کھل کر ہم سے دشمنی کا اعلان کر دیا ہے اس لیے میری غیر موجودگی میں یہ بندوق کام آئے گی۔“

پیر بخش جس نے ساری زندگی سادگی اور جھگڑوں سے دور رہ کر گذاری تھی بندوق دیکھ کر سہم گیا اور بولا۔ ”دیکھو بیٹا ہم غریب لوگ ہیں ہم ان کے ساتھ لڑ نہیں سکتے۔“

”بابا میں لڑنے کی بات نہیں کر رہا ہوں اپنا دفاع کر سکیں اس لیے یہ بندوق لایا ہوں۔“ امتیاز نے باپ کو سمجھاتے ہوئے کہا لیکن اس کا باپ نا سمجھی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

☆.....☆

رات کا اندھیرا ہر طرف اپنے پر پھیلا چکا تھا۔ باہر شدت کی سردی تھی لیکن امتیاز کے اندر الاؤ دہک رہا تھا۔ وہ اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا، مرکزی سڑک سے اتر کر کھیتوں کے بیچ بنی پگڈنڈی پر چلتا جا رہا تھا۔ وہ ایک ضروری کام سے شہر گیا تھا اور اب وہ واپس گھر جا رہا تھا لیکن پھر اس نے ارادہ بدل دیا تھا اور کھیتوں کی طرف مڑ گیا تھا ہر طرف سنائے کا راج تھا۔ گا ہے بگا ہے کتے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ ان آوازوں کو بے دھیانی سے سنتا آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والی نا انصافی کا بدلہ لینا چاہتا تھا لیکن اسے ایسا کوئی راستہ سمجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں مشغول چلتا جا رہا تھا کہ دفعتاً اس کے کانوں میں ایک آواز پڑی۔ وہ چونک کے رک گیا۔ آواز اس کے لیے جانی پہچانی تھی، لیکن جو جملہ اس کے کانوں نے سنا تھا۔ اس نے گویا اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکال دی تھی۔

”خبردار جو بھاگے، گولی مار دوں گا، جو کچھ بھی ہے سب نکالو۔“ امتیاز ایک ٹک اپنے گرد موجود ہولوں کو گھورتا رہ گیا۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں مشعلیں اٹھا رکھی تھیں۔ جن کی روشنی میں بس اتنا ہی پتا چل رہا تھا کہ آنے والوں نے ڈھانے باندھ رکھے ہیں۔

چند لمحوں بعد آواز دوبارہ گونجی۔ ”سنا نہیں تم نے، اپنی جیبیں خالی کر دو۔“

امتیاز بولا۔ ”اگر میری جیبیں خالی ہوں تو کیا کرو گے؟“

”تو ابھی تمہارے سینے میں ایک سوراخ کر کے نہر میں پھینک دیں گے۔“

بولنے والا اس بار خوفناک لہجے میں بولا۔

”مگر یار فرید تم تو یاروں کے یار تھے اپنے پرانے دوست کو مارتے ہوئے ہاتھ نہ کانپیں گے تمہارے؟“ امتیاز کو یقین ہو چکا تھا کہ یہ اس کے دوست فرید کی آواز ہے۔ اس نے پہچان لینے کے بعد فرید سے کہا۔

یہ بات سن کر فرید کے گردہ کا ایک آدمی آیا اور فرید سے کہا۔ ”اس نے تم کو پہچان لیا ہے اب اس کو زندہ چھوڑو تو ہمارے لیے خطرناک ہوگا۔“

”نہیں پہلے تھوڑی روشنی کرو میں اس کا چہرہ دیکھوں یہ ہے کون۔“ فرید نے اس آدمی کو کہا۔

روشنی ہونے کے بعد فرید اس کو دیکھ کر گہری سوچ میں پڑ گیا پھر اس کے چہرے پر شناسائی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ ”تم امتیاز ہونا میرے کلاس فیلو؟“

امتیاز ڈیرے کی جانب سے خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ کہیں ڈیرہ اس کے کھیتوں کو آگ نہ لگا دے، چوکیداری کی غرض سے وہاں جا رہا تھا کہ بیچ میں یہ لوگ نکل گئے تھے۔

”ہاں فرید ٹھیک پہچانا تم نے میں امتیاز ہی ہوں۔“

امتیاز نے فرید کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”فرید اس کے ہاتھ کو پکڑے اندھیرے میں کچھ امتیاز سے حال احوال پوچھنے لگا۔ امتیاز نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ فرید کو ڈاکو کے روپ میں دیکھ کے سوچ میں پڑ گیا تھا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کسی مشکل وقت میں فرید اس کی مدد کر سکتا ہے یا نہیں۔

”تم بتاؤ، تم تو بہت شریف تھے ڈاکو کیسے بن گئے؟“

امتیاز نے فرید سے پوچھا۔

جواب میں فرید نے جو بتایا وہ امتیاز کے حالات سے کسی طرح مختلف نہیں تھا۔

فرید نے کہا۔ ”امتیاز اگر ڈیرہ تمہیں زیادہ تنگ کرے تو مجھے اطلاع کر دینا مجھ سے جو بن پایا میں کروں گا اور ہاں کسی کومت بتانا کہ آج یہاں لوٹ مار میں نے کی ہے۔“

”کیا مطلب، مجھے لوٹنے کی کوشش سے پہلے بھی تم یہاں لوگوں کو لوٹ چکے ہو۔“ امتیاز حیرانی سے بولا۔

”ہاں آج رات، دو گھنٹے میں ہم ایک موٹر سائیکل اور چند ہزار روپے مختلف راہگیروں سے لوٹ چکے ہیں۔ بس تم کسی کو یہ بات بتانا مت۔“ فرید نے ایک بار پھر اسے تنبیہ

کی۔

”تم بے فکر رہو۔ میں کسی کو تمہارے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔“ اس نے فرید کو تسلی دی۔ فرید کے جانے کے بعد وہ اپنے کھیتوں کی طرف چلا گیا۔

دوسری صبح ڈیرے کے گرگے امتیاز کے گھر آئے اور سو دینے والے نے کہا۔ ”امتیاز یا میرے پیسے مجھے واپس کرو یا زمین کے ان کاغذات پر دستخط کرو۔“

”جاؤ ڈیرے کو کہہ دو میں نہ پیسے دوں گا نہ زمین جو کرنا ہے کر لو۔“ امتیاز نے دھاڑتے ہوئے کہا۔ سو دینے والے کے اشارے پر سارے لوگ امتیاز اس کے باپ اور چچاؤں پر پل پڑے پہلے تو امتیاز اور اس کے گھر والوں نے اچھا مقابلہ کیا مگر ان کی تعداد ڈیرے کے آدمیوں سے کم تھی اس لیے مار کھاتے کھاتے بے جان ہو گئے۔ ڈیرے کے آدمیوں نے زبردستی پیر بخش کے انگوٹھے کے نشان زمین کے کاغذات پر لگوا لیے۔

امتیاز تھوڑی دیر کے بعد اٹھا اور سب کو سہارا دے کر اندر لے گیا۔

”میں تو کہتا ہوں ہم یہ زمین ڈیرے کو دے کر اس گاؤں سے نکل چلتے ہیں۔“ پیر بخش کے بھائی وارث علی نے کہا۔

”چچا یہ گھر اور گاؤں ہم کسی طور پر نہیں چھوڑ سکتے چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“ امتیاز نے جذباتی لہجے میں کہا۔ وہ سب کی دلجوئی کر کے باہر آیا۔

اپنے گھر والوں کے ساتھ ڈیرے کی طرف سے کیا گیا ظلم و ستم وہ اب مزید برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے راست اقدام اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے اسے فرید کی مدد درکار تھی۔ اس نے فرید کو پیغام بھیجا کہ وہ اس سے ملے۔ فرید رات کے اندھیرے میں اس سے، اس کے کھیتوں پہ ملنے آیا۔ امتیاز نے اسے اپنا سارا منصوبہ گوش گزار کر دیا۔ وہ امتیاز کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو گیا۔

وہ رات بہت بھیا تک رات تھی کیونکہ اس رات میں کوئی ایک نہیں بہت سے واقعات رونما ہوئے جو کہ اس چھوٹے گاؤں میں بہت بڑی بات تھی۔

امتیاز فرید کے ساتھ رات کے اندھیرے میں ڈیرے کے گھر کی طرف ڈاکو ڈالنے جا رہا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ ایک انجان خطرہ اس کے گھر کی طرف بھی بڑھ رہا تھا۔

”فرید ہمیں کوشش کرنی ہوگی کہ کوئی شور اور آواز نہ ہو

اور ہم کسی کا خون بہانے سے بچ جائیں۔“

”تم کہتے ہو تو ایسا ہی ہوگا مگر ضرورت پڑنے پر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ فرید نے سیدھی بات کی۔

وہ رات کے تین بجے ڈیرے کے گھر میں داخل ہوئے اور بجتے بجاتے ہوئے ڈیرے کے گھر سے سارا روپیا اور زیور چرا کر باہر نکلے۔ امتیاز نے باہر جاتے ہوئے اسٹور روم کو آگ لگا دی ابھی وہ دیوار کو دکر باہر نکلے تو کہیں سے فائر کی آواز سنائی دی۔

امتیاز جب ڈیرے کے گھر میں ڈاکو ڈال رہا تھا ٹھیک اسی وقت ڈیرے کے لوگ ڈھانٹا باندھے اس کے گھر میں داخل ہوئے سب کو اٹھا کر مارا پیٹا اور امتیاز کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔ جواب میں بتایا گیا کہ وہ دوست کی شادی میں شرکت کرنے شام سے ہی شہر گیا ہے۔ ڈھانٹا پوشوں نے ان کو باندھ کر گھر کو آگ لگا دی اور فائرنگ کرتے ہوئے روانہ ہو گئے۔

☆.....☆

جب زریب نے دیکھا کہ اس کی ماں اپنے بھانجے سے اس کا رشتہ طے کر کے آئی ہے تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ رورو کے خود کو ہلکان کر لیا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ سوچ سوچ کے اس کا سر درد کرنے لگا تھا لیکن اس مسئلے کا کوئی حل نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں کتنی ہٹ دھرم ہے۔ وہ جو کرنے کا ٹھان لیتی ہے، کر کے چھوڑتی ہے۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ اپنے حق میں اپنے ماں باپ کے سامنے آواز اٹھاتی۔ وہ اگر رشتے سے انکار کرتی تو اس کا باپ تو اسے زندہ زمین میں گاڑ دیتا۔

جہاں عقل و شعور کے دروازے بند ہوتے ہیں وہاں صرف موت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ زریب نے بھی ایسا ہی ایک خطرناک فیصلہ کر لیا۔ وہ اب سب کے سونے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے دل میں اپنے ماں باپ کے خلاف نفرت کا سمندر موجزن تھا۔ وہ ان سے بات نہیں کر سکتی تھی لیکن انہیں ایسی تکلیف دے سکتی تھی کہ ساری زندگی وہ اپنے غلط فیصلے پر ملال کرتے رہتے۔

جب سب سو گئے تو وہ اٹھی۔ ان کے باورچی خانے میں مٹی کے تیل کا چولہا رکھا تھا۔ اسے جلانے کے لیے مٹی کا تیل ہمہ وقت ان کے گھر موجود رہتا تھا۔ اس نے تیل کی تلاش میں پورا باورچی خانہ چھان مارا لیکن اسے تیل نہ ملا۔ اس نے چولہے میں سے ہی سارا تیل نکال لیا۔ وہ اس وقت جس

پہلے ڈزنی لینڈ کا نقشہ

کیلیفورنیا میں ایک نیلامی کے دوران پہلے ڈزنی لینڈ پارک کا اصل نقشہ سات لاکھ آٹھ ہزار ڈالر میں فروخت ہوا ہے۔ 1953 میں بنائے گئے اس نقشے کو والٹ ڈزنی نے فنڈنگ حاصل کرنے کے لیے فروخت کیا ہے کیونکہ اس کے اپنے ہی اسٹوڈیو نے فنڈنگ دینے سے انکار کر دیا۔ ہاتھ سے بنے اس نقشے کو دونوں میں ڈزنی اور مصور ہرب ریمن کی مدد سے بنایا گیا تھا۔ اس اجلاس میں وین ایٹن گیلری کے آکشن مارک ایٹن کا کہنا ہے کہ کافی بہتر بولیوں کے بعد اس نقشے کو سات لاکھ آٹھ ہزار ڈالر میں فروخت کر دیا گیا ہے جس کے بعد یہ ڈزنی لینڈ کا سب سے مہنگا فروخت ہونے والا نقشہ بن گیا ہے۔ ان کا کہنا تھا ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ یہ نقشہ مسلسل سب کی جانب سے سراہا جا رہا ہے۔ خیال رہے کہ پہلا ڈزنی لینڈ کیلیفورنیا میں سو ایکڑ کار پارکنگ پر تعمیر کیا گیا تھا۔ 60 سال قبل کھلنے والے اس پارک میں اب تک 650 ملین لوگ سیر کرنے کے لیے آچکے ہیں۔

مرسلہ: درطیبہ، ملتان

کود و عادی رہی۔

کہتے ہیں کہ مظلوم کی آہ عرش کو ہلا دیتی ہے۔ امتیاز کی ماں کی آہ نے بھی عرش کو ہلا دیا۔ عرش والا حرکت میں آ گیا اور امتیاز کی موت کے حصے داروں کا مکافات عمل شروع ہو گیا۔ پندرہ سال بعد امتیاز کا ماموں کیسٹر کی وجہ سے دونوں ٹانگیں کٹوا کر دو سال تک بستر پر ہی رفع حاجت کر کے گند میں پڑا موت کا شکار ہوا اور ڈیرہ ایک ایکسپڈنٹ میں کمر تڑا کر دس سال بستر پر پڑا رہا تھا۔ وہ بٹنے جلنے سے بھی قاصر تھا۔ اس کی اپنی اولاد کو دیکھتے ہوئے بھی کئی سال گزر چکے تھے کیونکہ کوئی بھی اس کے بدبودار وجود کے قریب جانے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ اس کے مرنے پر اس کی اولاد نے شکر ادا کیا۔ زمین کے ایک ٹکڑے کی خاطر پوری نسل ہی ختم ہو گئی۔

پولیس موبائل سے اترتے ہوئے پولیس والوں نے اسے دبوچ لیا۔ پولیس والوں کو جبار نے پانچ ہزار روپے کرایہ کی چھتروں کا کہا تھا۔ امتیاز کو تھانے لے جا کر تشدد کیا جا رہا تھا اسی ناظم وڈیرہ تھانے میں داخل ہوا۔

”آئیے سائیں آئیے آج کیسے ہم غریبوں کے بھاگ کھل گئے بسم اللہ بسم اللہ۔“ تھانے دار چالوسی کرتے ہوئے بولا۔

”بس تم لوگ ہی نکلے ہو گئے ہو تبھی کیڑے کوٹے جیسے لوگ ہمارے راستے میں آجاتے ہیں۔“ وڈیرے نے امتیاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”ابھی آپ کے سامنے اس کی ٹانگیں توڑتے ہیں۔“ ”نہیں نہیں اب اس کو ہاتھ بھی نہ لگانا میں اس کی ضمانت کروانے آیا ہوں۔“ وڈیرے نے انگلی سے اوپر اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

وڈیرہ تھانے دار کو باہر لے کر گیا اور اسے پچاس ہزار دیتے ہوئے بولا۔ ”امتیاز کو حیدر آباد کے کسی تھانے کی حد میں قتل کرادو خبردار میرا نام نہیں بھی نہ آئے۔“ تھانے دار جس نے دس ہزار سے زیادہ کبھی رقم نہ دیکھی تھی پچاس ہزار لے کر خوشی میں پھولا نہیں سار ہاتھ۔

”آپ بے فکر ہو جائیں سائیں آپ کا کام ہو جائے گا۔“

پیر بخش خوش تھا کہ اس کا بیٹا حیدر آباد پہنچ چکا ہوگا۔ چار دن گذر گئے تھے مگر وڈیرے نے بھی ان کو تنگ نہیں کیا تھا۔ پیر بخش سوچ رہا تھا کہ آج وڈیرے کی طرف جا کر اس سے امتیاز کے لیے معافی مانگے گا۔ اسی ناظم باہر سے وارنٹ علی بھاگتا ہوا آیا اور روتے ہوئے بتایا۔ ”ابھی تھانے سے ایک پولیس والا اطلاع دے کر گیا ہے امتیاز مانجھند پولیس سے مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا ہے اس کی لاش دو دن سے وہاں پڑی ہے جا کر لے آؤ۔“

پیر بخش یہ سنتے ہی چکرا کر نیچے بیٹھ گیا اور اس کی ماں بیہوش ہو کر گر پڑی۔

امتیاز کی لاش کو آہوں اور سسکیوں سے دفنایا گیا۔ اس کے گھر والے بین کرتے ہوئے وڈیرے کو کوس رہے تھے۔ اسے بددعا دے رہے تھے۔ جوان اور نسل کو آگے بڑھانے والے بیٹے کی ناگہانی موت نے اس کے والدین کو جیتے جی مار دیا۔ سارے گھر والوں نے گاؤں چھوڑ دیا۔ وہ دوسرے گاؤں جا کر رہنے لگے۔ امتیاز کی ماں جھلاتے ہوئے قاتلوں

بیٹی نے خودکشی کی کوشش کیوں کی۔ شہر کے اسپتال میں وقت برباد ہونے سے زہینہ کی جان بچ گئی تھی۔

جبار کو اپنی بیوی سے زہینہ کی خودکشی کی وجہ کا علم ہو گیا تھا۔ زہینہ نے امتیاز کی نفرت میں ساری بات بڑھا چڑھا کے بیان کی تھی۔ امتیاز کے متعلق ساری باتیں جان کے اس کا خون کھول اٹھا تھا۔ وہ اس پر اعتماد کرتا تھا لیکن اس نے اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ وہ کسی صورت اسے معاف نہیں کر سکتا تھا۔

دوسری طرف وڈیرے نے نشان ڈھونڈنے والوں کی وجہ سے یہ پتا کر لیا تھا کہ اس کے گھر میں ڈاکا امتیاز اور اس کے ساتھیوں نے ڈالا تھا۔

”منشی آج رات امتیاز کے کھیتوں میں آگ لگا دو اور امتیاز کو پکڑ کر یہاں لے آؤ۔“ وڈیرے نے منشی کو دانت کچکچاتے ہوئے حکم دیا۔

”جو حکم سرکار کا۔“ منشی خوشامدانہ لہجے میں بولا۔

وڈیرے پر کام کرتے ہوئے ایک مزدور نے یہ بات سن لی جو امتیاز کا خیر خواہ تھا گو کہ وہ کمرے سے باہر تھا مگر اندر کی ایک ایک بات اس تک پہنچ گئی۔ وہ جلدی جلدی کام ختم کر کے امتیاز کے گھر کی طرف دوڑا۔ وہاں پہنچ کر اس نے امتیاز کو کہا۔ ”وڈیرے نے تم کو آج رات مارنے کا پروگرام بنایا ہے تم یہ گاؤں چھوڑ کر بھاگ جاؤ۔“

”اب وڈیرے کی موت اسے ہلا رہی ہے۔ آج رات میں ہی اس کو مار دیتا ہوں۔“ امتیاز انتہائی غصیلے لہجے میں بولا۔ ”یام گل مت بنو بیٹا یہ وقت ہوش سے کام لینے کا ہے۔“ پیر بخش نے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”ایسا کرو کچھ دن حیدر آباد چلے جاؤ وہاں میرا ایک دوست مل میں کام کرتا ہے وہاں تم کو کام دلوا دے گا جب ماحول ٹھنڈا ہوگا میں خود تم کو لینے آؤں گا۔“

”مگر بابا میں ان حالات میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔“ امتیاز نے کسی سے بولا۔

”ہماری فکر مت کرو وڈیرہ ہم کو کچھ نہیں کہے گا۔“ آخر کار پیر بخش اسے سمجھانے میں کامیاب ہو گیا اور اسے حیدر آباد روانہ کر دیا۔

انسان سوچتا کچھ ہے اور ہو کچھ اور جاتا ہے۔ زن اور زمین کی وجہ سے بننے والے امتیاز کے دونوں دشمن حرکت میں آ چکے تھے۔

امتیاز ابھی شہر جانے والی بس میں سوار ہو رہا تھا کہ ایک

کیفیت میں تھی اس نے اس کے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت سلب کر لی تھی۔ اس نے سوچے سمجھے بغیر مٹی کا تیل پی لیا۔ تیل پینے کے بعد وہ لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد اسے پیٹ میں درد شروع ہو گیا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے اندر آگ جل رہی ہے۔ پہلے پہل وہ تکلیف برداشت کرتی رہی لیکن جب تکلیف کی شدت بڑھ گئی تو وہ درد سے چیختے گئی۔ اس کی چیخ و پکار سن کر سب لوگ جاگ گئے۔ زہینہ اس کی طرف دوڑی۔ اس نے اس کے منہ سے مٹی کے تیل کی بوسونگھ لی۔ وہ زہینہ کے حلق میں انگلیاں ڈال کر اسے الٹی کروانے لگی۔ جبار اس کی حالت دیکھ کے گاڑی لینے چلا گیا۔

☆.....☆

فرید اور امتیاز فائرنگ کی آواز سن کر گھبرا گئے اور بھاگتے ہوئے کھیتوں میں گھس گئے۔ امتیاز نے فرید سے کہا۔ ”یہ سارا مال تم لے جاؤ بعد میں تم سے حصہ لے لوں گا۔“ فرید جواب میں کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ لوگوں کے چلانے کی آوازیں آنے لگیں اور اس کے گھر والی سائیڈ پر آگ کے شعلے دکھائی دیے۔

وہ اپنے گھر کی طرف دوڑا کہ کہیں اس کے گھر کو تو آگ نہیں لگی۔ وہ جیسے گھر کے قریب پہنچا اس کا اندیشہ بج بن کر سامنے آ گیا۔ وہ جیسے ہی گھر پہنچا تو کچھ لوگ آگ بجھانے کے لیے پانی پھینک رہے تھے اور دو تین لوگ اس کے گھر والوں کو رسیوں سے آزاد کر رہے تھے۔

”بابا یہ کس نے کیا مجھے بتاؤ میں اس کے گھر کو آگ لگا دوں گا۔“ امتیاز نے حلق کا پورا زور لگا کر چیختے ہوئے کہا۔

”بیٹا تم کچھ نہیں کر سکتے وہ وڈیرے کے آدمی تھے۔“ پیر بخش نے روتے ہوئے کہا۔

”کاش آج وڈیرے کا کام تمام کر دیا ہوتا موقع بھی تھا۔“ امتیاز نے دل میں سوچا۔

”بابا آپ فکر نہ کریں میں کل بڑے صاحب (ایس ایس پی پولیس) کے پاس جا کر اپنی فریاد سناؤں گا وہ کچھ نا کچھ کریں گے۔“ امتیاز نے باپ کو تسلی دی۔

دوسرے روز گاؤں میں ہر کوئی رات کو ہونے والے واقعات پر اپنے ہی اندازے لگا رہا تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا وڈیرے کی فلاں وڈیرے سے دشمنی ہے اس نے وڈیرے کے گھر ڈاکا ڈلوایا اور گھر کو آگ لگا دی۔ کوئی کہہ رہا تھا اسی گروہ نے امتیاز کے گھر آگ لگائی مگر سب کو پتا تھا یہ کام وڈیرے کا تھا مگر زبان پر کوئی نہیں لا رہا تھا البتہ یہ کسی کو پتا نہ تھا کہ جبار کی

گناہ گار

محترم ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم

سرگزشت میں سبق آموز کہانیوں کو ترجیح دی جاتی ہے اس لیے یہ سچ بیانی ارسال کی ہے، اگر سرگزشت کے معیار کی ہے تو اسے ضرور شائع کریں کیونکہ یہ سچ بیانی جرس صحرا ہے۔ راہ نما ہے۔ اس سچ بیانی کو پڑھ کر ایک نے بھی خود کو سنبھال لیا تو سمجھ لیں میری محنت پوری ہو گئی۔

ایم زیڈ شیخ
(آزاد کشمیر)

ہر طرف چیخ و پکار تھی۔ آسمان بھی اس منظر پر شاید اشکوں کی لڑیاں بہا رہا تھا۔ چیخنے چلانے والوں کی دلسوز آہ و فریاد سے ماحول انتہائی ٹھنکنا تھا۔ تماشاویوں کی بڑی تعداد موجود تھی کچھ مدد کرنے والوں میں شامل تھے مگر جتنے بھی تھے سب کی پلٹیں بھیگی ہوئی تھیں۔ عورتیں بین کر رہی تھیں۔ آٹھ اکتوبر 2005ء کا ہولناک زلزلہ گزرے ابھی دو سال ہی تو گزرے تھے کہ ”نوشہرہ“ اور اس سے ملحقہ علاقے کے بایسوں کے لیے ایک بار پھر قیامت صغریٰ پھا ہو گئی۔

ابھی تو پرانے زخم بھی نہیں بھرے تھے کہ ایک بوڑھا اپنے بیٹے کے گلے لگ کر رو رہا تھا۔ ”میرے خدا رحم کر۔“ کچھ عورتیں جھولیاں پھیلا کر آسمان کی طرف دیکھ کر چلا رہی تھیں۔ غرض، قیامت کی گھڑی تھی۔ پتھر دل بھی ہوتا تو اس منظر کو دیکھ کر اپنے آنسو نہ روک سکتا۔ ایسے میں ایک آواز آئی تو سب نے امید بھری نظروں سے اس طرف دیکھا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مترادف سب کی نظریں میٹائی کرنے والوں پر تھیں پر شاید دیر ہو چکی تھی۔

☆.....☆

شکیل کی دلی خواہش تھی کہ وہ فوج میں چلا جائے مگر اس کی بد قسمتی کہ وہ مڈل کا امتحان پاس نہ کر سکا۔ کسی بھی اسکول سے مڈل پاس کی سند لینا کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا مگر وہ اسے غلط سمجھتا تھا۔ اس کے دونوں لنگوئے دوست انڈر میٹرک ہونے کے باوجود بھرتی ہو گئے تھے۔ اس نے بہترے زور لگایا مگر وہ پرائمری پاس ہی رہا۔ قسمت کا لکھا سمجھ کر اس نے صبر کر لیا۔ گھر کے حالات کچھ زیادہ ٹھیک نہ تھے، اس کے والد محنت مزدوری کرتے تھے تو گھر کی دال روٹی چلتی تھی۔ جب موسم کی خرابی کے باعث کام نہیں ملتا تھا یا پھر بیماری کا غلبہ ہوتا تو فاقوں تک نوبت آ جاتی تھی۔ ایسے میں اس نے اسکول کی تعلیم کو خیر آباد

کہہ کر کوئی کام سیکھنے کا ارادہ کیا۔ کیو اے ٹیلرز کے مالک قدیر احمد نے اسے اپنی شاگردی میں لیا مگر اس کی طبیعت کام میں نہ لگتی۔ تین ماہ گزر جانے کے باوجود وہ کپڑے کاٹ تو لیتا تھا مگر سینے کا کام چند فیصد بھی نہ سیکھ سکا۔ اس کی عدم دلچسپی دیکھتے ہوئے وہاں سے اسے فارغ کر دیا گیا۔ اسے شروع دن سے ہی وہ کام اچھا نہیں لگا تھا۔ پہلے ہی دن کالج کی لڑکیوں کے سامنے استاد نے اسے بے عزت کیا تھا تو اس نے پکارا کہ وہ کر لیا تھا کہ وہ کم از کم استاد قدر کے پاس کام نہیں سیکھ گا۔ والد سخت طبیعت تھے اس لیے وہ کھل کر انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے روپے کی بدولت اس نے استاد کو یاد کروا دیا تھا کہ ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔ پیار، محبت کے چکر اور لڑکیوں سے اسے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی مگر نہ وہ دیکھ ہی چکا تھا کہ درزی کی دکان پر مردانہ گاہک کم ہی آتے ہیں۔

والد نے اسے دوبارہ ایک دو جگہ درزی کے پاس چھوڑا مگر اس کام سے اسے دلچسپی نہ تھی۔ ایک سال گزرنے کے باوجود وہ کوئی خاص کارنامہ سرانجام نہ دے سکا جس کو دیکھتے ہوئے اس کے والد نے اسے درزی بنانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ انہوں نے اپنے ایک جاننے والے کے توسط سے اسے سبزی منڈی بھیج دیا۔ صبح سے شام تک وہ بھانت بھانت کی بولیاں سنتا اور شام کے وقت ایک تھکلا سبزی کا اور ایک سو روپیہ لے کر گھر لوٹتا۔ گھر والوں کو اور کیا چاہیے تھا پس وہ مطمئن ہو گئے مگر وہ اطمینان چند دن ہی رہا۔

اس کا دل اس کام میں خوب لگ گیا تھا۔ صابر حسین اس سے دو تین سال بڑا تھا، اس لیے اس سے جلد ہی شکیل کی

جولائی 2018ء

226



دوستی ہو گئی۔ دونوں ایک ہی مالک کے لیے کام کرتے تھے اس لیے اکثر اکٹھے ہی ہوتے تھے۔

دن سارا گاہکوں کے ساتھ انکھیلیاں کرتے، بھاؤ تاؤ میں بحث و تکرار ہوتی تو خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔ کچھ دن بعد صابر نے اسے ایک کارآمد گرتیا جس کو سن کر شکیل کی

باچھیں، کھل گئیں۔ پھر اس نے صابر کے کہنے کے مطابق ہر چیز کے ساتھ پانچ فیصد ٹیکس لگا دیا۔ وہ اضافی آمدن شکیل کے لیے تازہ ہوا کا جھونکا تھی۔ مالک کو کچھ خبر نہ تھی کہ ان لوگوں نے خود ساختہ قیمتیں بھی لگا رکھی ہیں۔ بہر حال پتا چل بھی جاتا تو مالک کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچتا اسے تو پورا منافع مل رہا تھا۔ وہ صبح سبزی چھوڑ کر جاتا پھر شام کو واپس آ کر حساب کر کے انہیں اپنی دیہاڑی دے کر باقی پیسے خود لے جاتا۔ ان دونوں کے پاس گھر والوں کو دے کر بھی ماہانہ اچھے خاصے پیسوں کی بچت ہو رہی تھی۔

یہ جمعہ کا دن تھا، نماز کے بعد گاہکوں کا رش تھا کہ شکیل کی نظر اس پری چہرہ پر پڑی۔ وہ سبزی دینا بھول گیا بلکہ اس کے ٹماٹروں جیسے سرخ گال اور کھلا کھلا چہرہ دیکھنے لگا۔ اچانک اسے کسی نے پیچھے سے دھکا دیا تو اس کے قدم لڑکھڑائے۔

”بھائی دیکھ کر، مستورات کا خیال کریں۔“ شکیل نے دھکا دینے والے سے نرم لہجے میں کہا۔

”چل کا کے ذرا یہ لسٹ پڑ اور تمام چیزیں الگ کرتا جا۔“ لڑکی کے پیچھے کھڑے لڑکے نے شکیل سے کہا اور ساتھ ہی اپنا کندھا لڑکی کے کندھے سے ٹکرایا تو لڑکی نے گھور کر اسے دیکھا مگر وہ ڈھٹائی سے مسکرانے لگا، شکیل کا خون کھولنے لگا۔ وہ کوئی اوباش قسم کا لڑکا تھا جو غالباً کسی شادی بیاہ میں سلا دے وغیرہ کے لیے سبزی لینے آیا تھا۔ اس کی گاڑی بھی پاس ہی کھڑی تھی۔

”آگے سے ہٹ جانا دیکھ نہیں رہی دھوپ میں کھڑا ہوں۔“ لڑکے نے کہتے ہوئے ایک اور تازیبا حرکت کی جسے دیکھ کر شکیل کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ دوسرے گاہکوں کو نمٹنا رہا تھا جب کہ لڑکی اس کے دائیں جانب والی قطار میں کھڑی تھی۔ ”بھائی صاحب صبر کریں ویلا نہیں ہوں آپ کے سامنے ہی ہوں، براہ مہربانی بھائی آپ ذرا خواتین کا خیال کریں۔“ اس نے غصے سے کہا اور صابر کی تلاش میں نظریں گھمائیں کیونکہ وہ ابھی تک واپس نہیں پہنچا تھا نماز پڑھ کر۔

”تجھے بڑی تکلیف ہو رہی ہے، بہن ہے تیری کیا؟“ لڑکے کا جملہ سنتے ہی شکیل کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے آؤ دیکھنا تاؤ، پاس رکھی چھری اٹھائی اور چھلانگ مار کر نیچے اترا۔ ”تیری تو.....“ اس نے ایک گالی لڑکے کو دیتے ہوئے اس پر پل پڑا۔ پاس موجود لوگوں نے بروقت اس کے چھری والے ہاتھ کو پکڑ لیا ورنہ وہاں خون خرابہ ہو جاتا۔ اس کے منہ

جولائی 2018ء

227

ماہنامہ سرگزشت

افسر ماہ پوری

یکم دسمبر 1918ء کو ماہ پور چھپرا (بہار) میں ظہیر عالم صدیقی پیدا ہوئے جنہیں شعر و ادب کی دنیا میں افسر ماہ پوری کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک پاس کیا۔ 1936ء میں سرکاری ملازمت اختیار کی۔ مشرقی پاکستان کے مرکزی سیکریٹریٹ میں تقرری رہی۔ اردو کے ساتھ بنگلہ اور انگریزی پر بھی عبور حاصل رہا۔ انقلابی شاعر، قاضی نذر الاسلام کی 25 بنگلہ نظموں کا ترجمہ ”جام کوثر“ کے عنوان سے کیا۔ شاعری اور افسانہ نگاری کے حوالے سے لاہور کے جراند ادب لطیف، عالمگیر اور ماہنامہ نئی قدریں (حیدر آباد سندھ) میں آپ کے افسانے شائع ہوئے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی، کامل رزاقی اور افسر ماہ پوری نے مشرقی پاکستان میں اردو ادب کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ کراچی آنے کے بعد افسر ماہ پوری نے مشرقی پاکستان سے ہجرت کر کے آنے والے شعراء کے مجموعوں پر تقاریر، مقدمات اور پیش لفظ لکھے۔ ڈاکٹر جمیل عظیم آبادی کی مجلس احباب ملت اور سطوت میرٹھی کی بزم ندرت کے مشاعروں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے۔ غزلوں کا مجموعہ غبار ماہ اور نظموں کا مجموعہ نگار ماہ اور نعتوں کا مجموعہ حرا سے طور تک اردو ادب کے قارئین کو آپ کی یاد دلاتے رہیں گے۔ 15 فروری 1995ء کو افسر ماہ پوری کا انتقال ہوا۔ آخری آرام گاہ کراچی میں بنی۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں، از سید محمد قاسم مرسلہ: ظفر عابدی۔ کراچی

دھبے کو دیکھ کر انگلی اٹھا دیتے ہیں۔“ ان باتوں کو سوچ کر اس نے اپنے آپ کو روک رکھا تھا ورنہ وہ عمر کے اس حصے میں تھی جسے اندھی عمر (بلا سنڈائج) کہتے ہیں۔

چھٹی کے وقت وہ کالج کی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔ وہ ٹکیل کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتی تھی، بظاہر انجان بنی ہوئی نظریں جھکا کر وہ گاڑی میں سوار ہو جاتی۔ ٹکیل کی دلی خواہش تھی کہ وہ کبھی اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے مگر وہ اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ذرا سی غلطی کے باعث اس کو اس نوکری سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا اور وہ اس سہولت کو چھوڑ دینے کے تصور سے ہی کانپ جاتا تھا۔ وہ چپ چاپ

لڑکیوں سے بھی اس کی کوئی خاص دوستی نہ تھی بس دعا سلام کی حد تک۔ باقی لڑکیوں نے تو انت چار گھنٹہ تھی۔ وہ جب بریک کے وقت انگلی نیڑھی کر کے لڑکیوں کو سیٹی بجاتے دیکھتی تو حیران رہ جاتی کہ ایسی بھی لڑکیاں موجود ہیں روئے زمین پر۔ اپنے بوائے فرینڈز کا تعارف جس انداز میں کرایا جاتا اسے سن کر شدید کوفت ہوتی۔ اسے لگتا شاید وہ ایلی ہی کالج میں پڑھنے آتی ہے باقی سب تو وقت گزاری کے لیے آتے ہیں۔ والدین کی عدم توجہ اور پیسے کمانے کی دھن نے نوجوان نسل کو سائنس کی طرح کھیتوں میں فصل تباہ کرنے کا سٹینڈیٹ دے دیا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ وہ فارغ وقت میں لائبریری کا رخ کرتی تھی۔ چپ چاپ اس پرسکون گوشے میں بیٹھ کر اسے سکون ملتا تھا۔

بچھلے کچھ دنوں سے وہ عجیب سی کیفیت کا شکار تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کالج کی لڑکیوں میں دلچسپی لے رہا ہے۔ وہ لڑکی تھی اور جس مخالف کی نظروں کا مطلب سمجھتی تھی، ٹکیل ایک گہرے جوان تھا، خوش شکل ہونے کے ساتھ ساتھ بہادر بھی تھا اور وہ اسی کے گاؤں کا رہائشی تھا۔ اس کی بہادری کا مظاہرہ وہ تب دیکھ چکی تھی جب وہ بازار سبزی لینے گئی تھی، بعد میں اسے کسی رشتہ دار سے پتا چلا تھا کہ ٹکیل کو اس واقعہ کی پاداش میں مالک نے نکال دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اس سے متاثر ضرور تھی مگر اپنے بھائی فہد کا چہرہ جب بھی اس کی نظروں کے سامنے آتا وہ کانپ جاتی۔ فہد سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ کسی قسم کی شکایت پر اس کے اور اس سے رسم و راہ بڑھانے والے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا۔ گوکہ اخلاقی لحاظ سے وہ گھر میں اور پورے علاقے میں بہت اچھا تھا مگر اصولوں کے خلاف بات پر مرنے مارنے پر راتر آتا تھا۔ اس نے بڑے پیار سے ناصرہ کو سمجھایا تھا کہ اس کی کوئی بھی شکایت ناقابل معافی جرم ہوگی۔ انہی باتوں سے مجبور ہو کر اس نے اپنی زندگی میں حسرتوں اور خواہشات پر تالا لگا دیا تھا۔

اسے یہ سب یاد آیا تو عجیب سی کیفیت اس کے دل پہ طاری ہو گئی مگر پھر اس نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ مقدم اس کے والدین کی عزت ہے۔ اسے مدرسے کی باجی سے سنا ایک جملہ یاد آیا وہ کہتی تھیں۔ ”لڑکی ایک سفید کپڑے کی مانند پاکیزگی کا نمونہ ہوتی ہے جیسے سفید کپڑوں پر لگا ذرا سادہ نما یاں نظر آتا ہے اور لوگ سفیدی کو بھول کر اس دھبے کی جانب توجہ مبذول کر لیتے ہیں، ایسے ہی ایک لڑکی کی زندگی کے سارے اچھے کاموں کو بھول کر لوگ اس پر لگے ایک

کام میں مہارت کے بعد اسے پرائیویٹ ٹیکسی مل جاتی جس میں پچاس فیصد کے حساب سے اس کے اور مالک کے درمیان پارٹنرشپ ہو جاتی۔ یہ وہاں کا اصول تھا کہ دن بھر کی بچت مالک اور ڈرائیور کے درمیان تقسیم ہوتی تھی۔ اس نے ایک ٹیکسی دیکھ بھی لی تھی بس اس کے ڈرائیونگ سیکھنے کی دیر تھی۔ ابھی اس نے ڈرائیونگ لائسنس لینے کے لیے درخواست دی ہی تھی کہ اسے ایک اور آفر آگئی۔ اسے تنخواہ پر ایک پرائیویٹ کالج کی گاڑی چلانی تھی۔ تنخواہ معقول تھی کالج کے ساتھ ساتھ اسکول کے بچے بھی تھے جنہیں صبح اور دوپہر چھٹی کے بعد دو تین پھیرے لگا کر اسکول سے گھر۔ اس نے اپنے دوست سے مشاورت کے بعد ہائی بھر لی۔ گوکہ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی مگر وہ اسکول کے بچوں کے لیے انکل بن گیا تھا۔ چونکہ کالج میں نرسری سے انٹرمیڈیٹ تک کلاسز تھیں اس لیے بیک وقت کالج اور اسکول دونوں کہلاتا تھا۔ ابھی اسے گاڑی چلاتے ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ ایک دن اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اسے لگا چاند زمین پر اتر آیا ہے۔ اسے وہی ٹائٹ جیسے سرخ رخسار نظر آ گئے۔ ہاں وہ وہی تھی، وہی جس نے پہلی نظر میں اسے دیوانہ بنا لیا تھا۔ ساری دنیا سے بے نیاز وہ مغلیہ سلطنت کی کسی ملکہ کی مانند چلتی ہوئی آئی اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ٹکیل کو لگا کہ اس کی گاڑی کی قیمت اور حیثیت کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

☆.....☆

ٹکیل نے حسب معمول گاڑی کا بیک میرر ٹھیک کیا، اس کا مقصد نینا کی ایک جھلک دیکھنا تھا۔ اس کا اصلی نام تو ناصرہ تھا مگر پیار سے سب اسے نینا کہتے تھے۔ صبح، دوپہر اس کا دیدار کرنا ٹکیل کے لیے آب حیات کے مترادف تھا۔ اسکول کی وردی میں اسے دیکھ کر ٹکیل کو کسی حور کا گماں ہوتا تھا۔ نینا جوانی کی دلہنیز پر قدم رکھ چکی تھی۔ میٹرک کے بعد سال اول میں پہنچی تو ایک نئے جہاں کا آغاز ہوا۔ نیا اسکول، نئے کلاس فیلوز جن میں لڑکوں سے بڑھ کر لڑکیاں شرارتی تھیں۔ اس نے گھر کے حالات سے مجبور ہو کر سرکاری اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پھر جونہی اس کا بھائی کام پر لگ گیا، گھر کے حالات تھوڑے بہتر ہوئے تو گھر والوں نے اسے پرائیویٹ کالج میں داخلہ دلوا دیا۔ ساتھ ہی اس کے والد اور بھائی نے اسے متنبہ کیا کہ اگر کسی قسم کی شکایت گھر پہنچی تو وہ دن کالج کا آخری دن ہوگا اس کے لیے۔

اس پابندی کے باعث وہ اکثر لیے دیے رہتی تھی۔

میں جو آ رہا تھا وہ بکنا جا رہا تھا جبکہ وہ لڑکا جان بچا کر اپنی گاڑی میں بیٹھا اور نو دو گیارہ ہو گیا۔ ٹکیل غصے میں بھرا ہوا تھا، لوگوں کا ہجوم آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگا۔ کچھ لوگ بنا کچھ خریدے دوسری دکانوں کا رخ کرنے لگے۔ لڑکی بھی شرم کے مارے سبزی لیے بغیر واپس چلی گئی تھی۔ صابر واپس آ گیا تھا اس نے بڑی مشکل سے ٹکیل کو رام کیا۔ بعد میں ٹکیل نے اسے ساری صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ بھی حیران رہ گیا۔

”یار مٹی ڈالو، ایسے واقعات تو روز ہوتے ہیں، شرم و حیا اور غیرت تو اب جیسے ناپید ہو گئی ہے۔“

ٹکیل اب نارمل ہو چکا تھا۔ آس پاس کے دکانداروں کی بھیڑ اب چھٹنے لگی تھی۔ لوگ ویسے بھی پرانے پھدے میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ان دونوں کو اب فکر تھی کہ انہیں مالک تک بات پہنچی تو وہ سرزنش نہ کرے، اس لیے وہ دونوں چپ چاپ اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

اگلے دن گاؤں میں شادی کے باعث ٹکیل سبزی منڈی نہ گیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی ورنہ وہ واپس اسٹریچر پر ہی آتا۔ صابر اور مالک کی موجودگی میں ادبائش لڑکوں کی ایک ٹولی نے آکر کل کے واقعہ پر دکان میں توڑ پھوڑ کی۔ وہ سب مشتعل تھے اور کل والے لڑکے کا مطالبہ کر رہے تھے جس نے بدتمیزی کی تھی۔ مالک نے معافی بھی مانگ لی مگر وہ دکان کو خاصا نقصان پہنچا چکے تھے۔ ٹکیل کو گھر پر پیغام پہنچا دیا گیا کہ وہ کل سے ہرگز سبزی منڈی نہ آئے اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ اس ستم پر وہ تمللا کر رہ گیا مگر وہ کبھی کیا سکتا تھا تیر اب کمان سے نکل چکا تھا۔ وہ کوئی فلمی ہیرو تو تھا نہیں جو لاکارتے ہوئے گھوڑے یا موٹر بائیک پر نکل پڑتا۔

☆☆☆

ٹکیل کے لیے یہ خبر افسوسناک تھی کہ اب وہ سبزی منڈی میں کام نہیں کر سکے گا۔ اسے مالک کے نقصان کا بھی افسوس تھا۔ وہ حقیقت پسندانہ سوچ رکھنے والوں میں سے تھا اسے معلوم تھا کہ تھانے کچھری تک بات جائے گی تو جیت اس کی ہی ہوگی جو زیادہ پیسا لگائے گا۔ وہ بات کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس نے وہاں کام نہ کرنے کا ہی فیصلہ کیا۔ اسے دکھ تھا تو فقط اس بات کا کہ اس کا دل اس کام میں لگ گیا تھا اب کوئی دوسرا کام سیکھنے کے لیے اسے مزید وقت درکار تھا۔ وہ سوچ کے گھوڑے دوڑانے لگا کہ کیا کرے۔ اسے جو کچھ کرنا تھا سرمایہ لگائے بغیر ہی کرنا تھا۔ وہ اسکول کے ایک دوست سے مشاورت کرنے کے بعد ڈرائیونگ سیکھنے لگا۔ اس

دل میں تنہا لیے فقط دیدار پر ہی قناعت کیے ہوئے تھا۔ اسے اُمید نہ تھی کہ اس کی دلی خواہش اتنی جلدی پوری ہو جائے گی اور نینا اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ کر سفر کرے گی۔ وہ دن اس کے لیے عید کا دن تھا۔

☆.....☆

نینا اپنے اسٹاپ پر کھڑی تھی کہ گاڑی وہاں پہنچی۔ گاڑی کھچا کھچ بھری ہوئی تھی کہ ٹکیل کے اسے آواز دی کہ وہ فرنٹ سیٹ پر آجائے جہاں پہلے ہی ایک چھوٹا سا بچہ بیٹھا ہوا تھا۔ ٹکیل نے کہہ تو دیا تھا مگر اسے اُمید نہیں تھی کہ ایسا ہوگا۔ پھر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے خراماں خراماں چلتے ہوئے نینا کو اس کی سمت بڑھتے دیکھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور اندر بیٹھی تو ٹکیل ہکا بکا رہ گیا۔ اسے لگا جیسے گاڑی نہیں ہوائی جہاز ہے اور وہ اسے اڑاتا ہوا لے جا رہا ہو۔ راستے میں جب کھدے دیکھے بغیر وہ تیز رفتاری سے گاڑی چلاتا رہا کہ کہیں ڈر کر وہ اسے آہستہ چلانے کا مشورہ دے گی مگر وہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ ٹکیل پاس بیٹھے لڑکے سے ذومعنی گفتگو کرتا رہا مگر وہ حسن مجسم ایک قیمتی مجسمے کی مانند صمم بکم کی عملی تصویر و تفسیر بنی رہی۔ سفر تھا ہی کتنا، مگر ٹکیل کے لیے وہ زندگی کا حاصل تھا بچوں کے جھٹکنے لگنے پر چلانے کی آوازیں اسے سنائی دے رہی تھیں وہ بھی اس تیز رفتاری سے محفوظ ہو رہے تھے۔ اس نے کانچ پہنچنے پر باہر نکل کر حسرت سے اسے جاتے دیکھا اور گہرے سانس لینے لگا۔ واپسی میں اس کے چہرے پر جاندار مسکراہٹ تھی۔ پھر اچانک اسے ایک خیال آیا تو وہ چونک گیا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ اگر اس نے دیر کر دی تو ممکن ہے اس راہ میں کوئی اور اُمیدوار بھی سامنے آجائے۔ وہ اٹل ارادہ کر چکا تھا کہ اب اسے اظہارِ الفت کر دینا چاہیے۔ اس نے سوچا۔

وہ مہم ارادہ کر چلا تھا اگلے دو تین دن تو اسے موقع نہ ملا اس کے اندر کالاوا کھیلنے کو تھا۔ عجیب سی کشش تھی اس کے اندر اور آخر کار اس نے اظہار کر دیا۔ نینا نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا اور فقط اتنا ہی جملہ کہا۔ ”شکل دیکھی ہے اپنی؟“ اس جملے نے وہی کام کیا جو پیٹرول کے ڈرم میں جلتا سگریٹ کا ٹوٹا کرتا ہے۔ اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ تو بات کر کے چلی گئی مگر اسے اپنی آگ میں جلتا چھوڑ گئی۔ دل نے تسلی و دلاسا دیا ہزار دلائل دیے مگر سب بے کار۔ مرہم لگانے والا ہی جب قاتل بن جائے تو دل پر کیا گزرتی ہے وہی سمجھ سکتا ہے جس پر یہ حالات گزر رہے ہوں یا جوان حالات سے گزرا ہو۔

☆.....☆

نینا کو بہت تکلیف ہوئی تھی وہ الفاظ کہتے ہوئے مگر وہ مجبور تھی۔ اپنے گھر کی عزت بچانے کی خاطر اور مزید تعلیم جاری رکھنے کی خواہش کے باعث اسے دل پر پتھر رکھنا تھا۔ اسے اپنے ساتھ ساتھ کسی اور کے ارمانوں کا ٹٹل کرنا تھا۔ وہ بہت روٹی اور پھر دل کا غبار نکل جانے کے بعد اس کا ارادہ مزید مضبوط ہو گیا کہ اسے ٹکیل کے دل میں اپنی نفرت پیدا کرنی ہوگی۔ وہی نفرت اس کے لیے فائدہ مند رہے گی ورنہ وہ کسی دوسرے راستے پر چلا جائے گا۔ وہ راستہ جس میں سوائے بدنامی کے کچھ نہ ملتا۔

دوسری جانب ٹکیل نے بہتری کوشش کی کہ کسی طرح پتھر، موم ہو جائے مگر وہ اپنے ارادوں میں اٹل نظر آئی۔ اس نے کھلنا تھا نہ پھلنا۔ آخر کار بے شمار دفعہ نظر انداز کرنے کے باعث ٹکیل بد دل کا شکار ہو گیا۔ اس کا دل دنیا داری سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اسے دو تین اوباش دوستوں کی صحبت مل گئی تھی جو فارغ وقت میں ویران جگہ پر بیٹھ کر نشہ آور اشیاء استعمال کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ بھی اس لعنت کا شکار ہوتا چلا گیا۔ اس کے گھر والوں نے کوشش کی کہ وہ شادی کر لے مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ بات بے بات لوگوں سے جھگڑا کرنا اس کا معمول بن گیا تھا۔ ابھی اس کے چند دوست ہی جانتے تھے کہ وہ اس لٹ کا شکار ہوا ہے۔ بظاہر وہ ٹھیک ٹھاک نظر آتا تھا مگر اندر سے کھوکھلا ہو چکا تھا۔ اس نے نینا سے بات چیت کرنے کی کوشش ترک کر دی تھی۔ نینا کے امتحانات شروع تھے اس لیے وہ اس کے ساتھ نہیں جاتی تھی۔

یہ سوموار کا دن تھا جب اسے نینا کی یاد نے سخت تنگ کیا ہوا تھا۔ دوستوں سے مل کر اس نے بے انتہا نشہ کیا۔ دن ڈیڑھ بجے وہ نیم غنودگی کی حالت میں گاڑی لے کر اسکول چلا گیا جہاں اسے آج صرف دو ہی پھیرے لگانے تھے۔ وہ بچے لے کر نشے کی حالت میں انتہائی تیز رفتاری سے گاڑی چلا رہا تھا جبکہ بچے خوشی سے اچھل رہے تھے۔ اس کے دماغ پر نشے کی شدت کے باعث عجیب کیفیت طاری تھی جبکہ نینا کی شکل بار بار اس کے سامنے آرہی تھی۔ واپسی پر اچانک ہی اس نے رفتار خطرناک حد تک بڑھادی۔ اسے کچھ ہوش نہ تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اچانک اسے لگا کہ گاڑی کے دائیں جانب سامنے نینا کھڑی اسے بلارہی ہے وہ یہ بھول گیا کہ اس طرف نشیب میں دریا کی بے رحم موجیں ہیں۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ گاڑی دریا کی سمت موڑ دی۔

گاڑی نے سڑک سے نیچے اترتے ہی دو تین کلنیاں کھائیں اور چھنا کے سے دریا میں چلی گئی۔ اسے ہوش نہ رہا کہ کیا ہوا ہے۔ آخری آواز اس نے جوسی وہ بچوں کے چلانے کی تھی وہ اس بار خوشی سے نہیں خوف سے چلا رہے تھے۔ دریا کی بے رحم موجیں گاڑی کو اپنی آغوش میں لے چکی تھیں۔ جبکہ بچے چند لمحات کے لیے چیختے رہے پھر ان کی آواز آنا بند ہو گئی۔

☆☆☆

اسکول کی گاڑی کے حادثے کا جس نے بھی سناسر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی ماؤں نے رو کر آسمان سر براٹھا لیا تھا۔ ڈرائیور بے ہوش تھا کیونکہ جب گاڑی کھائی میں گر رہی تھی تو وہ اچھل کر باہر جا گرا تھا اور کھائی میں گرنے سے بچ گیا اسے ڈھلان پر اُگے پیڑوں نے نیچے گرنے سے بچا لیا تھا۔ اسے اسپتال منتقل کر دیا گیا تھا۔ کنارے پر کچھ بچوں کے بستے ملے تھے جو والدین اپنے سینوں سے لگا کر بلک بلک کر رو رہے تھے۔ ایک یتیم بچے کی ماں کو اپنے بیٹے کا جوتا ملا اس کی حالت پر آسمان سے آنسوؤں کی برسات مزید تیز ہو گئی تھی۔ ”ہائے میرا بچہ آج پہلے دن اسکول گیا تھا“ ایک ماں کی آواز آئی۔ ہنگامی کارروائی کرتے ہوئے کچھ بچوں کی لاشیں تھوڑی دیر بعد نکال لی گئی تھیں۔ اس ماں کو دل کا دورہ پڑا تھا جس کے چار بچے بیک وقت لاش کی صورت میں اس کے سامنے لائے گئے تھے۔ ہر گھر کا اپنا دکھ تھا۔ کچھ والدین تو اس بات پر تڑپ رہے تھے کہ ان کے لخت جگر کی لاش تک نہیں مل سکی تھی۔ رات تک مزید بچوں کی لاشیں بھی ان کے والدین تک پہنچا دی گئی تھیں۔ ابھی بھی کم از کم دس بچوں کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں تھی۔ اسکول کی حاضری کے مطابق پچیس بچے اور بچیاں گاڑی میں سوار تھیں۔ وہ رات نوشہرہ اور اس کے گرد و نواح میں قیامت کی رات تھی۔ ہر گھر میں سوگ کا سماں تھا۔ ٹیلی ویژن پر بھی خبر نشر ہو رہی تھی۔ سانحہ پر سب افسوس کا اظہار کر رہے تھے۔ خاص کر اس ماں کے بارے میں بات ہو رہی تھی جس کے چار لخت جگر لقمہ اجل بن گئے تھے اب گھر میں کوئی بھی بچہ نہیں تھا۔

اگلے دن اجتماعی نماز جنازہ ادا کی گئی کچھ بچوں کے لیے عانا بنانہ نماز جنازہ بھی پڑھی گئی اور ان کی لاش جلد مل جانے کے لیے دعا کی گئی۔ اگلے تین دن اسکول میں قرآن خوانی کی گئی اور تمام بچوں کی مغفرت کے لیے دعا کی گئی۔ وہ جنت کے پھول تو پہلے ہی معصوم تھے گناہگار تھا تو بس ایک شخص جسے

موت نے بھی قبول نہیں کیا تھا۔ ٹکیل کو ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو اسپتال میں پایا۔ پولیس کو اس نے بیان دیا کہ اسے کچھ سمجھ نہیں آئی کہ حادثے کی وجہ کیا بنی۔ کسی کے مطابق بریک فیل، کوئی کہہ رہا تھا اسٹیرن لاک کوئی تیز رفتاری کو وجہ بتا رہا تھا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

ٹکیل کو زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں۔ اگلے چند دن میں اسے ڈسچارج کر دیا گیا۔ تحقیقات جاری تھیں۔ سب لوگ اسے حادثہ قرار دے رہے تھے مگر ٹکیل جانتا تھا کہ یہ سب نشے کی حالت میں ہوا ہے وہ اس کا تصور دار ہے۔

یہ اس کی گھر میں پہلی رات تھی۔ وہ اسپتال میں دوا کے زیر اثر ہوتا تھا۔ اب گھر میں جونی اس کی آنکھ لگی وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اسے ہر طرف سے بچوں کی چیخ و پکار کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس کی آنکھیں پر نم تھیں مگر اب پچھتانے سے کیا ہو سکتا تھا۔ وہ سونے کی کوشش کرنے لگا مگر بچوں کی چیخ و پکار نے اسے سونے نہ دیا۔ اس رات کے بعد ہر رات اسے بچوں کی چیخ و پکار سنائی دیتی۔ وہ کئی راتیں جاگتا رہا اور آخر کار اس کا دماغ الٹ گیا۔ وہ عجیب و غریب حرکیں کرنے لگا۔ گھر اور گاؤں کے لوگ اس کی حالت سے باخبر تھے۔ ان کے خیال میں بچوں کے حادثے کے بعد شاک کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہو گئی تھی۔ جبکہ حقیقتاً وہ گناہوں کے بوجھ تلے اتنا دب چکا تھا کہ اسے دنیا کی کسی چیز کا ہوش نہیں رہا۔ اسکول کی وردی میں ملبوس جب بھی کوئی اسے نظر آتا اس کی آنکھیں پر نم ہو جاتیں۔ اس کی زندگی نا کارہ ہو چکی تھی۔ اب وہ سارا سارا دن سڑکیں ناپتا اور رات کو گھر آ جاتا۔ اکثر اس پر دورہ پڑتا تھا۔ وہ چیخنے چلانے لگ جاتا تھا۔ اسے بچوں کے ہاتھ اپنے گریبان پر نظر آتے تو وہ اپنے کپڑے پھاڑ دیتا۔

اس سانحے کو گزرے کئی سال ہو چکے ہیں۔ گناہگار اپنے گناہوں کی آگ میں جل رہا ہے۔ وہ اکیلا ہی نہیں اس کے ساتھ ساتھ کئی اور لوگ بھی بے قصور جل رہے ہیں۔ ایک گھر میں موجودناصرہ نامی ایک کنواری کے بالوں میں چاندی اتر آئی ہے۔ اس کا منگیتر ایک حادثے میں جاں بحق ہو گیا تھا۔ اب لوگ اسے منحوس سمجھ کر رشتے کی بات کرنا بھول گئے ہیں۔ وہ اکثر سوچتی ہے کہ شاید یہ اس کے گناہوں کی سزا ہے۔ وہ گناہ جو اس سے سرزد ہوا تھا۔ ایک انسان کا دل توڑنے کا گناہ۔ اسے اس گناہ کی پاداش میں ساری زندگی جلتے رہنا تھا۔



کے لیے بانو کے گھر چلی جایا کروں؟ نیلم بھی وہیں آجایا کرے گی۔“

”ٹھیک ہے میری بچی! چلی جانا لیکن شام ہونے سے پہلے پہلے گھر آیا جایا کرنا۔ شام کو یہ بھیڑیے کھل عام گھومتے ہیں۔“

”وعدہ۔ پکا وعدہ۔ میں شام ہوتے ہی لوٹ آؤں گی۔“ اس نے ماں کے گلے میں بازو ڈال دیے۔

☆.....☆

اپنے پاس ایک بکری کے میانے کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔ شام ہونے ہی والی تھی اور اب اسے اپنے جانوروں کا ریوڑ سنبھالنے جلدی سے گھر پہنچ جانا تھا۔ اپنی ماں سے کیا گیا وعدہ آج آٹھ سال بعد بھی اسے یاد تھا۔

سب بھیڑ بکریوں کو اپنے ہاتھ میں پکڑی چھڑی سے اکٹھا کرتے ہوئے وہ اپنی سوتی اوڑھنی سر پر اچھی طرح جمائے گھر روانہ ہوگئی۔ جانوروں کو ان کی مخصوص جگہ پر بند کر کے وہ ابھی اندر آئی ہی تھی کہ ایک چھپتی ہوئی تلخ آواز کانوں کے پردے پھاڑنے لگی۔

”روبی! اور وہی کہاں مرگئی تھی تو۔ میں کب سے تیرا انتظار کر

”تو پھر میری شہزادی اتنی خاموش کیوں ہے؟“

”ای می جان امیرے ابو کب واپس آئیں گے؟“

”آپ کے ابو اللہ تعالیٰ کے گھر چلے گئے ہیں بیٹا! وہ وہاں سے کبھی واپس نہیں آسکتے۔“ سلمیٰ نے اپنے آنسو روکے۔

”وہ اللہ تعالیٰ کے پاس اتنی جلدی کیوں چلے گئے؟“

”انھیں فوجیوں نے مار دیا تھا۔ وہ تو شہید ہیں۔ ایسا مقام ہر کسی کو نہیں ملتا۔“ سلمیٰ نے آسان لفظوں میں اس کی مشکل آسان کرنی چاہی۔

”یہ فوجی کون ہوتے ہیں ای می جان؟ نیلم اور بانو بھی ان کا نام لے رہی تھیں۔“

”فوجی وہ بھیڑیے ہیں جو ہماری وادی پر زبردستی قبضہ کر کے بیٹھے ہیں۔“

”ہائے اللہ!! ای می جی! بھیڑیے تو بہت ظالم ہوتے ہیں ناں۔ پچھلے سال ایک بھیڑ یا نیلم کی بکری کھا گیا تھا۔ ہم سب بہت روئے تھے۔“ وہ خوفزدہ ہوگئی۔

”ہاں میری بچی! یہ بھیڑیے ان سے بھی زیادہ ظالم ہیں۔ تمہارے ابو کو بھی انہوں نے ایسے ہی کھا لیا تھا۔“ سلمیٰ بچی کی نفسیات کے مطابق اسے سمجھانے لگی۔

”میں اب گلی میں بالکل نہیں کھیلوں گی لیکن کیا میں تھوڑی دیر

دینے میں ناکام تھی۔ آٹھ سال کی عمر میں اسے ماں نے باہر گلی میں کھیلنے سے منع کر دیا۔ وہ اس فیصلہ کی وجہ تو نہ سمجھ سکی لیکن ماں کی نافرمانی اس کی تربیت میں شامل ہی نہیں تھی اس لیے خاموشی سے اس حکم پر عمل کرنے کا وعدہ کر لیا۔

اگلے دن اسکول جاتے ہوئے وہ اپنے ذہن میں ان لفظوں کو ترتیب دے رہی تھی جس سے اس کی سہیلیاں اس فیصلہ کو سن کر ناراض نہ ہوں۔ اسبلی ہوتے ہی اس نے اپنی سہیلیوں کو یہ خبر سنا دی۔

”میری ماں نے بھی مجھے ایسا ہی کرنے کو کہا ہے۔“ نیلم نے حیرانی سے آنکھیں پھیلانیں۔

”اللہ قسم! ایک ہفتہ پہلے میرے بڑے بھائی نے بھی مجھے باہر نکلنے سے منع کیا تھا لیکن میں چھپ چھپ کر کھیلنے آ جاتی تھی۔“ بانو نے شرمندگی دکھائی۔

”لیکن سسکھو! وہ سب ہمیں منع کیوں کر رہے ہیں۔ ہم سب اتنے سالوں سے اکٹھے کھیل رہے ہیں اور اب کیسے کھیل پائیں گے؟“ روبی نے اچھے لہجے میں کہا۔

”میں نے اپنے ابا کو امی سے بات کرتے ہوئے سنا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ساتھ والے گاؤں میں فوجی بچے اغوا کر کے لے جاتے ہیں اس لیے نیلم کو گھر سے باہر مت جانے دیا کرو۔“

”ہاں۔ میرا بھائی بھی فوجیوں کا ذکر کر رہا تھا۔ یہ وہی فوجی ہیں جو بندوق چلاتے ہیں۔“ بانو نے سر ہلایا۔ ”میرا بھائی کہہ رہا تھا اپنی سہیلیوں کو گھر بلا کے کھیل لیا کرو۔“

”ٹھیک ہے۔ ہم گھر والوں سے اجازت لے لیں گے۔“ ان دونوں نے بیک زبان کہا۔

”روبی تمہارے تو ابو بھی نہیں ہیں۔ تمہاری امی مان جائیں گی ناں۔“ بانو نے پوچھا۔

”ہاں۔ وہ مان جائیں گی۔“ روبی کو اس کا سوال بہت برا لگا۔

اسکول سے چھٹی کے بعد روبی بہت خاموش تھی۔ گھر پہنچ کر بھی اس کیفیت میں کوئی فرق نہ آیا۔ شام کو اس کی ماں نے اسے اپنی گود میں بٹھالیا۔

”کیا بات ہے میری بیٹا ناراض ہے مجھ سے۔ میں نے باہر کھیلنے سے منع کر دیا ہے اس لیے۔“

”نہیں امی جان۔ میں ناراض تو نہیں ہوں۔“ اس نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

بھیڑیے

جناب معراج رسول السلام علیکم

اس بار جو ”سرگزشت“ بیان کر رہا ہوں یہ ہماری وادی کی ایک بیٹی نیلم کی ہے گو کہ تقریباً ایک صدی سے ہماری وادی میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ پہلے ڈوگرا راج کے سپاہی ہمیں مسلمان ہونے کی سزا دیتے تھے، اب ہندوستانی سپاہی وہی کچھ کر رہے ہیں، نیلم کی یہ داستان ہر مسلمان کے لیے سبق ہے۔

افتخار حسین اعوان
(کشمیر)

روبی ایک پہاڑی پر اداس بیٹھی تھی۔

سورج کا آٹشی گولا بہت تیزی سے مغربی افق میں سفر طے کر رہا تھا۔ نیلے نیلے امبر پر ڈوبتے سورج کی سرخی دیکھ کر اس کے دل میں اداسی اور آنکھوں میں بہت سے آنسو اٹھ آئے۔ وادی میں کئی دن سے بہت کشیدگی تھی۔ کچھ نوجوانوں کی شہادت نے مقامی آبادی کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی تھی۔

اس وادی کی قسمت بھی بہت عجیب تھی۔ اتنا خون خرابہ ہونے کے باوجود اس کی پیاس بجھنے کا نام ہی نہ لیتی۔ یہاں کے رہائشیوں پر اتنے ظلم ڈھائے جاتے تھے کہ انسانیت بھی شرماتا جائے۔

روبی ایک یتیم لڑکی تھی۔ اسے اپنے والد کی صورت بھی یاد نہیں تھی۔ وہ اس کی پیدائش سے پہلے ہی وفات پا گئے تھے۔ اس کی ماں نے بہت مشقت سے اسے پالا۔

ماں کی پر خلوص محبت سے وہ بہت خوش باش زندگی گزار رہی تھی۔ وہ اپنی ہمسایہ لڑکیوں کے ساتھ گڈے گڑیا کے کھیل کھیلتی تو گڑیا کے ساتھ کھڑا گڈا دیکھ کر ذہن میں کہیں تختی کا احساس ہونے لگتا مگر ابھی وہ اس احساس کو لفظوں کی شکل

رہی ہوں۔“

”میں موشیوں کو چرانے لے کر گئی تھی چچی جان! ابھی آئی ہوں“ اس نے سہم کر کہا۔

”موشیوں کو چرانے میں اتنی دیر کیوں لگا دی تو نے؟ کہیں پہاڑی پر کسی لڑکے سے یارانہ تو نہیں لگالیا۔“ وہ چیخ کر بولی۔

”کیوں غلط سوچتی ہو چاچی! ایسا کچھ نہیں ہے۔“

”غلط کی بجائی اگر کبھی ایسی کوئی حرکت کی تو میں تیری ٹانگیں توڑ دوں گی۔“ چاچی نے دھمکایا۔

”میری ٹانگیں توڑ دو گی تو اپنی خدمت کیسے کرادگی۔“ وہ بڑبڑائی۔

”اب وہیں کھڑی وقت ضائع کرتی رہے گی یا کھانا بھی بنائے گی۔ ابھی تیرا چچا آجائے گا۔ جلدی سے ہاتھ پاؤں چلا۔“

روبی خاموشی سے کونے میں بنے باورچی خانہ میں چلی گئی اور لکڑیاں جلا کر کھانے کی تیاری کرنے لگی۔

آج موسم بہت نرم تھا اور یہی نمی لکڑیوں میں بھی موجود تھی۔ کھاتے کھاتے اس کا برا حال ہو گیا۔ دھواں گلے اور آنکھوں میں بری طرح چہرہ ہاتھ لکڑیوں میں بھی موجود آڑ میں اپنے دل کا غبار ہلکا کرنے کا موقع مل گیا۔

آج اسے اپنی ماں بہت یاد آ رہی تھی۔ اس نے روبی کو واقعی شہزادیوں کی طرح پالایا تھا۔ اسے گزرا ہوا وقت یاد آنے لگا۔ وہ دس سال کی ہوئی تو سلمیٰ کو ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا۔ وہ گاؤں کے حکیم سے دوائی لے آئی مگر بالکل بھی فرق نہ آیا۔

کچھ دن بعد اسے شدید کمزوری بھی ہو گئی۔ کھانے پینے کا بھی بالکل دل نہ کرتا تھا۔ روبی اس کی حالت دیکھ کر بہت پریشان رہتی۔ ارد گرد کی ہمسایاں اس کی عیادت کے لیے آ جاتیں اور کچھ دیسی گھریلو ٹوٹکے بھی بتاتیں۔ کبھی کبھی وہ اپنے گھر سے کھانا بھی لے آتیں۔

سلمیٰ کا بخار دن بدن بگڑتا چلا گیا۔ اب اسے کھانسی بھی رہنے لگی۔ وہ اتنی شدت سے کھانستی تھی کہ اس کے چہرے کا رنگ سیاہ ہو جاتا پھر کچھ دن اور گزرے تو کھانسی کے ساتھ خون بھی آنے لگا۔ اس دن سلمیٰ بہت پریشان تھی۔ اس نے روبی کو بھیج کر بانو کی امی کو بلوالیا۔

اس کے آنے کے بعد سلمیٰ نے روبی کو باہر صحن میں جانے کا حکم دے دیا لیکن روبی نے پہلی بار ماں کی نافرمانی کرتے ہوئے کمرے سے باہر آ کر دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی

اور ان دونوں کی باتیں سننے لگی۔

”یہ اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے بہن تم نے؟ بخاریں فرق نہیں پڑا کیا؟“

”نہیں۔ اب تو معاملہ اور بھی خراب لگنے لگا ہے۔“ سلمیٰ کی نڈھال آواز آئی۔

”میں نے تم سے کئی بار کہا تھا کہ بڑے ڈاکٹر کو دکھا لو لیکن تم مانی ہی نہیں۔“

”ہاں بہن۔ میں نے غلطی کی۔ کاش میں نے تمہاری بات مان لی ہوتی۔“

”ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ کل چلے جاتے ہیں۔“

”مجھے کھانسی سے خون آنے لگا ہے۔ مجھے لگتا ہے میری زندگی ختم ہو رہی ہے۔“ سلمیٰ مایوسی سے بولی۔

”ایسا نہیں سوچو۔ اللہ تمہیں اپنی بیٹی کے سر پر سلامت رکھے۔“

”میں تمہیں ایک پتا دیتی ہوں۔ تم اس پتے پر خط بھیج دو۔ میرے چاچے کا بیٹا ہے ایک۔ میں اس سے چند معاملات طے کرنا چاہتی ہوں۔“

بانو کی ماں کچھ دیر بعد ہاتھ میں ایک کاغذ کا پرزہ تھامے چلی گئی۔ روبی بہت خوفزدہ تھی۔ اس نے اپنی ماں کی صحت کے لیے بہت سی دعائیں کیں۔

تین روز بعد ایک ادھیڑ عمر آدمی سلمیٰ سے ملنے چلا آیا۔ وہ کمزور جسامت، کچھ بڑی بالوں اور لمبوترے چہرے کے ساتھ عجیب سا تاثر دیتا تھا۔ اسے دیکھ کر روبی کو پہاڑی ڈھلوان پر ایک بوڑھا درخت یاد آنے لگا جو کسی کوسا یہ نہ دیتا تھا۔

بوڑھے شخص کی آمد کے بعد سلمیٰ نے ایک بار پھر روبی کو اپنی سہیلی کے گھر کھیلنے کے لیے بھیج دیا۔ لیکن روبی کا دل اب کھیلنے کو بالکل بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ کمرے سے باہر چھپ کر ان کی باتیں سننے لگی۔

”مجھے تمہاری طبیعت کا سن کر بہت دکھ ہوا اس لیے خط ملنے ہی پہلی فرصت میں چلا آیا۔“ اس شخص کی آواز بھی کسی مدہم جھرنے کی طرح نرم تھی۔

”میرا تو اب چل چلاؤ کا وقت ہے بھائی ریاض! قسمت نے مہلت ہی نہ دی کہ بیٹی کو اپنے گھر بار کا تحفظ دے سکوں۔“ سلمیٰ کی گلوگیر آواز نے روبی کا دل مٹھی میں بھیج لیا۔

”روبی کے والد کی شہادت کے بعد ہی تمہیں کسی سرالی رشتہ دار کے گھر پناہ لینا چاہیے تھی۔ گاؤں اور وادی کے

حالات تمہارے علم میں ہی ہوں گے۔ بھارتی فوجی تو ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت عورتوں اور بچوں کا قتل عام کرتے ہیں۔ وہ کشمیر کو مکمل طور پر بانجھ کر دینا چاہتے ہیں۔“

”روبی کے والد کا کوئی رشتہ دار نہیں تھا۔ وہ یتیم خانہ میں پرورش پاتے رہے پھر جہادی تنظیم سے وابستہ ہو گئے۔ بھارتی چوکیوں پر مغوی لڑکیوں کی بازیابی کے لیے حملہ کے دوران میری رہائی بھی انہی کی بدولت ممکن ہوئی۔ میرا گھر بار وہ درندے پہلے ہی جلا کر بھسم کر چکے تھے۔ وہ مجھے سہارا نہ دیتے تو پتا نہیں میں کن حالوں میں ہوتی آج۔“ سلمیٰ کے کھوئے ہوئے لہجے میں اسے پہلی بار اپنے والدین کے ماضی سے واقفیت ہو رہی تھی۔

”میں بھی ان دنوں سرینگر میں ملازم تھا۔ اگر اس حادثہ کا بروقت علم ہو جاتا تو میں تمہارا ہاتھ تھامنے میں ایک پل نہ لگتا۔“

”نہ نہ۔ بھائی ریاض! ایسا بالکل نہ سوچو۔ میری زندگی میں کوئی ملال نہیں۔ مجھے فخر ہے کہ میں ایک شہید کی بیوہ ہوں۔ اگر پروردگار مجھے اولاد نہ عطا کرتا تو میں اسے بھی مجاہد بنانا پسند کرتی لیکن روبی لڑکی ذات ہے۔ کمزور ہے۔ تم بس مجھ پر ایک احسان کر دینا۔ میرے بعد روبی کی سرپرستی میں کوئی کوتاہی نہ کرنا ورنہ میری روح تب بھی بیقرار رہے گی۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

روبی اس سے زیادہ سننے کی تاب نہ رکھتی تھی۔ وہ بھاری قدموں اور بوجھل دل لیے صحن میں سیڑھیوں پر جا بیٹھی۔ اپنا سر گھٹنوں میں دیئے وہ بے آواز روئی رہی۔ کچھ دیر بعد ریاض نے اس کے پاس آ کر شفقت سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”اپنی ماں کا آخری دیدار کر لو بیٹی! وہ اپنے آخری سفر پر روانہ ہو چکی ہے۔“

روبی دھاڑیں مارتی ہوئی ماں کی میت سے جا لپٹی۔ اس کے آنسو اور تڑپ بھی ماں کے مردہ تن میں کوئی حرکت پیدا نہ کر سکی اور وہ خاک اوڑھے ہمیشہ کے لیے اس کی نظروں سے دور ہو گئی۔

اگلے روز ریاض اسے اپنے ساتھ گاؤں لے آیا۔ رستے میں وہ اسے اپنی بیوی کی عادات اور مزاج کے متعلق آگاہ کرتا رہا مگر وہ بے دھیانی میں ہوں ہاں کرتی رہی۔ ریاض ایک سرحدی گاؤں میں رہتا تھا۔ اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی بیوی نے سخت الفاظ اور کرخت لہجے سے اس کا استقبال کیا۔

کتاب الہند

اس شہرہ آفاق کتاب کا پورا نام ”تحقیق الہند من مقولہ مقبولہ فی العقل اور مذولہ“ ہے۔ اس کتاب کا مواد حاصل کرنے کے لیے سال ہا سال تک البیرونی نے پنجاب میں مشہور ہندو مراکز کی سیاحت کا، اور سکریت جیسی مشکل زبان سیکھ کر اس کے قدیم لٹریچر کو براہ راست خود پڑھا۔ پھر ہر قسم کی مذہبی، تاریخی، تہذیبی اور معاشرتی معلومات کو جو اہل ہند کے بارے میں حاصل ہوئیں اس کتاب کے اوراق میں قلم بند کر دیا۔ البیرونی اگرچہ مسلمان ہونے کی وجہ سے اہل ہند سے بالکل جدا مذہب رکھتا تھا لیکن اپنی کتاب میں اس نے ہندوؤں کے خیالات کا کہیں مذاق نہیں اڑایا اور نہ ان کے مذہب اور رسوم و عبادات کے خلاف پروپیگنڈہ کیا ہے کیونکہ اس کے قول کے مطابق یہ باتیں ایک محقق کی شان سے بعید ہیں۔ اس نے اہل ہند کی داستان اپنے قلم سے عربی زبان میں اس مفہوم کے ساتھ بیان کر دی ہے جیسی ہندو عالم سکریت زبان میں اپنے اہل مذہب کے سامنے خود بیان کرتے ہیں۔ البیرونی پہلا شخص ہے جس نے ہندوؤں کے پرانے اور دیگر مذہبی کتابوں مثلاً بھگوت گیتا، رامائن، مہا بھارت اور منوسرتی وغیرہ کے اقتباسات کو عربی زبان میں ڈھال کر کتاب الہند میں پیش کیا اور اس طرح ہندوؤں کے قدیم ادبیات کو مسلمانوں سے خصوصاً علما کو عموماً متعارف کرایا۔

مرسلہ: قرۃ العین، اقراسی کراچی

”یہ کسے اٹھالائے ہوا اپنے ساتھ؟“ اس کی جھپتی ہوئی آواز سماعت کو بہت ناگوار گذرتی تھی۔

”میری چچیری بہن سلمیٰ کی بیٹی ہے۔ اس کا اب اس دنیا میں کوئی نہیں۔“

”تو اسے یہاں کیوں لے آئے، کسی یتیم خانہ میں بھرتی کرواتے۔“

”خدا کا خوف کرو گلبدن بیگم! میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتا۔ میں نے اس کی ماں سے وعدہ کیا تھا کہ میں اسے بیٹی کی طرح پالوں گا۔“

”کل کو اس کی شادی بھی کرنی ہوگی۔ اتنا خرچا کیسے برداشت کرو گے۔ ٹھیکیدار کی زمین پر کاشتکاری کی اجرت سے گھر کا نظام پہلے ہی بہت مشکل سے چلتا ہے۔“

”اللہ بڑا سبب الاسباب ہے۔ وہ ضرور کوئی نہ کوئی حل نکال دے گا۔“ ریاض نے بے نیازی سے کہا۔

”اگر لانا ہی تھا تو کسی لڑکے کو لے آتے۔ بڑھاپے کا سہارا ہی بن جاتا۔“

”بیٹیاں بھی سہارا ہی ہوتی ہیں۔ روٹی تمہیں کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دے گی۔ یہ بھی ہماری خدمت ہی کرے گی۔“

گلبدن نے شوہر کی اسی ایک بات کو اپنی گرہ سے باندھ لیا۔ اس نے روٹی سے گھر کے تمام کام کاج کروانے شروع کر دیے اور اسی جبر کی چکی میں پستے وہ اپنی عمر کے سولہویں سال میں آگئی تھی۔

وادی کے حالات اس عرصہ میں مزید خراب ہو گئے تھے۔ سرحدی گاؤں ہونے کی وجہ سے یہاں آئے روز بھارتی فوج کی گولہ باری سے جانی نقصان کا تو کوئی شمار ہی نہیں تھا۔ چھ ماہ پہلے ریاض بھی ایسی ہی ایک گولہ باری کی زد میں آ گیا۔

ریاض کی ٹانگوں پر بارودی ذرات کی وجہ سے زہریلے اثرات پیدا ہو گئے اور اس کی ٹانگیں ضائع ہو گئیں۔ اس معذوری کے ساتھ وہ کھیتی باڑی جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ گھر میں پہلے سے جمع شدہ کچھ رقم اس کے علاج میں صرف ہو گئی اور پھر نو بت فاقوں تک آ پہنچی۔

گلبدن کی بیزاری اور چڑچڑاپن بھی ان دنوں عروج پر تھی۔ اولاد سے محرومی کے دکھ نے اسے پتھر دل اور سخت مزاج بنا دیا تھا۔ وہ روٹی کو بھی کبھی دل سے تسلیم نہ کر سکی۔ صورت حال دن بدن بگڑتی جا رہی تھی پھر ایک دن گلبدن نے اپنی بیوہ ہمسائی کا ریوڑ چرانے کی ذمہ داری قبول کر لی۔ اس نے یہ کام روٹی کے ذمہ لگا دیا۔

روٹی اس نئی ذمہ داری سے بہت خوفزدہ تھی لیکن وہ جانتی تھی کہ اس گھر میں رہائش اور تحفظ کے احسانات چکانے کا وقت آگیا ہے اس لیے بادل ناخواستہ اس نے ہامی بھری۔ وہ ہر روز انھیں پہاڑی چراگاہ میں لے جاتی اور شام ڈھلنے سے پہلے لوٹ آتی۔

ریاض کی بے بسی اور گلبدن کا رویہ روٹی کے دل و دماغ میں گھٹن پیدا کر چکا تھا۔ وہ شدید تنہائی اور یاسیت کا شکار تھی۔ مرحومہ ماں کی یاد تو کبھی بھی دل سے جدا ہوئی ہی نہ

تھی۔ وہ مویشیوں کو چرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتی اور ایک پتھر پر بیٹھی اپنی زندگی کا گہرائی سے تجزیہ کرتی رہتی۔ اس کے ذہن میں اکثر ایک سوال شدت سے پیدا ہوا کرتا تھا۔ ”میں کیوں زندہ ہوں؟ میری زندگی کا آخر کیا مقصد ہے؟“

دن یونہی ادا سی اور بے کیفی سے بیتتے جا رہے تھے۔ ایک روز وہ معمول کے مطابق مویشیوں کو چرانے کے لیے گئی۔ موسم بہت خراب تھا۔ آسمان پر چھائے گہرے سیاہ بادل اور تیز ٹھنڈی ہوائیں بارش کے آثار بتا رہی تھیں۔ دوپہر کا وقت تھا لیکن گہرے بادلوں کی وجہ سے شام کا گمان ہو رہا تھا۔

اس کے مویشی بھی اس دن بہت اڑیل ثابت ہو رہے تھے۔ تین بھیڑیں ریوڑ سے پھڑک کر جانے کس جانب نکل گئی تھیں۔ اس نے اپنی ٹوٹی ہوئی چپل گھسیٹتے ہوئے پہلے بقیہ مویشیوں کو گھر پہنچانے کا فیصلہ کر لیا۔

گھر پہنچتے ہی گلبدن کی صلوامیں عروج پر تھیں۔ اسے بھیڑوں کی گمشدگی کا علم ہوا تو اس نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ ”ارے کم بخت! یہ نقصان کون پورا کرے گا۔ یاسمین تو میری جان کو آجائے گی۔“

”تم فکر نہ کرو چاچی! میں انھیں ڈھونڈ لاتی ہوں۔“ وہ موسم کے خطرناک تیور دیکھتے ہوئے بھی یہ فیصلہ کرنے پر مجبور تھی۔ ”اگر نہ ملیں مویشی تو مجھے اپنی منحوس شکل دوبارہ مت دکھانا۔“ محسن عبور کرتے ہوئے اس فقرہ نے اسے بری طرح مجروح کیا۔

وہ ایک بار پھر پہاڑی ڈھلان پر پہنچ گئی۔ یہ علاقہ اس کا دیکھا بھالا تھا لیکن ہلکی بارش کے باعث ہونے والی پھسلن سے قدم جمانے میں بہت مشکل پیش آرہی تھی۔ وہ اپنی بھیڑوں کو تلاش کرتے ہوئے اب پہاڑی ڈھلان سے اوپر جنگل کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔

بادلوں سے ڈھکے آسمان کی وجہ سے جنگل میں نیم تاریکی کا سماں تھا۔ یکدم اسے کسی غراہٹ کی آواز سنائی دی۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔ اس سے چند گز کے فاصلے پر دو بھیڑیے موجود تھے۔ ان کے قریب ہی اس کی بھیڑوں کا زرخرہ ادھر اڑا ہوا تھا۔ بھیڑیوں کی خون آلود تھوٹھنیاں اور گہری چمکدار آنکھوں نے اس کی وحشت و خوف میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔

وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹی اور بے تحاشا دوڑنے لگی۔ بچپن سے ذہن میں بیٹھے ایک خوف نے اس کو ہوش و حواس سے بیگانہ

کر دیا تھا۔

سرپیٹ دوڑتی اب وہ جنگل کے بیرونی حصہ کی جانب نکل آئی تھی۔ اس کی سانس دھونکی کی مانند چل رہی تھی اور ٹانگیں بری طرح لڑکھڑا رہی تھیں۔ مویشیوں کی موت کے بعد گلبدن اور یاسمین کے ہاتھوں بننے والی درگت کا احساس اسے مزید خوفزدہ کر رہا تھا۔

اسی وقت اسے اپنے پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ تیزی سے پلٹی لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ دو مضبوط ہاتھوں نے اسے سختی سے دبوچا اور کندھے پر ڈالے ایک کمپ میں پہنچ گیا۔

یہ انڈین آرمی کا کمپ تھا جہاں موسم کی رنگینی نے بھارتی فوجیوں کو بے قابو کر رکھا تھا۔ وہاں پانچ افراد موجود تھے۔ میز پر شراب کی بوتلیں رکھی تھیں۔ کمپ کے ایک کونے میں ایک بہت بڑا صندوق بھی موجود تھا جو جی الحال غیر مقفل نظر آ رہا تھا۔

”اس بلبل کو کہاں سے پکڑ لائے ہو راہول؟“ ایک درمیانی عمر کا آدمی اسے دیکھ کر بولا۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر روٹی کو کچھ دیر پہلے ملنے والے بھیڑیوں کی یاد آ گئی۔

”میں باہر پیشاب کرنے گیا تھا۔ وہیں ایک درخت کے پاس بیٹھی تھی۔“ راہول نے کہا۔

”بھئی واہ! آج تو اور بھی کچھ مانگتے تو ہمیں مل جاتا۔ اس موسم میں ایسی حسین لڑکی تو پر بھوک دیا ہے ہم پر۔“ ایک اور فوجی نے قہقہہ لگایا۔

”لیکن مجھے دال میں کچھ کالا لگ رہا ہے۔“ راہول بولا۔ ”کہیں یہ مسلوں کی جاسوس تو نہیں۔“

”اگر جاسوس ہے تو پھر تو اور بھی اچھی بات ہے۔ اسے اس جرات پر خوب انعام دیں گے۔“

روٹی کی رہی سہی اہمیت بھی ختم ہونے لگی۔ ان بھارتی فوجیوں نے اس کا لباس تار تار کر دیا اور باری باری اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتے رہے۔ رات گئے یہ کھیل یونہی چلتا رہا۔ وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں اپنی موت کی آرزو کرنے لگی۔

”کیا کرنا ہے اس کا اب؟“ اسی ادھیڑ عمر فوجی کی آواز اس کی سماعت میں پڑی۔ وہ ان کا لیڈر تھا۔

”جیسا آپ حکم کریں سر۔“ راہول کی آواز نشے میں لڑکھڑا رہی تھی۔

”یہیں مار کر پھینک دیتے ہیں اسے۔ صبح ہوتے ہی گاؤں پر حملہ بھی کرنا ہے۔ وہاں سے اس جیسی اور بھی مل جائیں

گی۔“

”اس گاؤں کا نام و نشان ہی مٹا دیں گے اس بار۔ کسی ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑنا۔“ تیسرے فوجی نے کہا۔

”اسی لیے تو آئے ہیں یہاں۔ ان مسلوں کو ایک یادگار زخم دے کر جائیں گے۔“ لیڈر نے کہا۔ ”ہتھیار اور دستی بم ایک بار پھر چیک کر لینا۔ مجھے کہیں کوئی گڑبڑ نہیں چاہیے۔“

”سب کچھ ریڈی ہے سر! بس صبح ہونے کا انتظار ہے۔“ راہول بولا۔

نشان پر مکمل حاوی ہو چکا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ نیند کی وادی میں چلے گئے۔ روٹی بمشکل سانس کھینچتی اٹھی اور ایک کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھ گئی۔ ان فوجیوں کے عزائم جان کر اس کے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔

اس کے دماغ میں اس وقت ایک ایسا جزبہ طاری تھا جو اسے انوکھی توانائی دے رہا تھا۔ وہ ایک شہید کی بیٹی تھی۔ جسے اپنی بے حرمتی کا بدلہ لینے کے علاوہ سینکڑوں دیگر جانوں کو بھی کسی طرح بچانا تھا۔ روٹی کے اندر ایک آتش فشاں سا اہل رہا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر اٹھی اور اس کمرے کی جانب بڑھنے لگی جس کے بارے میں راہول نے اپنے افسر کو بتایا تھا۔

صندوق میں دستی بم موجود دیکھ کر اسے اپنے فیصلہ پر عمل مزید آسان لگنے لگا۔ بچپن میں اسکول میں ایک بار ایسے بم کا استعمال بتایا گیا تھا جو اسے آج بھی یاد تھا۔ اس نے پوری قوت سے صندوق کا ڈھکن پیچھے ہٹایا اور چند بم نکال لیے۔

کھٹ پٹ کی آوازیں کر باہر پہرے پر موجود فوجی بھی اندر چلا آیا۔

”یہ کیا کر رہی ہے!“ وہ چلا یا۔

”میں اس دھرنی کی کمزور بیٹی سہی، لیکن میں تم جیسے بھیڑیوں کو مزید شکار نہیں کھیلنے دوں گی۔ میری جنت نظیر وادی بہت مقدس ہے۔ جب تک اس وادی کا ایک بھی فرد زندہ ہے تم لوگوں کے ارادے کبھی کامیاب نہیں ہونے دے گا۔“

روٹی نے ہسٹریائی کیفیت میں کہا اور گرنیڈ کی پن نکال کر مد ہوش فوجیوں کی طرف اچھال دیا۔

ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا اور کمپ کی دیواریں سرخ رنگ میں لٹھڑ گئیں۔

کشمیر کی ایک لاچار بے بس، مجبور بیٹی نے اپنی جان قربان کر کے اپنے گاؤں کو بچا لیا تھا۔

سلسلہ عذاب

محترم و مکرم معراج رسول
السلام علیکم

یہ سرگزشت میری ہے۔ میں خود کو اذیت دے رہا ہوں لیکن کیسے یہ آپ کو اس سچ بیانی میں مل جائے گی۔ میں کیوں آوارہ گرد بنا، کیوں ملک ملک شہر شہر گھوم رہا ہوں یہ بات بھی میں نے اس سچ بیانی میں لکھ دی ہے۔

مرشد
(یو ایس اے)

میں ایک شدید اذیت میں مبتلا ہوں، ذہنی اذیت میں۔ میرے گناہ کا وعدہ توڑنے کے گناہ کا، دھوکا دینے کے گناہ کا کوئی مدا بھی نہیں ہے کیونکہ رہگور کی دھول میرے قدموں کے نشانات بھی مٹا چکی ہے۔ اسی لیے میں چاہ رہا ہوں کہ میری آپ بیتی کوئی سن لے اور اگر اس سے کسی کی آنکھیں کھل گئیں، کوئی گرنا ہوا سنبھل گیا تو میرے ذہن کا بوجھ کم ہو جائے گا۔

میری روداد میں اہم موڑ اس وقت آیا جب میں نے گریجویشن کیا۔ گریجویشن کرنے کے بعد مجھے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کی آفر ہوئی پہلے تین ماہ تربیتی مراحل کے طے کرنے تھے۔ پھر میری صلاحیتوں اور کام دیکھ کر آفیسر گریڈ میں ترقی دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ مجھے پروڈکشن سائیڈ پر فیکٹری میں کام کرنا تھا مگر قیاحت یہ تھی کہ وہ فیکٹری کئی سو میل دور ایک اجنبی شہر میں تھی۔ اس شہر میں جان پہچان کا کوئی نہ تھا پھر بھی میں نے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔

کپڑوں کا ایک چھوٹا بیگ اور ایک بریف کیس لے کر اسی شہر کو جاتی بس میں سوار ہو گیا۔ کئی گھنٹوں کی مسافت کے بعد بس اس شہر میں داخل ہوئی۔ میرے لیے اس شہر کی عمارتیں، ٹریفک اور چہرے غرض ہر چیز اجنبی تھی۔ ہزاروں

چہروں کے بیچ میں میرا کوئی اپنا چہرہ نہ تھا۔ مجھے پہلے دن یہ اندازہ نہ تھا جب اس سفر سے باہر نکلوں گا تو کئی ایک کو اکیلا کر جاؤں گا۔

میں ایک چھوٹے سے شہر سے گیا تھا اور اتنی زیادہ ٹریفک اور بھیڑ دیکھ کر میں ہراساں تھا۔ ایک بڑے چوک پر بس سے اترا، ایک متوسط ہوٹل میں جا کر ایک ماہ رہنے کے لیے کرائے کے کمرے کی بات کی۔ چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں ایک بیڈ کے علاوہ میز کرسی رکھی تھی۔ اس تین منزلہ ہوٹل کے بیچ میں تھیں اور ارد گرد کمرے بنے تھے۔ کمروں کے باہر راہداری تھی جہاں سے صحن میں جھانکا جاسکتا تھا۔ صحن میں ہر وقت چائے پینے اور کھانا کھانے والوں کا رش لگا رہتا تھا۔ وہیں لوگ بیٹھ کر ٹی وی دیکھ رہے ہوتے۔ میں نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا۔

میں پہلی بار اپنے شہر سے باہر نکلا تھا۔ عمر میری بائیس سال کے قریب تھی۔ زندگی کا کوئی تجربہ میرے پاس نہ تھا کہ اسے کس ڈھنگ سے گزارا جاتا ہے۔

یہ میری زندگی کا پہلا پڑاؤ تھا جس میں میں بالکل اکیلا تھا، مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ تنہائی کتنے عرصے پر محیط ہوگی۔ کمرے میں سامان رکھ کر باہر نکلا تو شور اور بھیڑ سے مجھے وحشت ہونے لگی اور میں فوراً لوٹ آیا اور پھر سے کمرے کی تنہائی میں اپنے آپ کو قید کر لیا۔ میں واقعی اس وقت ایک غریب الوطن تھا جو اپنا کیریئر بنانے ایک نئے ہجوم میں آگھسا تھا۔

میں بنیادی طور پر ایک شرمیلا انسان ہوں۔ کسی اجنبی سے گفتگو میں پہل کرنا میرے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ میں ہوٹل کے صحن میں بیٹھا اپنے ارد گرد کے لوگوں سے بات کرنا چاہتا تھا مگر ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ یوں بھی میں دوست بنانے میں احتیاط کرتا ہوں اس لیے دوست میرے کم ہیں اور دشمن تو بہت ہی کم ہیں۔ ایک بات اور بتا دوں کہ مجھ میں کوئی خاص بری عادت نہیں ماسوائے اس کے کہ حسن میری کمزوری ہے۔ حسن چاہے وہ چہروں میں ہو، مناظر میں، مجھے فوری اپنی جانب کھینچتا ہے۔

میں جس فیکٹری میں جاب کرنے آیا تھا وہ ایک مشہور کمپنی تھی۔ ہر بندہ اس میں جاب کرنا چاہتا تھا، خواہ لیبر کی ہی جاب کیوں نہ ہو۔ فیکٹری والے لیبر کو صرف چھ ماہ کے لیے رکھتے اور پھر اس کی چھٹی کر دیتے۔ پرائیویٹ کمپنیوں کے ذریعے انہیں کنٹریکٹ پر رکھتے تھے تاکہ لیبر یونین سے



خلاصی رہے۔ وہ فیکٹری شہر سے ایک گھنٹے کی مسافت پر تھی۔ شہر کے مختلف مقامات سے فیکٹری کو ہر صبح بس لیبر کے لیے چلتی تھی۔ آفیسر کے لیے نئی کور دین چلتی تھیں۔ میں چونکہ ابھی آفیسر نہ ہوا تھا اسی لیے مجھے لیبر کی بس میں فیکٹری جانا تھا۔ فیکٹری کے بچکنگ ڈیپارٹمنٹ میں لڑکیاں کام کرتی تھیں اور وہ آمدورفت کے لیے بسوں ہی کو ذریعہ بناتیں۔

میں نے ہوٹل کے منیجر سے فیکٹری جانے کے لیے بس کا معلوم کیا تو پہلے وہ مجھے مرعوب ہو کر ستائشی نظروں سے دیکھنے لگا کہ میں اس مشہور کمپنی میں آفیسر بھرتی ہوا ہوں۔ اسے شاید یقین نہیں آ رہا تھا بھی بار بار میرا جائزہ لیتا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس ہوٹل سے دس منٹ کی پیدل مسافت پر ایک چوک ہے وہاں سے صبح چھ بجے بس ملتی ہے۔

سردیوں کے دن تھے۔ منہ اندھیرے میں ہوٹل سے نکلا۔ بس لی اور بے ہنگم موسیقی سنتا سات بجے پہلی شفٹ کے ساتھ فیکٹری کے گیٹ پر اترا۔ درجنوں باوردی بیکورٹی گارڈز گیٹ پر تعینات تھے۔ فیکٹری بہت بڑی تھی۔ ایک طویل سڑک کے دائیں جانب اس کی عمارتیں تھیں۔ درمیان میں لیبر میس تھا۔ بائیں جانب قطار در قطار درخت تھے جن کے نیچے پختہ بیج بنے تھے۔

آفیسرز کا میس گیٹ کے دائیں جانب ایک خوب صورت کالج تھا۔ مجھے اندر لے جایا گیا۔ ضروری کاغذات پر دستخط کے بعد مجھے احساس ہوا رہا تھا کہ میں دنیا کا خوش قسمت انسان ہوں جس کو پہلی جاب ملنی نیشنل کمپنی میں ملی ہے۔ میرا منیجر مجھے اس لمبی سڑک پر چلاتا ہوا آخری عمارت میں لایا جہاں میرا آفس تھا جو فیکٹری کی مشینوں کے شور کے

درمیان بناتا تھا۔

فیکٹری میں کہیں بھی آنا جانا ہوتا تو سب کو اس لمبی سڑک سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔

گو میں کاغذوں میں ابھی آفسر نہ تھا مگر کام اور ذمہ داریوں کے حوالے سے مجھے آفسروالے اختیارات حاصل تھے۔

پہلا دن تھا اور میرے ڈپارٹمنٹ میں کام کرنے والا ایک لڑکا مجھے لیبر میس لے جانے کے لیے لے گیا۔

ہال بھرا ہوا تھا اور پچاسوں لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ لائن میں کھڑے ہو کر اپنی ٹرے میں کھانا لیا اور پھر سب سے پیچھے ایک خالی میز پر جا بیٹھا۔ ارد گرد میزوں پر بیٹھے لوگ مجھے پر تجسس نظروں سے دیکھتے اور پھر ساتھ بیٹھے ساتھیوں سے سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگتے۔ میں ان کے لیے نیا تھا اور وہ میرے لیے نئے تھے۔

لڑکیوں کا لٹچ روم اس بڑے ہال سے متصل تھا۔ میں سر جھکائے کھانا کھا رہا تھا کہ سانولے رنگ کا ایک نوجوان چہرے پر خیر مقدمی مسکراہٹ سجائے میرے ساتھ آ بیٹھا۔ تعارف پر معلوم ہوا کہ وہ سلیم ہے اور فیکٹری کی ورکشاپ میں سپروائزر ہے۔ کچھ ہی دیر میں ہم دونوں بے تکلف ہو گئے۔

کھانا کھا کر باہر نکلے تو دیکھا کہ درختوں تلے کئی لڑکیاں سفید کوٹ پہنے بیٹھی ہیں یا پھر کھڑی ہیں۔ ہر جانب ان کی باتوں اور تہقہوں کی آوازیں گونج آرہی تھیں۔ کہیں لڑکے بھی ان کے ساتھ کھڑے تھے۔

میں باہر نکلا تو بیشتر لڑکیاں اور لڑکے خاموش ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔ میں ان کی نظروں کی تاب نہ لا کر مڑا اور اپنے ڈپارٹمنٹ کی طرف جانے لگا۔ میں خاصا نروس ہو رہا تھا۔

سلیم نے مجھے ایک منٹ رکھنے کا کہا اور خود درخت تلے بیٹھ کر بیٹھی لڑکیوں کی جانب چلا گیا۔ لڑکیاں میری جانب دیکھ رہی تھیں۔ میں میس کی جانب سے منہ پھیرے اپنی پینٹ کی جیب میں دونوں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔

ایک کیا بائچ منٹ ہو گئے مگر سلیم واپس نہیں آ رہا تھا۔ سرگھا کر ادھر دیکھا تو وہ میرے بالکل عقب میں بیٹھ کر بیٹھی ایک لڑکی سے باتیں کر رہا تھا۔ لڑکی نے مجھے اپنی جانب دیکھتے پایا تو نظریں اٹھا کر میری جانب دیکھا۔ نظروں سے نظریں ملائیں تو میں ساکت رہ گیا۔ اس کی آنکھیں سوئی

سوئی سی نشے میں ڈوبی مگر چمک دار تھیں۔

سلیم نے واپس آ کر میرا بازو تھامنا تو میں شرمندہ سا ہو کر سکتے کی کیفیت سے نکلا۔ میں واپس اپنے آفس جا رہا تھا مگر ایک عجیب سا احساس دل میں محسوس کر رہا تھا۔

دوسرے دن بھی یہی ہوا۔ میں لٹچ کر کے باہر نکلا تو وہ اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی تھی۔ میں نے جھجکتے ہوئے اس کی جانب دیکھا تو اس کے کھلتے چہرے پر سوئی آنکھیں جاگئیں۔ میری جانب انھیں اور پھر ادھر ادھر بھٹکنے لگیں۔

پھر ہر روز یہی ہونے لگا۔ اسے ایک نظر دیکھنے کا میں سارا دن پلان بناتا۔ اسی ایک لمحے کو سوچتا، اس ایک لمحے کو پھولوں کی طرح ہار میں پروتا۔ خواب بناتا اور اس کو تعبیر تصور کرتا۔ ان آنکھوں میں چھپے بھید یا نے کی کوشش کرتا اور اسی ایک لمحے کو کئی دکش روپ دے کر گھنٹوں آفس میں بیٹھا سوچتا اور مسکراتا رہتا۔ شاید مجھے محبت ہو گئی تھی۔

محبت اس طرح اچانک وار کرتی ہے اس کا تجربہ مجھے پہلی بار ہو رہا تھا۔ میرے دن رات اسی کے ہو گئے تھے۔ میرا اٹھنا بیٹھنا، سونا اور چلنا اسی لڑکی کی یاد میں ڈوب گیا تھا۔

میں صبح سات بجے فیکٹری پہنچ جاتا اور چھٹی کے بعد بھی وہیں رہتا۔ وہ شام سے پہلے چار بجے واپس چلی جاتی تھی۔ وہ چلی جاتی تو یوں محسوس ہوتا کہ شام اچانک اتر آئی ہے۔ میں کام سے فارغ ہوتا اور اسی بیٹھ پر بیٹھا فضا میں سگریٹ کے مرغولے چھوڑتا اس کی یاد میں گم ہو جاتا۔

ویک اینڈ کی دو چھٹیاں اوروں کو طمانیت دیتی تھیں مگر میں بے چین اور چڑچڑا ہوا جاتا۔ اس کے بغیر دو دن گزارنا میرے لیے محال تھا۔ میں نے تصور ہی تصور میں اسے اپنی دلہن بنا لیا تھا۔ اسے سولہ سنگھار کراتا، زیور بھی خود پہناتا تھا اسے آنکھیں کھولنے کی التجا کرتا اور پھر ان میں ڈوب جاتا۔

ہوٹل میں رہنا مجھے پسند نہیں آ رہا تھا۔ اسی لیے نئے کرائے کے گھر کی تلاش شروع کر دی تھی۔ کسی نے بتایا کہ فیکٹری کے ڈرائیور نے دو منزلہ ناگھار بنایا ہے۔ اوپر کا حصہ ابھی زیر تعمیر ہے اور نچلے حصے میں تین کمرے ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ فیکٹری کے تین ملازمین کو وہ کمرے علیحدہ علیحدہ کرائے پر دے دے۔ میں نے اس سے ملاقات کی اور بات چلی کر لی۔ میرے علاوہ دوسرا کمرہ فیکٹری میں فوٹو کاپی مشین کے آپریٹر جعفر نے لے لیا تھا۔ زیادہ کرایہ دے کر بڑا کمرہ

میں نے حاصل کر لیا۔ تیسرا کمرہ خالی تھا۔

یہ گھر شہر کی نسبتا کھلے اور نئے علاقے میں تھا۔ گیٹ کے سامنے سینٹ کا پختہ چبوترہ تھا۔ ساتھ والے گھروالوں نے چبوترے کی جگہ تین فٹ کی چھوٹی چار دیواری بنا کر ایک احاطہ بنا لیا تھا جس میں انہوں نے بیچ رکھے تھے۔ متوسط لوگ اس علاقے میں رہتے تھے۔ آنے جانے کے لیے سوزوکی یا موٹر سائیکل کا استعمال بہت زیادہ تھا۔ پاس ہی ایک کھلے میدان کے گرد مارکیٹ تھی جہاں مجھے ضرورت کا سارا سامان مل سکتا تھا۔ وہاں چند ایک چھپر ہوٹل بھی تھے جہاں میں کھانا بھی کھا سکتا تھا۔

میں اپنے کمرے کے لیے بیڈ، درمی، بستر، الماری کے علاوہ ٹی وی اور فریج بھی لے آیا۔ میرا مسکن آباد ہوا تو ایک نئے طرز کی زندگی گزارنے کے لیے میں مکمل تیار تھا۔ اچھی جاب کے ساتھ اور ٹائم بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ چند ماہ میں اگر مجھے آفسر گریڈ مل گیا تو خواہ دوگنی ہو جانی تھی۔ پیسے کی فراوانی تھی اور ادھر اکیلی زندگی جس پر کوئی ٹکراؤ آنکھیں براجمان نہ تھیں۔

فیکٹری کی بس ہر صبح سامنے سڑک سے بھی گزرتی تھی، اگلے روز صبح تیار ہو کر بس کے لیے باہر نکلا تو سامنے وہی لڑکی کھڑی تھی۔

میں حیرت اور بے یقینی کے عالم میں کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس کا چہرہ دوسری جانب تھا جہاں سے بس آتی تھی۔ اس نے ابھی مجھے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے اس بات پر خوشی تھی کہ وہ یہیں رہتی ہے، یہیں آس پاس اور میں اسے اکثر دیکھ سکوں گا۔

میں اس کے سراپے کو دیکھ رہا تھا۔ لمبی گردن، سیاہ چمک دار گیسو اور دراز قد میری نظروں کی پیش اتنی تھی کہ اس نے محسوس کر لیا۔ گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔

اس کی اداس آنکھیں ایک دم چونک اٹھیں جیسے سوتے ہوئے جھنجھوڑ کر جگا دیا گیا ہو۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں مگر نہ جانے کیوں پہلے کی طرح اداس سی ہو کر بے اعتنائی سے بس کا انتظار کرنے لگیں۔

اسے سامنے پا کر میرے قدم زمین میں گڑ گئے تھے۔ اسے دیکھ کر میں مکمل بے خودی میں گھر گیا تھا۔ قدرت نے اسے میرے سامنے لا کھڑا کیا تھا اور میں یہی سمجھ رہا تھا کہ اوپر والا بھی اسے میرا بنانا چاہتا ہے۔

بس آئی تو وہ اگلے دروازے سے سوار ہوئی۔ میں

نے جلدی سے سڑک پار کی اور بمشکل بس کے پچھلے دروازے سے اوپر چڑھا۔

اس دن میس سے لٹچ کر کے نکلا تو وہ اسی بیٹھ پر بیٹھی تھی۔ میں نے اس کی جانب دیکھا تو اسے اپنی جانب متوجہ پایا۔ میں ذرا سا مسکرایا تو اس کی آنکھوں میں جھلکے بھر کو ذرا سی چمک ابھری مگر دوبارہ پھر سے اداسی سے بھر گئیں۔ شاید میرا مسکراتا اسے اچھا نہ لگا تھا۔

آخر ان آنکھوں میں اداسی کے لہریے کیوں ہوتے ہیں۔ میں اکثر یہ سوال اپنے آپ سے کرتا تھا مگر اب ان آنکھوں سے مجھے کچھ پیغامات مل رہے تھے۔ کئی سوال ان آنکھوں میں اپنے لیے پاتا تھا۔ میں خود میں اتنی ہمت رکھتا تو ان آنکھوں میں چھپے سوالوں کا جواب پالیتا مگر میں تو اس کے آگے گنگ ہو جاتا تھا۔ میں سوچتا کہ اس سے اپنی دل کی حالت کس طرح بیان کروں۔ کیسے اسے بتاؤں کہ میں وہ کچھ نہیں بتا سکتا جو میرے اندر ہے۔

اسی دوران میری سلیم سے دوستی ہو گئی۔ وہ سلیم کی منہ بولی بہن تھی۔ اسی نے چھ ماہ کے لیے اس کی جاب کرائی تھی۔ سلیم نے مجھے بتایا کہ اس کا نام رابعہ ہے اور گھر میں سب اسے رابی کہتے ہیں۔ متوسط اور عزت دار لوگ ہیں۔ ضرورت کے تحت یہ جاب کر رہی ہے۔ اپنی خواہ سے کچھ ماں کو دیتی ہے اور باقی سے اپنا جہیز تیار کر رہی ہے۔ گھر میں سب سے بڑی ہے اور دو بہنیں اور ایک بھائی اس سے چھوٹے ہیں۔

میرے گھر میں بڑی بہنیں اور بھائی تھے جن کی ابھی شادی ہوئی تھی۔ یہ میرے لیے ایک طرح سے ناممکن تھا کہ ان کی شادی سے پہلے میں گھروالوں سے اپنی شادی کی بات کروں۔ اس وقت کیا، میں تو اگلے سات آٹھ سال تک بھی شادی نہیں کر سکتا تھا۔ میں بھی سوچتا کہ اگر اس سے شادی ابھی نہیں کر سکتا تو اسے کیوں پیار کی راہ پر گھسیٹوں مگر دل تھا کہ مسلسل اپنی رٹ لگائے ہوئے تھا۔

میں عمر کے اس دور میں تھا جہاں کچھ بھائی نہیں دیتا۔ کاش میں نے دل کے ساتھ کچھ عقل سے بھی کام لیا ہوتا۔ اسے کوئی موم کی گڑیا نہ سمجھتا بلکہ جیتی جاگتی حساس لڑکی سمجھتا۔ اس وقت سمجھ جاتا تو آج اس کرب میں نہ ڈوبا ہوتا۔ اسی علاقے میں شاہد بھی رہتا تھا۔ وہ انجینئرنگ یونیورسٹی کے فاسٹ ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا۔ ایک دو ملاقات کے بعد وہ میرا دوست بن گیا۔ وقت کے ساتھ یہ دوستی گہری

ہوتی گئی۔ پھر وہ اور جعفر دونوں میرے راز داں بن گئے۔ میں شام کو کھانے کے بعد شاہد کے گھر چلا جاتا۔ ہم لمبی واک کرتے۔ کسی چائے خانے میں بیٹھ کر چائے پیتے۔ میں ہر روز اسے اپنی محبت کی تازہ روئیداد سنا تا۔ وہ ہمیشہ سن کر مسکراتا دیتا۔ جعفر کو زیادہ نہیں بتاتا تھا کیونکہ وہ بھی اسی فیکٹری میں ملازم تھا۔

کچھ ماہ تک آنکھوں سے نکلے سندھے آنکھوں سے نکراتے رہے۔ پھر اسی کی خاموش اور اداس آنکھوں میں ہلکی سی مسکراہٹ ابھری اور پھر وہی مسکراہٹ ان آنکھوں سے نکل کر چہرے پر پھیل گئی۔

میں سوتا تو اسی کی یاد میں۔ میں اٹھتا تو اسی کا نام لے کر اور خیالوں میں اسے اپنے پاس بٹھا لیتا جب اکیلا ہوتا۔ صبح تیار ہو کر گھر کے باہر چوتھے پر کھڑا ہوتا تو نظریں اسے ہی ڈھونڈ رہی ہوتیں۔ وہ لیٹ ہو جاتی تو میں بے قرار ہو جاتا۔ وہ آ جاتی تو اور بے قرار ہو جاتا۔

انہی دنوں ترقی پا کر میں آفیسر ہو گیا۔ اب مجھے دین پر جانا تھا۔ وین بس سے ذرا پہلے آ جاتی تھی۔ اس لیے وقت سے پہلے میں نکل آیا۔

میں گھر سے باہر نکلا تو وہ عجیب شان بے نیازی سے دوسری سمت نامعلوم چیزوں کو تنک رہی تھی۔ گیٹ بند کرنے کی آواز سن کر اس نے ادھر دیکھا۔ ہلکا سا مسکرائی مگر پھر وہی اداسی اس کی آنکھوں میں پھیل گئی۔ آنکھوں کی مستقل اداسی اس کے حسین سراپے کی دلکشی کو دو چند کرتی تھی۔ وہ اس کی شخصیت کا ایک حصہ بن گئی تھی۔ اس کے حسن میں حزن تھا۔ شوخی اس کے چہرے پر نہیں نکلتی تھی۔ وہ بہت خوش ہو کر اداس لگتی اور بہت اداس ہو کر نہ جانے کیا لگتی ہو گی۔

اس روز وین آئی سامنے سے گزری نہیں بلکہ سامنے آ کر ٹھہر گئی۔ میں چوتھے سے اتر کر وین میں بیٹھ رہا تھا تو اس کے چہرے پر حیرت تھی کہ خوشی، مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ میں وین کے اندر بیٹھنے سے پہلے اس کی جانب گھوما اور ہاتھ کے اشارے سے ذرا سا سلام کر دیا۔ اس کے ہونٹ وا ہوئے تو محسوس ہوا کہ اسے خوشی ہوئی ہے۔ اس نے سر کو جنبش دے کر جواب دیا تو میں سر سے پاؤں تک سرشاری میں نہا گیا۔

اس دن میں آفیسرزمیں میں لچ کرنے گیا۔ وہاں جانا مجھے کھل رہا تھا کیونکہ میں ہر روز لیبرمیں سے نکلنے کے

بعد رابی کو درخت تلے بیٹھا دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا۔ آفیسرز میں کے مختلف اوقات تھے مگر میں جلدی لچ کر کے باہر نکل آیا۔ درخت کے سامنے سے گزرا تو وہ وہیں سہیلوں کے درمیان گم صم بیٹھی تھی۔ مجھے آتے دیکھا تو اچانک اس کے ہونٹ وا ہوئے اور رخساروں پر لکیر کھینچ گئی۔ میں سمجھ گیا وہ خوش ہے اور مسکرا رہی ہے۔

پھر ایک صبح اس سے بات کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ میں گھر سے باہر نکلا تو وہ اسٹاپ پر نظر نہیں آئی۔ چوتھے پر کھڑے ہو کر میں نے راستے کی جانب دیکھا مگر وہ بھی ویران پڑا تھا۔ وہ نظر نہ آئی تو یوں لگا کہ دن نہیں نکلا۔ پچھلے دو ماہ میں اس نے کبھی چھٹی نہیں کی تھی، پر آج کیا ہوا، ضرور اس کے ساتھ کوئی واقعہ ہوا ہے۔ ایسی کیا بات ہوئی ہے میں اس نکتے پر غور کر رہا تھا۔ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ دن کیسے گزرے گا رات کیسے کٹے گی۔

میں سوچتا ہوا احاطے سے ٹپک لگائے کھڑا تھا۔ اچانک ایک دبی دبی نسوانی ہنسی سنائی دی۔ دیکھا تو حیران رہ گیا کہ وہ برابر والے مکان کے باہر بنے احاطے کی بیچ پر بیٹھی ہے مجھے اور ہر اس کے دیکھ کر ہنس رہی ہے۔ اسے اپنے اتنا قریب دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ کچھ نہ سوچھا تو میں نے سلام کر دیا۔ لمحہ بھر کو خوش ہوئی پھر دنگی اداسی آنکھوں میں آٹھری مگر خوشی سے ہونٹ وا تھے۔ مجھ سے ایک لفظ بھی ادا نہ ہو رہا تھا جس کی ادائیگی میرا رواں رواں کر رہا تھا۔ بس مجھ سے اتنا ہوا کہ اس احاطے کے نزدیک بیٹھ گیا۔ وہ بھی بیچ سے اٹھ کر پاؤں داری وال کے قریب آئی۔ اسے اتنا قریب پا کر مجھ سے کچھ بولا نہ گیا اور میں نے گھبراہٹ میں کہہ دیا جس کی توقع مجھے ہر گز نہ تھی اور نہ اس کو۔ میں نے کہہ دیا۔

”میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اس کے نازک ہونٹ بند ہوئے۔ اداسیوں کے پھیرے پھر سے آنکھوں میں سجے اور وہ حیرت سے بولی۔ ”یہ فیصلے تو ماں باپ کرتے ہیں۔ میرے اختیار میں کچھ نہیں۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں شرمندہ سا کھڑا تھا۔ میری شرمندگی کو سہارا دے کر اس نے کہا۔ ”آپ کا نام نوید طارق ہے نا؟“

”جی یہی میرا نام ہے۔“

”آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟“ جب اپنے شہر کا بتایا تو حیرت بھرے لہجے میں بولی۔ ”آپ تو بہت دور

کے رہنے والے ہیں۔“ ”جی ہاں لیکن اب تو آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔“ یہ سن کر اس نے اپنے تاثرات بڑی خوب صورتی سے چھپائے۔

میں ذرا اور بہادر بن کر بولا۔ ”میں آپ کا نام نہیں پوچھوں گا کیونکہ آپ رابی ہیں۔“

اس کے ہونٹ مسکرائے اور بولی۔ ”یہ تو مجھے گھر میں کہتے ہیں۔ میرے اپنے۔“

”آج غیر ہوں مگر کل کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ راستے ایک ہوں تو غیر اپنے لگنے لگتے ہیں۔“

یہ سن کر اس کے ہونٹوں کے علاوہ آنکھوں میں بھی مسکراہٹ اتر آئی تھی۔

اتنے میں وین آگئی۔ میں نے اسے ایسے دیکھا جیسے پجاری دیوی کو دیکھتا ہے۔ عقیدت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر میں وین میں جا بیٹھا۔

میں اور رابی عمر کے جس دور سے گزر رہے تھے وہ زندگی کے رنگین سال ہوتے ہیں۔ احساس اور خیالات تو لڑکے لڑکیوں کے ایک جیسے ہوتے ہیں مگر مطلع نظر مختلف ہوتا ہے۔ لڑکی خواب دیکھتی ہے اپنے آئیڈیل کے اس انسان کے جو اسے پسند آئے اور وہ بڑے چاؤ سے بیاہ کر اسے اپنے گھر کی عزت بنالے۔ لڑکیاں جسے پسند کر لیتی ہیں تو اسے ہمیشہ کے لیے اپنے دل میں بند کر لیتی ہیں۔ وہ ٹھکانے نہیں بدلتیں۔ ایک کی ہو کر رہتی ہیں بھلے وہ اسے ملے یا نہ ملے۔ اگر شادی نہیں اور ہو جائے تو نئے گھر میں خود کو قریب سے ایڈجسٹ کر لیتی ہیں مگر دل کی پھانس نہیں نکلتی لیکن لڑکا پہلا عشق کرتا ہے تو دوسرا بھی کرتا ہے۔ کسی ایک کا تب تک نہیں بنتا جب تک سامنے والی اپنے ٹیلنٹ سے اسے اپنا نہ بنا لے۔ بہت کم ہوتا ہے کہ لڑکا شادی کے لیے کسی لڑکی سے عشق کرے۔ دعوے تو کرتا ہے مگر مکاری کر رہا ہوتا ہے۔ پسند تو کرتا ہے مگر اپنا نہیں سکتا۔ وعدے تو کرتا ہے مگر ایفا نہیں کر سکتا۔ یہ ایک عمومی رویہ ہے جس کو میں بیان کر رہا ہوں مگر میرے ساتھ ایسا نہ تھا۔

اب وہ ہر دن اسٹاپ پر جلدی آ جاتی اور آ کر ساتھ والے احاطے میں پچھی بیچ پر بیٹھ جاتی۔ ہم باتیں کرتے ڈھیر دو باتیں ایک دوسرے سے مذاق بھی کر لیتے تھے۔ میں ہنستا اور وہ صرف مسکرائی رہتی۔ اس کے حسن میں

خاص بات اس کی آنکھوں کا حزن تھا جو اس کی پوری شخصیت پر قبضہ کیے بیٹھا تھا۔ اس کی اداس آنکھیں دیکھ کر میں کھوسا جاتا۔ کپڑے ہمیشہ سادہ اور پروقار پہنے ہوتے۔ وہ سادگی میں بھی نمایاں ہوتی۔ اس کی ذات میں خوبی اس کی کمالت میں تھی۔

ہم آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے پیار میں ڈھلتے چلے گئے۔ ایسے کہ ہمارے دن رات ہی ایک ہو گئے۔ وہ دن کا احوال سناتی اور میں راتوں کے قصے سناتا۔ وہ اپنے گھر کی باتیں بتاتی اور میں گھر بسانے کی باتیں کرنے لگتا۔ میں شادی کی بات کرتا تو حیا سے اس کی نظریں جھک جاتیں۔ میں تحفے لاتا تو وہ انکار کر دیتی۔ وہ لاتی تو میں لے لیتا۔ وہ باتیں کم کرتی اور مجھے دیکھتی رہتی۔ مجھ سے کبھی کوئی وعدہ نہ مانگا مگر میں ہر روز اسے اپنی قسمیں دیتا تھا۔ ایک دن کہنے لگی۔ ”مجھے اتنے وعدے کیوں دیتے ہیں۔ مجھے کیوں اتنی یقین دہانیاں کراتے ہیں۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ میں تو اعتبار کے کھونٹے سے بندھ چکی ہوں۔“

ایک بار میں فیکٹری کی سڑک پر جا رہا تھا۔ وہ دوستوں کے ہمراہ درخت تلے ہمیشہ کی طرح خاموش بیٹھی تھی۔ اسے اداس بیٹھے دیکھا تو میرے قدم خود بخود رک گئے۔ میں رکا تو لڑکیوں نے اسے کہنیاں مارنا شروع کر دیں۔ اس نے گھبرا کر نظریں اٹھائیں۔ اس کی نگاہ میں میرے لیے التجائیں تھیں۔ وہ آنکھوں سے بولی اور میں نے آنکھوں کی زبان سن لی۔

دوسری صبح وہ بیچ پر بیٹھی تھی۔ اس کی نظروں میں میرے لیے بہت پیار۔۔۔ اور کچھ شکایتیں تھیں۔ سلام کا جواب دینے کے بعد پوچھا۔ ”کل لچ کے وقت تم گھبرا کیوں گئی تھیں؟“

وہ اپنی عادت کے مطابق ٹھہر ٹھہر کر بولی۔ ”آپ ہمارے سامنے آئے تھے تو میرا دل رک گیا تھا کہ معلوم نہیں آپ کیا کہہ دیں؟ آپ کچھ کہیں گے تو لڑکیاں کیا کہیں گی؟ پہلے ہی سب مجھے چھیڑتی ہیں کہ نوید صاحب تم کو بہت چاہتے ہیں۔“ پھر مجھے بغیر پلکیں جھپکائے کچھ دیر دیکھ کر بولی۔ ”مگر میں ہمیشہ انکار کر دیتی ہوں۔“

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”رابی تم انکاری کیوں ہو جاتی ہو؟“

اپنے سفید دوپٹے سے آنکھوں کے نم کوٹنے صاف کرتی ہوئی بولی۔ ”اپنے آپ کو بہت سمجھاتی ہوں کہ آپ کا

خیال دل سے نکال دوں۔ رات دیر دیر تک جاگ کر آپ کے بارے میں سوچتی ہوں۔ رشتے کے بارے میں سوچتی ہوں۔ آپ ابھی لڑکے ہیں اور زندگی کے فیصلے آپ اکیلے نہیں کر سکتے۔ میرے بارے میں پھر کیوں اتنا بڑا فیصلہ گھر والوں سے پوچھتے بغیر کر لیا۔“ کچھ دیر کے لیے رک گئی میں اس کے رخساروں پر بہتے آنسو بڑے کرب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ”آپ صرف پیار کی بات کرتے تو اپنے تک رکھتی مگر جب شادی کی بات کی ہے تو میرے گھر تک جائے گی اور میرے گھر کی عزت داؤ پر لگ سکتی ہے۔ اب بھی بتا دو کہ تم شادی نہیں کر سکتے تو میں اپنی ماں سے بھی ذکر نہیں کروں گی۔ صرف یہ کہوں گی تم سے نوید! تم سے میں واقعی بے انتہا پیار کرنے لگی ہوں اور یہ پیار ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں گی مگر تم میری راہ چھوڑ دو۔ یہ گھر چھوڑ دو۔ شہر نہیں چھوڑ سکتے تو محلہ ہی چھوڑ دو۔“

میں نے تڑپ کر کہا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو رابی؟“ وہ بولی۔ ”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ مجھ سے شادی کرنا تمہارے اختیار میں نہیں۔ شادی کو بیچ سے نکال کر اپنے پیار کو بچا لو اور مجھے اپنے سے دور کر کے کہیں اور مکان لے لو۔ آج کے بعد شادی کا کہا اور بعد میں نہیں کی تو میں سمجھوں گی کہ تم جھوٹے تھے تمہارا پیار جھوٹا تھا۔ اپنا مان رکھ لو نوید۔ چلے جاؤ۔ ورنہ جب مجھے بھی یہ احساس ہوا کہ میرا پیار کھوٹا تھا تو مر جاؤں گی۔“ وہ رونے لگی۔ روتے روتے بولی۔ ”آپ سے شادی کے بغیر وہ لوں گی مگر آپ کا پیار کھو کر جی نہ سکوں گی۔“

اسی دوران دور سے مجھے اپنی وین آتی دکھائی دی۔ جلدی سے اس سے کہا۔ ”تم لنچ سے پہلے میرے آفس میں آنا کسی کی جاب کے لیے کوئی درخواست بھی لے آنا مگر آنا ضرور، میں انتظار کروں گا۔“

وین رکی تو اس جانب بڑھنے سے پہلے میں نے رابی کو دیکھا۔ اس کی جھیل جیسی گہری آنکھوں میں التجاؤں کے بادل تیر رہے تھے۔ میں سارا راستہ یہی سوچتا رہا کہ وہ کیا ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس کا خدشہ بجا تھا؟ یہ بھی سوچا کہ میں ایک دو سال میں اس سے شادی کر سکتا ہوں تو جواب مجھے نفی میں ملا۔ اس کے کہنے پر میں شادی نہ کرنے کا کہہ سکتا تھا مگر اس کے ساتھ اسے چھوڑنے کی شرط بھی اس نے لگا رکھی تھی جو میری اکیلی زندگی کو تہہ وبالا کر دیتی۔ اپنے سے دور کرنے کا اسے میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جسے اپنی مرادوں سے

پایا تھا اسے چھوڑ دینا مجھے گوارا نہ تھا۔ میں نے مستقبل کا نہ سوچا اور رابی کو اپنے قریب لانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس دن میں لنچ پر نہیں گیا۔ اس کے انتظار میں بیٹھا رہا۔ وہ آفس کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو اس کی پتلی ناک سرخ ہو رہی تھی۔

میں اپنی کرسی سے اٹھا۔ میز کے گرد گھوم کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ پہلی بار وہ میرے اتنا قریب آئی تھی۔ اس کے قرب کی مہک مجھے مدھوش کر رہی تھی۔ میں نے شدت پیار میں اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ میرے بازوؤں کے مضبوط حصار میں پہلے وہ تھوڑا پھڑپھڑائی اور پھر بے خود ہو کر میرے سینے سے لگ گئی۔ وہ رونی رہی تھی۔ اس کی تمازت سے میں جل رہا تھا۔ پھر اسے اپنی کرسی پر بٹھایا اور خود اس کے سامنے میز پر جا بیٹھا۔ اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بولا۔ ”میری بات غور سے سنو رابی، اگر تم سے پیار کرتا ہوں تو شادی بھی تم ہی سے کروں گا۔ اس پیار کا کیا فائدہ کہ ملاپ بھی نہ ہو، اگر تم سے شادی نہ کر سکتا تو تمہارے راستے میں بھی نہ آتا۔ تم میری ہو اور صرف میری۔“ پھر اس کی خوب صورت آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ ”ان آنکھوں کی قسم، نہ تم کو چھوڑ سکتا ہوں اور نہ ہی بھول سکتا ہوں۔ رات دن سوتے جاگتے صرف تمہارے بارے میں سوچتا ہوں۔ میں مر جاؤں گا رابی مجھے مرنے سے بچالو۔“

اس نے اپنے داہنے ہاتھ سے میرے چہرے کو چھوا اور بولی۔ ”اگر آپ کو اپنی باتوں پر اتنا یقین ہے تو آج سے رابی آپ کے یقین پر ایمان لے آتی ہے سرکار۔ آئندہ سے آپ نوید نہیں میری سرکار ہیں۔ اب یہ دل کیا میری جان بھی آپ کے حوالے ہے۔“

وہ اب اپنی آنکھوں اور ہونٹوں سے مسکرا رہی تھی۔ مسکراتے مسکراتے میرے گلے لگ گئی۔ میں نے کہا۔ ”رابی کیا ہم باہر کہیں مل سکتے ہیں۔ نہ فیکٹری میں زیادہ بات ہو سکتی اور نہ اسٹاپ پر، تمہارے ساتھ بیٹھ کر میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

وہ کانپ کر بولی۔ ”یہ بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ یہ میری اور میرے گھر کی عزت کا معاملہ ہے۔ کسی نے کہیں دیکھ لیا تو سب ختم ہو جائے گا۔“ میں ہنسی لگا ہوں سے دیکھ کر بولا۔ ”یہ بہت ضروری ہے کہ ہم باہر ملیں۔ ہم ملنے میں احتیاط کریں گے تاکہ کسی کو

معلوم ہی نہ ہو۔ چند ہفتوں میں تمہاری جاب ختم ہو جائے گی پھر کب اور کہاں تم سے بات کر سکوں گا؟ پلیز میری بات مان جاؤ۔“

وہ ٹھکست خوردہ لہجے میں بولی۔ ”مجھ پر رحم کرو، اتنا بوجھ مت ڈالو کہ مر ہی جاؤں۔“

”کیا میرے پیار پر بھروسہ نہیں ہے؟“ میں نے اس کے سیاہ گھنے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ”میرا امتحان مت لو۔ مجھے گھر پر جھوٹ بولنا پڑے گا۔“ مجھے پھر افسردہ کھڑے دیکھ کر بولی۔ ”ٹھیک ہے سوچ کر بتاؤں گی۔“

آگے ویک اینڈ تھا، دو دن اسے بغیر دیکھے کا ٹٹا ایک عذاب تھا۔ اس کی یادوں کی محفل سجائے میں کمرے میں بند بڑا رہا۔ میرا چین وہ چھین کر لے گئی تھی۔ کسی چیز میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ میرے درد کا علاج یہ نہ تھا کہ اس کو دیکھوں۔ اسے دیکھ لیتا تو درد اور بڑھ جاتا تھا۔ یہ کیفیت مجھ پر پہلی بار آئی تھی۔ سرشاری بھی اور اداسی دونوں ایک ساتھ۔

گیٹ پر نیل ہوئی تو باہر آ کر دیکھا تو شاہد کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ہنس کر کہنے لگا۔ ”یہ کیا جیو کی جیسی حالت بنا رکھی ہے۔ اس ایک لڑکی کی خاطر اپنا کیا حشر کیا ہوا ہے۔“ ”یار اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ ہر وقت اسی کا خیال پاس رہتا ہے۔ اپنے پر قابو بھی نہیں رہا۔“ میں نے بے بسی سے کہا۔

”شہزادے، لگتا ہے ڈراما کر رہا ہے۔ نہیں کر رہا تو کسی ڈاکٹر سے دماغی معائنہ کروا۔“ پھر شاہد اپنی ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”لگتا ہے افسانے اور ناویلیں بہت پڑھی ہیں، کسی لڑکی سے اچانک محبت ایک وقتی ابال ہوتا ہے۔ جب ایسا کوئی ابال سراٹھائے تو عقل کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ اپنے دماغ اور زبان، دونوں کا عقل مندی سے استعمال کرنا چاہیے اور تم اپنے اس معاملے کو سر پر نہ چڑھاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ واپسی مشکل ہو جائے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ تم کس واپسی کی بات کر رہے ہو، کیا سمجھتے ہو کہ میں کوئی فلرٹ کر رہا ہوں؟“

وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ہاں تم فلرٹ کر رہے ہو۔“

”میں اس سے بے پناہ پیار کرتا ہوں۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

جاپانی اپنے پالتو جانوروں سے بہت محبت کرتے ہیں اور ان کی موت کے بعد انہیں شاہانہ انداز میں دفنایا جاتا ہے، جس پر لاکھوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق ایک کلو گرام وزنی جانور کی تمام رسومات پر پاکستانی 86 ہزار روپے لاگت آتی ہے۔ ”کوکولون“ نامی کمپنی اس کام میں ماہر ہے اور وہ ایک بڑے جانور یعنی کئی کلو وزنی کتے کی آخری رسومات پر ایک لاکھ روپے سے زائد رقم وصول کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی اپنے پالتو جانور کی تدفین کے ساتھ پھولوں والی قبر یا پھر پیانو اور وائلن پر افسردہ جن بجانا چاہتا ہے تو اس کے لیے اضافی پچیس تا تیس ہزار روپے ادا کرنا ہوں گے۔

☆☆☆

پاکستان اور چین کی باہمی محبت کا ایک ثبوت چین نے اپنے شہر سنگھائی میں پاکستان کا شاہی قلعہ بنا کر دے ڈالا ہے، جی ہاں لاہور کا تاریخی شاہی قلعہ اب اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ سنگھائی میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

برطانیہ کا 87 سالہ شہری رون گولڈ اسپنک عجیب و غریب بیماری کا شکار ہیں، ان کے دماغ میں مسلسل اپنے ملک کا قومی ترانہ بجا رہتا ہے۔ طب کی زبان میں اس کیفیت کو میوزیکل ایئر سنڈروم ایم ای کہا جاتا ہے۔ بہرے یا کم سننے والے افراد اس کے زیادہ شکار ہوتے ہیں۔

مرسلہ: منشی محمد عزیز مئے۔ لڈن

قہقہہ لگا کر بولا۔ ”تم ایک چھوٹے شہر میں ایک سادہ زندگی گزار کر آئے ہو۔ تمہیں کیا معلوم کہ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ یہ محبت وغیرہ سب دماغی فتور ہیں۔ محبت کر دو مگر چٹ نہ جاؤ اور نہ اسے اپنے ساتھ چمٹنے دو۔ شہزادے یہ سب ناٹم پاس ہے۔ آج میری باتوں کو نہیں سمجھتے تو کل ضرور سمجھ جاؤ گے۔“

میں نے بے زاری سے کہا۔ ”شاہد تم نے مایوس کیا، سوچا تھا کہ تم سے اس کی باتیں کروں گا، میرا غم کم ہوگا مگر تم تو میری روح پر زخم لگانے آئے ہو۔“ ”چلو تم سے ایک شرط لگاتا ہوں۔ اس سے بات

کرو۔ وہ بات بھی شادی سے شروع کرے گی اور ختم بھی اسی پر ہوگی۔ یہاں گھروں میں لڑکیاں شادی کے لیے تیار بیٹھی ہوتی ہیں۔ تمہارے جیسا کوئی بدھول گیا تو ان کی قسمت جاگ اٹھتی ہے۔ یہ نہیں کہ وہ اچھی نہیں ہوتیں۔ اچھی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ رشتوں کی ضرورت مند بھی ہوتی ہیں۔“ شاید نے کہا۔

میں نے شاید کو نہیں بتایا تھا کہ میری اس سے بات ہو چکی ہے۔ حیرت تھی کہ ہم میں ایسی ہی بات ہوئی تھی مگر میں مطمئن تھا کہ رابی نے جو بات کی تھی اس کا مطلب شاید کی باتوں سے بالکل مختلف تھا۔

مجھے خاموشی یاد آ کر اس نے پوچھا۔ ”تم آخر چاہتے کیا ہو۔ صرف محبت محبت گھیلو گے یا شادی بھی کرو گے؟“

”مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوگا مگر ایک بار وہ بن ٹھن کر میرے اس کمرے میں ضرور آئے گی۔ مجھے میری ماں کی قسم ہے جو اسے اس کمرے میں نہ لایا۔“ میں نے ایک عزم سے کہا تو شاید کھڑا ہو گیا، بولا: ”چل باہر چلتے ہیں فلم دیکھتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں اور باہر کی تازہ ہوا شاید تمہاری کھوپڑی کے لیے سودمند ہوگی۔“

میں نے جذبات میں آ کر ایک بڑی قسم کھالی تھی۔ اپنی اس ماں کی قسم جس کا میں ورد کرتا تھا۔ ایسے وعدے تو میں رابی سے بھی بہت کر چکا تھا۔ وعدے تو سب یاد تھے اور یاد رکھنا کون سی بڑی بات تھی۔ اصل بات تو وعدے ایفا کرنا ہے۔

ویک اینڈ ختم ہوا تو میرا طویل انتظار بھی ختم ہوا۔ خوب تیار ہو کر اس کی چاہت میں لپٹا باہر آیا تو وہ بیچ پر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ازلی اداسی اور خاموشی کے ساتھ بے پناہ افسانہ بھی تھی۔

میں نے سلام کر کے پوچھا۔ ”رابی تم کب آتی ہو۔ ہر بار پہلے سے موجود ہوتی ہو؟“

آہستگی سے رک رک کر بولی۔ ”میں تو رہتی ہی یہیں ہوں، آتی تو جب اگر یہاں سے جاتی۔ اپنا جسم گھر لے جاتی ہوں مگر یقین کر دو روح ادھر ہی تمہارے پاس ہوتی ہے۔“ ذرا دیر خاموش ہو کر بے خودی میں پھر بولی۔ ”بچھلے دو دن میں نے کس طرح سے تڑپ تڑپ کر تمہارے بغیر گزارے، یہ میں ہی جانتی ہوں۔ ایک پل بھی تم کو اپنے سے الگ نہیں ہونے دیا۔ مجھے کیا سے کیا بنا دیا ہے، سرکار۔“ وہ پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ”پھر کیا سوچا رابی، ہم کہیں باہر مل رہے ہیں؟“

”ہاں اب کہیں بھی لے چلو۔ اگلے ہفتے جاب بھی ختم ہو رہی ہے تو پھر کس طرح آپ کو دیکھ پاؤں گی۔ نہیں دیکھوں گی تو مرنے جاؤں گی۔ چار ماہ میں ہی میری دنیا۔۔۔ بدل گئی ہے۔ اچھا لگتا ہے یہ سب، بہت اچھا۔“ وہ ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ سجائے بولی۔

میں نے سرشاری سے کہا۔ ”تمہارے ساتھ بیٹھنا، تمہیں سننا، تمہاری آنکھوں میں دیکھ کر کھوجانا، تمہارے ہاتھ پکڑ کر تمہیں تکتا۔ یہی میرے خواب ہیں اور یہی آسان تعبیریں ہیں۔“

شاید زندگی میں لڑکیاں یہی سب سننا چاہتی ہیں جو میں اس دن رابی سے کہہ رہا تھا۔ میں جو بھی اسے کہتا اسے پلکوں سے چن لیتی۔ گو وہ سب میں اسے سچائی سے کہہ رہا تھا مگر اگر کوئی اچھا اداکار ہو تو اس سے زیادہ پرتاثر باتیں کر سکتا ہے جو لڑکی کے وجود کو جکڑ لیں۔

میری ایسی باتیں سن کر اس کے چہرے پر خوشیوں کے چراغ جل اٹھے۔ اسی کیفیت میں وہ بولی۔ ”تمہارا کہا ایک ایک لفظ سحر میں ڈوبا ہوتا ہے۔ میں انہیں یاد نہیں حفظ کر لیتی ہوں۔ تمہارے وعدوں پر اعتبار کر لیا ہے۔ تمہاری قسموں پر ایمان لے آئی ہوں۔ سجدے انسان کو جائز نہیں ورنہ میرے سجدے تمہارے قدموں میں ہوتے، تمہارے نام کی تسبیح کرتی ہوں۔ تمہیں پڑھتی ہوں، تمہیں کیا پتا تمہیں ہی پوجتی ہوں۔“

میں اپنے لیے اتنے بڑے بڑے الفاظ سن کر خود کو دیوتا سمجھ رہا تھا۔ فرط مسرت سے میرا دواں دواں بھل اٹھا تھا مسکرا کر اس سے پوچھا۔ ”یہ اتنے مشکل الفاظ کہاں سے سیکھے؟“

ہنس کے اپنے چہرے سے سیاہ بالوں کی لٹ ہٹا کر بولی۔ ”خود ہی سکھائیں اور اب کہتے ہیں کہاں سے سیکھے؟ تم نے تو مجھے راستہ دکھایا۔ میں تو چل پڑی اس راستے پر۔ اگر تم نہ بھی آئے تو میں رکنے والی نہیں۔ چلتی رہوں گی بھلے اکیلی ہی ہو جاؤں۔ اب آپ کی ہو گئی یہ رابی۔ آپ چلے گئے تو کسی اور کی بھی نہ بن سکوں گی۔ تمہاری طرح بہت سے وعدے تو نہیں کرتی مگر میری یہ باتیں اٹل ہیں یاد رکھنا سرکار۔“

اس دن اس کے اس لہجے اور روپ سے میں خود میں

گیا تھا۔ وہ ایک عزم سے بول رہی تھی۔ وہ اس راستے پر مجھ سے کہیں آگے بڑھ چکی تھی۔ میری محبت بھری باتوں نے اس کے دل و دماغ کو سخر کر لیا تھا۔ وہ جیسے کسی نشے میں یہ سب بیکر کہہ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک، انداز گفتگو، اعتماد اور خود پردگی کے عالم کو میں اپنی محبت کی جیت سمجھ رہا تھا۔ آج بیٹھا جب یہ سب لکھ رہا ہوں تو سوچتا ہوں کہ میں اسے جیتا نہیں بلکہ بہکانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

میں اسے کچھ کہنے والا تھا کہ اس نے اشارے سے مجھے چپ کر دیا، بولی۔ ”دین آنے سے پہلے یہ بھی سنتے جاؤ۔ میں بھی ایسی نہ تھی۔ میں نے زندگی کے ہر موڑ پر خود کو چٹان بنائے رکھا۔ بہت سے لوگوں نے مجھے متاثر کرنے کی کوشش کی مگر میں نے سب کو ایک طرح سے دھتکار دیا۔ ابتداء میں آپ کو بھی میں نے ٹھوکر ماری چاہی، کترا کر ٹکنا چاہا مگر جہاں مڑی وہیں سامنے آپ ہی کو پایا۔ آج یہ رابی آپ کے سحر میں ڈوب کر صحرائی بن بیٹھی ہے۔ جس کی اب کوئی منزل نہیں۔ اس لیے اب یہ نہیں پوچھوں گی کہاں لے چلو گے۔ صرف یہ بتا دینا کہ کب لے چلو گے۔ مجھے تو ابھی بہت کچھ کہنا ہے اور ہاں اپنے بارے میں کچھ نہ بتانا کیونکہ مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میرے لیے تو اتنا ہی بہت ہے کہ تم میرے ہو۔“

آج تو اس نے مجھے بھی چت کر دیا تھا۔ میں سنبھلا اور بولا۔ ”تمہیں بتا دوں گا۔ دن اور وقت تمہاری سہولت کے مطابق طے کریں گے۔“

پھر اس کی جاب ختم ہو گئی۔ اس سے پہلے میں نے رابی سے باہر ملنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ اس نے گھر میں یہ بہانہ کیا کہ وہ کسی دوسری فیکٹری میں جاب انٹرویو دینے جا رہی ہے۔

شاید سے موٹر بائیک لینے اس کے گھر پہنچ گیا۔ اس کو وجہ بتائی تو اس نے پوچھا۔ ”کہاں لے جاؤ گے؟“

میں اس نے شہر کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا۔ اس نے مجھے ایک پارک کا بتایا جو دریا کے کنارے تھا۔ پھر مجھے ٹیکسی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم اس لڑکی کے جھانسنے میں پھنس رہے ہو۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اس کے گھر والے بھی اس منصوبے میں ملوث ہیں۔ ان کو پڑھا لکھا اچھی شکل و صورت والا برسر روزگار داماد مل رہا ہے اور انہیں کیا چاہیے۔“ پھر سرد لہجے میں بولا۔ ”میں سمجھا تھا کہ دل لگی کر کے نکل جاؤ گے مگر تم تو اپنے آپ کو مصیبت میں

ڈال رہے ہو؟“

میں بھڑک اٹھا اور بولا۔ ”بائیک یہ رہی، میں چلتا ہوں گاڑی ریٹ کر لوں گا۔“

چابی میرے ہاتھ پر رکھتا ہوا وہ بولا۔ ”دو تین گھنٹے سے زیادہ نہیں لگانا جلد آ جانا۔“

دن کے وقت پارک خالی تھا۔ سامنے بہتے دریا کی موجوں میں پھیروں کی کشتیاں کچھ دریا کے بیچ میں اور کچھ کنارے کھڑی تھیں۔ دریا کے پار، کچے کا علاقہ نظر آرہا تھا۔ ہم تھے اور خاموشی کی سائیں سائیں تھیں۔

پارک کے ایک کونے میں کینٹین تھی۔ کینٹین بوائے کو کچھ کھانے پینے کا آرڈر دیا اور لان میں رکھی کرسیوں پر ہم بیٹھ گئے۔ وہ آرڈر لایا تو میں نے ایک بڑا نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ بقایا اپنے پاس رکھنے کا کہا تو وہ ایک دم ہمدرد بن گیا۔ ہمیں وہاں سے اٹھا کر نزدیکی درختوں کے جھنڈ تلے بٹھا دیا جہاں بیچ کے علاوہ کرسیاں میز بھی تھیں۔ وہاں سے ہم کسی کو نظر نہیں آ سکتے تھے مگر دریا اور کشتیاں ہمارے سامنے آ گئی تھیں۔

میں ذرا گھبرایا ہوا تھا مگر وہ بڑے اعتماد میں تھی۔ ہلکے رنگ کے سوٹ میں اس کی شخصیت اور زیادہ نکھر آئی تھی۔ وہ حسین تو تھی ہی مگر جب تمکنت سے سراٹھا کر چلتی تو لگتا کوئی شہزادی آرہی ہو۔

ہم بیچ پر بیٹھ گئے لیکن ایک فاصلہ اپنے درمیان رکھا۔ میں اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس کی پتلی ناک اور نازک ہونٹوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے عارض پر پھیلے گیسو اپنی انگلیوں سے ہٹانا چاہ رہا تھا۔ کچھ ہمت کر کے اس کے سفید مرمریں ہاتھوں کی نازک مخروطی انگلیوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

وہ ہنس کر بولی۔ ”کیا دیکھ جا رہے ہیں؟“

اس کے بولنے سے میرا سر ٹوٹا۔ میں نے کہا۔ ”یقین نہیں آ رہا کہ تم میرے اتنا قریب ہو۔“

پھر اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے گالوں پر رکھتے ہوئے بولا۔ ”جب یہاں تمہارے شہر آ رہا تھا تو دل بہت گرفتہ تھا۔ سوچ رہا تھا کہ جس دیس میں اپنا کوئی سے نہیں تو وہاں میری منزلیں کیوں لکھی ہیں۔ لیکن جب تم کو پہلی بار دیکھا تو وجہ سمجھ میں آ گئی کہ قدرت کیوں مجھے یہاں بھیج لائی ہے، پھر گھر ملا تو تمہاری گلی میں، اوپر والا ہمیشہ مجھ پر بہت مہربان رہا ہے مگر آج تو اس نے مجھے نواز ہی نواز دیا۔“

میری باتوں کے دوران ہی وہ بڑے قرینے سے کھسک کر قریب ہو گئی۔ میں نے جب اسے اپنی بانہوں میں لیا تو اس نے کوئی مداخلت نہ کی۔ محبت کا ایک الاؤ اس کے روئے روشن پر چمکنے لگا۔ وہ میرے اتنا قریب تھی کہ اس کے تنفس کی حد مجھے چھلانے لگی مگر مجھے یہ معلوم تھا کہ اجازتوں کی گلیاں کس موڑ سے شروع ہو کر کہاں ختم ہوتی ہیں اور ممنوع کی تختیاں کہاں لگ جاتی ہیں۔

وہ خاموش اور پرسکون تھی جیسی اسے نیند آگئی ہو۔ جیسے آنکھیں بند کیے کسی سہانے سینے میں کھوئی ہو۔ مجھ سے لپٹی اپنی گرفت مضبوط کرتی جا رہی تھی۔ پھر اچانک الگ ہو گئی جیسے کوئی سحر ٹوٹا ہو، جیسے کچھ یاد آ گیا ہو، جیسے ڈر گئی ہو۔

پھر اس نے ہمت کی اور میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر میری آنکھوں میں نجائے کیا تلاش کرنے لگی۔ میں کچھ پوچھنے لگا تو انگلی میرے ہونٹوں پر رکھ کر مجھے خاموش کر دیا جیسے کوئی بچے کو پیار سے چپ کرتا ہے۔ وہ فنا ہو جانے والی کیفیت میں تھی۔ میں حیران تھا کہ اتنا پیار اس میں کہاں سے آ گیا۔ وہ اتنی کم عمری میں میرے پیار میں جھلنے لگی ہے؟ محبت کے شروع کے پیغام اس تک پہنچانے میں، میں نے بڑی شدت دکھائی تھی تاکہ اسے اپنے پیار میں باندھ دوں جو باتیں بعد میں طے ہونی تھیں وہیں نے پہلے بولوں میں کر ڈالی تھیں۔ اسے اپنے پیار میں باندھ کر میں جیت چکا تھا۔ اس کا میڈل میرے گلے میں آچکا تھا مگر اس کی کون سی جیت ہوئی تھی؟ وہ تو اپنا دل بری طرح سے ہار بیٹھی تھی۔ اب میں خود کو اس کا مجرم تصور کر رہا تھا کہ میری وجہ سے اس نے اپنی یہ کیا حالت کر دی ہے۔ میں نے اس سے پیار تو کیا تھا مگر تڑپنے کے لیے نہیں بلکہ زندگی کو حسین بنانے کے لیے کیا تھا۔ میں تو چاہت کے معطر جھوکوں سے سیر ہونا چاہتا تھا مگر وہ تو روگی بن بیٹھی تھی۔

وہ جس طرح سے میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی مجھے لگا کہ سودائی ہو گئی ہے۔ آنکھوں سے آنسو بہتے چلے جا رہے تھے۔ وہ کپکپا رہی تھی۔ میں گھبرا گیا۔ اسے جھنجھوڑ کر پوچھا۔ ”کیا ہو رہا ہے تمہیں؟ تم ٹھیک نہیں لگ رہی؟“ وہ بہتے آنسوؤں کے بیچ بڑے عجیب انداز میں مسکرائی۔ میرے چہرے کو بے چینی سے ٹٹولنے لگی جیسے کوئی تاپینا اپنی قیمتی چیز کو ٹٹولتا ہے۔ مجھے اس کی دماغی صحت پر شک ہونے لگا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ ”مجھے پاگل سمجھ رہے ہو؟“

میں تشویش سے بولا۔ ”یہ تم کو کیا ہو رہا ہے، کپکپا کیوں رہی ہو؟“ ایک بے خودی میں وہ بولی۔ ”جس کی پوجا کی جائے اسے باندھ کر تو نہیں رکھا جاسکتا؟“

”رابی یہ تم کہنا کیا چاہتی ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا؟“ میں نے تشویش سے اسے اپنے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ جذبات سے اس کی آواز بھگ گئی تھی۔ وہ رندھے گلے سے بمشکل بولی۔ ”میری ایک بات خاموشی سے بغیر مجھے ٹوکے ایک بار سن لو۔ اپنی ساری ہمت جمع کر کے یہ بات کرنا چاہتی ہوں۔ آج نہ کر سکی تو پھر بھی نہ کر سکو گی۔“ میری گود میں سر رکھ کر کہنے لگی۔ ”میری منزل شادی نہیں۔ میں پچھلے کئی دنوں سے یہی سوچ رہی ہوں۔ تمہارا پیار ہی میرے لیے بہت کچھ ہے۔ اسی کو سنبھال لوں یہی بہت ہے۔ تم کو سنبھالنے کے لیے کوئی میری طرح کمزور نہیں بلکہ مضبوط لڑکی چاہیے وہ جو تمہارے اسٹیٹس کی ہو۔ میرا بس چلے تو اپنی سرکار کے لیے میں خود ہی کوئی ڈھونڈ لاؤں۔ ہم غریب لوگ ہیں، میرے والد ایک آڑھت میں نشی ہیں۔ ان کی آمدن سے ہمارا گھر بمشکل چلتا ہے۔ ہمارا گھر بہت چھوٹا ہے، تمہارا یہ احسان بھی بہت ہے کہ مجھ سے محبت کی ہے۔ تم سے شادی کر کے میں تمہاری زندگی خراب نہیں کرنا چاہتی۔ تم بڑے لوگ ہو اور میری سرکار کی شادی بھی بڑے گھر میں ہونی چاہیے۔ ہم غریبوں سے تمہیں کیا ملے گا سوائے میری محبت کے۔ تم شادی نہیں بھی کر لو میری محبت ویسے ہی ساتھ رہے گی۔ تمہاری رابی تمہارے قابل کہاں۔ یہ سوچو آج اس نے پہنا ہوا ہے۔ وہ بھی کل رات سہیلی سے ایک دن کے لیے لائی ہے۔“ پھر وہ سسکیاں لینے لگی۔ میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر کچھ کہنا چاہا تو لیٹے لیٹے بولی۔ ”ابھی کچھ اور کہنا ہے۔ پلیز تھوڑی دیر اور سن لو۔“

وہ بولی۔ ”تم یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے۔ میرے کہنے پر مجھے چھوڑ دیا تو سرخرو ہو جاؤ گے اور میں، میں تو تمہاری یاد سے بندھی کہیں بھی بیٹھی رہوں گی۔ تمہاری خوشی اور زندگی کی دعائیں مانگا کروں گی۔ کسی کی بھی بن کر ہمیشہ تمہاری ہی رہوں گی۔“ وہ دوبارہ سے رونے لگی۔ سسکیوں سے اس کے سر پر رکھا دوپٹا کھسک کر نیچے جا گرا۔ اس کے سیاہ گھنے بال اور

بالوں کو بل دے کر بنائی چوٹی اس کی پیٹھ پر پھکیاں دینے لگی۔ اس کا میرے لیے ایثار دیکھ کر میں خود آبدیدہ ہو گیا تھا۔

میں نے دوپٹا اٹھا کر اس کے سر پر رکھا اور اپنے ساتھ لگا لیا۔ مجھ سے ایسے لگی جیسے کسی پناہ میں آگئی ہو۔ جیسے کوئی کشتی تند و تیز طوفانوں کے گرداب سے بچ کر گھنے اور پرسکون پانیوں میں آجائے۔ طوفان سے بچ کر آنے والے جس طرح بے سدھ لیٹ کر رب کا شکر ادا کرتے ہیں ایسے ہی نڈھال رابی ستا رہی تھی۔ میں اس سے کہہ رہا تھا۔ ”یہ مت کہا کرو تم میرے قابل نہیں۔ میرا اسٹیٹس بڑا ہے۔ میں خود بڑے کنبے میں پلا بڑھا ہوں۔ والد صاحب گھر کی کفالت کرتے تھے۔ کھیتے کودتے پڑھ لکھ کر کوئی ڈگری لے لی۔ میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا کہ تم کہاں پٹی بڑھی ہو۔ تم امیر گھر میں بھی ہوتی یا کہیں بھی ہوتی میرے لیے اتنی ہی اہم ہوتی جتنی ابھی ہو۔ اپنی محبت کو دولت کے ترازو میں تولنے کا گناہ میں نہیں کر سکتا۔ اب آئندہ سے مجھے یہ مت کہنا کہ میں تمہارے قابل نہیں۔ مجھے دکھی کر دو گی۔“

وہ بولی تھی۔ ”میں صرف یہ چاہتی ہوں تم خوش رہو اور یہی میری خوشی ہے۔“ پھر میری گود میں سر دوبارہ رکھ کر بولی۔

”بتاؤ کتنا تم سے پیار کروں کہ میرے ساتھ تم خوش رہو۔ میری سب کچھ لے لو، سارے سجدے اور ساری عبادتیں لے لو۔ میری اگلی پچھلی ساری دعائیں لے لو۔ جو اب تک نہیں دیکھے وہ سارے خواب لے لو۔ جو خوشی میں نکلے تھے وہ آنسو لے لو۔ اس کے عیوض صرف اتنی اجازت دے دو کہ تمہارے دل میں کہیں بیٹھ کر تم پر دعائے حفظ و امان پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہوں۔“

اس دن میں نے اسے واپسی پر شہر میں ڈراپ کیا اور خود شاہد کو بائیک لوٹا کر تھکا ہوا کمرے میں آکر لیٹ گیا۔

اس دن کافی دیر تک سوچتا رہا کہ یہ کتابیں، افسانے کہانیاں نہ صرف اچھی سوچ دیتی ہیں بلکہ باتوں کا سلیقہ بھی سکھاتی ہیں۔ ایسی پیاری دل موہ لینے والی باتیں، خوبصورت جملے عام لڑکیاں کب کر سکتی ہیں۔ ایسی لڑکی کو کھو دینا عقلمندی نہیں تھی۔ اگلے ہی ہفتے اس کی بات ایک دوسری فیکٹری میں کرادی۔ ایک جاننے والے سے بات کر کے آفس کی جاب دلادی۔ اس کی تعلیم انٹرمیڈیٹ تھی مگر پھر بھی محنت سے کام کرتی تھی کہ مجھے کوئی شکایت نہ ملے۔ وہ ایک دو ہفتے

بعد کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے مجھ سے مل لیتی۔ ہم اکثر دریا کنارے اسی پارک میں بیٹھے رہتے۔ کبھی کوئی فلم اکٹھے دیکھ لی، کبھی کسی اچھے ریٹورنٹ میں اسے کھانا کھلانے لے جاتا۔ اسے تحفے دلانے کی کوشش کرتا مگر وہ انکار کر دیتی، اچھے کپڑے خریدنے کا کہتا تو کہتی۔ ”ابھی نہیں جب شادی ہو جائے گی تو لڑکروں گی۔“ میری اپنی جاب بھی جاری تھی اور اسے بھی وقت دیتا تھا۔

دس ماہ گزر گئے اور وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ اسی دوران شاہد اور جعفر مجھے کہتے رہے کہ اس لڑکی سے چھپا چھڑالو۔ وہ لگاتار میرے پیچھے لگے رہے تھے۔ ایک بار شاہد کی باتوں سے تنگ آکر میں نے اس سے کہا تھا۔ ”میں اس سے پیار کرتا ہوں اور وہ مجھ سے، مجھے اپنے علاوہ اس کی فکر ہے کہ اسے چھوڑ دیا تو اسے بہت دکھ ہوگا۔“

وہ ہنس کر بولا۔ ”کوئی کسی کے لیے نہیں مرتا، اگر اسے تم سے بہتر مل گیا تو تمہیں پہلی فرصت میں بھول جائے گی۔ اگر نہ ملا تو یاد کر کے تمہیں کو سے گئی۔ محبت کچھ نہیں ہوتی ہر ایک کا اپنا اپنا مطلب ہوتا ہے۔ ہر ایک کی اپنی طلب ہوتی ہے۔ تمہاری طلب ایک خوب صورت لڑکی تھی جس سے تم پیار کی باتیں کر کے رات کو رو مینٹک گانے سنا کرو۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے کوئی پینڈسم، پڑھا لکھا اور برسر روزگار جوان لڑکا مل جائے۔ جب بھی تمہیں اس سے کوئی دوسری خوب صورت لڑکی مل گئی یا اسے نصیب سے کوئی اور اچھا لڑکا مل گیا تو پھر آخری خط لکھ کر اپنی مجبور یوں کی داستانیں لکھے گی۔“

میں نے قائل ہونے سے بچنے کے لیے دوسرا نکتہ پیش کیا تھا۔ ”اس کی باتوں سے کبھی ایسا نہیں لگا کہ وہ میری جاب سے متاثر ہے۔ اس نے ہمیشہ مجھ سے، میرے پیار میں ڈوب کر باتیں کی ہیں۔ اتنا عرصہ ہو گیا، نہ اس نے کوئی تحفہ لیا اور نہ کوئی چیز، اس میں لالچ میں نے بھی نہیں دیکھا۔“

وہ بہت دیر ہستار ہا پھر بولا۔ ”آج کل کے لوگ شیخ چلی دور کے نہیں کہ سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو ذبح کر ڈالیں۔“ پھر آنکھ مارتے ہوئے بولا۔ ”میں بتاؤں میرے شہزادے اس سے کیا باتیں ہوتی ہوں گی جس سے تم بہت متاثر ہوئے ہو۔“ میں خاموش رہا تو خود بولنے لگا تھا۔ ”یہی باتیں ہوتی ہوں گی۔ تم نے مجھے بدل کر رکھ دیا ہے۔ میرے

رات دن تمہاری یاد میں گزرتے ہیں۔ تم پر دلی ہو اور چلے جاؤ گے میں آپ کے قابل نہیں۔ آپ بہت اچھے ہیں اور اپنے جیسی لڑکی آپ کو مل جائے گی۔ مجھے تو آپ کی خوشی چاہیے۔“ اس کے علاوہ وہ اور بھی بہت کچھ کہتا رہا۔ میں شاہد کی باتوں پر خاموش بیٹھا رہا۔

مجھے خاموش دیکھ کر اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”پیارے کے یہ سبق محبت کی ہر کتاب میں لکھے ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں کیا کیا پڑھ کر تم محبت کرنے یہاں آ گئے۔ پہلے زندگی اور محبت کی کتابیں پڑھتے، یاد کرتے اور تب گھر سے نکلتے۔ میرے پینڈو شہزادے۔“ پھر سنجیدگی سے بولا۔ ”کبھی بھی وہ تمہیں اپنے گھر بلوا سکتی ہے کہ امی جان کھانے کی دعوت دے رہی ہیں۔ اب تم پر دباؤ ڈالنے کا وقت قریب آ رہا ہے۔ ایک نقطہ ذہن میں بٹھا لو کہ شادی کی ہامی ان کے سامنے کبھی نہیں بھرنی۔“

ایک دن کہنے لگا۔ ”شہزادے شادی وہاں کرنا جہاں گھر والے چاہتے ہوں۔ یہ پیار وغیرہ جہاں چاہو اپنی مرضی سے کرتے رہو جوڑی جھوٹ بول کر تمہارے ساتھ باہر گھوم سکتی ہے وہ کیسے قابل اعتبار ہو سکتی ہے؟“

گھر جب آتا تو جعفر بھی اسی قسم کی باتیں کرتا۔ ہر بار یہی کہتا کہ کیوں اسے اپنے ساتھ تھکی کر رکھا ہے۔ بہت عرصہ ہو گیا اسے اپنے ساتھ رکھے ہوئے۔ اب ٹھیک دکھا کر چلا کرو۔ کبھی یہ کہتا کہ تم چھوٹے علاقوں سے آئے پڑھے لکھے لڑکے جاب ملنے ملتے ہی پہلا کام عشق میں ڈوب جانے کا کرتے ہو۔ پھر لڑکی کے گھر والے لڑکے پر اخلاقی دباؤ ڈال کر اسے بڑھاتے جاتے ہیں اور آخر ایک دن دونوں کا نکاح انجام پا جاتا ہے۔“

انہی دنوں میں خود کو بدل رہا تھا کیونکہ اس کی محبت فزوں تر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی دیوانگی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر بار ایک ہی قسم کی جذباتی باتیں سن کر میں اب اکٹا ہٹ کا شکار ہونے لگا تھا۔ اس پر سونے کا سہاگا شاہد کی نصیحتیں اور مجھ پر کم عقل ہونے کا الزام مجھے سوچنے پر مجبور کر رہا تھا کہ میں غلطی کر بیٹھا ہوں۔

اس کا چہرہ گودھی تھا، وہی اداس اور سوئی گہری آنکھیں، وہی خوب صورت ہاتھ اور وہی وارثی مگر مجھ میں وہ ہلچل پیدا نہ ہوئی جو شروع میں ہوا کرتی تھی۔ پھر میری جاب اور کیریئر کے حالات کے علاوہ کوئی اور نیا موڑ بھی میری زندگی میں آنے لگا۔

میری جاب کو ایک سال ہونے والا تھا۔ کمپنی نے مجھے اسٹنٹ منیجر کی پوسٹ پر ترقی کے علاوہ نئی گاڑی کا وعدہ کیا۔ یہ میرے لیے ایک بہت بڑا بریک تھرو تھا، اس عمر میں اور جاب کے ایک سال کے اندر اتنی بڑی آفر آج تک کسی اور کو نہ ہوئی تھی۔ اپنی پڑاؤٹ کے فارمولے میں کچھ میکینیکی تبدیلیاں کر کے میں نے کمپنی کو بڑے اور مستقل نقصان سے نجات دلا دی تھی۔ جس نے مجھے ادارے میں اہمیت کا حامل بنا دیا تھا۔

کمپنی نے مجھے شہر کے پوش علاقے میں گھر کرائے پر لینے کے لیے میرا ہاؤس رینٹ بڑھانے کی یقین دہانی بھی کرائی تھی۔ یہ سب میرے لیے ناقابل یقین تھا۔ اس علاقے میں جہاں میں رہ رہا تھا وہاں گاڑی رکھنا دشوار تھا کیونکہ سب اوسط درجے کے لوگ رہتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ اب کمپنی بھی نہیں چاہتی تھی کہ میں اس علاقے میں رہوں۔ لہذا میں نے بروکر کے ذریعے اچھے گھر کی تلاش شروع کر دی تھی۔

انہی دنوں یونیورسٹی کے طالب علم اپرٹس شپ کے لیے ہماری فیکلٹی میں آئے۔ ان میں لڑکیاں بھی تھیں۔ اسی میں فوزیہ بھی تھی۔ خوش شکل، پڑھے لکھے اور امیر گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ لباس ہر روز نیا ہوتا اور اس کو فیشن کے نئے تقاضے نبھانے کے فن بھی خوب آتے تھے۔ سادہ لباس والی راہی مجھے جدید لباس میں ملبوس فوزیہ کے مقابلے میں بھیجی جھکی لگنے لگی۔ وہ اداس اور سوئی سوئی آنکھیں جو کبھی جان نکال دیا کرتی تھیں ان سے جان چھڑانے کے جواز خود سے پیدا کرنے لگا۔ میرا کام شاہد اور جعفر نے پہلے ہی سے آسان کر رکھا تھا اور اب فوزیہ نے آکر لکیر کھینچ ڈالی۔

فوزیہ میرے ڈپارٹمنٹ میں اپرٹس کے لیے آئی تھی۔ اس نے اچانک اس طرح مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیا جیسے راہی نے کیا تھا۔ میں نے اپنے دل سے راہی کو مکمل نہ نکالا تھا بلکہ کچھ گنجائش پیدا کر کے فوزیہ کو بھی وہیں بٹھا دیا۔ میرے اسٹنٹس نے جب لگانے سے پہلے فوزیہ کو اپنی جانب راغب کر لیا تھا۔ ایک دو بار ان کے گھر کھانے پر اس کے والدین نے مدعو کیا تو مجھے ان کا ڈرائیور لینے آیا تھا۔ ان کا گھراٹا بڑا اور شاندار تھا کہ میں بہت زیادہ مرعوب ہو گیا۔ گھر میں کئی کمرے چمکتے فرش، قیمتی قالین، بڑا ڈرائنگ روم، بارہ بندوں کی قیمتی ڈائنگ ٹیبل کے علاوہ ضرورت کا ہر سامان موجود تھا۔ گھر میں تین تو صرف گاڑیاں تھیں۔

غرض یہ سب ہونے کے بعد میں اپنی حیثیت بھول کر اور راہی کی محبت یاد کر کے فوزیہ کے عشق میں بری طرح سے گرفتار ہو گیا۔ ایک ایسے دوراں پر کھڑا ہو گیا کہ خود مجھے بھی معلوم نہ تھا کہ کس طرف جانا ہے۔

اس دوران میں نے راہی کو کوئی ایسا تاثر نہیں دیا تھا کہ اس سے دور ہو گیا ہوں کیونکہ مجھے ایسا تاثر دیتے ہوئے بہت زیادہ ہمت کی ضرورت تھی جو مجھ میں نہ تھی۔ میری ممکنہ ترقی پر وہ بہت خوش تھی کیونکہ وہ کبھی کہ دن رات میرے لیے دعائیں کرتی ہے۔

ایک بار اس نے بہت ضد کی تو میں اسے دریا کنارے میں اسی پارک میں لے آیا جہاں اسے پہلی بار لے گیا تھا۔ سامنے دریا کی لہریں سرشاری سے نہیں بلکہ خاموشی سے ایسے بہہ رہی تھیں جیسے کوئی تھکا مسافر جاتا ہے۔ کشتیاں وہی تھیں مگر اب دریا کنارے اداس کھڑی تھیں۔ نہ سورج میں کوئی رنگ تھے نہ زندگی میں کوئی خوشبو۔ راہی نے وہی کپڑے پہنے تھے جو وہ اکثر پہن کر آیا کرتی تھی۔ وہی آسمان جو پہلے راہی کو دیکھ کر مسکراتا تھا۔ اب گھر در نظر آتا تھا۔ فضا بوجھل تھی، سانس لینا بوجھل تھا کیونکہ اس کا قرب میرے لیے بوجھل تھا۔ میری جانب دیکھتی تو زبردستی مسکراتا پڑتا۔ گویا سب موسم دل کے اندر ہوتے ہیں۔

وہ میرے سینے سے پیٹھ لٹائے اپنی ٹانگیں لمبی کیے بیچ پر بیٹھی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”سرکار خاموش کیوں ہیں؟“ میں نے بات بنائی۔ ”یہ گھر والے بہت یاد آ رہے ہیں سوچتا ہوں ان سے جا کر مل آؤں۔“

مڑ کر میری گالوں کی چٹکی لیتے ہوئے وہ بولی۔ ”اچھا ہے ناں جا کر مل بھی آئیں اور شادی کی بات بھی کر لیں۔“ شادی کے بار بار ذکر پر اب میں زچ ہو جاتا تھا مگر لہجہ کو نرم رکھتے ہوئے بولا۔ ”ہاں بات تو کرنی ہے بس موقع ہی دیکھ رہا ہوں۔“ پھر دل پر جبر کر کے اس کا دل رکھنے کے لیے اس کے کان میں کہا۔ ”تمہیں جلدی ہے کیا؟“

وہ ہنس پڑی۔ پھر بولی۔ ”کہا تھا ناں آپ نے کہ گھر والے قبول کر لیں گے مجھے ویسے اگر نہ بھی کیا تو کوئی بات نہیں۔ ان کی اتنی خدمت کروں گی کہ وہ مان جائیں گے اور خود آپ سے میری تعریفیں کیا کریں گے۔“

میں خاموش رہا۔ اسے کیسے بتانا کہ اب مجھے کوئی اور اچھی لگنے لگی ہے۔

ہم وہاں سے اٹھنے لگے تو وہ بولی۔ ”امی ملنا چاہتی

ہیں آپ سے۔ میرے لیے ایک رشتہ آیا ہے۔ لڑکے کے گھر والے آئے تھے۔ کہتے تھے کہ ہمیں چاند سی بہو چاہیے۔ منخوسوں نے مجھے پسند کر لیا۔ اسی وجہ سے امی کو آپ کا بتانا پڑا۔“ اس نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں آؤں گا یا نہیں، بس بڑے اعتماد سے بولی۔ ”جب آنا تو ذرا بن ٹھن کر آنا۔“ آخر راہی نے بھی دنیا کو منہ دکھانا ہے۔“ میں اسے اعتماد کی اس بلندی تک لا چکا تھا کہ اسے یقین تھا کہ مجھ سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔

ایک دن میں اور جعفر گھر پر بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے کہ گیٹ پر تیل ہوئی۔ جعفر گیٹ پر گیا اور جب لوٹا تو راہی کا بھائی ہمراہ تھا۔ اس کا بھائی کہہ رہا تھا۔ ”نوید بھائی! امی کل رات آپ کو گھر کھانے پر بلا رہی ہیں۔“ یہ کہہ کر مجھے جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔

جعفر نے سنا تو چپک کر بولا۔ ”کیوں نہیں نوید صاحب بھی آئیں گے اور میں بھی۔“ پھر اس کے بھائی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تاکید کرتے ہوئے بولا۔ ”نوید صاحب بڑے افسر ہیں۔ دعوت ان کی شان کے مطابق ہونی چاہیے۔“

مجھے جعفر کی زبان درازی اور چرب زبانی سے پہلے ہی چڑھتی تھی۔ وہ جب بولنے پر آتا تو بولتا ہی چلا جاتا تھا۔ اس کی یہ بات مجھے سخت ناپسند تھی اسی وجہ سے مجھے غصہ آ گیا۔ ”اپنی زبان کو قابو میں رکھا کرو۔ پہلے دیکھ لیا کرو کس وقت کون سی بات کرنی ہے۔“

جیسے ہی وہ باہر نکلا جعفر ڈھیٹ پنے سے بولا۔ ”مفت کا مال ہے تو ہم عیاشی کیوں نہ کریں؟“

”اپنی منطق اپنے ہی پاس رکھو، میں نے سوچ لیا ہے کہ راہی سے شادی نہیں کروں گا۔ اسی وجہ سے مجھے اس کے گھر جانا اس کی دعوت قبول کرنے میں ہچکچاہٹ ہو رہی ہے۔“

میری اس بات پر جعفر ایسے خوش ہوا تھا جیسے اس کی دلی مراد برآئی ہو، وہ خوشی سے شاد لہجے میں بولا۔ ”ایسی کلی محلے میں پھرتی لڑکیوں سے تمہاری جوڑی بنتی بھی نہیں، تم نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے۔ اب آگے میں خود سنبھال لوں گا۔“ پھر مجھے آنکھ مارتے ہوئے بولا۔ ”اسے گھر لانے کی تمہاری قسم بھی پوری کروں گا۔ بس دیکھتے جاؤ۔“

اگلی شام نہ چاہتے ہوئے بھی میں جعفر کے ہمراہ ان کے گھر پہنچ گیا۔ ڈیوڑھی میں اس کے بھائی نے ہمیں خوش

آمدید کہا۔ صحن سے گزار کر اندر برآمدے میں لے گیا۔
چھوٹا سا گھر تھا۔ صحن کے ایک کونے میں پانی کا ڈرم
رکھا تھا۔ ساتھ چوکی اور صابن پڑا تھا۔ تار پر وہیں نیا تولیا
لٹکا تھا۔ صحن کو خوب رگڑ کر دھویا گیا تھا۔ پاس ایک چھوٹا سا
پکچن تھا جس میں خوب گہما گہما تھی، کئی دیکھے چولہے پر
چڑھے تھے جن میں شاید صبح ہی سے کھانے تیار کیے جا رہے
تھے۔ پکچن میں کاؤنٹر پر نئی پٹیلیں اور پیچھے رکھی تھیں۔

وہ دو کمروں کا گھر تھا۔ کمروں کے آگے برآمدہ تھا
جس میں بچے صوفوں پر ہمیں بڑی عزت و توقیر سے بٹھایا
گیا۔ صوفوں پر نئی چادریں بچھی تھیں کہ ان کی بوسیدگی چھپ
جائے۔ برآمدے میں دیوار کے ساتھ میز پر اوپر نیچے غلاف
چڑھے لوہے کے ٹرک رکھے تھے۔ غرض انہوں نے گھر کو
اپنے طور پر خوب بدلاتھا۔

میں صوفے پر بیٹھا دل میں شرمندہ ہو رہا تھا کہ ان
غریب لوگوں نے میرے لیے کتنا اہتمام کر رکھا ہے۔ گھر
والے سب میرے آگے پیچھے بچھے جا رہے تھے۔ رابی کی امی
مجھے شفقت بھری نظروں سے دیکھتی تھیں۔ اس کے بہن
بھائی بے تکرور بنے گھوم رہے تھے۔ بہنیں رابی کو کہنیاں مار کر
چھیڑتی تھیں۔ وہ بہن بھائیوں کو اشاروں کنایوں سے
احکامات دیتی تھیں۔ پھر کن انکھیوں سے میری جانب دیکھ کر
مسکرا دیتی۔

وہ اس رات بہت حسین لگ رہی تھی۔ وہ بہت خوش
تھی۔ اس نے کڑھائی والا نیلے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا جو
اس پر خوب بیچ رہا تھا۔ میں جان بوجھ کر اسے نہیں دیکھتا تھا۔
مجھے معلوم تھا کہ اسے نظر بھر کر ایک بار دیکھا تو نظریں نہ ہٹا
پاؤں گا۔ اس کی خوب صورتی میں اس شب سب سے دلکش
چیز اس کی آنکھوں تھیں جن میں میرے لیے پیار تھا۔

وہ آخری شب تھی جب اسے میں نے خوش دیکھا
تھا۔ پھر اس شب کی تاریکی نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔
اس کی ماں نے مجھ سے پوچھا۔ ”ماشاء اللہ ترقی
ہونے والی ہے۔ گاڑی بھی مل جائے گی۔ تنخواہ بھی اچھی ہو
جائے گی۔“

میں نے دل میں سوچا کہ ان کی نظر میری گاڑی اور
تنخواہ پر ہے۔ مجھے برا محسوس ہوا۔

رابی ماں کی یہ بات سن کر تڑپ اٹھی ماں سے بولی۔
”اماں جی بس کریں۔ یہ کیا پوچھ رہی ہیں۔ یہ کیا سوچیں
گے۔“

ماں جی پرانے وقت کی تھیں۔ سادگی سے بولیں۔
”رابی! میں نے کون سا غلط پوچھ لیا ہے۔ دعائیں ہی تو
دے رہی ہوں۔“

جعفر بول پڑا۔ ”اللہ کے کرم سے بڑے افسر ہیں۔
ایک سال میں اتنی ترقی ہو گئی۔ اب یہ محلہ ان کے رہنے کے
قابل نہیں ہے۔ جلد یہاں سے کسی امیر علاقے میں چلے
جائیں گے۔“

رابی یہ سن کر ایک دم سکتے میں آ گئی۔ اسے میں نے اپنا
یہاں سے شفٹ ہونے کا نہیں بتایا تھا۔ اس نے میری
جانب دیکھا تو میں نے سر جھکا لیا۔

ماں جی بہت کچھ پوچھتی رہیں اور میں گول مول
جواب دیتا رہا۔ میرا لہجہ اکھڑا کھڑا تھا۔ ہر سوال کا دو لفظوں
میں جواب دے کر خاموش ہو جاتا۔ میرے ماتھے کی شکنوں
سے رابی کو صاف محسوس ہو گیا تھا کہ اس کی ماں کے پوچھے
گئے سوالوں کا میں جواب نہیں دیتا چاہتا۔ اس نے شاید
بھانپ لیا تھا کہ میں فرار کی راہیں ڈھونڈ رہا ہوں جیسی تو اس
کے چہرے پر جلتے قمقمے بچھ گئے تھے۔ کوئی سانولا بادل اس
کے چہرے پر لہرا نہ لگا۔

کھانوں کی اتنی اقسام تھیں کہ جعفر ٹوٹ پڑا۔ میں
نے اپنے لیے بہت کم لیا۔ ماں جی کے اصرار پر بھی نہ لیا۔ وہ
کہتی رہیں کہ یہ رابی نے بنایا ہے۔ وہ رابی نے بنایا ہے مگر
میں نے کسی چیز کو چھوا بھی نہیں۔ رابی جیسے ساکت ہو گئی تھی۔
میرا سر دروہ اس کے لیے اندوہناک تھا۔ وہ شکستہ ہوئی اور
جیسے ٹوٹ کر کرسی پر جا بیٹھی۔ لڑکی تھی تو نازک بھی تھی۔
نازک تھی جیسی حساس تھی اور اس لیے میرے اندر کی تبدیلی کو
بھانپ گئی تھی۔ میرا بدلہ روہ اسے وقتی نہیں بلکہ دائمی لگا۔

کھانے کے بعد جعفر نے صوفے پر بڑی اجلی سفید
چادر سے اپنے ہاتھ صاف کیے تو میں نے دیکھا کہ چادر کے
نشانات رابی کے چہرے پر پڑے ہیں ایسی کلمایا، مرجھایا اور
بکھرا چہرہ جو رابی کا بھی نہ ہوتا تھا مگر آج وہ رابی کا تھا۔

جعفر ماں جی سے کہہ رہا تھا کہ اس کی بیوی اگلے
دیک اینڈ پر یہاں آرہی ہے۔ آپ لوگوں کی دعوت کرنا
چاہتی ہے۔ آپ لوگوں نے ضرور آنا ہے تو ماں جی نے کہا۔
”بیٹا میرے تو جوڑوں میں درد رہتا ہے۔ میری بیٹیاں
آجائیں گی۔“

”رابی ماں کو اشارے کر کے انکار کرنے کا کہتی رہی مگر
ماں جی نے اس کے اشاروں کو نہیں دیکھا۔ جعفر نے ماں جی

کی بات سن کر دعوت پکی کر دی۔
اس شب واپسی کے لیے میں اٹھا تو ایک نظر رابی کو
دیکھا۔ اس کا چہرہ کلمایا تھا جیسے یقین ٹوٹا ہو اور کرجیاں اس
کی آنکھوں میں چھگ گئی ہوں۔ وہ گھائل نظر آرہی تھی جیسے
اس کے اندر کچھ ٹوٹا ہے اس کا دل ٹوٹا تھا کہ اس میں رکھا میرا
وعدہ؟“

میں خود بوجھل دل لیے واپس آیا تھا اتنا نہیں جتنا ہونا
چاہیے تھا کیونکہ رابی پر فوزیہ کا سحر غالب آ رہا تھا۔

پورا ہفتہ میں نے نہ رابی سے رابطہ کیا اور نہ اس نے
مجھ سے۔ اگر وہ میرے اسٹیشن کی بھوک ہوئی تو مجھ سے محبت
کی بھیک مانگتی۔ اسے یہ ادراک تھا کہ محبت جیت کی طرح
گلے میں ڈالی جاتی ہے۔ بھیک کی طرح یہ جھولی میں نہیں
پڑتی۔

میں ایک پوش علاقے میں کرائے کا گھر پسند کر کے
آ رہا تھا کہ وہ مجھے اسٹاپ پر کھڑی ملی۔ اسے اپنے آس پاس
کا ہوش بھی نہ تھا۔ وہ اپنے دکھ اپنے دامن میں بھرے بوجھل
بوجھل کھڑی تھی۔ وہ چند دنوں میں بہت بدل گئی تھی۔ جیسے
کچے رنگ کی میٹھی کو دھونے سے وہ بدرنگ ہو جائے۔ ہونٹ
سیاہ اور رخسار زرد تھے۔ دل پر زخم کھا کے وہ کتنی دور نظر آنے
لگی تھی۔ کتنی اجنبی نظر آرہی تھی۔ وہ مجھے ایسی نظروں سے
دیکھ رہی تھی جیسے کبھی میں اس کا کچھ تھا بھی نہیں۔ اس نے
اپنے گھر دعوت پر مجھے عزت سے بلایا تھا مگر میں اس کا دل
روند کر چلا آیا تھا۔

آج پچیس سال بعد میں یہ سوچتا ہوں کہ میں بھی کتنا
خود غرض اور بے پرواہ تھا۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ بھول جاتا ہوں۔
پہلی بار اسے دیکھا تو اپنا دل بھول آیا۔ آخری بار اسے دیکھنے
گیا تو اسے بھول آیا۔ میری کم عمری، میری بے وفائی، میری
سنگ دلی اسے لے ڈوئیں۔ اس کے ساتھ جو برتاؤ میں نے
کیا وہ میری اذیت کا سبب بن گیا۔ وہ ایسی فطرت کی
لڑکیوں میں تھی جو جب بھی کسی کی ہوتیں تو سدا اسی کی
رہیں۔ میں اس سے نظریں کترا کر نگل گیا تھا۔ یہ بھی مڑ کر نہ
دیکھا کہ کیا کیا کیفیتیں اس کے چہرے پر اتر رہی ہیں۔ میں
نے دل میں یہ سوچا تھا کہ بیس پچیس دن بعد یہ محلہ چھوڑ
جاؤں گا اور پھر ہم ایک دوسرے کو بھول جائیں گے۔

کچھ دن بعد جعفر کی بیوی آئی تو ساتھ چھوٹی بہن کو بھی
لائی۔ جعفر اپنی سالی کی تعریف میں رطب اللسان کہ وہ بہت
سکھڑ ہے۔ بہت اچھے مزاج کی ہے۔

دعوت کے روز شام کو جعفر انہیں لینے خود گیا۔ رابی کو
دیکھا تو میرے دل پر گھونسا پڑا۔ اس لڑکی نے اپنی کیا حالت
بنائی تھی۔ وہ مجھ جیسی تھی۔ رنگ زرد سے نیلا پڑ چکا تھا جیسے کسی
زہریلی چیز نے کاٹا ہو۔ ہونٹ سیاہ اور سر کے چمک دار بال
ایسے کہ رنگ کاٹ سے دھو کر آئی ہو۔

وہ میرے کمرے میں جعفر کی بیوی کے ہمراہ درہی پر
بہن کے ساتھ بیٹھی تھی۔ میں نے سلام کیا تو اس نے نیلی
پلیٹیں اٹھا کر جواب دیا۔ یوں لگا کہ آنسوؤں کی ندیاں
چھپائے بیٹھی ہو۔ وہ ایسے بیٹھی تھی جیسے کوئی سادھو دھونی
رہائے بیٹھا ہو۔ اس کی آنکھوں میں یہ پیغام تھا کہ اذیت
دینا تو تمہاری فطرت نہ تھی پر نہ جانے یہ ادا کہاں سے سکھی۔
وہ ہاتھ میں ہاتھ لیے بیٹھی تھی۔ میں تو وہ ہاتھ چھوڑ گیا تھا مگر وہ
میری گرفت لیے بیٹھی تھی۔

مجھے معلوم نہ تھا کہ جعفر نے راستے میں اسے میرے
بارے میں کیا کیا بتایا ہے۔

میں پچھتا رہا تھا کہ اسے گھر پر کیوں بلایا۔ اس لیے کہ
اس کے سلگے کا تماشا دیکھ سکوں۔ اس دن اسے شکستہ کرنے کا
مجھے بہت قلق ہوا۔ ایک چھری سیدھی سینے میں اتر گئی۔

وہ دعوت کھانے تو نہ آئی تھی بلکہ مجھے یہ بتانے آئی تھی
کہ محبت کے کیا قرینے ہوتے ہیں۔ پیار کے کیا سلیقے ہوتے
ہیں۔

اس نے دعوت میں کچھ نہ کھایا۔ میں نے اس کے گھر
کچھ نہ کچھ تو کھایا تھا مگر اس نے صرف دو گھونٹ پانی کے
پیسے۔ وہ مجھے جتلا رہی تھی کہ رابی غریب ہے مگر خود داری اور
عزت میں تم سے کہیں بڑھ کر ہے۔

جعفر اپنی بیوی اور سالی کے ہمراہ اس کی بہن کو اپنا
پورشن دکھلانے لے گیا۔ وہ اور میں اب کمرے میں اکیلے
تھے۔ اس کی نظروں میں میرے لیے اب بھی پیار تھا۔

مجھ سے اس کا یہ اجڑا اجڑا روپ دیکھا نہ گیا۔ اس
کے ٹوٹے بکھرنے کا عکس چہرے پر صاف نظر آ رہا تھا۔ شاید
اسی لیے فوزیہ کا عکس دب گیا۔

میں نے اپنی بے بسی کی غلط تاویل دینا شروع
کر دیں۔ اپنے پیچھے ہٹنے کی جھوٹی وجوہات بتائیں۔ اپنی
فرضی مجبوریوں کو ان میں مگر وہ خاموش بیٹھی مجھے دیکھتی رہی۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑا تو برف کی طرح سرد تھا۔ اس نے
ہاتھ نہیں چھڑایا۔ میں نے خود چھوڑا تو ڈھلک گیا۔ میرا دل
چاہا کہ ایک بار وہ میرے کاندھے پر سر رکھ کر رو دے مگر مجھے

JASOOSI DIGEST PUBLICATIONS

Convey Your Message to
Millions of Our Readers,
World Wide
Through



63-C, PHASE II EXTN., D.H.A., MAIN KORANGI ROAD, KARACHI 75500-PAKISTAN.
PHONES : (92-21) 35802552-35804200-35895313 FAX : (92-21) 5802551
Email : jdpgroup@hotmail.com

بیٹھے تھے کہ مرکزی دروازے سے آٹھ دس لڑکیاں داخل ہوئیں۔ یہ نو جوانوں کی فطرت ہے کہ نسوانی ہنسی سن کر ادھر دیکھتے ضرور ہیں۔ نفرتی کھنٹیوں جیسی آواز کی ہنسی نے مجھے مڑ کر ادھر دیکھنے پر مجبور کر دیا کہ وہ ایک ایسا لمحہ تھا جس نے مجھے ساکت کر دیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے ان لڑکیوں میں رابی بھی تھی جو وہیں سے مڑ گئی تھی۔ شاید اس نے مجھے فوزیہ کے ساتھ بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ فوزیہ کا داہنا ہاتھ میں اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ رکھا تھا۔ یہ منظر بھی اس نے دیکھ لیا ہے۔ اسی وجہ سے وہ واپس مڑ گئی ہے مگر میں نے اس بات کو اہمیت نہیں دی اور پھر سے فوزیہ کی طرف جھک گیا۔

اگلے دن مجھے ہیڈ آفس جانا تھا وہاں سے ارجنٹ کال آئی تھی۔ صبح کی فلائٹ سے میں کراچی کے لیے چل دیا تاکہ ایک دن وہاں گزار کر واپس آسکوں۔ ٹریولنگ ایجنٹ نے واپسی کی سیٹ بھی کنفرم کرادی تھی اس لیے میں دو دن بعد اپنے گھر آ گیا۔ جیسے ہی گھر میں داخل ہوا تو دروازے کے قریب ایک لفافہ پڑا دیکھا۔ اٹھا کر نظر ڈالی تو اس پر رابی کا نام لکھا تھا۔

ڈاکیہ ڈال گیا تھا۔ دھکی دل سے وہ خط لیے کمرے میں آیا۔ اسے کھول کر پڑھنے والا ہی تھا کہ باہر بیل ہوئی۔ گیٹ کھولا تو رابی کا بھائی کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں سوچی ہوئی تھیں جیسے بہت دیر تک روتا رہا ہو۔ اس کی پریشان حالت دیکھ کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے۔ سب ٹھیک ہے ناں؟“

وحشت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”بھائی جان! رابی آپا مر گئی ہے۔“

ایک برچھی تھی جو میرے کلبجے کے پارا تر گئی۔ میرے قدم لڑکھڑائے تو گھر کے گیٹ سے جا لگا۔ میرا وجود زلزلوں کی زد میں آ گیا۔ میں ڈوبنے لگا تو اس کا چھوٹا بھائی میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔ ”بھائی جان! آپ کو کیا ہو رہا ہے؟“

میں بے یقینی سے پوچھ رہا تھا۔ ”ابھی تم کیا کہہ رہے تھے؟“

بولا۔ ”رات آپا نے ابا کی ساری گولیاں کھالی تھیں۔ امی نے صبح اٹھایا لیکن وہ نہیں اٹھی۔ وہ مر گئی تھی۔“

میں وہیں گیٹ سے فیک لگا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ ساتھ میڈیکل اسٹور تھا۔ وہاں سے کوئی میرے لیے پانی لے آیا۔ میں بلندیوں سے پاتال میں آگرا تھا۔ دماغ میں آندھیاں

محسوس ہوا کہ وہ یہ نہ کہہ دے کہ کم ظرف کے آگے رونے سے بندہ بے آبرو ہوتا ہے۔ بے وفا کے کندھے پر سر ٹکانے سے ہمیشہ کے لیے جھک جاتا ہے۔ وہ جانے تک مجھے ٹکٹلی باندھے نکلتی رہی تھی۔ آنکھوں میں وہی پیار، فنا ہونے کی آرزو، وارفتگی، دلبری اور مرثیہ جانے کی تمنا تھی۔

پھر وہ چلی گئی۔ وہ روٹھ کر چلی گئی۔ اس کے بعد دوبارہ اس کا چہرہ میں نے کبھی نہ دیکھا۔

دوسرے دن شام کو جب میں فیکٹری سے واپس آیا تو جعفر مسکرا کر بولا۔ ”میری سالی تمہیں پسند کرنے لگی ہے۔ آج تمہارا کمر اسی نے صاف کیا ہے۔ تمہاری الماری سے سب چیزیں نکال کر دوبارہ لگا میں ہیں۔ سارا وقت تمہارے کمرے میں گزارا۔“

میں طنزیہ ہنس کر بولا۔ ”میرے بھی کیا اعلیٰ نصیب ہیں۔ ایک رابی کورات واپس بھیج دیا تو دوسری تم صبح کو لے آئے۔“

وہ سر جھکائے شرمندہ کھڑا تھا۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ رابی کو کل رات لاتے وقت کیا کچھ غلط سلط میرے بارے میں بتایا ہوگا۔ جعفر کی چالاکی میں سمجھ چکا تھا۔ وہ اپنی سالی کے لیے راستہ صاف کر رہا تھا۔ میرے دل و دماغ پر تو فوزیہ چھا رہی تھی، اس حالت میں اس کی سالی کا جادو کیسے چل سکتا تھا۔ اسی لیے میں نے اسے بے دھڑک سنا دی تھی۔

رابی کا بھائی کچھ دن بعد آیا کہ باجی بلارہی ہیں۔ کہتی ہیں بہت ضروری بات کرنی ہے۔ میں نے بہانہ کر دیا کہ ان دنوں بہت مصروف ہوں گھر بھی شفٹ کرنا ہے۔ اگلے دن میں دفتر کے کام سے جانے سے پہلے ملنے ضرور آؤں گا۔

چند دن گزر گئے۔ اگلے ہفتے مجھے اپنے نئے اور خوب صورت گھر میں شفٹ ہونا تھا۔ ترقی کا لیٹر مجھے کمپنی کی جانب سے مل چکا تھا۔ نئی گاڑی بھی بک ہو چکی تھی مگر میں اداس تھا، کوئی خوشی مجھے محسوس نہ ہوتی تھی۔ لگتا تھا کہ کچھ میں نے غلط کر دیا ہے۔ کوئی مبارک باد دینے آتا تو بھاری دل سے وصول کرتا۔

رابی سے میل ملاقات بالکل موقوف ہو چکی تھی۔ اب تو اس کا نام بھی ذہن سے محو ہو رہا تھا کیونکہ میرا زیادہ وقت فوزیہ کے ساتھ گزرنے لگا تھا۔ ہر شام ہم کہیں نہ کہیں باہر ضرور ملتے تھے۔ رات کا کھانا اسٹھ کسی اچھے ریستورانٹ میں کھاتے۔ اس روز بھی ہم لاروش کے نیم تاریک ہال میں

چل رہی تھیں۔ سڑک پر چلتے رکشے، موٹر سائیکل اڑ کر میرے گرد گھومنے لگے تھے۔ میرے زمین و آسمان ٹکرائے۔ میرے ہونٹوں سے متواتر یہی الفاظ نکل رہے تھے۔ رابی تو مر گئی۔ واقعی تو مر گئی، نہیں تو نہیں مر سکتی۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ خواب ہے مگر جب اس کے بھائی کی آنکھوں میں دیکھا تو لگا نہیں یہ سچ ہے۔ وہ مر گئی ہے۔

کچھ لوگ مجھے گھر کے اندر لے گئے۔ بستر پر لٹا دیا۔ لوگ واپس چلے گئے۔ رابی کا بھائی وہیں تھا۔ اس سے پوچھا۔ ”رابی اب کہاں ہے؟“

چھوٹا بچہ تھا معصومیت سے بولا۔ ”آپا قبر میں ہے۔“ میں پتھر کی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ نہ مجھے یقین آ رہا تھا اور نہ ہی میں یہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ وہ مر گئی ہے۔ شدت غم سے اپنا منہ باز دلوں میں چھپا لیا۔ کمرے میں کسی اور کی موجودگی گراں لگ رہی تھی۔ اس کے بھائی کو گھر بھیج دیا۔

اکیلا ہوا تو گھٹ گھٹ کر رونے لگا۔ میں دوسرے عذاب میں گھر چکا تھا۔ اس کے مرنے کا دکھ اور اپنے چھتتاؤں کا بوجھ میرے دونوں دکھ ایک دوسرے سے بڑھ کر تھے۔

جعفر گھر آیا تو میں بستر پر بیٹھا آنسوؤں کی تسبیح گھماتا رہا۔ پریشان ہو کر پوچھا۔ ”نوید رو کیوں رہے ہو؟“ ”تم نے کہا تھا ناں رابی کو ٹھینکا دکھا کر چلتا کرو مگر وہ خود ہی چلی گئی۔“

جب اسے بتایا کہ رابی مر گئی تو بے اختیار اس کے منہ سے یا اللہ! یا اللہ نکلنے لگا۔ باہر میڈیکل اسٹور سے شاہد کوفون کیا اور اندر آ کر رونے بیٹھ گیا۔

رابی کا خط پڑھنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ وہ میں نے اپنی الماری میں بغیر پڑھے رکھ دیا تھا۔

شاہد حواس باختہ پہنچا تو رنگ اس کا فق تھا اور آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھا اور نظریں چرائیں۔ وہ بھی اپنے آپ کو رابی کی موت کا ذمہ دار سمجھ رہا تھا۔ مجھے اس سے کیوں گلا ہوتا، یہ دیوار تو خود میں نے اپنی ہاتھوں سے ڈھائی تھی۔ رابی کی محبت کی تحنیک تو میں نے کی تھی مگر شاہد نے اپنے دونوں ہاتھ میرے پیروں پر رکھ دیئے۔ روتے ہوئے بولا۔ ”معاف کر دے یا رب! قسم سے سب لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں مگر یہ مختلف کیوں نکلی؟ یہ وہ نہ تھی جو میں سمجھا تھا۔ یہ وہ نہ تھی یا رب! کوئی اور چیز تھی۔“

شاہد جب یہ کہتا کہ یہ وہ نہ تھی تو میں اپنے آپ سے پوچھتا یہ نہ تھی کا مطلب یہ کہ اب نہیں ہے۔ یہ سوچ کر میرا

کلیج چھلنی ہو جاتا کہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اس دن تو وہ یہیں بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھتی جاتی تھی۔ میں اب سمجھا تھا کہ وہ آخری بار دیکھ رہی تھی۔ کاش وہ مجھ سے نفرت کرتی۔ اتنی محبت نہ کرتی تو بھی نہ مرنی۔

شاہد کہہ رہا تھا۔ ”میں رابی کو عام لڑکی سمجھ بیٹھا تھا جو تمہیں پھنسانے آئی تھی۔ ورنہ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ لڑکیوں کے دل نازک ہوتے ہیں۔ کالج کی طرح۔ ہم ان کو ٹھوکروں پر رکھے ہوتے ہیں۔ انہیں سبز باغ دکھاتے ہیں۔ بڑی بڑی قسمیں اٹھاتے ہیں۔ وعدے کرتے ہیں۔ محبت جتلا کر دشمنی کرتے ہیں جیسے کوئی انتقام لے رہے ہوں۔ سچ تان کر انہیں محبت کے جال میں پھنساتے ہیں۔ جب وہ ہماری محبت کا دم بھرنے لگتی ہیں تو پھر انہیں بھٹکی ہوئی لڑکی سمجھتے لگتے ہیں۔ پھر یہی کہتے ہیں کہ میرے ساتھ پھنس سکتی ہے تو کسی کے ساتھ بھی پھنس سکتی ہے۔ ہماری نظر میں وہ کمزور کردار کی بن جاتی ہے۔“

میں اکیلا رہنا چاہتا تھا۔ شاہد کو بھیج دیا۔ جعفر اپنے کمرے میں جا لیا۔ میں کمرے میں اندھیرا کر کے لیٹ گیا، وہ رات میری زندگی کی کٹھن ترین رات تھی۔

اس رات تیسرے پہر میرا دل گھبرا اٹھا تو باہر چبوترے پر آکھڑا ہوا۔ وہ بیچ دیکھنے تھا جہاں وہ بیٹھی مسکرا کر مجھے دیکھا کرتی تھی۔ وہ بیچ دیکھ کر دبی دلی سسکیاں میرے حلق سے نکلنے لگیں۔ اسی بیچ پر بیٹھا میں سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جا رہا تھا۔ اس کی یاد میں گھل رہا تھا۔ رل رہا تھا۔ ماضی کی یادوں نے مجھ پر یلغار کر دی تھی۔

میں گزرے ہوئے لمحوں کو ذہن کی اسکرین پر دیکھ رہا تھا کہ ہم پارک میں اکٹھے بیٹھے ہیں۔ وہ بے اختیار ہو کر مجھ سے لپٹ رہی ہے اور جب علیحدہ ہوتی تو پھر لپٹ جاتی۔ میں اس سے وعدے کرتا تو یہی کہتی کہ وعدے مت کرو، یہ مت کہو کہ ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔ بار بار مجھے یقین دلاتی کہ اسے میرا وجود نہیں پیار چاہیے۔ وہ جب بھی یہ کہتی کہ میرے پیار کے سہارے ساری زندگی بتا دے گی تو میں ہنس پڑتا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اتنی زیادہ سچی ہے کہ جیسے ہی احساس ہوا کہ میرا پیار بھی ڈھونگ تھا تو پھر جی نہ سکی۔

مجھے چند دنوں پہلے کی بات یاد آرہی تھی جب اس کے گھر دعوت پر گیا تھا۔ نیلے سوٹ میں دہن لگ رہی تھی۔ کتنی افسردہ ہو گئی تھی جب میں نے اسے بری طرح نظر انداز کیا تھا۔ وہ حیرت اور سکتے کی حالت میں مجھے دیکھتی رہ

گئی تھی۔ میرے گھر میں بیٹھی تھی تو بھی بھی، سلگتی اور راکھ ہوتی۔ وہ وقت واپس آجائے کاش۔ میں اسے منالوں۔ معافی مانگ لوں اس کے قدموں میں سر رکھ کر کہوں۔ رابی اپنی سرکار کو ایک بار معاف کر دو۔ ایک موقع دے دو مجھے۔

چند دن بعد فیکٹری گیا۔ اس درخت تلے بیٹھ کر میں اور سلیم دونوں روئے۔ سلیم کہتا تھا کہ ماں جی سے جا کر مل لو۔ وہ تم کو بہت یاد کرتی ہیں۔ جا کر ان کے گلے لگ جاؤ۔ شاید تمہیں سکون مل جائے۔

رابی کے گھر جانے سے پہلے میں شیشے میں اپنا گناہ گار چہرہ دیکھتا رہا۔ اس کے سارے نقش بدل گئے تھے۔ میرے گناہوں نے میرا چہرہ گہنا دیا تھا۔ چہرہ اتر چکا تھا۔

میرا چہرہ تو بار بار اترتا رہا تھا۔ پہلے اس کی آنکھوں میں اترتا۔ پھر اس کی محبت کے سمندر میں ڈوبا اور پھر اس کی نظروں سے اترتا۔ آج پچھتاؤں کی دلدلوں میں اترتا ہوا تھا۔ یہ سوچ کر میں اپنے آپ پر ہنس پڑا کہ اس سے تعلق توڑنے کے لیے میں کسی خوب صورت موڑ کے انتظار میں تھا۔ واہ رابی کیا خوب صورت موڑ تم نے میرے لیے چنا۔ کس طرح راستے علیحدہ کر لیے۔

رابی کے گھر گیا تو صحن میں ماں جی میرا انتظار کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ اس طرح سے وہ روتی تھیں کہ لگتا تھا گھر کے درو دیوار ماتم کر رہے ہوں۔ اس کی بہنیں برآمدے میں دروازے کی دہلیز پر کھڑی رو رہی تھیں۔ مجھے اسی صوفے پر بٹھایا مگر اب کوئی اجلی چادر نہ تھی۔ سامنے وہی کرسی پڑی تھی۔ محسوس ہوتا تھا کہ نیلا سوٹ پہنے بیٹھی مجھے نکلے جا رہی ہے۔ گہرا جڑا جڑا لگ رہا تھا۔ ایک ایک کو ناما ماتم کدہ تھا۔ ایک برباد گھر جس کی تباہی کا میں اکیلا ذمہ دار تھا۔

میں دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے بیٹھا تھا۔ ماں جی بتا رہی تھیں۔ ”وہ چند دنوں سے متواتر کہتی چلی آرہی تھی۔ میں نے نوید سے شادی نہیں کرنی۔ وہ بہت دور کا پردہ سی ہے۔ مجھے وہ میری ماں سے دور کر دے گا۔“

پھر ماں جی مجھ سے پوچھنے لگی۔ ”تم نے اپنی مجبوریاں اسے بتائی ہوں گی؟“ میں خاموش اپنا چہرہ چھپائے بیٹھا رہا۔ ماں پھر سے بتانے لگیں۔ ”وہ شروع سے بہت حساس تھی۔ ابھی تو انیس سال کی تھی مگر میرے دکھ بانٹنے لگی تھی۔ خاموش تو شروع سے رہتی تھی مگر پچھلے کئی ماہ سے بہت خاموش رہنے لگی تھی۔ میں جانتی ہوں بیٹا وہ کیوں خاموش تھی۔ صرف

تمہاری وجہ سے وہ ہنسنے لگی تھی۔ پچھلے دنوں کہنے لگی اماں، جہیز کے کپڑوں سے ایک سوٹ اپنے لیے سلوا لوں۔ برا لگتا ہے دوسروں کے کپڑے پہن کر نوید صاحب کے سامنے جانا۔ میں نے کہا چلو سلوا لو تو اس نے نیلا سوٹ سلوایا جو تمہاری دعوت پر اس نے پہنا تھا۔“

یہ سن کر ایکدم میں نے اپنے چہرے پر رکھے ہاتھ ہٹائے۔ ماں جی کو دیکھا اور رو پڑا۔ ماں جی کہے جا رہی تھیں۔ ”وہ اپنا سوٹ بار بار مجھے دکھا رہی تھی مگر میں نے نظر بھر کر اس کی جانب دیکھا بھی نہ تھا۔ میں اٹھ کر زمین پر جا بیٹھا اور ماں جی کے قدم پکڑ کر رونے لگا۔ وہ رابی کی باتیں بتا رہی تھیں۔“

”اس کا رشتہ آیا تھا۔ اب کہتی تھی ماں اس کے لیے ہاں کر دو۔ میں نے تمہارا ذکر کیا تو لڑنے لگی۔ کہتی تھی ان کی اپنی مجبوریاں ہیں۔ وہ میرے ساتھ شادی تو کر لیں گے مگر ان کی زندگی خراب ہو جائے گی۔ ان کے خاندانی جھگڑے ہیں۔ مجھے۔۔۔ ان جھگڑوں میں نہیں پڑنا، مجھے نوید کے ساتھ شادی نہیں کرنی، آپ بس اس رشتے کے لیے ہاں کر دیں۔“

کچھ لمحے رک گئیں۔ بیٹی نے پانی لا کر منہ چھو پلایا اور وہی خود بھی پیا اور بولیں۔ ”میں تو اس رشتے پر خوش تھی مگر مجھے رابی کے دل کا معلوم تھا کہ وہ صرف تمہارے ساتھ ہی خوش رہ سکتی ہے۔ جس لڑکے کا رشتہ آیا تھا وہ امریکا میں رہتا ہے۔ لڑکے کی بہن کی شادی پر رابی بھی تھی۔ لڑکے نے شادی کے فوٹو دیکھے تو رابی کو پسند کر لیا۔ اس کے گھر والے منتیں کر رہے تھے۔ سب لوگ مجھے کہتے تھے کہ لڑکا امریکا میں ہے خوب صورت ہے، پڑھا لکھا ہے۔ وہیں سے ڈگری لی ہے۔ پہلے تو رابی اس کے نام سے بگڑتی تھی مگر اب کہتی ہاں کر دو۔“

میں حیرت سے بیٹھا یہ سب سن رہا تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ مجھ سے شادی کی لالچ میں مجھے اپنی اداؤں سے پھنسا رہی ہے مگر وہ تو اتنے اچھے رشتے سے میرے لیے انکار کر رہی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ زمین بھٹے اور میں زندہ اس میں دفن ہو جاؤں۔ میں ماں کا چہرہ دیکھ کر روتا رہا۔ ماں کہتی رہیں۔ ”بیٹا تم روؤ مت، اس کی روح کو تکلیف ہوگی۔ میں نے تمہیں اس لیے گھربلایا تھا کہ رابی اس رشتے کے لیے ہاں کہنے پر مجھ پر زور دے رہی تھی تم سے مشورہ کرنا تھا مگر تم خود اتنے مصروف تھے کہ نہ آسکے۔“ ماں جی مجھ کو بتاتی رہیں۔ ”بیٹیوں کا چہرہ ماں کے لیے آئینہ ہوتا ہے۔ مائیں ان کا دل ان کے چہرے میں دیکھ لیتی ہیں۔ میں اب تم سے اس لیے

ہینڈ ریمووہ کریم/لوشن



ہم لڑکیوں کو یہی تو چاہیے



ایک کھیل تھا تو میں اسی دن مر گئی تھی۔
رابی آپ کو سب گناہوں پر معاف کرتی ہے۔ دل سے
معاف کرتی ہے۔
آپ نے پیار نہیں کیا تو کوئی بات نہیں۔ میں تو آپ
سے محبت کرتی ہوں اور مر کر بھی کرتی ہوں گی۔
ایک وعدہ کریں مجھ سے کہ کسی لڑکی سے جھوٹے
وعدے نہیں کریں گے۔ کسی ایک کے ہو کر رہیں، سچ کہتی ہوں
یہی زندگی ہے یہی بندگی ہے۔

ہمیشہ کے لیے اللہ حافظ
رابی

پھر میں نے جاب چھوڑ دی۔
سب میرے اس فیصلے پر متعجب تھے۔ میں نے استغنیٰ
اپنے ڈائریکٹر کو دیا تو اس نے کہا۔ ”ایک بار پھر سوچ لو۔“
میں نے کہا کہ اب زندگی بھر فیصلے کر کے پیچھے نہیں
ہٹوں گا۔ میں نے استغنیٰ رکھا اور ان کے کمرے سے باہر نکل
آیا۔ ماں جی سے ملنے گیا۔ بہت دیر ان کے پاس بیٹھا رہا۔
مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ ”بیٹا تمہاری
آنکھوں میں ابھی تک رابی بیٹھی ہے۔ مجھے نظر آتی ہے۔“
میں نے گھر کا سارا سامان جعفر کے حوالے کر دیا۔
صرف اپنے چند کپڑے اور کچھ کتابیں لے آیا۔ شاہد سے کہا
مجھے ریلوے اسٹیشن چھوڑ دو۔ راستے میں اس سے ایک بار پھر
قبرستان جانے کا کہا تو اس نے گاڑی قبرستان کی جانب موڑ
دی۔ ڈھیروں پھول اس کی قبر پر چڑھائے۔ اس کے پاؤں
میں بیٹھ گیا۔ قبر کے کتبے پر لکھا تھا۔
راجہ کمال۔ عمر 19 سال۔

ٹرین شہر سے باہر نکلی اور میرے وجود میں آندھیاں
چلنے لگیں۔ میں اس کی قبر پر اس سے آخری وعدہ کر کے آیا تھا
کہ جس لڑکی کی قربت نے اسے مجھ سے بدظن کیا اب میں اس
سے بھی نہیں ملوں گا کیونکہ فوزیہ کی محبت ایک چمک تھی جو
آنکھوں کو خیرہ کر سکتی ہے لیکن رابی کی محبت دائمی ہے۔ ہر پہل
ساتھ رہے گی۔ تب سے میں ملک ملک آوارہ بادل بنا پھر رہا
ہوں۔ کچھ دن ایک ملک میں گزارتا ہوں پھر کسی اور ملک کے
لیے چل دیتا ہوں۔ گویا پردیس کی قانونی الجھنوں میں بار بار
خود کو پھنسا کر اپنے آپ کو مزادے رہا ہوں۔ مجھے نہ فوزیہ کی
کوئی خبر ہے نہ اپنے گھر والوں کی۔ بس ایک دعا ہے کہ میں
وقت آخر تک اسی طرح ہر جانی پن کی سزا خود کو دیتا رہوں۔

ملنا چاہتی تھی کہ تم میری بیٹی کا پیار ہو۔ وہ تم سے عقیدت رکھتی
تھی مگر جب سے تم دعوت سے گئے تھے۔ وہ پھر سے اداس
نظر آنے لگی تھی۔ وہ اس رات روتی رہی تھی۔ پھر ہر دن مصلے
پر بیٹھی دعا کرتی رہتی۔ بیٹا! ماں ہوں۔ جانتی ہوں۔ وہ تم کو
نہیں مانگتی تھی۔ تمہاری زندگی کی دعا مانگتی تھی۔ خوشیوں اور
کامیابیوں کی دعا مانگتی تھی۔ اس رات بھی رو کر دعا مانگ
رہی تھی۔ اذانوں کے وقت اپنے ابا کو نماز کے لیے اٹھایا۔ خود
بھی نماز پڑھی اور پھر سو گئی۔ وہ سوئی تو مجھے سکون ملا کہ کچھ دیر
تو آرام کرے گی۔ مجھے کیا معلوم کہ ہمیشہ کے لیے سونے
جاری ہے۔ دن چڑھ گیا تھا۔ اٹھایا تو نہیں اٹھی۔ ضد کر کے
سوئی رہی اور سوتے سوتے قبر میں جا اتری۔“

میرے بہتے آنسوؤں سے گھر کا فرش گیلیا ہو رہا تھا۔
مرتے مرتے مجھے سرخرو کر گئی۔ ایک حرف بھی میرے خلاف
زبان پر نہ لائی تھی۔ میں روتے ہوئے ماں سے بولا۔ ”بڑا ظلم
کیا ہے رابی نے مجھ پر۔ خود مر گئی اور مجھے پوری زندگی کا روگ
لگا گئی۔ مجھے زہر دے دیتی مگر یہ درد اور اذیت نہ دیتی۔ کیسے
گزریں گے میرے یہ دن۔ کیسے بیتے گا میرا یہ جوگ۔“
میں نے ماں سے کہا۔ ”میں جا رہا ہوں۔“

پوچھا۔ ”بیٹا کہاں جا رہے ہو؟“
”معلوم نہیں کہاں جاؤں گا مگر یہ شہر چھوڑ کر جا رہا
ہوں۔ آپ سے ملنے آتا رہوں گا۔ اس شہر میں رہا تو مر جاؤں
گا اور مجھے آپ لوگوں کے لیے ابھی نہیں مرنا۔ بیٹی گئی مگر بیٹا
آپ کے سر کا سا تباہ بنے گا۔“
اسی رات میں اپنے گھر آیا۔ الماری سے رابی کا خط نکالا
اور زمین پر آلتی پالتی مارے، وہ خط پڑھنے لگا۔
میری سرکار!

ہمیشہ سلامت رہیں۔ آپ کی رابی اپنی زندگی سرکار
کے حوالے کر رہی ہے۔ ہم بہن بھائی بہت مشکل حالات میں
پل رہے ہیں۔ ہمیں تو کھانا بھی ڈھنگ کا نہ ملتا تھا تو اتنا پیار
کہاں سے ملتا جو آپ نے دیا۔ یہ پیار میرے لیے زندگی کی
بہت بڑی نعمت تھی۔ آپ کا پیار اور پھر اس کا اظہار بہت دلکش
تھا۔ پھر خبر بھی نہ ہوئی اور اپنا دل آپ کو دے بیٹھی۔ آپ کے
پیار میں جدائی کا خدشہ بھی تھا۔ میں آپ سے جدائی برداشت
کر لیتی مگر یہ برداشت نہ کر سکی کہ آپ نے مجھ سے بھی پیار کیا
ہی نہیں۔ اگر پیار کرتے تو ہوں میں آپ کے ساتھ جوڑ کی
بیٹھی تھی اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر یوں نہ سہلا رہے
ہوتے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ آپ پیار نہیں کرتے اور یہ سب